

ہرچہ کی اشاعت میں تاخیر ہوگئی — ضرورت تھی کہ تھوڑا سا میں بھی آرام کر لیتا — یہی سوچ کر خوبصورت وادیوں کی طرف نکل گیا تھا۔

اس مرتبہ ان تمام عنوانوں کے ماتحت مضامین پیش کئے جا رہے ہیں۔ جن کا وعدہ سابقہ شمارے میں کیا گیا تھا۔ نئے عنوان تھے گمشدہ مضامین — حالات حاضر — اور تصویریں — ممکن ہے آپ اب کے بھی تصویریں نامی مضمونچے کو ڈھونڈیں اور وہ نہ ملے۔ کیونکہ اس کی جگہ ایک اسکچ (اختر اورینوی) پیش کیا جا رہا ہے۔ ہرچند کہ دونوں مضمونوں کی حدود قدرے مختلف ہیں۔ مگر میں یہ دونوں ایک ہی خاندان کے — البتہ اس مرتبہ ایک اور نئے عنوان کے ماتحت ”کھلے خط“ چھاپے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی مدیر کے نام بھی کام کے خط آ جاتے ہیں۔ مگر وہ ذاتی چیز سمجھ کے ایک طرف ڈال دیئے جاتے ہیں۔ اب کے راز یزدانی مرحوم کا ایک پرانا مگر تحقیقی نوعیت کا خط سامنے آ گیا تو میں نے اسے ایک اور خط کے ساتھ پیش کر دینا مناسب جانا۔ آئندہ بھی ہم اس سلسلے کو قائم رکھیں گے۔

جن ادیبوں نے ہمیں نیا انداز فکر دیا۔ ان میں ٹی۔ ایس۔ ایلٹ بھی ہے۔ آپ کو علم ہی ہوگا کہ میں بڑے ادیبوں کے مرنے پر یقین نہیں رکھتا۔ اگر کسی ادیب کی تحریریں زندہ ہیں تو وہ خود زندہ ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو آج ہم ایلٹ کے انتقال کے بعد ان کی تحریروں کو نہ ڈھونڈھنے — اس شمارہ میں ان کے ایک مضمون اور ایک نظم کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

نصیرالدین ہاشمی کا بھی ایک غیر مطبوعہ مضمون ”اہل نواہی کی ادبی خدمات“ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ مضمون وہ ہے۔ جسے ہاشمی صاحب نے مرحمت فرماتے وقت وعدہ کیا تھا کہ اس کی دوسری قسط جلد ہی حیدرآباد جا کر پہنچا دوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ مضمون کے آخر میں لکھا ہے۔ ”باقی آئندہ“ — میں مرحوم نصیرالدین ہاشمی سے عرض کرنا ہوں کہ وہ اپنا وعدہ پورا کریں۔

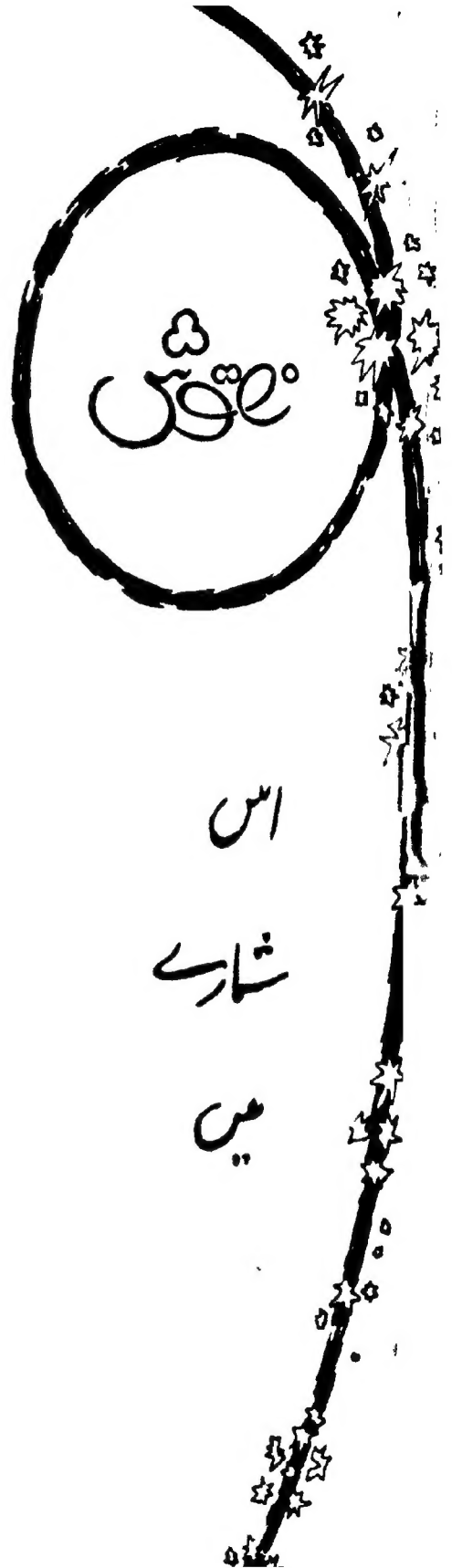
ممتاز منٹی نے اب کے اپنے ایک نمائندہ افسانے ”آہا“ کا تجزیہ خود کیا ہے۔ یہ سلسلہ بھی بڑا اہم ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ بڑے ادیبوں سے، ان کی نمائندہ تخلیق کے محرکات پر بھی لکھوائیں۔

شوکت تھانوی کی ایک اہم تخلیق ”نسیم منزل“ کو بھی قسط وار پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ پہلی قسط حاضر ہے۔ آئندہ بھی ہم اس سلسلے کو قائم رکھیں گے تاکہ ادارہ نقوش آپ کو یاد دلانا رہے کہ شوکت تھانوی اردو کے صاحب طرز ادیب تھے۔ یوں اس لئے کر رہے ہیں کہ ہم اپنے محسنوں کو جلد ہی بھول جانے کے مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

بعض تخلیقات پر وقت نہ ملنے کی وجہ سے، صحیح جگہ پر نہیں آسکیں۔ یہ مجبوری تھی — ہر چند کہ کوئی بھی کسی کی مجبوری کو معاف نہیں کرتا۔ مگر میں آپ سے درگزر کی درخواست تو کر سکتا ہوں۔

”ہد نقوش“

• بابائے اردو مولوی عبدالحق مجبوری نقوش کہا کرتے تھے۔ سوچتا ہوں ان کی یاد میں کبھی اس نام



زندگی آئینہ اور زندگی آموز ادب کا گنایندہ

ٹیلیفون ۳۵۲۵
رہائشی ۶۴۸۹۸

جسٹس ایل نمبر ۵۳۱۲

نقوش



علیہ السلام ربانی آباد

قیمت مجموعہ پورچہ
۵/۵۰ روپے

محمد طفیل

۵۵ نمبر ۲۰ روپے
برادری ۲۵ روپے

ادارہ فروغِ اردو ۵ لاہور

ترتیب

۱ - طلوع

محمد طویل - ۳

عظیم فن کار

۲ - اہل روایت اور شخصی استعداد

۳ - چہار شنبہ مبارک

فی المس - سلسلہ ۳۰

نمبر: انصاف حسین نقوی

فی - ایس - سلسلہ ۳۸۱

نمبر: سید فیضی

شخصیات

۴ - مولانا ابو الطحان شحین

۵ - ڈاکٹر عبدالحق

۶ - پروفیسر لبرل

۷ - آغا شہ

مولانا عبدالحق و رہابادی - ۲۶

مولوی عبدالحق - ۲۹

نمبر: معین الرحمن

ضیاء الدین احمد پری - ۱۹۱۶

محمد حسب اللہ رشیدی - ۱۳۷۷

مقالے

۸ - شہر آشوب

۹ - دودھ تقدیرین و ب

۱۰ - ادب اور مدنی و عقل

۱۱ - تشریح الفاظ

۱۲ - اہل لڑائی کی اردو لغات

۱۳ - جرنل فاضلہ رفقا

سید معبود حسن رضوی - ۵۰

ڈاکٹر سید بلجاری - ۸۱

ڈاکٹر ذیشان چاند - ۱۱۸

رتبہ حسن - ۱۱۰

صدرالاس ہاشمی - ۱۲۹

سالم شاہد - ۱۶۵

گشدہ مضامین

۱۴ - قرآن مجید و سب سے پہلا دور و زمانہ

نظمیں، غزلیں

۱ - برق دیدہ

۲ - آفتہ

۳ - دلہن کی برہمنی تو سنا دے نوری نعتی

۴ - بے سبب تپ کا برسرِ حسن تون

۵ - سدا سے بے حد

۶ - فن کی سب سے زیادہ آواز ہے اور چاہو

شاد علی القادر - ۳۳۰

مدرسہ محمد امجد علی خان

جوش مسیح - ۱۹۱

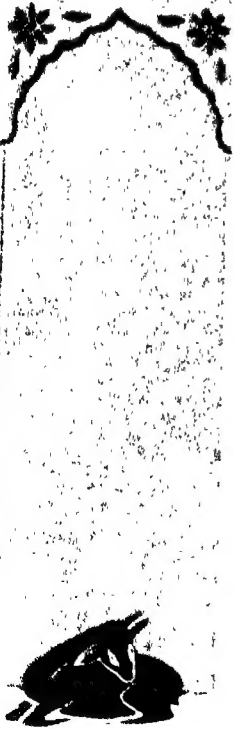
جوش مسیح - ۱۹۲

فدائی کورنگی پوری - ۱۹۶

سیدہ فاطمہ علیہ السلام - ۱۹۷

محمد سائیدہ - ۱۹۸

احمد علیہ السلام - ۱۹۹



طلوع

بب سے میں نے یہ پر حجابہ کرتا، کیوں کے خلافت دادیہ چانے کی بجائے بہتر یہ ہے
 یہ نیز، مادا دیا جائے۔ اس وقت سے میرا چنے کا انداز بدل گیا ہے۔ میں اب یہ نہیں کتا کتا
 دے لے کر نہیں، غلوں اور بے کچھ نہیں کیا۔ غلوں سے اسے نے کچھ نہیں کیا۔ جلد اپنے طور پر یہ
 کا ہوں وہ جہاں تک ہو سکے۔ ادب کی راہوں میں چھوٹے چھوٹے دیے جلد دوں۔
 میرے ایک دوست نے کہا: زندگی کسی کو صحت نہیں دیتی۔ اس لیے جلد سے

بے پھر زواہی:

مناج

نہا ہوں درمان سوتا ہے جی جلد پڑا کر بیٹھے۔ اچھے کاموں کی خواہش ہوتا
 میں جوتے جلد پڑا کر بیٹھے۔

لکھنوی میں نے ایسے سارے۔ دونوں پر نظر ڈالی۔ جوا بھی نا سودہ تھے۔

چند دن اسے تھے۔ جس میں زبان کی تسکین کے سامان نظر آئے۔ چند ارمان
 تھے جن میں ان کی آواز کو ٹیٹے دیے۔ چند ارمان ایسے بھی تھے۔ جو محض خواب و خیال کی ذ
 تسکین تھے۔

پنے۔ انوں و بوب دن۔ دو غلے ترازیوں میں تو لا تو کبھی کوئی پڑا اچھٹا ہوا

بسی کوئی

میرے دہی کے نماں غلوں میں تو ایک دنیا بسی ہوئی تھی۔ جس سے میں کسی حد تک
 بے خبر تھا۔ یہ وہ دن تھے ایک ساتھ چلا۔ تو نے کسی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس مینا بازار میں
 نو ہفتہ نو۔ دوسری کیفیت دیکھ مشعل ہو گیا۔

میں نے سوچا زندگی صحت ہے یا نہ ہے۔ کوئی مجھ سے میری آرزوں کو تو
 نہیں لے جاتا۔ دوسری صحت میں۔ وہ دن جہاں کی ساتھی!

میری سوچیں ابھی مجھے عقل ہی دے۔ یہی عقیدے کہہ نظر تک ایک ایک کر دیے جا

اور میرے ساتھ کیا:

ہر دھڑکتی موت کو ایک نا سودہ کی آرزوئے صحت دے دی!

محمد رفیع





سنتھالی

عمل ، زین المادین

طلوع

جب سے میں نے یہ پڑھا ہے کہ، یوں کے خواتین داویہ پانے کی بجائے بہتر یہ ہے کہ
 اب نہ، ماویہ دیا جائے۔ اُس وقت سے میرا سوچنے کا انداز بدل گیا ہے۔ میں اب یہ نہیں کہتا کہ
 نے کہ میں کیا، انھوں نے اب نہیں کیا۔ انھوں نے سارے نے کچھ نہیں کیا۔ بلکہ اپنے طور پر یہ چاہئے
 ہوں کہ جہاں تک ہو سکے۔ اب کی راہوں میں چھوٹے چھوٹے دیئے جلا دوں۔
 میرے ایک دوست نے کہا: زندگی کسی کو صحت نہیں دیتی۔ اس لیے جلد سے جلد
 بپہ کر ڈالیں!

مکمل ہے

ان ہوں ۱۵۔ ان سرتو اسے ہی جلد پڑا کر لیجئے۔ اچھے کاموں کی خواہش ہو تو انھیں
 میں جوتے ہو کر لیں!

نہیں! میں نے اپنے سارے، انوں پر نظر ڈالی۔ جو ابھی نا اسودہ تھے۔
 چنہ۔ ان سے تھے۔ جس میں ان کی تسکین کے سامان نظر آئے۔ چنہ ارمان ایسے
 تھے جن میں ان کی سوا کی کو بیٹھنے دیکھ۔ چنہ ارمان ایسے بھی تھے۔ جو محض خواب و خیال کی دنیا کے
 تھے۔

اپنے، انوں کو جب دن دودھ سے ترار دین تو لا تو کسی کو فی پڑا بھکتا ہوا نظر آیا
 کسی کو!

میرے ان کے شانِ عافوں میں تو یہ دنیا ہی ہوتی تھی۔ جس سے میں کسی حد تک
 بنے ہوئے تھا۔ یہ وہی ہے کہ ایک سادہ چار۔ تو جسے کسی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس میں بانہ میں ایک
 خواہش کو، دیکھو دوسری کیفیت دینا مشعل ہو گیا۔

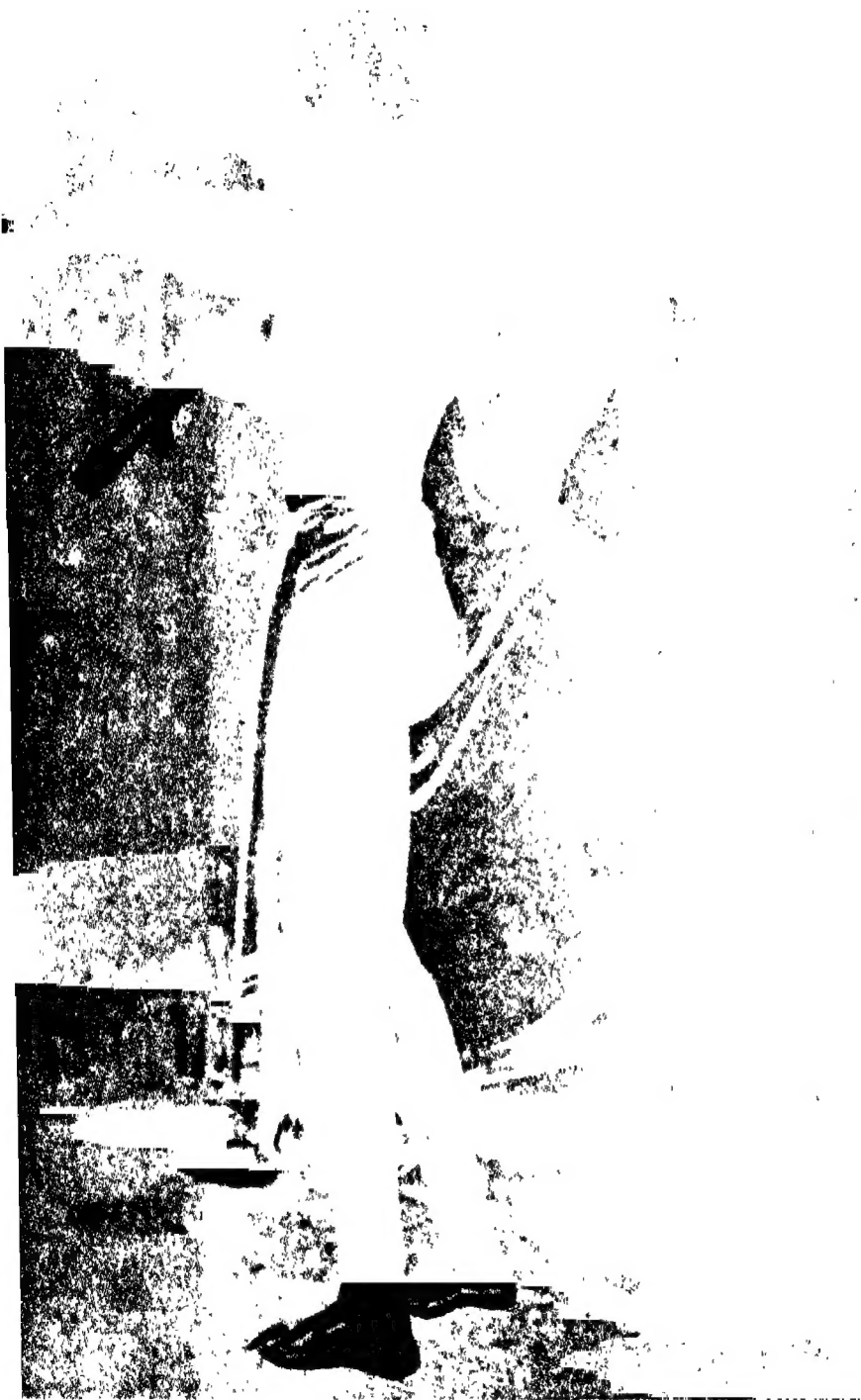
میں نے سوچا کہ زندگی صحت سے یا نہ ہے۔ کوئی مجھ سے میری آرزوں کو تو چھین کر
 نہیں لے جاسکتا۔ وہ میری ساتھی ہیں۔ وہ ان جہان کی ساتھی!

میری سہیلی ابھی مجھے قہقہے ہی دے رہی تھیں کہ وہ نظر تک ایک ایک کر دیئے ہوئے تھے
 اور میری سہیلی نے کہا:

میرا صحت کو ایک نا اسودہ کی آواز دے شکت دے دی!

محمد طفیل





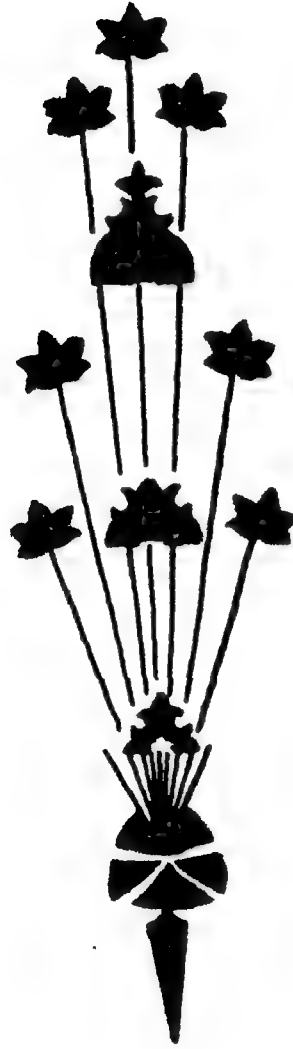
سنتھالی

عمل ، زین الماہدین

ہیڈائنز ۲۰ نومبر ۱۹۶۸ء

نمائندہ مذاکرہ آف آرٹس سے فائن آرٹس کی سند حاصل کی۔ سپین، میکسیکو،
جاپان اور رہائشی ممالک میں کام کر چکے ہیں۔ کالج آف آرٹس اینڈ کرافٹس
ڈھاکہ سے بیسٹ ہیں۔ اور اس وقت پشاور یونیورسٹی کے فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ
کے فائبر ماسٹر ہیں۔

پریسکو اور دوسرے بین الاقوامی اداروں کے زیر اہتمام نمائشوں میں ان کی
نصائح سے سراج نمائش پایا۔ برطانیہ، فرانس، ترکی، جاپان، میکسیکو، رہائشی
ممالک اور روس میں ان کی ایک شخصیت نمائش منعقد ہو چکی ہیں۔
خلیل اسحاق اور صدر کے اتمام یافتہ ہیں۔



مقاله

شہر آشوب

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

میرا ایک مضمون 'شہر آشوب' کے عنوان سے گھنوبہ نیورسٹی جرنل کے ۱۹۳۲ء کے سالانے میں شائع ہوا۔ میں اُس مضمون میں وقتاً فوقتاً نئی معلومات کا اضافہ کرتا رہا۔ اس اثنا میں محرمی ڈاکٹر سید حبیب اللہ نے ایک مبسوط تحقیقی مقالہ 'شہر آشوب کی تاریخ' کے عنوان سے لکھا جو اُن کے مجموعہ 'مقالات بحث و نظر' میں شامل ہے۔ ہر سال میں اپنے مضمون میں اضافے کرتا رہا اور اب وہ مضمون تمام اضافوں کے ساتھ موجودہ محدث میں شائع کیا جا رہا ہے۔ موضوع کی یکسانی کے باعث میرے اور ڈاکٹر صاحب موصوف کے مقالوں میں بعض مضامین کا اشتراک ناگزیر ہے۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جو ایک مقالے میں ہیں اور دوسرے میں نہیں ہیں۔ اس لیے ان دونوں مقالوں کے مطالعے سے 'شہر آشوب' کے بارے میں سب کچھ نہ سہی، بہت کچھ مزید معلوم ہو سکتا ہے۔

ادیب

مرآ آشوب، ابتدائی مفہوم اور اس کی وجہ تسمیہ | 'شہر آشوب' ایک منفی ظلم کا نام ہے، جو ابتدا میں ایسے قلعوں یا راجوں کا مجموعہ ہوتی تھی، جن میں مختلف طبقات اور مختلف پیشوں سے فتنہ رکھنے والے لڑکوں کے حسن و جمال اور اُن کی دل کش اداؤں کا بیان ہوتا تھا۔ مرنی اعتبار سے لفظ 'شہر آشوب' یا مرگیا ضا فی ے اصناف متکثر کے ساتھ یعنی آشوب شہر یا اسم فاعل ترکیبی ہے یعنی آشوبندہ شہر اس سے نفوی حیثیت سے شہر آشوب لے ایک معنی ہوئے شہر کے لیے فتنہ اور جنگا مراد دوسرے معنی ہوئے شہر میں فتنے اور جنگا مرے پر پا کرنے والے۔ حاصل دو کو ایک ہے۔ حسین و جمیل لڑکوں کی ذات جنگا مر کا باعث ہو سکتی تھی۔ یہی 'شہر آشوب' کی وجہ تسمیہ ہے۔ خواجہ حافظ ابدولہ فی کے مندرجہ ذیل شعروں سے لفظ 'شہر آشوب' کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے:-

فغان کین لویا بی شوخ و شیریں کار و شہر آشوب
چنان پروند صبر از دل کہ ترکان خوان عینا را
مہ نہ تنہا خواہم این خوابان شہر آشوب را
یکست در شہر آشوب خوابان نیست کوسے خوب را

حافظ

جاتی

کچھ حکم کے بعد میں یوسف علی حسینی جو بانی نے سورابامیوں کا ایک مجروح مصنف الامتاف کے نام سے مرتب کیا۔ اس کے دیباچے کا ابتدا بامی درجہ خانے کی ہے جو حسب ذیل ہے :-

لے اہ رخ تو طابان اطل
یوسف بہ جات نکالی چون پیر
پر مٹن زور کا شہر بجے ت
از مٹن مال است و شہر آشوب

اس بابی کے آخری دو مصرعے بھی شہر آشوب کی وجہ تسمیہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ماخذ محققان شیرانی نے شہر آشوب کی تعریف یوں کی ہے: "اس قسم کی نظمیں جو میں شہر آشوب کا موضوع" پیشہ درون کا قلعہ کی شکل میں ذکر ہو، شہر آشوب کہلاتی ہیں۔ یہ تعریف ابتدائی شہر آشوب پر پورے طور پر صادق نہیں آتی۔ ان میں پیشہ درون کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ جیسا اوپر کہا جا چکا ہے، پیشہ درون کوئی کے شہر و حال اور ان کی دل کش اداؤں کا ذکر ہوتا ہے۔ بعد کے بعض شہر آشوب کا موضوع بھی یہی ہے۔

شہر آشوب کی ہیئت اور موضوع میں تنوع | ابتدا دراز کے ساتھ شہر آشوب کی ہیئت میں تنوع پیدا ہوا گیا اور اس نے قلعوں اور ربابیوں کے علاوہ کسی مختصر شہروں یا منفرد شہروں کے مجموعے کی شکل اختیار کر لی، کبھی قلعہ کی اور کبھی شہر کی۔ اس کے موضوع میں بھی تبدیلی ہوتی رہی۔ اس میں کبھی شہر کے قلعہ جتن اور پیشہ درون کا بیان کبھی ہر دی کے رنگ میں کبھی تخیل اور ربابیوں کے انداز میں ہونے لگا۔ اور آخر کار شہر آشوب اسے ایسی نظم اولیٰ جملے علیٰ جس میں کسی شہر کی تباہی اور اہل شہر کی بد حالی کا بیان ہو۔ اس طرح شہر آشوب کی حسب ذیل تین قسمیں ہو گئیں :-

۱۔ ایسے نظمیں ربابیوں، مختصر شہروں یا منفرد شہروں کا مجموعہ جس میں مختلف جہتوں اور پیشہ درون کے لوگوں کے موصوفوں اور ان کی دل کش اداؤں کا ذکر ہو۔

۲۔ ایسی نظم جس میں مختلف جہتوں اور پیشہ درون کا ذکر ہر دی کے رنگ میں یا تخیل کے مجموعے کے انداز میں کیا گیا ہو، خواہ قلعہ کی شکل میں، خواہ شہر یا شہرستان کی شکل میں۔

۳۔ ایسی نظم جس میں کسی شہر کی تباہی اور اہل شہر کی بد حالی کا بیان کیا گیا ہو، خواہ کبھی شکل میں ہو۔

شہر آشوب کی ہیئت اور موضوع کا توضیح کے بعد اب فارسی انداز دو کے کچھ شہر آشوبوں کی کیفیت تاریخی ترتیب سے بیان کی جاتی ہے اور ان کے کچھ اشارہ نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس طرح شہر آشوب کے تدریجی ارتقاء کا خاکہ سامنے آجائے گا۔

شہر آشوب کا نمونہ | سب سے قدیم چیز جو شہر آشوب کے نام سے ملتی ہے وہ محمد سعد سلمان ترمذی ۱۱۵۰ھ کے ہاں فارسی قلعوں کا مجموعہ ہے جو ان کے کئیات میں شامل ہے۔ اس لیے ہم اسی قدیم شاعر کو شہر آشوب کا نمونہ کہتے ہیں۔ ان قلعوں میں مختلف جہتوں اور پیشہ درون کے رنگوں کا ذکر ہے جو بار اور دہر کے لفظوں سے

یکے گئے ہیں۔ مثال کے لیے چند قطعے مع عنوانوں کے نقل کیے جاتے ہیں۔ ہر قطعے کا عنوان ایک مصرع ہے۔

صفت یار رنگریز کُند

چشم زد کرد آن رُخ رنگریز کہ باوش سرد است و رُخ آفتاب
بشستش پس از رنگ آب و چشم کہ شست آب جہان آن ہر دو خواہ
بلے ہرچہ رنخش کُند رنگریز از آن پس بشوید مرا در آب

در حق دلبر جبار بگفت

آنکہ او بردگان ز بس خوبی پھر خورشید بر شہر آمد
شدند از تنور چون دل من باد و رفت و باد و مر آمد

صفت یار کبوتر باز است

اُنس تو با کبوتر است ہمہ شنگری از ہوس بپا کر خویش
ہم باعث بر تو باز آید ہر کبوتر کہ رانی از بر خویش
رفتن و آمدن نبرد رہی چون نیا موزی از کبوتر خویش

صفت یار بر بلی گشتہ

بت ز ہر آسمان جہاں چو ز ہرہ ہمہ بر تو فرزند خالی
کند تو خالی نہ باشد ز ہر بلط ز ہر بلط نہ باشد بلط ز ہر خالی

کلا طرح بہت سے مہتوں اور ہیشہ وروں کے لڑکوں کا ذکر ہے، جی میں سے چند یہ ہیں۔ جنہر فروش، چاہ کمن، رقا ص، آہن گر، برودہ فروش، کاتب، قصاب، طبیب، بنم، عطلا، دیاباب، شاعر، بخوی، چوگان باز، قلندر، لشکری، تیغ زن، کشتی گیر، یسین لڑکوں کا ذکر اُن کے اوصاف کے ساتھ کیا ہے، مثلاً: خوش آواز، زرین کر، خوش رو، سماجی، فلسفی۔ بعض لڑکوں کا ذکر ان کے حیرت کے ساتھ کیا ہے، مثلاً: نابینا، گنگ، اچھل، رنگ زدہ، خط بر آوردہ، سیل چشم، گریاں۔ یہ قطعے مختلف جہروں میں ہیں اور ان میں بیٹیوں کی تعداد دو سے نو تک ہے۔

ان قطعوں میں جہ یاروں اور دلبروں کا ذکر کیا گیا ہے، عالم خیال کے سما خارجی دنیا میں اُن کا وجود نہیں، اور تفسیر طبع کے سما ان قطعوں کی تصنیف کا کوئی مقصد نہیں۔ اس قسم کے تمام شہر آشوبوں کا یہی حال ہے۔
ایک طرح کا ایک شہر آشوب امیر خسرو متوفی ۷۸۱ھ کی طرف منسوب کیا گیا، مگر غالباً کسی بہت بعد کے شاعر کی تصنیف

رویش پس پتہ ترا زومی تاخت گزنی کہ مگر ماہ بمیزان آمد

در صفت ترسا پتہ

اے بُتِ بزمِ مریحِ مگر ترسا کی باید کہ بوسے بندہ بے ترس آئی
مگر چشمِ ترم بہ آستینِ پاک گئی مگر برب خشک من لب ترسا کی

امیر خسرو نے اپنے فارسی اشعار میں جو ہندی لفظ اور فقرے جا بجا داخل کر دیے ہیں، ان کی مثال میں حافظ محمود خاں شیرانی نے اپنی کتاب پنجاب سے میرے اُردو میں بہ رباعی شمس کی ہے۔

تیلی سپرے کہ می فسد و شد تیلے از دست و زبان چرب اُردو اویلے
خالے بہ لبش دیدم و غمغم کہ تل است گفنا کہ بروغت دریں تل تیلے

یہ اس رباعی کو از قسم شہر آشوب قرار دیا ہے لیکن صرف ایک رباعی پر شہر آشوب کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ آگے چل کر فرماتے ہیں۔

رستم بہ تماشا بہ کتار جوئے دیدم بہ لب آب زن ہندوئے
غمغم منا چیت بملے کویت فسد یاد بر آرد کہ دُر دُر کوئے

یہ رباعی کو صنف شہر آشوب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں کسی پیشہ ور کا ذکر نہیں ہے۔ صرف ایک فقرہ 'دُر دُر کوئے' با آغلیبے جو دو تائیں بھی ہے اور دو معنی بھی۔ اس فقرے کو اگر فارسی بھیجے تو ایک معنی نکلتے ہیں اور اگر ہندی بھیجے تو دوسرے معنی نکلتے ہیں۔

۱۔ مخدعہ باسد باسد امیٹوی (مترنی شاعر) نے اپنی کتاب منار المصابط میں امیر خسرو کا اسی طرح کا ایک شعر لکھا ہے جو صحیح ہے۔
غمغم کہ در پی حنا نہ مامون تو نام گفنا کہ در پی حنا نہ جویت مامانی
اس شعر میں دو لفظ مامون اور مامانی دو معنی ہیں اور دو معنی ہیں۔ باسد نے اسی مقام پر امیر خسرو کی ایک رباعی بھی لکھی ہے جو ذیل میں سچ کی جاتی ہے۔

داریم آرد کہ حکایت کنیم بات لاد غلام روئے تو صد برگ زیر پات
ہر بر بھی کہ دید رخِ خوبت لے صم ذنار رگست و لکد ز دبروئے لک

یہ رباعی میں نشان زدہ الفاظ پر ہندی ہونے کا دھوکا جوتا ہے مگر وہ فارسی ہیں۔ بات یعنی باتو لاد ایک شہر و معروف پیرل پات یعنی پائے قواحت ایک بُت کا نام۔ منار المصابط کا ایک قدیم اور خوش خط نسخہ ایسی ناقص نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ ادیب

ابن ہشام کی تصنیف صفت الاسماء کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں صفت لکھا ہے کہ ایک وقت بادشاہ نے کلاخا دولت کی طرف توجہ فرمائی -
صفت مردوں کی صفت خداوندی کسی کی صفت دیکھی اس کے بارے میں ایک شعر کہ دیا۔ چنانچہ چھپی گر کی تعریف میں یہ معلق کا:

دیر چھی کو او در محسوس بے ہمتا بود
حرف ہائے چاہ و سر نوشت مابود
اکی حال میں حکم ہوا کہ شہر صفت مردوں اور پیشہ وروں کے معنی کی تعریف میں اشارہ کہ بادشاہ کے حضور میں پیش کریں۔ شاعر نے اس حکم کی تعمیل کی اور شاہی حاتیوں سے سرفراز ہوئے۔ میں نے بھی چند شعروں کیلئے اور الطاف خسرو اذ سے مستحضر ہوا۔ چونکہ بادشاہ نے مجھ پر سب سے زیادہ توجہ اور رعایت فرمائی لہذا یہ قطع نظم ہو گیا۔

خداوند عالم سخن رانی	شاہ آبرو شہ نصیب مستدار
شہ را طلب نمود شے	کہ فاش نہ گر ہر اشار
بہر وقت و پیش کش کرد	از در خشم و کوسے شہوار
بہر اہم نمود و دے	بہر اندک و بہر سخن بیار
کو یہ میں غار نمود و بہر لعل	میں شہم لعل بہر پیش میں بہر غار

در بابے دایمیں اگر میں نے ہر سال ترتیب دیا اور صفت الاسماء اس کا کام لکھا، کہ خسرو ملک سخن کی نظریں شہر قبول حاصل کرے

یوسف بر جانی کا شہر آشوب مستحسب صفت الاسماء
صفت الاسماء میں کل ستر با حیاں ہیں۔ ذیل کی رباعی سے شہر آشوب کی ابتدا کی گئی ہے۔

شہر آشوب کے پیشہ وروں کو است	بادشاہ و کد افق رساں چوں مہار است
وہ عالم معنی شرفش پر زمرہ مست	از نام جان پناہ اکبر شاہ است

اس کے بعد اشعار سے رباعیوں میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کے ملاکوں کی تعریف کی گئی ہے۔ آخری رباعی در تعریف یوسف کا خود جس پر شہر آشوب ختم ہوتا ہے یہ ہے۔

یوسف سخن از بستن بازار کو	آہم بادشاہ حکایت حصار کو
وہ زاد از مسکن کہ خاکو شانہ	خاکوش نشیں بید و ہیار کو

یوسف بر جانی کی چند رباعیاں صفت الاسماء سے نقل کی جاتی ہیں۔

در تعریف شاعر پسر

در ملک سخن خسرو معنی بین است
هم محل بیش چو شعر او ز نغمین است

شعر پسرے کو چوں سخن شیریں است
هم سرو قدش چو طبع او موز و نعت

در تعریف آتش باز پسر

آتش بازے کو آتش سخن افزوخت
آتش بازی ز طرۃ خویش آموخت
در سر که آتش افشانی کرد
یک چشم زدن تمام عالم را سوخت

در تعریف زرگر پسر

زرگر که دل از وفاش ناز و مارا
در بوته جبرمی گدازد مارا
از لطف بدست مادر غاتم معل
تا حلقه مجوش خویش سازد مارا
ب (محمّد) نے اپنی کتاب ترک شاعری کی تاریخ میں سبھی متوفی سالہ
کی ایک نظم "شہر انجیر" کا ذکر کیا ہے جو اُس نے شہر ایدریا نوپل کے متعلق لکھی تھی اور
جوئی کیا ہے کہ فارسی میں اس طرح کی کوئی نظم موجود نہیں ہے۔ پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ ادبیات ایران میں اس دعوے کو
لے تے ہوئے تحفہ سامی کے حوالے سے کہا ہے کہ فارسی میں کم سے کم ایسی دو نظمیں ضرور موجود ہیں، ایک دیتی قبی کی نظم
یز پر اور دوسری حرّی اصفہانی کی نظم گیلان پر۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تحفہ سامی میں ایسی دو نظمیں، چار نظموں کا ذکر کیا گیا ہے
ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

سُطّان حسین میرزا کے زمانے میں آگئی خراسانی (متوفی ۹۲۱ھ) ایک فاضل دانش پر داز
لکھی خراسانی کا شہر آشوب | اور قصیدہ گو شاعر تھا، مگر اس کے مزاج میں خباثت اور حرص دُنیا بہت تھی۔ اُس نے
بر خسرو کے قصیدے دیائے ابراہ کے جواب میں اہل برات کی جو میں ایک شہر آشوب لکھا جس کے ابتدائی شعر یہ ہیں۔

عمر شہر پری رنگ بہشت اور است
در گمش را شہر خورد شید گل میخ ز راست
جہم ہیں یک شست خاک ز خاک زین خندش
ز گس باغ جان آئے او ہفت اختر است
پائے تخت صد ہزار ان خبر و گیتی گشت
گنہ تاریخ بے شان انجم شکراست
چرخ کی رو ہیں کہ از تاثیر او شہر چنیں
مسکھ میں پریشان رود گاہ ہزار است

قصیدے میں رنگ افاد بہت آئے ہیں جو ذکر کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن دو شعر جو خواہ میں کیا لکھیے کہ گئے ہیں
میں اُس کی تصویر لکھ دی گئی ہے۔

اکبر بادشاہ اور شہر آشوب | اکبری حمد کی تصنیف صفت الامناف کا ذکر اہر آپ کا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں صفت لکھا ہے کہ ایک وقت بادشاہ نے کاغذ دولت کی طرف توجہ فرمائی - صفت گروں کی صفت و عذرا و ہر کسی کی صفت دیکھی اس کے بارے میں ایک شعر کہ دیا۔ چنانچہ چھپی گر کی تعریف میں یہ صفت لکھا:

دہ چھپی کہ اور حس بے ہمتا بود
حرف ہانے چاہے اور فروشت ما بود
اسی حال میں حکم ہوا کہ شہر صفت گروں اور پیشہ وروں کے صفت کی تعریف میں اشارہ کہہ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کریں۔ شاعر نے اس حکم کی تعمیل کی اور شاہی خاتیوں سے سرفراز ہوئے۔ جس نے بھی چند شعر عرض کیے اور الطاف خسروانہ سے مستحق ہوا۔ چونکہ بادشاہ نے مجھ پر سب سے زیادہ توجہ اور حمایت ذاتی منانہ یہ قطع نظم ہو گیا۔

خند و عام سخن رانی شاہ اکبر شہ فک معتاد
شہ را طلب نمود شبے کہ فاشند گو ہر اشار
بہر نقد و پیش کش کہ وہ از دہنم و دے شہوار
بہر تعریف نمود و دے بہ ہر اذک و بہ من بیار
گروہ من غار بود و ہر محفل من شد مہمانی پیش من ہر بخار

و بارے و امیں آفرین نے یہ سادہ ترتیب دیا اور صفت الامناف اس کا نام رکھا کہ خسرو ملک سخن کی نظر میں شرف قبول حاصل کیے۔

یوسف جرجانی کا شہر آشوب مستحکم بہ صفت الامناف | صفت الامناف میں کل ستور با حیاں ہیں۔ ذیل کی رباعی سے شہر آشوب کی ابتدا کی گئی ہے۔

نہ سخن ز بے عش و دغواہ است بادشاہ و دغواہ رساں چوں اداست
وہ عام مہنی شرفش بر ز ہمنہ از نام جہان پناہ اکبر شاہ است

اس کے بعد اشارے ربا جہوں میں مختلف جہتوں اور پیشہ وروں کے ملاکوں کی تعریف کی گئی ہے۔ آخری رباعی در تعریف یوسف کام خود جس پر شہر آشوب ختم ہوا ہے یہ ہے:-

یوسف سخن از بستن بازار کو آفرین باشد حکایت حصار کو
وہ ز ادایہ منکر کہ خاموشانہ خاموش نشین ہمد و بیار کو

یوسف جرجانی کی چند رباعیاں صفت الامناف سے نقل کی جاتی ہیں:-

در تعریف شاعر پسر

در ملک سخن خسرو معنی بین است
ہم لعل بکش چو شہر اکو رنگین است

شاعر پسرے کہ چوں سخن شیریں است
ہم سرود شش چو طبع او موز و نست

در تعریف آتش باز پسر

آتش بازے کہ آتش سخن افروخت
آتش بازی ز طرۂ خویش آموخت
در مصرکہ کہ آتش افشانی کرد
یک چشم زدن تمام عالم را سوخت

در تعریف زر گر پسر

زرگر کہ دل از دفاش نازدارا
در بوٹہ حبس می گدازدارا
از لطف بہت ما دور خانم معل
تا ملکہ بگوش خویش سازدارا

گلب (۱۱۸۷ھ) نے اپنی کتاب 'تذکرہ شاعر' کی تاریخ میں سبھی متوفی ۹۱۸ھ کی ایک نظم 'شہر انجیر' کا ذکر کیا ہے، جو اُس نے شہر پیر یا نوبل کے متعلق لکھی تھی اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ فارسی میں اس طرح کی کوئی نظم موجود نہیں ہے۔ پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ ادبیات ایران میں اس دعوے کو رد کرتے ہوئے تحفہ سامی کے حوالے سے کہا ہے کہ فارسی میں کم سے کم ایسی دو نظمیں ضرور موجود ہیں، ایک وحید قلی کی نظم 'تبریز پر اور دوسری حرثی اصفہانی کی نظم 'گیلان پر'۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تحفہ سامی میں ایسی دو نہیں، چار نظموں کا ذکر کیا گیا ہے جو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

سلطان حسین میرزا کے زمانے میں آگہی خراسانی (متوفی ۹۳۲ھ) ایک فاضل دانش پر داز اور قصیدہ گو شاعر تھا، مگر اس کے مزاج میں خباثت اور حرص دنیا بہت تھی۔ اُس نے امیر خسرو کے قصیدے 'دیائے ابرار' کے جواب میں اہل برات کی ہجو میں ایک شہر آشوب لکھا، جس کے ابتدائی شعر یہ ہیں:-

حرم شہر پری رنگ بہشت اور است
در گلش را چترہ خورشید گل مرغ زارت
جرم طین یک مشت خاک ز خاک پر خندش
ز گس باغ جہان آئے او ہفت اختر است
پائے تخت صد ہزاران خبر گوئی شست
گنہ تاریخ بے ستان انجم شکرات
چرخ کی رو میں کہ از تاثیراد شہر چنیں
مسک مجھ پریشان روزگار بہر است

اس قصیدے میں ایک الفاظ بہت آئے ہیں جو ذکر کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن وہ شعر جو خواجہ حسین کیال کے لیے لکھے گئے ہیں ان میں اُس کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔

اس شہر آتشب سے نامزد ہوا جس کی زبان کاٹ ڈالی۔
 اس شہر آتشب سے نامزد ہوا جس کی زبان کاٹ ڈالی۔
 اس شہر آتشب سے نامزد ہوا جس کی زبان کاٹ ڈالی۔

دعوتی کا شہر انگیز
 دعوتی کا شہر انگیز ہے جو کہ ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔
 دعوتی کا شہر انگیز ہے جو کہ ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔

اس شہر انگیز میں ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔
 اس شہر انگیز میں ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔
 اس شہر انگیز میں ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔

دعوتی کا شہر انگیز ہے جو کہ ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔
 دعوتی کا شہر انگیز ہے جو کہ ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔

اس شہر انگیز میں ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔

دعوتی کا شہر انگیز
 دعوتی کا شہر انگیز ہے جو کہ ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔
 دعوتی کا شہر انگیز ہے جو کہ ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔

دعوتی کا شہر انگیز ہے جو کہ ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔

دعوتی کا شہر انگیز
 دعوتی کا شہر انگیز ہے جو کہ ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔
 دعوتی کا شہر انگیز ہے جو کہ ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔

دعوتی کا شہر انگیز
 دعوتی کا شہر انگیز ہے جو کہ ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔
 دعوتی کا شہر انگیز ہے جو کہ ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔

دعوتی کا شہر انگیز ہے جو کہ ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔

دعوتی کا شہر انگیز ہے جو کہ ایک شہر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی۔

تختہ سامی اور مذکورہ بالا شہر آشوبوں کی نوعیت | تختہ سامی کا مصنف سام میرزا شاہ اسماعیل بانی سلطنت صفویہ کا
فرزند تھا۔ اُس نے یہ کتاب ۹۵۷ھ میں لکھی۔ کتاب میں

سات صفحے ہیں۔ پانچویں صفحے میں فارسی کے شاعروں کا ذکر ہے، صرف ان شاعروں کا جو مصنف کے ہم عصر تھے۔ سام میرزا کا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آگئی اور حرقی کے شہر آشوب میں ہرات اور گیلان کے لوگوں کی سخت بھوک لگی تھی اور وحیدی قتی کے شہر انگیز میں مصعب بنان تبریزی، یعنی تبریز کے مختلف پیشہوروں کے ملاکوں کے حسن و جمال کا ذکر کیا گیا ہے۔ عشقی کے شہر انگیز کا صرف ایک ہی شعر سامنے ہے اور اس سے گمان ہوتا ہے کہ اس نظم کا موضوع بھی مصعب بنان تبریزی ہے۔ یہ چاروں شاعر سام میرزا کے ہم عصر تھے۔ ان کی زیر نظر نظموں میں دو ایسی ہیں جن میں کسی شہر کے لوگوں کی بھوک لگی ہے اور ایسی ہیں جن میں مختلف طبقوں اور مختلف پیشہوروں کے ملاکوں کے حسن کا ذکر کیا گیا ہے۔ شکل کے اعتبار سے ایک قصیدہ ہے ایک مثنوی ہے اور دو کی کیا شکل تھی معلوم نہیں۔
ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :-

تبریز اور ہرات کے علاوہ بعض اور شہر آشوبوں کا ذکر بھی تختہ سامی میں آیا ہے
مثلاً فقہور لاجی کا شہر آشوب گر جتان، عشقی کا شہر آشوب تبریز۔ اسی طرح
وجیر الدین عبداللہ سانی شیرازی کا شہر آشوب خطہ تبریز۔

میرے مطالعے میں تختہ سامی کا وہ ایڈیشن رہا ہے جو پرنسپل یونیورسٹی نے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا تھا۔ اُس میں نہ فقہور لاجی کا ذکر ملتا ہے نہ سانی شیرازی کے شہر آشوب کا۔ ڈاکٹر عبداللہ نے سانی کا نام وجیر الدین عبداللہ لکھا ہے۔ یہ نام بھی تختہ سامی کے اس ایڈیشن میں موجود نہیں ہے۔

طاہر وحید کے ابیات در تعریف ہر فرقہ | شاہ عباس ثانی صفوی (۱۵۷۸ تا ۱۶۲۹ء) کے وقایع نگار طاہر وحید
(متوفی ۱۶۲۹ء) نے اپنی ایک نظم میں ہر طبقے کے

ملاکوں کا ذکر ایک دو شعروں میں اور بعضوں کا تین چار شعروں میں کیا ہے۔ یہ اشارہ قدیم بیامن میں جو میسر کتب خانے میں موجود ہے، ابیات در تعریف ہر فرقہ کے عنوان سے درج ہیں۔ ان میں سے چند شعر نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں :

زر گر پسر

بستہ ہمد چو نقرۂ حمام زر گر پسران نازک اندام
خام دل غشتہ پریشان اعتر زینہ ساز ایشان

حداد پسر

حداد خبر ندارد از درد بیہودہ چہ کو کم آہی سرد

نہار پسر

نہار پسر زندہ ہمیشہ برپاے دل و زور تیشہ
گمے کو خادو بس کشیدہ چون آہ امید من بریدہ

کمال

کمال کہ دہری فن دوست چشم روشن زویدن دوست

نعمت خان عالی کا قصیدہ شہر آشوب | مدعا میری میں نعمت خان عالی کی شہر کتاب وقایع محاصرہ کوکھڑو

جس میں ایک قصیدہ شہر آشوب ہے جس میں اہل دکن کی پریشانی
عالی جان کی گئی ہے یہ قصیدہ شہر آشوب کے مضمون سے متعلق ہے۔ میں اس میں شہر آشوب کے پرانے
مضمون کی تصدیق بھی کرتا ہوں۔ اس قصیدے کے چند شعر نقل کیے

وہی ملک خواب و بیدار میں رہتا رہا ہے
بہر مست و سیدہ خلق اسدا و ناداری
سپاہیوں کی موت کی گنت جوں
حبیب از عجب و بیامی وار و مہین معنی
مختار و ام کشیدہ فداکت از فلک حاصل
مخائب سال را بہشت ماہ روزہ و روزہ
ماند و پیش کشا می بہار رشتہ شے
رسد تا جان سپاری کار قبولی زبے برقی
دور و آواز را از غار خود را انداز خست
نہ جہد و سے زر حجام اگر آئینہ نغوشہ
فرہ و زانی بہ علاج آئینہ است و پند می گوید
ز گم یابی کے پُرسیدہ از روزت چہ مانڈایا
صدائے ماتے از خاندان ریخت پُرسیدم
ز جانے غفلت شای شہیدم نعمت ہمایہ
یکے گشتہ خداوندہ بحق فرج پسینہ

چو گنج افتادہ اند اہل ہند در گنج ویرانے
کہ معنی ہم ندارد این زبان حرف سخن دانے
دشیر و سپہ دار دوم آجے لب نانے
نباشد خوب تر از شربت دینار و رمانے
ز منصف جوع چند قرص مراد گردانے
برائے آن کہ معلومش نہ شد شمال و شبلانے
سوز عشق بازان دام گیر در شستہ جانے
برائے سرخرو و غی چون خادو بسیدہ پانے
ملک و بریزہ خواشش خود تیز و ندانے
کہ یک سو در باطنش نیست غیر از چشم حیرانے
برای نسبت بود و در رفیق کار آسانے
بجھت احوال اگر این است پہرے ساقی دانے
چہ شد گفتند و رای خانہ دار و گشت ہمانے
کہ تنھے دید شب و راتہ پُر آرد انبانے
برائے قلہ ٹکٹہ و کن ایجاد طوفانے

یچے گنت اے رحمان حق موسیٰ عمران
یچے گنت اے خداوند کریم از حرمت موسیٰ
یچے گنت بہر قرص دادن خلق کن یارب
یہوئے ہندوئے نصرانیئے، گبرئے، مسلمانے
بیار از آسمان ترا عجیب یا مرغ بر یانے
برائے ما فرست امروز ہم چون مائدہ خوانے

یچتا خوشابی کا جہان آشوب | احمد یار خان یچتا خوشابی غلام خان (شہنشاہ اورنگ زیب) کے ادھر عہد
میں ملک سندھ کا صوبہ دار تھا۔ مشہور خوب کہتا تھا۔ ایک شہری عالم گیر

کے مرثیے میں لکھی ہیں کہ نام 'جہاں آشوب' رکھا۔ اس کے دو شعر یہ ہیں:-

ایرانی کس بے قدر قیمت
چو مال مردہ پامال قیمت
بہر در خاک بے قدری ضررہ
چو شیر اہل زنگ خوردہ

(تذکرہ بے نظیر)

فارسی کے کل شہر آشوبوں کا پتہ لگانا مقصود نہیں ہے۔ اور چون شہر آشوبوں کا ذکر کیا جا چکا ہے وہ شہر آشوب کے
نقوی اور اصطلاحی معنی اور اس کے بنیادی یا ابتدائی اور ثانوی یا توسیعی مفہوموں اور ہیئتوں کی توضیح کے لیے
کافی ہیں۔

اردو شہر آشوب کی ایک مشکوک مثال | اردو میں متعدد شہر آشوب کہے گئے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں ذیل کا قلم
شہر آشوب کی مثال میں پیش کیا گیا ہے اور امیر خسرو کی طرف منسوب کیا

گیا ہے:-

ہندو بچہ بن کہ جب حسن دھڑے چھے
بروقت سخن گفتن کچھ پچور جھڑے چھے
گفتہ زب لعل تو یک بوسہ بچہ مر
گفتا کہ ارے رام نرک کا میں کہے چھے

یہ قلم امیر خسرو کی تصنیف ہو یا نہ ہو، اس میں شک نہیں کہ کسی قدیم شاعر نے اس ابتدائی دور میں کہا ہے، جب فارسی اور
ہندی کی آمیزش سے اردو کا پیکر تیار ہو رہا تھا۔ اس ایک قطعے کو انفرادی حیثیت میں شہر آشوب نہیں کہہ سکتے، بلکہ ممکن
ہے کہ یہ کسی مجموعہ قلمات میں شامل ہو جس کو مجموعی حیثیت سے شہر آشوب کہہ سکتے ہوں۔

مثالی ہند میں اردو شاعری کا عام رواج محمد شاہ کے عہد میں ہوا۔ اس عہد کے کئی شاعروں نے شہر آشوب کہے ہیں جن
میں زمانی ترتیب قائم کرنا مشکل ہے۔ اس لیے ان ہم عصر شاعروں کے شہر آشوب بلا لحاظ ترتیب پیش کیے جاتے ہیں۔

نابجی کا شہر آشوب | محمد شاکر ناجی محمد شاہی عہد کے نامی شاعر تھے۔ ان کے بارے میں آزاد آبجیات میں
لکھتے ہیں:-

نادر ی چڑھانی اور محمد شاہی لشکر کی تباہی میں خود شامل تھے۔ اس وقت دربار کا گنگ
شرفاد کی خماری، پاجیوں کی گرم بازاری اور اس پر ہندوستان یوں کی آرام طلبی اور

ہر چہرہ کی ایک عروسی عکس میں مصیبت۔

یہ کہ اس شخص کا شوبہ کتنے ہیں۔ آزادانہ اس شخص کے حسب ذیل دو بند نقل کیے ہیں:-
 طبع جو نہ تو بر سرِ ہیں انہ کہ جیتے تھے دُعا کے زور سے دلی وواکی جیتے تھے
 شرم میں گھر کی نکالی نہ ہے جیتے تھے محو و نقش میں جا رہا کہ چیتے تھے
 گھر میں بنیاں بازو آپ کے کمال

مقام سے بچ گیا مرناسیں تو کھانا کھا کر میں شام کے اچھے پرانا کھا
 نہ پانی پیئے کر پیا وہاں نہ کھانا کھا بے تھے وہاں جو شکر تمام چھانٹا کھا
 ذرا تھک رہا تھا وہاں نہ کھانا کھا

آئی ہے۔ وہاں بہت چند حضرات کی تہی کے ساتھ محمود غزنوی بھی نقل ہو گئے ہیں۔
 یہاں کہتے ہیں جو آراء اور آرائی کے جو حصے اور تہہ و ستودہ کے حصہ تک نہ دے، جو کوئی
 کتبی کا شہر آشوب میں رہی نہ رہے تھے، علیٰ ہر حال نہ کرنا، ہر قسم میں ملتے ہیں، گویند شہر
 آشوب و عزم و قوت نہ اور نہ تھکات کے خوف قادیانہ پوری کہتے ہیں بہت سے شہر و نہشت، علیٰ ہر حال ہر قسم شہر آشوب
 از و سے یادگار است۔ اگر قادیانہ یاں بھی ہے تو شاید اس سے زیادہ عرصہ کی شہر آشوب نہ فارسی میں کیا گیا اور نہ اردو میں۔
 سات سو شہر و عزم ہر حال پانچ شہر نے تھکات آشوب میں اور پانچ شہر میر تھکے اپنے ذکر نہ شہر میں نقل ہو گئے ہیں اور وہ ایسے
 خوف تہی ہیں کہ ذکر نہ میر تھکے کے پہلے عرصہ میں تھکے میں نہ تھکے گئے۔ ان شہروں میں شہر ہر حال و فیہ روز،
 دانش اور حکما دانش کی جو کئی گئی ہے۔

ابن شداد پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کھتری کے شراب و خمر میں مختلف چیزوں کے، دھوسوں کی جو ایک ایک

[illegible][illegible]

اس شخص کا پہلا بند 'بیس' سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ 'بارہ صدی' سے حاتم کی مراد ہے بارہویں صدی ہجری جس میں ان کی زندگی گزر رہی تھی، حسب ذیل ہے :-

تو کھول چشم دل اور دیکھ قدرت کرتار کہ جن نے ارض و سما اور کیا ہے لیل و نہار
 ذرا کے سیس نگار و سما تو ہسر کے دوار کہ دور بارہ صدی کا ہے سخت نا بہار
 جہاں کے باغ میں یکساں ہے اب خزان و بہار

اسا غری بنیہ ہے :-

کہے ہے پر مخ اگر تھہر اپر جنا حاتم تو سنے پاس نہ کر جا کے انتہا حاتم
 تے ہے رزق کا نامی سدا خدا حاتم تو انتخاب زمانے کا نام نہک حاتم
 قسرا بند و فقرش میں نہیں ہے حسب ذیل ہے :-
 ذکر و مجاہدہ کو فقاری کی نوبت ہے مصاحبت کی اگر جدا اس کو خدا سے
 یکسر قوم کو برائے مکان پر حوت ہے تو کیا جو اگر داسے کی زر پتی پہنچے
 ہے افتخار تجیوں کا خود عزت و عار

حاتم کے اس شعر آشوب کا بنیادی موضوع وہ سماجی انقلاب ہے جو نادر شاہ کے حملے سے دم میں آیا تھا اور جس کے نتیجے میں جتنا قیام و خیر میں کچھ بھاری کھری ہو رہی تھی، یعنی اپنے اپنے جتنے کچھ نیچے اتر رہے تھے اور پیچھے جھٹکے ہوئے تھے، حاتم اپنے جتنے کے آدمی تھے۔ وہ اس انقلاب کو ایک حیثیت عظیم کہہ سکتے تھے۔ اسی کے ساتھ ان کا حاکموں، امیروں، منصب داروں اور اہلکاروں کی بد اخلاقی اور بد اعمالی کی نشایت بھی تھی۔ اس شعر آشوب کے کچھ کھڑے نقل کیے جاتے ہیں :-

شہوں کے بیچ دولت کی کچھ نشانی نہیں امیران پہ سپاہی کی قدردانی نہیں
 بزرگوں پہ کہیں ہوتے مسکائی نہیں قراضہ کھانے کی پاب نہیں روپائی نہیں
 کہا جاتا ہے جانا، اسادت و پیار
 میاں کے قاضی و مفتی جیسے ہیں شریف میاں کے دیکھو سب اہل کار ہیں گھوڑ
 میاں کرہ سے نہیں دیکھتے ہیں آدم کی آؤ میاں سمجھوں نے بھلائی ہے لڑکھو تو گلو
 میاں نہیں ہے دار و منصب دار و دار

امیر زادے ہیں میاں اپنے حال کے نیچے تھے آفتاب پر اب آٹھنے زواں نے نیچے

رذائے آج نئے نیچے زر کے متے ہیں ہیں لباس زری سب کو کی دکھاتے ہیں

ظہری آتے ہیں پُر کیے آگ آگ کے کشتے پھرتے ہیں پی پی کے دھندلکے

گھٹتے سب بے ہر اک آگ پھلاوے کا بھوٹا دھپنے سے بابل سے نرنگا گالے کا

پہری ہیں پکے جاویں آگ تیل کے نہیں ہیں تیل سا بیٹے اور چنبیل کے
ہونے ہیں صاحب مال دزد و حیل کے رکھیں ہیں شوق سدا دل کے پناہ سیل کے
مٹے ہیں بھول خانہ قیام باش و دار

حرام خورم گئے اب طالع خود ہونے جو چوتھے وہ جسے شاہ شاہ چوہنے
جو زبردست تھے سدا دوزخ میں وہ جسے جنوں کو زود تھا سب مال مورہ نے
جو خاک بچاتے تھے تھے سو بگڑے دوزار

بھرا ہے یہ دزدوں کے پست و بادام ظہری و تانیس اپنے صاحبوں کو ظالم

جاں ہیں صاحب غن غنا غاس ملے ہیں محل جنوں کے تھے ان کو کھٹکے کٹنے میں

جل جل کچھڑ کے بوم آجے ہیں بستی میں نجیب چھوڑ کے ٹھنڈی کو ہیں محل میں خوار

نجیب خاں بدوش ایک مینی اور دوش جے باغبان کے گھر میں بہار جوں گلزار

جاں میں صاحب شیشر ہی کے مقل مر جھگڑے ہیں کا شہر سدا دکان اور گھر
بیشہ کاذب ہیں بھڑ بھڑے پنے بختوں پر ابیر دودھ غنی وہی کے ہیں غور
بنا ہے نڈا فاش شد شک فاش و نگار

دوں کے بیج منائی نہیں بے یار وہی کہیں جو بگڑے بھی شاید تو اب ہزار وہی
سندوق ساز کے زر ہے بھرا انار وہی جو تھے شیش سدا کریں اب سولہاں وہی
حواقرن کے جسے ہیں سرورید ہمار

ہم کی دوسری بارہ صدی میں بھی کچھ اسی طرح کا باغی کھ گئی ہیں۔ چند بار
کا خط ہیں۔

ہم کی دوسری بارہ صدی

دقت جو مرا قلعے میں آتے ہیں بنی بے جہ کی دے کیا کیا بھیں دکھاتے ہیں

ہاں میں مے پیچ و تاب کھاتے ہیں لگتے خراب ہیں اور بکتے زر کھاتے ہیں

خزائنِ خدا بھی یہی شہر تیں دکھاتے ہیں

دور ہے شہر کا کچھ نہیں دُزگار بہت نجیب قسم زندگی سے ہیں بسینہ دار

اچھے پٹے پہنتے ہیں مندانِ خوار لکھو تو کس طرح ہم سے سپر مری کا دستار

ہمارے غضبِ بیزاری کھاتے ہیں

اندھی کی بالکل طرح رو بیٹھے بہت ایرِ جُبیرِ دس سے ہاتھ دھو بیٹھے

دوں طرف سُرُجِ دار جو بیٹھے جہاں پناہ سیتی ٹلک کو ڈبو بیٹھے

دیکھ دوڑ سے تو بھی اٹھک کھاتے ہیں

دیکھتے ہی کچھ زما زور آیا دوں سے ہر گئی اب جفا دہور آیا

کیا کریں دُشیا کا اور طر آیا نینے پھیل گئے پاجیسوں کا دور آیا

گلی دو چوں میں بن کے بھیں دکھاتے ہیں

ہاں اس بند کے آخری سرے کی شرت کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ نیچے بیٹھے کے لوگوں کی مالی حالت

خود آرائی اور خود کافی کا شوق تو پیدا ہو گیا ہے لیکن سیاہی ابھی نہیں آیا ہے بھٹکتے پیشے والوں کی

نصیب انداز میں پیش کیا گیا ہے مثلاً

یہ کی تک بھڑکے کے پتے بن گئے پوچھا سرے کا تو اسیرِ دلی سہریں

تو کی چوکان کینا کر بیٹھیں چریں ہیں کیستے میدان کر کے گھر انکھیں

پھر ان کے باپ جی اس کی پستے بناتے ہیں

نیچے جی کر جلت کر ٹپ کھنڈی منہ کے ڈال دیاں تو پھون کو لکے پر مذی

سینے جاتے ہیں چوک کی منہ دی پھر یہ ہیں کہتے ہم ہاٹ گھاس ہیں رندی

بیش دہی و صاحب نکا دکھاتے ہیں

وچھو ڈرے اور تیرے کسی روز رکھا آچرے بن گئے کا

سل پر دم آتا ہے پچھتے ہیں سچو رہا تار دار سچے کا

دو چار یا پچھوں کھڑکھٹاتے ہیں

گھنڈیاں پر سے اٹھکے حسی کے لا جو رہی بن گئے بچے پانچے سوئی کے

ہاں گھنڈیاں اور سونے انگری کے چریں ہیں اور بن گئے دھوپ کی کھنڈی کے

مستند اور اذکار کا مجموعہ سے آگے جاتے ہیں

اسے غزل کے انخاص بننے کے ہیں اور یہ غالباً کمال ہے۔ مطلع موجود نہیں ہے۔ اس کی زبان میں اتنی غامضیاں ہیں کہ یہ محض کلام نہیں معلوم ہوتا۔

شعریاتی کا قصیدہ 'حسب حال زمانہ' | بھی نانی صاحبہ و شفیق اور ملک آبادی نے 'حسب حال زمانہ' -
غزلوں سے ایک قصیدہ کی شکل کا شعر آشوب کھا جس کے ابتدائی
شعریہ ہیں۔

ایک دن دل نے کہا مجھ سے کہ صاحب شمس اور میر
اس اکھ کے پانچ صوفیوں کے چوتھے بادشاہ
ان کی دولت میں رقت اور سب غرض حال تھے
آسمان دہی ہے اور دہی زمین نصرت سے دو
ثامت نیت بجا تہ پر میں ہے کچھ قصور
یہ کلام میسر سامنے ہیں ہے۔ اس لیے اس کی ذمیت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

میر حسن کی زبانیات و ترجمین الہی عرفان | میر حسن کے خیالات میں زبانیات و ترجمین الہی عرفان کے غزلوں سے یہ
جہاد، غزلی، بھلا اور سحر کے دھڑوں کا اور اس اذکار سے کیا جاتا ہے۔

نئے فاپر سب کو دھکیل جاتا ہے اس غرضی کو کوئی پاتا ہے
دو چار سے نہیں جاتا ہے الہی اولی کا ہے ۔۔۔ ہاتھ سے اس کے کچھ بھرا آتا ہے

میر حسن کا قصیدہ 'حسب حال زمانہ' | میر حسن کے خیالات میں زبانیات و ترجمین الہی عرفان کے غزلوں سے یہ
جہاد، غزلی، بھلا اور سحر کے دھڑوں کا اور اس اذکار سے کیا جاتا ہے۔

سودا کا قصیدہ 'شعر آشوب' | سودا کے دو شعر آشوب ہیں ایک قصیدہ کی شکل میں اور ایک غزل کی شکل
اب سامنے میرے جو کوئی پسند و محال ہے دو شعر آشوب کے دو شعر آشوب ہیں زبان ہے

اس قید سے میں اب دلہی کی شخصیت اور اہل کمال کی بے قدری اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ قید سے میں بجز کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ چند شعر نوٹنے کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں۔

گھر ڈالے ہر ڈکڑی بھٹے میں کسو کی
تھوڑا سا چادر پار پہ نشان ہے
گزرے ہے سدا یوں ملت دور کی بنا
خیر ہو کہ میں تو ہر خیر کے ہاں ہے
سرد آگری کیجئے تو ہے اس میں شفت
دکھن میں ہے وہ جو وہ سمنان ہے
قیمت جو پکاتے ہیں اس طرح کڑاٹ
بکھے ہے فدا شدہ یہ دوزی لاکھان ہے
فلانی اگر کیجئے تو کھان کی بت بہت
ہاں اور دیتے اس کے جوئی شرفی تھا
اور احاطہ آخرہ غالب کیا ہیں بتاؤں
ہاں۔۔۔ وال اس اور جوئی وانا ہے
وہ گزرا ہوا وہ طمان سے دلائے
شب غور تھے تھوڑا سا ہاں ہے
وہ بیت کے سبزہ تھکے تھے کھان
غزلی میں تھا اب میں فدا شدہ کڑا ہے
جو ہر سو اپنا تھے گزری ہیں آہ
چاہت ہو کوئی شیخ نے یہ فدا ملت
دیتا تھے ادا تھے وہی تھے نسبت
وہاں میں تو اسود کی رشتی ہے اعتدال
سو اس پر نہ تھیں سہی کے دل نہیں ہے
یہاں غور نسبت ہے تو ادا فدا شدہ

مندر پر او شاد رنگت تھات سے یہ کئے ہیں تھانے اپنے زمانے کے جیسوں اور شادوں کی حرارت بھی ہے اُن کے جوئے و دوست نقل کرتے ہیں:

عجیب

جیسے پہ جب بت سے جلد آدمی ناز
سرد سورا پہ اوجھسی دے ہاں ہے
صحت ہے نہ اس سے اگر تھانے تھوڑا عجیب
تھوڑے آدمیوں کو وہ نسبت سوراں ہے
دیتے ہیں شکاری و کھان ہاتھ میں اس سے
تھوڑی ہوا کے فکر اس وقت کھان تے
اور اچھا تو یہ جو وہ مناسب اور بھی
کھا تو یہی تھے ہیں، پھر اس کو حفظاں ہے
جھونک میں ہے غور اور غور سے یہ آدمی
بت آدمی پہ پھلی تھیں آپکا زباں ہے
یہ بھی تو نہیں ہے کسی سے جو نسبت
ہاں میں جو کہیں درد اٹھ پٹھان کے
جو جو سنا سنا ہوا ہوا ہوا ہے

رکتے ہیں غرض مرگ سے ڈرنے کو سپاہی کر دکھا کجور بہت کماں ہے

شاعر

شاد جوئے مہلتے ہیں مستی احوال دیکھے جو کوئی شکر و ترود کو قریاں ہے
 مشتاقی کلمات اُنہوں کا کس و نا کس فنا نہیں اُس سے جو ظن ایہ ظن ہے
 گر عید کا سہرہ میں پڑھیں جا کے دو گانہ نیت کفہ تنیت صابن زان ہے
 تاریخِ تزد کی ریت آٹھ سپر بھر گرمی میں بیگم کے شینس نغز خاں ہے
 استاد محفل ہو تو کہیں ریشہ آیا بھر کوئی نہ پوچھے سپاں سیکھ کماں ہے
 سرد کا دوسرا شہر شربِ حشیش بند کاغذ ہے اس میں بھی دہلی کی تباہی دہان کے
 سرد کا محفل شہر آشوب گون کی بے روزگاری ایروں کی پریشان حالی اور خبر بیرون کی کس پر ہی کا بیان ہے

اس شہر شرب میں ہیں کہیں نو کار ملک بہت کراہی ہو گیا ہے چند بند نقل کیے جاتے ہیں
 کامیں نکلے یہ سرد سے نہیں تو ڈانٹاں ڈول چسپے ہے جا کہیں ذکرِ ہرے کے گھوڑا مرال
 لگا دو گئے یہ اس کے جواب میں دو بول جو میں کہوں گا تو بکے گا تو کہے یہ ششول
 باکر توڑی تھی ہے ڈھریوں یا قول

سپاہی رکتے تھے ذکرِ امیر دولت مند سرد آمد ان کی تو جاگیر سے جوتی ہے بند
 کہا ہے ملکِ لڑکت سے رکتوں نے پسند عویک شخص ہے ایسے شوبے فاحش و نہ
 دی زبان کے تھقت میں زبرداری کول

ہیں ان فاکھ میں کارلسن جو یوں ہر تباہ کرنا وہ زبرد زراعت میں تو نہ دی پرکھ
 بند وہاں ہی فکر رکھیں یہ میں چاہا کماں سے آویں پیادے کریں جو پیش نگاہ
 کچھ سرد جو پچھے پسپاں وہ بازو کے قول

دی تھا وہی بابے پر اُنہوں کی مشاں جو چاہو اس کو نہ بکرائیں تو یہ کیا احسان
 پران کا ٹکر ہے تنیت غریب پر حشر آں رہتے کا مصلہ اگر ملک کا یہی تو ندان
 نچے میں آتش کسروں کے پاکی میں ڈھول

نخل ہو یہ رسا نے زمیں بہت پانی کچھ وہ شورعی عیسیں ہیں جو سرد پاٹا
 تمام غریب تہ سید ملک میں کالی ندان کراٹے مل کر ٹھہرائیںٹ کا مانی
 پر پئے زعم میں ہراک جانے تو ڈھول

ملکیت سرد کے دو ملہ و شورعی غم گون کی دوسے بھی یہ مصروف نگاہیں ہر جا بکلا (ادیب)

پسے جو لام انھیں تو نکل کے کھائی سے رکھیں وہ فروغ جو سوئی پھرے لڑائی سے
پیادے ہیں سو ڈریں سر ٹھٹھاتے نائی سے سدا گر پڑیں سوتے میں مہار پائی سے
کسے جو خواب میں گھوڑا کبھی کے نیچے اول

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری سپاہی آمنتی سبوں کو بے کاری
اب آگے دستہ تن کی کموں میں کیا غاری سوال و سختی کو چاڑ کر کے پساری
کسی کو آفر دے بازہ اور کسی کو کٹول

یہ جتنے غمتی و جائز کے حقے منصب دار تھڑک کر کے ڈھیلے انھوں نے جو ناچار
خانہ مسترض میں بیوں کے دی سپر توار گھوڑوں سے اب جو نکلے ہیں لے کے دو بختیار
بغل کے بیچ تو سونا ہے ہاتھ میں کپول

ایرا بھو جی دانا انھوں کی ہے یہ چال برے ہیں خانہ نشین دیکھ کر زمانے کا حال
پچھ ہے سوزنی غوج کھڑا جھلے بے زوال حضور بیٹے ہیں اک دو ندیم اہل کمال
دھری ہے سامنے ایک پکیاں اک قبول

سوزا پڑے زندہ دل تھے۔ جمی باتوں پر دوسرے روئے اُن پر وہ بستے تھے۔ کیس اپنہ شہر کی تباہی سے وہ بھی انہماں
بھک تار نہ جوتے۔ تو بھستے بستے رو دیے اور شہر آشوب کا زخمی حصہ دہی مرحوم کا مرثیہ ہی گیا۔ چند بندہ ملاحظہ
ہوں :-

خواب ہیں وہ عمارات یا کموں ٹھو یا کس زخمی کے دیکھے سے جاتی رہی تھی کھل اور پیاس
اور اب جو دیکھ کر تول ہوئے زندگی سے اس جانے کل چسپوں میں کہ کر بے گھاس
کیس تنوں پڑا ہے کیس پڑے م قول

یہ بارگاہ کئی کس کی نصیر نہیں مستورم نہ جلنے کوئے نہ عاید قدم وہ کوئی تھا شرم
جہاں تھے سدا دستور اب اس جگہ ہے زورم مچی ہے زار و زخمی سے اس پہچان میں حرم
کھوں کے ساتھ ہاں بیس کریں تھی قول

غیب زادوں کا ان دنوں ہے یہ مسول وہ برقع سہ پہرے جس کا قدم تلک ہے قول
ہے ایک گرد میں لڑاکا گلاب کا سا پھول اور اُن کے شہ حب کا برابر ہے یہ اصل
کوخاک پک کی جیس ہے جو ہے نول

جان آباد تو کب اس ستم کے متابی تھا مگر کبھی کسی عاشق کا یہ تھروں صحت
کوئیں شاہ دیا گویا کہ فتنہ باطل تھا جب دیا گویا یہ بحرِ معاں میں ساحل تھا

پسے جو کام انہیں تو نکل کے کھائی سے رکھیں وہ فوج جو موٹی پھرے لڑائی سے
پیادے ہیں سو ڈیں سر مٹاتے نائی سے سوار گر پڑیں سوتے ہیں چار پائی سے
کسے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے اول

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری سپاہی تاقتہی سبھوں کو بے کاری
اب آگے دفتر تن کی کہوں میں کیا خواری سوال دستخی کو چاڑ کر کے پساری
کسی کو آفر دے بازہ اور کسی کو کٹول

یہ جتنے فتنہ دی و جاگیر کے تھے منصب دار تلاش کر کے ڈھیلے انہوں نے ہو ناچار
غلام فتنہ میں بیروں کے دی سپر توار گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لے کے وہ ہتھیار
بنل کے بیچ تو سونا ہے ہاتھ میں لکڑی

امیر اب جو ہیں دانا انہوں کی ہے یہ چال ہونے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانے کا حال
بھی ہے سوزنی خوب کھڑا بھلے ہے زوال حضور بیٹے ہیں اک دو ندیم اہل کمال
دھری ہے سامنے ایک پکیدان اک قبول

اڑے زندہ دل تھے۔ جن باتوں پر دوسرے روتے اُن پر وہ ہنستے تھے۔ لیکن اپنے شہر کی تباہی سے وہ بھی آخر کہاں
متاثر نہ ہوتے۔ مہر ہنستے ہنستے رو دیے اور شہر آشوب کا آخری حصہ دہلی مرحوم کا مرثیہ ہی گیا۔ چند بند لائحہ

خواب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس کہ جی کے دیکھے سے جاتی رہی تھی ٹھک اور پیاس
اور اب جو دیکھ تو دل بوسے زندگی سے اُداس بجائے گل چمنوں میں کر کر ہے گھاس
کہیں تنوں پڑا ہے کہیں پڑے مرغل

یہ باغ کھا گئی کس کی فتنہ نہیں معلوم نہ جانے کہ نے رکھیا یہاں قدم وہ کہن کا شرم
جہاں تھے سمد و صنوبر اب اس جگہ ہے زرقم مچی ہے زراغ و زرخ سے اب اس چمن میں حرم
فلوں کے ساتھ جہاں نہیں کریں تھی کول

نجیب زادیں کا ان دونوں ہے یہ مسمول وہ برقع سہ پہرے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ایک گرد میں دھکا گلاب کا سا بھول اوداؤں کے حشر طلب کا ہر ایک سے یہ حاصل
کہ خاک پاک کی قیاس ہے جو ہے نول

جہاں آباد تو کب اس ستم کے متاثر تھا مگر کبھی عاشق کا یہ شہر دل بھتا
کرتوں شاہ دیا گیا کہ فتنہ باطل تھا جب عرصہ کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا

کرم کی خاک سے مستی تھی خلق مرقی رول

سروا کے اعلیٰ شہ آشوب کی تسلی آتا دیکھتے ہیں۔

ہے دروغا پر ہیں کھتے ہیں کراہ شاہ اور دربار بادشاہ کی جو کہی ہے۔ غور سے

دیکھو تو ملک کی وہ سوزی نے اپنے وطن لاشہ کیا ہے؟

میر کے چند محسنوں میں شہ آشوب کی جھلک ہے۔
تیرے کوئی باقاعدہ شہر آشوب نہیں کیا۔ لیکن ان کے چند محسن ایسے ہیں

ان کی جہولیت اور سپاہیوں کی شہادت اور بے پروسانی کا بیان کیا ہے۔ ایک محسن کے چار بند اور دوسرے کا
بقیہ بند درج کیے جاتے ہیں۔

جس کو جو حیدر اور تے کو او

یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ

عوض مردم جو ہے اکھٹے آہ

وہ میں جس کو دیکھو سو ہے آواز

نہ لکھا ہے سب نے ساز و باس

یہی حاضر یہ اقی

ماں اڑتی ہے نہیں سے آست م

رنگ کی جاتے حال تباہ نام

بڑوں کے بند ہیں آہ

نہیں ہے۔ اہ ہے میں حال

جاؤں جو ہے چہ وہاں

رنگ کی اپنے طور پر ہے مسان

رنگ کی ہستی ہے غافلہ خواہ

شعل ہی ہوئی ہو کو وہاں شعل

ان کے دیکھو یوں کی ہو دھندل

نہ وہ آب ہے نہ چچہ آتش

نہ وہاں ہی ہے سب ہواں

یہ جو ہے لکھ سپاہیوں کا حال

ایک خواہیے ہے اک لکھال

بادشاہ و وزیر سب قلا کش

بچے والے جوتے جئے ہیں فقیہ
تن سے ظاہر گئیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذب غزن منصف و کیر
دیکھیں ٹکڑا اگر برابر کش

ایک نمس میں ایک شیخ جی کی بھوکا ہے، جن کے پاس دستخطی فردا اجرا کے لیے گئے ہیں اور انہوں نے بھوٹے
دھمکے کے تیر کو خوب دوڑایا ہے۔ ذیل کے دو بند انہیں شیخ جی کی زبان سے ہیں:

مٹے جو ہیں وزن کو بھرتے ہیں سو بھی اسباب گردی دم بستے ہیں
ہیں سپاہی سو بھوکے مرتے ہیں و بڑی پی کے زیت کرتے ہیں
ایک نکور بیچے ہے اک ڈھال
دینے کا ہر کہیں ٹھکانا بھی جو د کو چاہیے زانا بھی
یاں نہیں ش کے لکھ میں نا بھی کبھو موتا ہے پنا کھانا بھی
ورن بھوکے رہتے ہیں بیٹھے نہ حال

ایک نمس میں شہر۔ میں خود اپنی پریشان حالی بیان ہے۔ اس نمس کا آخری بند مشہور ہے 'جو حسب ذیل

ہے۔

حالت تو یہ کونجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سندش و دنی سے جتا ہے جوں چراغ
سبب تمام چاک ہے سارا جا رہے داغ
بے نام مجلسوں میں مرا میسر ہے داغ
از بند کام دانی نے پایا بت استسار
ان غموں کے منتقل آزاد نے سچ لکھا ہے:

چند نمس شکایت زمانہ میں ہوشہ آشوب کے لکھے ہیں..... مگر ایسے
کدور کے ہیں کہ گویا کچھ نہیں ہے۔ (نہجیات ص ۱۹)

ایک نمسوں کے علاوہ تیر کی غزلوں میں جا بجا ایسے شعر ملتے ہیں، جی کو میر
میر کے ابیات در تعریف بر سر قلم لکھے ہیں۔ ابیات در تعریف اہل حرفہ کے قبیل کی چیز کہہ سکتے ہیں یا ظاہر دیدہ کا
منقولہ اشارہ۔ کی طرح 'ابیات در تعریف ہر فرقہ کہہ سکتے ہیں' ان اشعار میں جی فرقوں کے نام آئے ہیں وہ یہ ہیں:
انڈی، دھوبی، مسلمان، حقار، ہزار، مروت، زرگر، گلی، فردوس، توکش، آتش باز، ابا جہان، افانہ، خان، صوب، مفتی، سپا،
کشی، میر، قاضی، مفتی، حبیب، سید، برہمن، ترک، مغل، ہندو، اہل دول، امیر۔ اگر میر کے یہ منثور اشعار ایک جا کر دیے جائیں
تو ایک شہر آشوب اپنے انتہائی مفہوم میں تیار ہو سکتا ہے۔ ذیل میں ایسے چند شعر مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

پیش رو بہت ہے وہ زارِ پیر پڑے ہیں کھائی میں مدت سے ہم

پُر شور سے ہے مشتِ منیٰ پیراں کے یہ کاسہ سدا سہ غنور ہوتا ہے

یہ کیا سارے ہیں پیارے جس کے جب اُسی حلقہ کے لڑکے سے دوا دیتے ہیں

غبارِ آگ سیا ہی پیر سے لڑی قریب اُس کے تھوار کر کر گئے

افغانِ خاں کو راکا کی کیسے دیدنی ہو قندہ بارا اُس کا یاد شنیدنی ہے

وہ باغیاں پر کچھ لڑتے تھے بے باب یہ اور گل کھلے ہیں اک پھولوں کی دکان

وہ آتش کا بھی پر کیا ہے سرورِ جفا مارے تھواروں کے اُنکھ بھٹوں کو تو کیا

یہ نند سے جو وہ نرم گلِ آتش باز ہم اپنے پرے سے اُٹتے جو مایاں دیکھیں

دلِ لشکر میں ایک سپاہی زاد نے ہم سے چھین لیا ہم درویشِ طلب میں اس کی ڈیوے ڈیوے پھتے ہیں

وہ دھو بی قائمِ مقام ہے یس و ن او دھ ہے بہت کوئی کہے اس سے مٹنے میں تجھ کو کیا ہم دھو ہیں
اس حلقہ کے اشرار باہرِ عقیدت پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ ابتدائی شہر آشوبوں کے زیرِ اثر عقیدہ اور روایتِ افغان
میں کے گئے ہیں۔

قائم کا شہر آشوب | قائم چاند پوری نے مجھ میں تین ہفتہ کا ایک محسوس شہر آشوب کیا ہے، جس میں خسروں کی دیرانی
اور غمخیزوں کی پریشانی لایا ہے۔ ابتدا بادشاہِ وقت کی سخت جھڑپوں کی گئی ہے، مگر وہی
حک کی تباہی اور رعایا کی ذلت رہا ہے۔ شروع کے دو بند گئے۔

کیا یہ شکرِ عظم پر اس کی نگاہ ہے ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں داد خواہ ہے
نپاک آپ ساتھ شیر کا سپاہ ہے ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں داد خواہ ہے

شیطان کا یہ غلّی ہے، نہ غلّی ادا ہے

برہنہ تھی ایک غلّی کے بی میں یہ آرزو ہو دے گا بادشاہ بھی پھر ہند میں کبھی
تازہ مرنے وہی ہوں سب رو بھی غلو سو آسمان نے لاکے غلّی کیا تو تڑا

جس کے بستم سے چار طرف آہ آہ ہے

آگے چل کر بادشاہ کے باپ دادا تک کی خبر لی گئی ہے اور اس کی طاقتوں کو اس کے بزرگوں کا دربار

دیا گیا ہے۔

تو تو خدا کے فضل سے اس باپ کا پسر جس کا خطاب شاہ طاقت پناہ ہے
دادا ترا جلال کنور کا تخت مبتلا کتا تھا کشتیوں کے ڈوبنے کو بر ملا
اس خاندان میں محنت کا جاری ہے سدا دوں دوش کس طرح سے میں تیرے نہیں بھلا
ہنر مند حاکم اس کا ترا عذر خواہ ہے

اسے بادشاہ کے محل میں شہر دیوان اور مزدوریات زندگی نایاب ہیں :-

جو شہر میں تھے سہرے ہر چیز میں خراج ٹھیکے دوا کے بیج میں رہتے تھے جوں اناج
و ان دروے شکم کے کوئی مرنے جاؤ آج کس چیز سے حکم کرے بیٹا کر عمل
نے زیرہ ہے نہ سونف جس نے ان کو ہے

اچھے پڑے ہیں شہر میں دے دے مکان خوب جن کی صنایع جانیں تھے موتی عرق میں ڈوب
اک زیرہ غصے پہ جان جہاں ویں تھے خاک رُوب تو وہ اب اس زمین میں حاضر سفید رُوب
و جہوں اب اس جگہ پہ دستور سیاہ ہے

غریب جوں یا امیر سب کے سب افلاسی کا شکار اور فقر و فاقے میں گرفتار ہیں۔

اُن ان شک شب جو میسر کسی کو آنے ممکن ہے کیا کہ بیٹے کے اسروٹی سے کھانے
نیچے چھ زمین کے یا آسمان پہ جانے یوں گرد پیش گھر ہے بے اک تعلقت نہیں
جیسی طرح حصار میں ہارے کے آہ ہے

تہن زیب پر تے جنہیں اتنی تھی جی میں عار خاصہ ہمیشہ جسم میں اُن کے تھلے ستار
سو غم سے ترے ہیں وہ یا تک ذلیل و خوار دستار حصہ سے ہے ان کے سر پہ بار
جار اگر ہے تہ پہ تو وہ گرد و آہ ہے

کیا جانے آسمان کی جگہ کیا گئی ہے کل مہمان بایہ دار سے لے تا بے کہ بعض
کوئی روز آگے گھر میں تھی حرم کے چل پہل مہمان میں اُن کے آئی نہیں گر پکا تھا کھان

پر سولے اسٹیشن میں نہ واہ نہ گاہ ہے

منہی نے سبکے اخلاق خراب کر دیے ہیں ۔
 اس سب پر ایسے عاشق و معشوق تکیہ نہ ٹنک
 دیکھے جو زور شمع پہ تو جل مومے پتھک
 عالم سے اُلا گیا غم ناموسی و پاس ٹنک
 جس سے سو تو زور شک جیٹے کے اُس تے تنک
 دیکھو جدھر تو باپ کو بیٹے کا داہ ہے

دوڑی لگانے کا دروازہ بند اور سرکاری طرزیست آیا ہے ۔

حاکم جو اس ضلع کا ہے مارج گلاب رتنے
 دوڑی ہزار ہا کی تھی وہاں بکد کچھ سولے
 سواب جو نوکری کو کوئی اس کے پاس بنے
 مٹا ہے کچھ توڑوں میں پہ چٹا کمال سے آنے
 نہ ملک ہے نہ مال نہ دولت نہ جاہ ہے
 یہ زہن عالی اور بد اخلاقی شہروں سے گزر رہے ہیں تھک چکی تھی ہے ۔

قبسات اک جگہ تھی شریفوں کی بود و باش
 فاسق نعر پڑے جو کوئی دہاں اجدادش
 عصمت زون کی عصمت مرید زیادہ فاش
 قتلے کی رُود سے مرد فرشتوں کی سی معاش
 سو بھوکھ تے مسام پہ اُن کی نہاہ ہے

اس شہر آشوب میں مختلف فرقوں ملہتروں اور پیشہ وروں کا ذکر کم ہے مگر بے ضرور ۔

ایا ہے کامیوں پہ جو کوئی دلوں کا پھیر
 سرشتہ دار و فرالی بیٹے یہ کھیر (۹)
 ڈالیں ہیں ہاکے پٹیلے میں یہ کاغذوں کے کھیر
 بین دو کون ہے جو غریبے چھوٹا مہیر
 کو تو ضرور نہ کو چاہ ہے

منہی پھر یہی ہیں بھوکھ سے کرتے غلامند
 فاسق کے طعنی تھی مری ہی قسمت مگر
 بے چارہ مری کے گھر میں ہمیشہ سڑ پڑ
 عاشق کے یہاں بھی ہیں تو
 اللہ میں حسرت سے رکھے واہ واہ ہے

یہ چند بن جو اوپر نقل کیے گئے ہیں قاتل کے شہر آشوب کی نوعیت ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں ۔

حسرت کا غمخس در احوال دہلی : اس مضمون سے اُس کے قیادت میں شائع ہے ۔ اس غمخس میں چالیس بند ہیں ۔
 ڈاکٹر محمد رفیع نے رسالہ "نثر و شاعری" کے شمارے میں ص ۱۰۰ پر محمد رفیع کے اس غمخس کے ان تالیف گنے دیروں
 حسرت کے اس غمخس سے نہ کر شاید کچھ جن جو بھول ان کے رضا بھیریری نام پر ہیں مضمون ہے اور مصنفت ویران
 کے ہاں میں کھا ہے ۔

اگرچہ اس دیوان کا اندراج فرست کتب خانہ میں ذوقی رام حسرت کے نام سے ہے، لیکن حقیقت میں یہ میر محمد حیات الما طلب بہ بیت قلی خاں حسرت جفیم آبادی المتوفی سنہ ۱۰۹۶-۱۰۹۵ھ کا دیوان ہے۔

میرے استفسار پر مولانا عیسیٰ ناظم رضا لاہوری نے تحریر فرمایا کہ "حسرت کے دیوان میں یہ غزل نہیں ہے۔ اس کو شایع کرنے والے نے انتساب میں غلطی کی ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ غزل جعفر علی حسرت کہتے ہیں جو مشہور محافلہ بند شاعر حرکت کے استاد تھے۔ وہ دہلی کے رہنے والے تھے، مگر ان کی عمر کا زیادہ حصہ فیض آباد اور لکھنؤ میں گزرا۔ جعفر علی حسرت کے کلیات کا ایک قلمی نسخہ جلد تہذیب لاہوری لکھنؤ میں محفوظ ہے، اس میں غزل در احوال دہلی بھی شامل ہے۔ حسرت نے اپنے شعر آشوب میں پہلے افغانوں کے حملے سے دہلی کی تباہی کا حال تیرہ بندوں میں بیان کیا ہے۔ ابتدائی چار بند مثنوی ہیں:

نہیں ہے مریے سے کم جاں آباد کا حال اگر لکھوں تو قلم ناز زدن ہونے کی مثال
وگر پڑھوں تو کہاں غم سے ہے سخن کی مجال اگرچہ چرخ سنگم یہ اس پہ لایا زوال
پر آپ روئے ہے رکھ منہ پہ اسے دال

کیا غفیم کے شکر نے یوں اسے دیراں کہ جیسے باد غزاں سے جو حالت بستاں
ذیل حادثہ و دے کسی پہ یوں حوفاں گزر گیا ستم افغان کے ظلم سے جو دماں
فغان کہ ہو گیا یہ کشت سبز سب پامال

وہ باغ جس میں کہ گل روئے سب جس گل سے اور ان کی زلفیں فروں تر تھیں جہد سبیل سے
جہی کے رشک تھے رخسار خط و کال سے ورازا اس پہ جو دست ستم تعادل سے
دریغ مٹ گیا نقشہ رہا نہ وہ خط و حال

سودا اس کے سے تھی زلف ہوشانہ نجیر ہمارا اس کی سے عزت تھرم تھا کشمیر
ہر ایک اس کے مکان میں بہشت کی تیسرہ جہد نگر کہ دوسو جھے تھا عالم تصویر
ذہر کے داں سے جہد ہار پڑے نگاہ خیال

اس کے بعد یہ دکھایا ہے کہ بادشاہ، شاہی خاندان کے افراد، امیر، جاگیردار، ملازمت پیشہ، سپاہی، نجیب، بخوی، حبیب، شاعر، محترم، سوداگر، پیر، نادے، مرثیہ خواں سب کے سب غفلت اور بے روزگاری کا شکار ہیں۔ چند بند نقل کیے جاتے ہیں:-

جو بادشاہ دماں کا رکھے قاتحت آدمی وہ اپنے قوت کو اطفال کے ہماخت
خدا کی ہے جیسے دیتا تھا سدا بند غلامی غفیم آہ کے لے اس سے اس کے شہر کج

دشکل ہے کہ کرے شیر کو شکار شمال

جو حسد اور خزانہ تو سب ٹاٹا بکسرا
دیں سوکس پہ یہ فرقے کے لگ اور چاکر
دہانہ مال بجز سنگ کو ٹھنوں کے اندر
جو چھت تھی چاندی کی دیو اب خاص کے اندر
سودہ دذیر نے کی فریاد بھی کر نکال

نجیب تو جسے فاقوں سے اب بھی رہنمائی
رہی نہ مٹتی ہے رونق نہ اس کی شہم میں ہائے
جواہل حرف ہیں ان کا تو کیجے کیسہ مذکور
جنوں کا کب تھا کھوئی اُن کا یہ دستور
کہا کے چوک میں رکھیں ہیں اک دھڑی پٹال

دو جو کہ فنِ طبابت میں تھے اور سطور اسے
انہوں نے دیکھا تھا ہوشیہٹ ما کو کی مکے
مرض ہے جو عجز کا سو کس طرح سے جلے
وہ چھوڑ دے کب کو کہیں جو کچھ اب خدا دکھائے
سلائی سرسے بازار میں بنے کمال

جنوں کا پیری مریدی تھا سلسلہ باری
انہوں کو کھنے لگی گھر میں ان بد شراری
مرید فاقوں سے سوتے ہیں خودیہ ناچار
سنی جاں کہیں جیسے بے واں کی تیاری
دور وئی تھے یہ جا کر گئے وہ کس شمال

مستور اُن میں جوتے کھینچتے ہیں حیرانی
ٹٹے کو کھینچ دے تصویر گرچہ جوفانی
جو خط کے لکھنے میں مہر مل کے تھے ثانی
قلم کو اُن کب سے دن ات غوی اُٹانی
کہیں ہیں مڑی کہ سنا غنچہ شستب ک شمال

ہنری بند میں شاعر گنا ہے کہ شرک تباہی اہل شہر کی بد اہمالی کا نتیجہ ہے۔

جہاں آباد نہ جتا کسی سرد سے تباہ
جو حسرت ایسے مل کتے ہم نہ نہر سیاہ
پائے مل پہ ناموس پر رکھیں جو نگاہ
تو اُن پہ کہو نہ بھیجے بھلا غضب اللہ

ہمارے آگے ہی آئے ہمارے یہ اعمال

جرات کا محسوس
حسرت کے شاعر و جرات کا ایک ترجیح بند محسوس ایک قدیم معنی میں جو جس کا صریح ترجیح

اہل صحرے سے نہایت رکھتی جو۔ یہ پابندی اس محسوس کا خاص وجہ ہے۔ لیکن اس میں شہر آشوب کی شان کی پوری طرح موجود
ہے۔ مستور دوسرے شہر آشوبوں کی طرح اس میں بھی شاعر کو زمانے سے یہ شکایت ہے کہ اُس نے امیروں کو محسوس اور غریبوں
کو تو غور کیا ہے اور شریفوں کو زمانے سے دوچار کر کے کینوں کو عروج سے دیا ہے۔ اس محسوس میں بائیں بند ہیں۔ چاند بند
اور کچھ مہرے نقل یکے جاتے ہیں جو اس کی شہر آشوب کی نوعیت واضح جو ہونے کی۔

اب ان کو دے شفق چرخ شال نارنجی بُنا جو کرتے تھے لیل و نہار شطرنج
یہ دیکھ کیونکے نہ اُبکے بخاؤ تن جی غمور حشر نہ کیوں ہو جو کلپٹری مگھی

حضور جبل بستان کرے نوا سنجی

جو گل مندوش تھے اب ہیں وہ مالک باغ جو منفس اذلی تھے کہیں ہیں پیش فراغ
جو خاک دب تھے اب ان کا عرش پر ہے باغ یہ کاؤں کاؤں خوش آئے کسے جو مادہ زراغ

حضور جبل بستان کرے نوا سنجی

بگھتے خاک نہیں ساڈے کے جو تیل سوا حکیم جیو کہا دیں سب ان سے پوچھیں دوا
پلے جب ایسی طاقت کی اس جگہ میں ہوا تو کیوں نہ پھر سرگردن ہلاک کے لوا

حضور جبل بستان کرے نوا سنجی

دیا سلائی جو پیچے تھایا کر سرکسٹا جو ابے صاحب شکر بنا کے اک جھنڈا
ہوائے باغ جہاں سے ہو کیوں نہ دل ٹھنڈا جو مٹنی مرغ کا پھر کھٹکتے ہی اندھا

حضور جبل بستان کرے نوا سنجی

جو ماگہ اڈوں کو دے چرخ منصب شاہی جو گس کھدے تھے وہ اڈھیں دشاؤں کاہی
لگا کے بیٹے تھے جو خواہو کھانے بے خان بڑا گھر اس کا ہے بیت الملائکات جس کا مکان

جو بیچ کھاتے تھے کنبشک دام میں لاکے کر ہی ہیں عرش پر پرواز اب ہو چڑیا کے
جنھوں کے گھر تھی ادارت گھر ان کا ہے سرا بنی گھر اس کے عمارت جو پیچے تھا چرنا

معاہلات میں اب اعتبار ان کا ہے کو جی کوکتے تھے پدے کی ضائی کیا ہے

آخری بند :-

جست و دو کہ ہے جزاوت کی ہسری کا خیال وہ مجھو لے اپنی جی تو اپنے جو ہنس کی پال
کہو اڈے اب ہیں لاہ احمد کو جی سے نکال نہیں گل اس پہ جو پھد کی پھلا پھلا پروال

حضور جبل بستان کرے نوا سنجی

رائع عظیم آبادی کی شہنوی در بیان انقلاب زمانہ
فہم علی راسخ عظیم آبادی شہنوی ۱۳۳۰ء نے شہنوی کی شکل
میں ایک شہر آشوب کہا ہے جو شہنویات راسخ مرتبہ ممتاز

میں صوبہ ذیل خزان کے ساتھ شامل ہے :-

• شہنوی در بیان انقلاب زمانہ و شکایت خلک و جمہور احوال میناں بدو عظیم آباد :-

اس شہنوی میں راسخ نے عظیم آباد ایشیا کی گزشتہ خوش حالی و فارغ اہلال اور موجودہ عسکی و ناداری کا ذکر کرنے

کے بعد چھوٹے دروں کا حال کھا ہے وہ یہ ہیں، شایع، خفا، مستم، شاعر، ملکات، ذراعت، تجلوت، عبادت، صاحب، غزنی میں کئی ایک تو ہیں شہر ہیں۔ نونہ کلام دروغ ذیل ہے :-

کوئی تھی اور ام سے بے تعجب	کوئی تھی مجھے اسباب پیش و حسب
کیسے مجلسِ عشق و بزمِ نشاط	کیسے دوستوں میں ہمِ اختلاط
جہاں اک عجب باغ تھا دل کشا	ہر اک گل میں تھی اس کے بو سے وفا
یہ کھڑا اب ہو گیا حصارِ زار	غزاں جو گئی اے اس کی ہمار
کوئی اس جگہ میں تو نظر نہیں	کوئی غنچہ ساں صاحبِ زر نہیں
بے اب خاک وہ بنے اور ان کا فرق	جو تھے سر سے پائے جواہر میں فرق
جیسے ہندوئی قائم پہ تھی دار و گیسر	جونے میں وہ تاجِ فرشِ حصیر
مصلحت سے ہر کوئی بے کار ہے	فقط شخصی برسہہ کار ہے
کہانی کا کار سے دور بدر	ہیں آوارہ اور بابِ فضل و عشر
عشر نہ داتا ہے جگر ریش ریش	نہیں جاتا ہے کوئی پیشہ بھی پیش

شایع جو ذی حسرت و تعظیم نہیں	دل ان کے بھی صدمہ کش جیم نہیں
غمِ قوت ہے یاں ملک ہر زمان	کو ہیں رشتہ سبوساں نازان

لکھوں خوشنویسوں کا میں حال کیا	فوشے پر اپنے ہیں گریاں سدا
بہت فکر روزی سے ہیں دردناک	قلمِ غم سے ان کے ہوا سینہ چاک

وکالت کا بازار بھی سرد ہے	دکیل اب جو ہے وہ بڑا مرد ہے
نہاں اب وکالت ہو روٹی پذیر	مولا ہی سب جو گئے ہیں فقیر

ذراعت کا پیشہ بھی بے آب ہے	دُر مدایاں تو نایاب ہے
کسے کب یہ پیشہ کس کو کونساں	کوسر سبز ہوا بہت ہے کمال

عبادت میں بھی کچھ نہیں اب حصول	اعطا ہیں اس حمد میں سب قول
--------------------------------	----------------------------

ہر اک کو مرضِ مٹھی کا ہے آج طیب اب پھارے کریں کیا علاج

سپاہی کی مٹی بھی ہے اب خراب کہ تینا ہوا فوکر کی کا تر باب
جو انجھ ہیں اب اُن لایہ رنگ ہے کہ قیمت سے اپنی انجھیں جنگ ہے
ہیں اسسلاس سے ایسے اندوگیں کہ مٹی کا گھوڑا میسر نہیں
نہ تر کش ہے نے تیر ہے نے کہاں خدنگ الم کے تاشاں حسدِ زمان
کہاں کی کہاں جو رہے ہیں تباہ اگر تیر ہے تو فقط تیر آہ
صفتِ پشتوں اور پیشہ وروں کی کس میری اور مٹھی کا بیان کرنے کے بعد شاعر شہسدر کی خوش حالی اور بد حالی کو اہل شہر کی اخلاقی حالت کا قیود قرار دیتا ہے:-

یہ چنہ عجب دل کشا شہسدر تھا طلسماتِ تھاواہ کیا شہسدر تھا
تھے صدقِ صفا پیشہ اس کے مقیم طریقی دفا پر بہت مستقیم
بہت نینتیں نیک رکھتے تھے سب زباں اور دل ایک رکھتے تھے سب
اب اس شہسدر کا طور ہی اور ہے مقیموں کا اس کے بڑا طور ہے
کوئی ان میں علتِ زو نہ نام ہے کسوا سخن چینی ہی نام ہے
بہت جانتے ہیں فریب اور زور بہت بڑھ گیا حد سے فسق و فجور
نہیں نیک نیت کوئی یاں و لیک اُترے تو ہے وہ ہزاروں میں ایک
نقدِ اکبر آبادی نے پشائیں عین بندہ کا ایک شہر آشوب کہا ہے جس میں اگرے کے
پیشہ وروں، سپاہیوں اور امیر زادوں کی پریشاں حالی بیان کی ہے۔ اُس کے چند بند

نقدِ اکبر آبادی

نقل کیے جاتے ہیں:-

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے کار و بار بند رتی ہے طبع سوچ میں لیسل و نہار بند
دیرا سخن کی فکر کا ہے موی دار بند ہو کبھی صدمہ نہ منہ میں زباں بار بار بند

جب اُترے کی خلق کا جو روزگار بند

اب اگرے میں جتنے ہیں سب لگے ہیں تباہ آنا لگت کسی کا نہیں ایک دم تباہ
ناخوہیز دایے بڑے وقت سے پناہ وہ لوگ ایک لڑی کھٹائی میں اب آہ

کسبے بڑے کی یاد میں جن کو ہزار بند

مراں بیٹے جو ہری اور سیٹھ سا جو کار دبتے تھے سب کو نقد سوکھاتے ہیں اب آہ

باندر میں کڑے ہے پڑی خاک بے شمار بیٹے ہیں یوں مکانوں میں اپنی دکان دار
 بچے کچھ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند
 ماریں ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سبیاں کے دستکار اور جتنے پیشہ دار ہیں دوستے ہیں بازار
 کونے ہے تھکاتھک تو پینے ہے سرشار کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے بار
 چھٹیس پینے داروں کا ہے کاروبار بند
 بیٹھے باٹلی راہ میں تنگ سے پتے ہیں جلتے ہیں نانبائی تو بڑھ بھرنے بھرتے ہیں
 ڈھینچے بھی ہاتھ ملتے ہیں دس رو کو دھتے ہیں روتے ہیں وہ جو شروع دوا دانی پتے ہیں
 اور وہ تو مرنے جو نہیں تھے بازار بند
 ہر دم کماں کروں کے آپریج و تاب ہیں صاف اپنے حال میں غم کی کتاب ہیں
 مرنے ہیں جیسا ساز مسخر کتب تاب ہیں نقاش ان سبوں سے زیادہ خراب ہیں
 رنگ و قلم کے جو مرنے نقش و شمار بند
 ختم پر بھی یاں تیں ہے منگھی کا زور پیسے کماں جو سال پہ جو مٹر دیں کا شور
 کانپے ہے سر ٹھوٹے ہوئے اس کی پور پور کیا بات ایک بال کٹے یا تراشے کو ر
 یاں تک ہے اتارے دندلی کی دھار بند
 کیا پھوٹے کام دالے دیکھا پیہ در عجیب روزی کے آئی ہاتھ سے ملے ہیں سنبھ
 ہوتی ہے بیٹھے جیسے شب شام حق قریب اٹھتے ہیں سب کان سے کہہ کر کیا نصیب
 قسمت ہماری ہو گئی ہے اختیار بند
 جتنے ہیں آغا آگرے میں کارخانہ جات سب پر پڑی ہیں آنکھ کے روزی کی شکلات
 کس کس کے کد کد کو رو دیے کس کس کی کیچے آ روزی کے بے رفت کا جتنا نہیں ہے پات
 ایسی جو انکھ آ کے ہوئی ایک بار بند
 دیکھے کوئی بھی تو پڑا ہے احب ڈسا چہنہ نہ پیل نہ پھول نہ سبزہ برا بھرا
 آواز قریب کی نہ قبل کی ہے صدا نہ حوض میں ہے آب نہ پانی ہے نہر کا
 چادر پڑی ہے خشک تو ہے آبشار بند
 عاشق کو اسیر کو آگرے کا ہے کچھ کو دیر کو آگرے کا ہے
 منگھ کو فقیر کو آگرے کا ہے شام کو فقیر کو آگرے کا ہے

اس واسطے یہ اُس نے لکھے پانچ پارہ بند

اب ہمک میں شہر آشوبوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ابتدائی مضمون کے شہر آشوبوں کو چھوڑ کے باقی سب شہر آشوب اور شاہ و زانی کے محلوں سے دہلی کی تباہی اور دہلی دہلی کی بد حالی کے اثر سے وجود میں آئے ہیں۔ ان میں شہر آشوب کے مضمون کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ یعنی ان میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا حال بیان کیا گیا ہے، طبقاتی درجہ بندی میں جو فرق آگیا تھا اور اس سے امر اور شرفاء کے اقتدار اور سرحدی میں جو دخل پڑ گیا تھا، اس پر غم و غصے کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ کے قیامت خیز ہنگامے نے دہلی کے زمیں و آسمان کو جل کر کچھ کا کچھ کر دیا۔ اُس پاس کے دیہاتیوں نے شہر میں گھس کر قتل و تالابازار گرم کر کے شریعت، معزز اور خوش حال باشندوں کو بڑی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا اور انگریزوں نے دہلی کے بڑے بڑے لڑائی لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ ان الم ناک اور وحشت خیز واقعات کے بیان میں بہت سی غلطیاں کی گئیں۔ یہ غلطیاں حقیقت میں مروجہ کسر تھیں ہیں۔ ان کو شہر آشوب کہنا کچھ بہت مناسب نہ تھا۔ لیکن اب شہر آشوب کے مضمون میں اور وسعت پیدا ہو اور وہ غلطیاں بھی شہر آشوب کے حصار سے میں آگئیں، جن میں پیشہ وروں اور طبقوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر نہیں ہے، بلکہ دہلی کی تباہی کا عمومی انداز میں بیان ہے۔

اس طرح کی غلطیوں کا ایک مجموعہ منشی محمد فضل حسین خاں کوکب نے مرتب کر کے فنان دہلی کے نام سے شایع کیا، جن اچھ نظموں کا اعادہ کر کے نکالی بدایونی نے فریاد دہلی اور انقلاب دہلی کے دہرے نام سے ۱۹۳۱ء میں شایع کیا۔ ان نظموں زیادہ تر غزل کی شکل میں ہیں، مگر چند غزل اور مسدس بھی ہیں۔ داغ دہلی کا مسدس اپنی نوعیت میں اس مجموعے کی دوسرا سوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، لیکن شاعرانہ محاسن کے اعتبار سے جب بہتر اور سب سے زیادہ مشہور ہے۔ خود منف نے اپنی اس نظم کو 'شہر آشوب' قرار دیا ہے اور کچھ جب ہمیں 'شہر آشوب' کے نئے مضمون کی بنیاد اسی نظم سے ی ہو۔ اس مجموعے کی نظموں کی تفصیلی کیفیت ڈاکٹر سید عبد اللہ کے اُس خطے میں دیکھی جاسکتی ہے، جو شہر آشوب کی ایک کے عنوان سے اس کے مجموعہ مقالات بحث و نظر میں شامل ہے۔ یہاں صرف داغ کے شہر آشوب کے چند بند پیش کرتے ہیں :-

فلک زمیں و فلک جناب منی دلی بہشت و جہنم سے بھی انتخاب منی دلی

پانچ پارہ کے عدد اگر کسی طرح جو فاسد ہندسوں میں لکھے جائیں مینہ ۴۵ تو اس غزل کے ہندوں کی تعدد ظاہر ہوگی جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ نے فنان دہلی کے مجموعہ اس مطالعہ، دہلی شہر کے حوالے سے کہا ہے کہ یہ مجموعہ تین شہزادوں میں منقسم ہے شہزادہ اولیٰ کام حضرت محمد سراج الدین خاں، شہزادہ رفیع الدین، شہزادہ دوم و مسدسات شہر آشوب، شہزادہ سوم درغزلیات وغیرہ، میرے کتب خانے میں فنان دہلی کا وہ نسخہ ہے جو پہلے بدایونی، دہلی میں شہزادہ محمد علی چغتای، اس میں صرف دو شہزادے ہیں۔ موقت کتاب خانہ دہلی میں کھلے نامش فنان دہلی گزشتہ بدو شہزادہ بزرگام و سائیدہ... تختی شہزادہ و مسدسات شہر آشوب۔ دو درمیں درغزلیات و قطعات وغیرہ :-

بانار میں کڑے چھ پڑی خاک بے شمار جیسے ہیں یوں دکانوں میں اپنی دکان دار
 جیسے کرپور جیسے ہوں قیدی تھار بند
 ماریں ہیں ہاتھ ہاتھ پربیاں کے دستکار اور جتنے پیشہ دار ہیں دستے ہیں ازار
 کونے بے تن کمار تو رہنے ہے سرسار کچھ ایک دو کے کام کار فانیں ہیں بھار
 چھٹیس پینے داروں کا ہے کاروبار بند
 بیٹھے باٹھی راہ میں تھکے سے چلتے ہیں جلتے ہیں نا بنائی تو بھر بھونے جلتے ہیں
 دھینے بھی ہاتھ ملتے ہیں اور سر کو دھتے ہیں روتے ہیں وہ جو شروع و دارائی بتے ہیں
 اور وہ تو مرنے جو نہیں تھے ازار بند
 ہر دم کماں گروں کے آپر پچ و تاب ہیں صاف اپنے مال میں غم کی کتاب ہیں
 مرنے ہیں جیسا ساز مہر کسب اب ہیں نقاش ان سبوں سے زیادہ خراب ہیں
 رنگ و قلم کے جو مئے نقش و شمار بند
 خاتم پر بھی پان تین ہے مٹسی کا زور چسپہ کماں جو سان پہ جو ستروں کا شور
 کانپے ہے سرجھوتے ہوئے اس کی پور کیا بات ایک بال کٹے یا تراشے کو ر
 پان تک ہے اتارے دھڑائی کی دھار بند
 کیا پھوٹے نام والے دیکھا چہ درغیب روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سبغیب
 جوتی ہے بیٹھے جب شام میں قریب اٹھتے ہیں سب دن سے کر کر کو یا نصیب
 قسمت ہماری ہو گئی ہے اختیار بند
 جتنے ہیں آج اکرے میں کارخانہ جات سب پر پڑی ہیں ان کے روزی کی مشکلات
 کس کس کے ڈکھ کو روپے کس کس کی کیجے آ روزی کے بے رخت کا جتنا نہیں ہے پات
 ایسی جو کچھ آ کے جوتی ایک بار نہ
 دیکھے کوئی پھر تو پڑا ہے احب ڈسا غنہ نہ پھل نہ پھول نہ سبزہ ہر ابھرا
 آواز قویوں کی نہ جہل کی ہے صدا نہ حوض میں ہے آب نہ پانی ہے نہر کا
 پاد پر پڑی ہے خشک تو ہے آبشار بند
 عاشق کو اسیر کو آگرے کا ہے کچھ کو دیر کو آگرے کا ہے
 مٹسی کو فقیہ کو آگرے کا ہے شام کو تغیر کو آگرے کا ہے

اس واسطے یہ اُس نے لکھے پانچ پار بند

اب تک جو شہر آشوب کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ابتدائی مضمون کے شہر آشوب کو چھوڑ کے باقی سب شہر آشوب اور شاہ و ترانی کے محرم سے دہلی کی تباہی اور اہل دہلی کی بد حالی کے اثر سے وجود میں آئے ہیں۔ ان میں شہر آشوب کے ابتدائی مضمون کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ یعنی ان میں مختلف طبقوں اور پیشہوروں کا حال بیان کیا گیا ہے، طبقاتی درجہ بندی میں یکایک جو فرق آگیا تھا اور اس سے امر اور شرفاء کے اقتدار اور سرہندی میں جو خلل پڑ گیا تھا، اس پر غم و غصے کا اظہار کیا گیا ہے۔ شہر کے قیامت خیز ہنگامے نے دہلی کے زمین و آسمان کو جمل کر کچھ کا کچھ کر دیا۔ اُس پاس کے دیہاتیوں نے شہر میں گھس کر قتل و غارت کا بازار گرم کر کے شریں، معزز اور خوش حال باشندوں کو بڑی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا اور انگریزوں نے دہلی کے بڑے ٹکے نامی گرامی لوگوں کو پھانسی پر لٹھا دیا۔ ان اہم ناک اور دہشت خیز واقعات کے بیان میں بہت سی تفصیلات کی گئیں۔ یہ تفصیلات حقیقت میں دہلی محرم کے سرخیے ہیں۔ ان کو شہر آشوب کہنا کچھ بہت مناسب نہ تھا۔ لیکن اب شہر آشوب کے مضمون میں اور وسعت پیدا ہو گئی اور وہ تفصیلات بھی شہر آشوب کے دائرے میں آگئیں، جن میں پیشہوروں اور طبقوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر نہیں ہے، بلکہ شہر کی تباہی کا عمومی انداز میں بیان ہے۔

اس طرح کی نظموں کا ایک مجموعہ منشی محمد تفضل حسین خاں کوکب نے مرتب کر کے فغان دہلی کے نام سے شائع کیا، جن میں کچھ نظموں کا اضافہ کر کے نظامی بدایونی نے فریاد دہلی اور انقلاب دہلی کے دوسرے نام سے شہر میں شائع کیا۔ ان نظموں میں زیادہ تر فغان کی شکل میں ہیں، مگر چند محسوس اور مستحسن بھی ہیں۔ داغ دہلی کا مستحسن اپنی نوعیت میں اس مجموعے کی دوسرا نظموں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، لیکن شاعر سادہ محاسن کے اعتبار سے جبکہ بہتر اور سب سے زیادہ مشہور ہے۔ خود مصنف نے اپنی اس نظم کو 'شہر آشوب' قرار دیا ہے اور کچھ عجیب ہیں کہ شہر آشوب کے نئے مضمون کی بنیاد اسی نظم سے پڑی ہو۔ اس مجموعے کی نظموں کی تفصیلی کیفیت ڈاکٹر سید عبداللہ کے اُس مقالے میں دیکھی جاسکتی ہے، جو شہر آشوب کی تاریخ کے عنوان سے ان کے مجموعہ مقالات بحث و نظر میں شامل ہے۔ یہاں صرف داغ دہلی کے شہر آشوب کے چند بند پیش کیے جاتے ہیں :-

فلک زمین و طہم جناب غنی دتی بہشت و غلہ سے بھی انتخاب غنی دتی

پانچ پار کے حدود اگر اسی طرح جو خاصہ ہندو میں لکھے جائیں یعنی ہم تو اس محسوس کے بندوں کی تعداد ظاہر ہو چکی ہو جیتا لیس ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے فغان دہلی مہجور میں مطالب، دہلی شہر کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ مہجور تین شہروں میں منقسم ہے شہر اولیٰ نام صورت مہراجہ افریقہ و مرزا دیفح اسود، شہر دوم دستہ سات شہر آشوب شہر سوم و مرغزیات وغیرہ : میرے کتب خانے میں فغان دہلی کا وہ نسخہ ہے جو علی بدایونی دہلی میں شہر میں چھاپا تھا۔ اس میں صرف دو ترانے ہیں۔ مرقم کتاب نے دیباچے میں لکھا ہے : نامش مقلد دہلی گزاشہ بدو شہرہ بجز جام و سائیدہ نعتیں شہرہ دستہ سات شہر آشوب۔ دو دہلی مرغزیات و تعلیمات وغیرہ :

یہ شہر وہ ہے کہ تھابہ جواب تھی رتی مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھا دلی

چڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی زکس کی

خبر نہیں کہ اسے کاشی نغسہ کس کی

یہ شہر وہ ہے کہ انسان وہاں کا دل تھا یہ شہر وہ ہے کہ ہر شہر وہاں کا دل تھا

یہ شہر وہ ہے کہ بندہ دستان کا دل تھا یہ شہر وہ ہے کہ سامے جہاں کا دل تھا

رہی نہ آدمی یہاں سنگ و خشت کی صورت

بجی ہوئی تھی جو ساری بشت کی صورت

جب شکل گل و گلستاں نغسہ آئی پڑی بدھسہ کو نکاہیں خزاں نظر آئی

جب اٹھ کے تاشاؤ غریباں نغسہ آئی تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نغسہ آئی

وہ گلرخان کسوں پر کے قہقہے نہ رہے

وہ ببلان خوش اماں کے چہچہے نہ رہے

ہر گھم بڑے قحطی اہل محبت میں سے پہلے غریب پھر ڈکے پناہ وطن وطن سے پہلے

نہ پھر زندوں کو پیارے کس میں سے پہلے قیامت آئی کہ مرنے تل کھن سے پہلے

تمام اس جو ذوق نہ اقرارہ بھی نہ ملی

یہ قدر تھا کہ حسد کی پناہ بھی نہ ملی

پیادہ پاہوں رواں شہر صد افسوس لو کے گھونٹ پٹلیں باد و غار صد افسوس

ذیل و غوار ہوں اہل وقار صد افسوس ہزار حیف و دل بیتزار صد افسوس

جھکے ہیں بار اہم سے تنے جوئے کیسے

بڑا گئے ہیں یہاں کیسے ہوئے کیسے

شہر کے چٹا سنے گھنٹہ اور اہل گھنٹہ پر جو مصیبتیں ڈھائیں ان سے قیاس کیا

جانتا ہے کہ ان کے یہاں میں شاعروں کی زبان خاموش اور قلب حرکت نہ رہے

برق کھنوی کا شہر آشوب

ہوں کے۔ یہاں ان نظروں کا جو ہر مرتبہ کرنے کا کسی کو خیال نہ آیا۔ ادواب اتنی قدرت گزر جانے کے بعد ان کی تلاش

میں کامیابی مشکل ہے۔ اس وقت صرف ایک مسدس میرے سامنے ہے جو اپریل ۱۹۳۷ء کے لاہور یونیورسٹی آرڈینری

میں ایک قلم بیاض سے نقل کر کے شائع کیا گیا ہے۔ اس کے مصنف برق کھنوی نے خود اس کو شہر آشوب کہا ہے

یہ مسدس برق کے عبور دیوان میں نہیں ہے۔ یہاں کے ایک قلم دیوان میں شامل ہے۔ اس کے جیسے آبد جیسے گلابی

لیکن یہ سندس بھی مشق کے اندر سے متاثر ہو کر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے مضامین، شاعر کا لب و لہجہ، اس کے غم کی نوعیت، اس سب چیزوں سے صاف ظاہر ہے کہ اندر سے متاثر ہو کر واجد علی شاہ کی معزولی اور نکلنے کو روانگی کے بعد کھنک بے روایتی اور اداسی کا اس میں بیان کیا گیا ہے۔ اس وقت تک شہر ان تباہیوں سے اور اہل شہر ان مصیبتوں سے محفوظ تھے، جو کچھ دن بعد اندر کے قتبے میں پیش آنے والی تھیں۔ اس سندس کا آخری بند جس میں اس کو شہر آشوب قرار دیا گیا ہے، حسب ذیل ہے:-

ہم پہ اسے برق جو گزرا ہے سنایا ہم نے نقشہ سب کھینچ کے شعروں میں دکھایا ہم نے
شہر آشوب کا رو کے رُکھایا ہم نے وقت پر دوستوں کو دوست نہ پایا ہم نے
خلق میں نیز اقبال ہمارے وہ تھے
سب کو ثابت ہے کہ یار تارے وہ تھے

اس بند کی بیت کے دونوں مصرعوں میں وہ اشارہ واجد علی شاہ کی طرف ہے۔ دو اور بندوں میں بھی اسی طرح اشاروں سے کام لیا گیا ہے۔ اس نظم میں واجد علی شاہ سے محبت اور ہم دردی اور ادھر کے تختِ سلطنت پر ان کی واپسی کی تنا کا اظہار ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے عزیزوں کے خوف سے بادشاہ کا نام لینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس سندس میں اتنا نہیں بند ہیں۔ اس کے چند بند نقل کئے جاتے ہیں:-

کل کے مذکور یہ ہیں اپنے بھی انسانے تھے رنگ فردوس پر شہر کے مینانے تھے
تھاباں ہیروں کی تھیں سوں کیپانے تھے ماہِ نور شیر رخ شش کے پر دے تھے
سب ہوا خواہ سیمان کما کرتے تھے
رات وہ پروں کے جھڑ میں ہاگتے تھے
تھے اُٹتے تھے جھٹ تھے پر زادوں کے میسے ہر روز جھماکتے تھے آزادوں کے
مے سٹتے تھے نہ برگز کبھی فرادوں کے کبھی آگاہ نہ تھے نام سے بیدادوں کے
کیا کہیں کس سے کہیں ہائے وہ محبت کیا تھی
نام اندر کے اکھاڑے کی حقیقت کیا تھی

ہانتے تھے کہ اسی صبح گزرا ہائے کی چمن میٹھ میں ہرگز غزاں آنے کی
آرزو نخلِ محبت سے شراپائے کی یہ نہ بچے تھے قصار تک نیا لائے کی

یہ وہاں — نے تذکرہ جہانِ غریب درج کیے ہیں وہ تذکرہ ابطلو خانہ کے حاشیہ نمبر ۱۲ میں نقل کر دیے گئے ہیں۔
(تذکرہ اشعار مستغنی عن الامم اللہ طوقان ص ۳۰۳)

حین در چشم زدن محبت یاد آہستہ شد

روے گل سیر ندیم و ہمار آہستہ شد

ایک بھی پیش نظر انہی کی تصویر نہیں قدر دینا میں نہیں حق میں توقیر نہیں
جواہل اور کچھ اس خواب کی تعبیر نہیں تیرے دل کے لیے ناز شبگیر نہیں

فرمانے داغوں سے کیا جسم مرشح اپن

بٹ لیا مانتے آنکھوں کے مرقع اپنا

اب بھی آجانی جو وہ پھر وہی صورت جو ملے وہی جنیاں وہی چلیں وہی مشرت جو ملے
رنگی سب جانتے رہیں اور کراحت جو ملے پھر وہی شام ہو اپنی وہی شرکت جو مانے

پھر وہی سیر کریں پھر وہی آبادی ہو

پھر وہی لپاؤ وہی رنگ وہی شادی ہو

ایک بس اُن کے نہ ہونے سے یہ سب ہو شربت زندگی جس سے یہ مسد ہو
دل کو شیشہ دو دم اب بے خبر ہو ہم کو دوزخ سے زیادہ چمک شہر ہو

نازدول سے دل عرش بلا سے یا رب

موت نہ لے ہیں یا اُلو سے گلے یا رب

موت جینے سے کہیں اپنے لیے جتے ہے بال نشتر ہیں تو ہر ایک نفس خنجر ہے

تکلیف ہے غشت لہر فرش زمیں بستر ہے در ہیں آفرش اجل گور سے بدتر گھر ہے

چارہ اس میں نہیں برص جو قسمت جو ملے

ذہر کھانے کے لیے کائنات اوارت جو ملے

لکھنؤ کے مشہور ریختی گوشت خان صاحب نے بھی ایک شعر آشوب اپنے —
جان صاحب گشت آشوب [زمانے کی خدمت میں کہا ہے ۔ یہ بیانیہ بند کا محض ہے ۔ چند بند اس کے بھی نیچے

کم ملیں تو وہ سے ہر اک کی خدمت آجکل دنی مرے کی طرح گھر گھر ہے دولت آجکل

مردوں کی جو گئی نام و بہت آجکل لکھنؤ میں شاد ہے سبوں کی خدمت آجکل

گور پر حاتم کے روتی ہے سعاد آجکل

ایٹ سے یہ ایٹ بکھینچ ہرگز خون کائیں پیسے والے اکٹھے کے واسے سہر کو ڈھائیں

ماں بی اپنے ولی کھنکے بھی چونا کھائیں پلے بسلنے کے کھر کھڑیں مل بٹھڑے بنائیں

خیر کی جا ہے ہر اک دل میں کڑت آجکل

رنگ یہ ہونٹوں نے ہر اک جیسہ ان ہے منہ کی کے ہاتھ سے انسان بھی جیواں ہے
جوش جیواں تھا پیسے سے وہ انسان ہے اے دو گانہ جان دیکھو کیا خدا کی شان ہے

جوش میں پانی ہیں اور ہم کو بے مشت آجل
منہ کی میں کام آتا ہے نہ کوئی رشتہ دار باپ ہے ماں ہے جو کچھ ہے ہوا پر در و گار
غیر کیسے حال اپنوں کا یہ ہے اب آشکار ایک بھائی کہ ہے فاقہ اک ہے کتنا زہ مار
مٹ گئی دنیا کے پرے سے محبت آج کل

ہو گئی راحت ہے دشمن سے بچے جو حسیب دور دولت ہو گئی کس طور پر محشر تریب
پاؤں جو پھیلے گئے پھر نہیں جا گئے نصیب جو گئی تھی پیسے والے اب وہیں منہ غریب
ان کے گھر صمان رہتی ہے قناعت آج کل

نانی دھوئی کوٹے بھیا رے قصائی نابکار ایک کوڑی کے لیے جوتے ہیں گڑن پر سوار
رُٹ کر ہم کو بھنے تیسلی تنہولی مالداد ہم فقیروں سے ہیں بدتر دیکھو بوجھ آشکار
پا حسیب کے گھر میں ہوئیوں کو نہ دولت آج کل

یہ مکتبی دہلوی کا "عالم آشوب"

بعد کے بعض شاعروں نے شہر آشوب کے طرز پر "عالم آشوب" اور "دہر آشوب" لکھے ہیں۔ اور دو کے ذریعہ اور ممتاز ادیب اور شاعر پنڈت برج موہن دتا زیر میننی دہلوی نے ۱۹۳۳ء میں ایک نظم "عالم آشوب" کے نام سے کہی۔ انھوں نے میری طلب یہ جس خط کے ساتھ یہ نظم لکھی بھیجی تھی اس میں اس کے حقیقی یہ رائے ظاہر کی ہے:

یہ نظم شہر آشوبوں سے مختلف ہے۔ ان میں اثر تعلیم یا ایک قسم کی جوہر پھو جوا کرتا تھا۔ یہ مکتبی مرئی حال ہے۔

اور اس نظم کی وجہ تصنیف یہ بتائی ہے:-

نیم مارچ ۱۹۳۳ء کو دہلی میں کنسل آف انڈیا اور میونسپلٹی میں حکومت ہند کا سبٹ (سماں نہ) پیش ہوا۔ تیس کروڑ سے زیادہ کھانا دکھایا گیا۔ نئے ٹیکسوں کی تجویزیں پیش ہوئیں۔ سارے صوبوں میں کھانے کے بجٹ پیش ہوئے۔ وطن کا افلاس مدت سے دل کو دکھائے رہا تھا۔ یہ نئی صورتیں اس نظم کی محرک ہوئیں۔

یہ عالم آشوب قید کے کی شکل کی بہت طوفاقی نظم ہے اور اس میں ہندوستان کے افلاس کا مرقع کھینچا گیا ہے مصنف نے پچھلے عام اہل ملک کی منہ کی نمایاں کیا ہے پھر ملازمت پیشہ، تجارت پیشہ، تعلیم یافتہ، مزدوری پیشہ، اہل مذہب اور زراعت پیشہ جتنوں کی پریشان روزگاری دکھائی ہے۔ یہ مختلف طبقوں کے لوگوں کا ذکر کرنا شہر آشوب کے قدیم مفہوم کا پر تہ ہے

مگر اس علم کے اندر تھے ایسے بھی ہیں جو شراب شرب سے مختلف ہیں اور جو کہ بقول مصنف تھیں عرض حال کہ کیا پیسے۔ ان میں سے بعض کے مخالف ہیں۔ دوسری پرستی اور کثایت شمار کا۔ حکومت اور رعیت کی طور پر۔ مالگیرانہ اس کے اسباب اس عالم اثر شرب کے چند اقتباس ذیل میں دیکھ کیے جاتے ہیں :-

تقسیم

پچانے ہیں ملک پر انہوں نے غرضیں نہ تھیں ملک دہلی کا ہے جو سر پر خانوں کے سود
شراب شرب کھا کرتے تھے پہلے ملک اب عالم اثر شرب کے کھلے کا ہے منہوں تیار

عزمت پیشہ

تو رہی پیشہ رہیں ان کا نہ پھر احوال ان پر رہتی ہے صاحب کی بیٹ بھرا
یہ کہہ گئے ہیں کہ اس سے کہہ لیں میں آپ بنے ملک ہے پندرہویں کی پہلی کا شمار
سادہ غریب کی ہے امان یہ نہیں روداد پیسے سالی اڑا پھر وال سے پھر جائے گھر
وقت اب یہ ہے جیسے میں ہے باقی بنتا پان پوری سے تو پھر بے میاں سے بھی ملک
ذکر بخیر و فخر ارجح ہیں انھیں کوئی بھرو دیکھ کا ہے نہ کوئی قسم خوار
بہنٹے کسی کی دہا تو شاید میں کسی کا خود مسیت میں ہوں تو ایک ہیں یا دو خیار

تجارت پیشہ

ملک کی ان کو امداد کا بھنا انہیں تم کو دیتے ہیں دکائی جو یہ بڑھا شہر
ان کے ہاتھوں میں ملتی ہے دھن کی دولت قوم کے سر پر چلاتے ہیں یہی تو تھوار
نفسہ آتے ہیں نہیں بے جوساں نہیں ملک میں ان کی درآمد کے یہ ہیں درآمد
ہیں یہ دلال اگر حیثیت اسلی دیکھو فیہ طوں کی یہ آزمخت کے ہیں فرمانبردار

تعلیم یافتہ

کری چاہیں نہ وہ کچھ کری نہیں ہاتھ کا کام وہ تو ان کو کرنا پر بیٹھے ہیں جس کھانے ادھار
بھول بیٹھے ہیں بزرگوں کے بڑا دھن کو ایک سے لے کے تو رہ گیا ان کا اختیار
ان اسامی کسی عالی برائی پھر دیکھیں آپ بابو کوئی کی دو رو یہ رو دفتر میں تھوڑ
مضیاں مضیوں پر ہیں کہ پتہ آتی ہیں منکبہ سے سوارش کے خوں کے ہوا

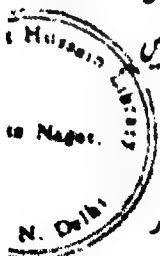
پہی در پہی کہ اُلجھا ڈپٹے میں ایسے عقل انسانی ہے سمجھانے میں جن کے بیار
ہا بڈی اس کا نتیجہ جو ہے وہ ظاہر ہے علم حاضر سے جسے ملے ہیں سب ل بیزار

ہے حکومت جو تھی دستِ طاقت کنگال کون ادا کرے کس کی سبھی ہیں ناچار
صنعتی لکھنوی کا دھڑا شوبہ | سالانہ انعام سید علی نقی صفتی لکھنوی نے اپنی ثانوی تعلیم اہلیات علوم ۱۹۲۵ء کے
دیباچے میں انیس شریک ایک دہرہ آشوب لکھا ہے۔ اس کے چند شعر نقل کیے
جاتے ہیں:

پُر شور و شرآج کل ہے آفتاب
لکھن نے کھلے تھے شہر آشوب
اسدیتہ و ایشیا دیورپ
چھائی ہوئی آدہ پرستی
کتر ان میں حنہ کے بندے
حنہ ماں بر نفس ہر کرور
جنباں رنگ آدہ پرستی
کھانا پیانا نہ سے اڑانا
اسد اد کو زمزم کبریائی
مخصوص اقامت ابیض القون
خونخوار آئین زندگی ہے
جب عقل فساد حسدان ہو
ایسے بگڑے ہوئے ہیں اخلاق
مجھ کو لکھا ہے دھڑا آشوب
بر خط سواد کمنہ سے گھسٹا
منہ منی نقطہ حنہ کی ہستی
اکثر حسد میں دہو کے بندے
باشندہ شہد دساکن وہ
بر نفس میں انتہا کی پستی
جو اس پر عمل کرے وہ دانا
انکار کو دعویٰ حنہ انی
ایک ایک دماغ تخت فرعون
تہذیب بشر در زندگی ہے
در ہم بر ہم نہ کیوں جہاں ہو
(تعلیم اہلیات ص ۱۵)

اجازت دینی لکھن کے یکم جولائی ۱۹۲۵ء کے پرچے میں قمر انصاری لکھنوی کا ایک منہ
قمر انصاری کا دھڑا شوبہ | دہرہ آشوب کے عنوان سے شایع ہوا جس میں پچیس بند ہیں۔ ابتدا کے چند بندوں
میں اپنے زمانے کی برائیاں بیان کرنے کے بعد اس کے ذمہ فاسخ و اعلا، موعی الحقی، جوگی، سادھو، لیدر، اسٹرا
حاج علم، شام برف طاست بنائے گئے ہیں۔ چند بند اور کچھ مصرعے نقل کیے جاتے ہیں:-

آج اک قصہ دیرینہ سنا تا ہوں میں خواب فطرت سے زمانے کو بگڑا ہوں میں
حد پار یہ اُسے یاد دلاتا ہوں میں خود بھی روتا ہوں جہاں کبھی روتا ہوں میں
دُور جا پستی ہیں اس وقت نکا ہیں سیدی
اب کے روکے سے رکتی نہیں آہی یزنی
نہ وہ ہم ہیں نہ وہ مستی ہے نہ وہ کیف و خمار نہ وہ ساقی نہ وہ مہرب نہ وہ ہنگام ہمار



دو دنیا زدہ ظلم نہ دوشمن نہ دو یار دو عیاذ نہ گھیس نہ دو گلشن نہ بہار

دو محبت نہیں دو گنج و صواب نہیں

دو طیرہ نہیں دو آب و حوش آب نہیں

مذکے ٹوٹے ہونے تار ہیں فصل برہم فخر و غرور ہے موجود ہے شور و باتم

گرد سے تیرہ تار ایک نعلانے عالم بخود منار کا جس پر ہے سراب بسیم

پھول مرجانے گلستاں میں کو رو پھلتی ہے

پتی پتی کھٹ افسوس پڑی ملتی ہے

ایں غم میں کتنے جہتوں کی جو کا انداز یہ ہے

رنگ اپا ہے کہ میں کا کوئی شب ہی نہیں قاضی وہ ہے کہ جسے صل سے طلب ہی نہیں

مردی وہ ہے کہ آفاق رکھے زمین و راز فتنی وہ ہے کہ میں کی جو خدا شک پر داز

جوئی وہ ہے کہ جو عریانی پہ اپنی جیسے آواز سوائی وہ ہے کہ جو اللہ کا شہرے ہم راز

ساحر وہ ہے جو گمان کو بے کار ہے

سب سے بہتر وہی میٹھ ہے جو کھڑے پستے

حاج لہر وہ ہے کہ جب حاج جانے زینت شب تک اس میں ہے خوب شانے

پھر جو اسے جو وہ آواز کرنا زیبا پڑانے بھلائی ہے کے بعد از دو گڑن کوٹنے

داشود ہیں کہ تعبیر کو کہ سے میں جو آئیں غائب و مومن و اندر وہ کے کچھ شعر سنائیں

پہلے میں جس سے ٹھکی ہو گئیں خوب آرائیں ٹھنڈی جانے تو لم سے سے آواخت بھیجیں

شرائے یکے کہ جوں اس میں صفائی آباب ممتنع کسی طعنے سے نہ ہوا اے صواب

زہر و دغ میں کو کھٹ نہ سمجھا جائے بازو لے شام فتنہ جو جہاں سے پائے

ہم میں جا کے جو اچھا گائی گایا ہے کھنکھنے والوں کو وہ البتہ جھایا ہے

اے قمراب ہیں زمانے کے یہی سیل و نہار
یعنی برزخِ ہفت کے یہی ہیں اطوار
مجھ کو اچھے نہیں آتے ہیں نغمہ کچھ آثار
صاف کہتا ہوں کہ ہے صاف ٹی میرا شمار
دھندلا دہ ہے کچھ رنگ بدلنے کے لیے
ہانب فرج سورج ہے نکلنے کے لیے

یہی عشرت ہے تو پیدا کوئی زحمت ہوگی
یہی راحت ہے تو ظاہر کوئی کلفت ہوگی
یہی دن ہے تو یہاں شام مصیبت ہوگی
یہی شب ہے تو یہاں صبح قیامت ہوگی
پھر زمانے کے سب اطوار بدل جائیں گے
وہی دنیا وہی اوضاع غصہ آئیں گے

شیریں بن باسی کا 'شہر آشوب'
شیریں بن باسی کا چو امیس بند کا محسن شہر آشوب کے عنوان سے اخبار ہندم لکھنؤ میں ۱۲ دسمبر ۱۹۱۷ء کو شائع ہوا۔ ایڈیٹر نے جوڈ اس پر لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر آشوب اس وقت زندہ تھے اور ان کا کلام ہندم میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ اس شہر آشوب میں شاعر پہلے خط لکھنؤ کے پرنسپال پر شکوہ کرتے ہیں کہ 'ابلی فی اہل علم اور لکھنؤ والوں کی شیریں زبانی خوش پوشاکی، شائستگی اور تہذیب یاد کر کے افسوس کرتا ہے۔ چہ دوسرے شہر آشوبوں کے خطوط مختلف پیشہ وروں کی جگہ مختلف اداروں کا اہلکار بیان کرتا ہے اور مختصر اُپنی فقیہ، سنی، عالم دین، مفتی، ڈاکٹر، سرکاری افسر، عسکر، انجینئر، سمار چکی کے ممبر، ٹیلی فون دایاں، پتھر پر ویسٹ، ڈین، ڈیڑ اور شاعر کی جگہ کرتا ہے۔ چند بند نمونے کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں:-

کیا لکھنؤ کے شہر کی حالت کروں بیان
باغوں کا شہر کہتے تھے جس کو کبھی مہیاں
جس کی صفت میں تھا کبھی سب لہاں چلی
جوتا تھا جس پہ غلہ بریں کا کبھی گھانا
افسوس اس کو میٹ گیا دور آسمان

وہ باغ کیا ہوئے وہ گلستاں کدھر گئے
وہ بوٹاں بہشت بہ داماں کدھر گئے
ہر شاخ سے حیرت مندی خواں کدھر گئے
فدا ہے کیا جوئے وہ دنیا بان کدھر گئے
ہم نے کبھی تو ایسی دیکھی کوئی خنداں

مفتی نہیں دبیر نہیں مصلحتی نہیں
ملا نہیں فقیر نہیں مولوی نہیں
مُرشد نہیں مُرید نہیں مفتی نہیں
عارف نہیں فقیر نہیں باطنی نہیں
دھندلا دہ تھا کمال کا فنا نہیں تھا

جو پر ہے غیرتے مرشد ہے شاہ ہے پاؤں ہے عریں ہے نامریا ہے
اور صوفیوں کی جو بھی میاں غایت ہے اب تو تاش سینوں کی آماج گاہ ہے
کیونکہ دل کی آگ سے اُٹھنے کے دھول

کالی میاں پہ جتنے ہیں سب محاب ہیں اسکل بھی کائے پلاں بے حساب ہیں
بیکار کچھ ہیں بعض طاقت آاب ہیں بیکار مد سے ہیں محابت عزاب ہیں
نہد کر ہے جاسمہ تو از اذیش و لال

گو چور ہیں ڈیہ ہیں اور ہیں پادشہ کچھ ان میں ہے وقت میں مہنہ میں بے خبر
کی بحث کم نکاہ میت است کے بے ہیز قیوں کی ہے ٹھہر نہ تدریس پر غصہ
پہ فریب و گوں لا کرتے ہیں راہ گان

آتا نہیں ہے کوئی ہز اور ہیں شہریر ناویتی میں جہ کی نہ جہنے کسیں غیر
بے شرم ہے محاب یہ بخت اور فقیہ اب ایسے دیکھ جگے جنب رکے دیر
جہ کو نکالی بھی نہیں آئی ہیں سرخیاں

مطب مردمن سے قرانی پہ بے نکاہ کیا ہر فصاحت اور جوفت میں دستا
ان شاعروں کے قول سے اند کی پناہ اک شعر پر بھی جو گئی گراں کے دادا
اپنے کو آپ کہتے ہیں من قافی زان

سب جو چکا بیان تاجی کا مہرہ جو کچھ جہا جہا سے گناہوں کی ہے سزا
ہر ایک دل سے اب تو نکلتی ہے یہ دعا اجڑا ہنایہ دیں بے پھرے لے خدا
تو ہے کریم فضل کی اپنے دکاٹے شاں

اسے نفس کا آخری بند غیر اکبر آبادی کے شہر آشوب کے آخری بند کی نقل ہے۔ دونوں بند لا غلط ہوا
ماشق کو اسیر کو آگرے کا ہے مخ کو دہیر کو آگرے کا ہے
نفس کو فقیہ کو آگرے کا ہے شام کو فقیہ کو آگرے کا ہے
اس واسطے یہ اس نے کھے پانچ پار بند

قیہ کی کو اسیر کو لکھنو کا ہے فت مد کو سیفر کو لکھنو کا ہے

شاعر کو فقیر کو لکھنؤ کا ہے احق کو شہر کو لکھنؤ کا ہے
جو کبھی طرح نہ اُس کی تباہی پہ فوج خواں

خاتمہ کلام | مستند سلطان سے شہر پہنچا ہوا تھا تقریباً نو صدیاں گزریں۔ اس طوفانی مدت میں غازی اور اردو
میں بہت سے شہر آشوب کے لئے ہوں گے۔ ان میں سے چند جو راقم کے علم میں آئے ان کا ذکر اور ان
کے نمونے اس مقالے میں تکنیکی ترتیب سے پیش کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح جو شہر آشوب کے مفہوم میں جو تبدیلیاں ہوتی
رہیں اور اس کی حیثیت اور موضوع میں جو تنوع پیدا ہوتا رہا، اُس کا ایک خاکہ قاریوں کے سامنے آگیا ہوگا اور یہی اس
مقالے کا مقصد ہے۔

مولانا ابوالکلام کی شخصیت

مولانا عبد الماجد دریا بادی

بو علقہ یامان تو ہیشم کی مسرہ زم
زم حق و باطل ہو تو زور ہے مومن

کوئی آدمی مومن ہی نہ ہو، اس شان، اس سج و جی، اس خوش کام و یار، جو ان آنکھوں نے ایک تصویر تو اقبال کے قلم حقیقت
نظم کی گھیس ہوئی، اپنے زمانہ میں دیکھ لی، اور تصور بھی کیسی ابھی سمائی، ایک شک سے دست، تو کپکپ سے رات، بج کی ٹھٹھیس میں
ایمان سے حلقہ کاٹیں، تو اب دیکھیے، مولانا کے منہ سے کس طرح نکل جاتا ہے، جن بیانیوں پر لیٹے، دین، ابن، سیاسی، علمی،
شخصی، نہ قسم کے ترکے اور تم سے، انیت و شکست، ایک سے بڑھ کر ایک، کہیں شورش، جے جی، کہیں بدل چال کی نذر کو شربت
ہرے میں اور حقیقت کی آمد ہے تو سن لیا، وہی ہے ۔

بے زبان میری ابرو مسہ دار

گھٹنوں نہیں پیراں، پیٹھے اور دل نہ گہرائے، نہ اگلے نہ پچھلے۔

ہر جگہ میں موقع اس کا آیا کہ چوتے مولانا کے غیر اخلاقی یا من دینی پر پڑا وہ دعوت، تجلید، جواہج، خورج، جواہج، تقریر
اب سماں ہی دھرا ہے، ایک شہر ہے کہ گرج رہا ہے، اٹا ہے، دسواں، کہ دھال کی، خطابت کی آگ برسا رہا ہے، اور رہا ہے کہ آ
پہر صاف لگانے ہے کہ

ہے مسلم بیوتیخ جو مسہ دار

لیکن جوش و خروش کے عالم میں بھی شروع جوانی کے دور کو چھوڑ کر تقریباً زبان کا بے باہر نہیں، قابو کے اندر دکن پر اور نفس پر جیسے
پہر لگا جوا، اشتعال کے سمندر سے جیسے دیں، اٹھ رہی ہیں اور علم و مقام کی چٹان سے ٹکرا کر واپس چلی جا رہی ہیں۔
ایک دن کی بارش ہے، لیکن چم تقویر کے سلسلے زمانہ آج سے تینائیں سال قبل سنہ ۱۹۰۷ء کے آئیے، وقت تحریک خلافت
و تحریک ترک وادعت کی بحر پر، جوانی کا، پھر پتہ کی زبھر و خلافت کے پڑ جوش نعرے اور، جان و ثناء خلافت پر سے دوڑنے کو نہ
لیکس یو، پٹی کا ایک مسوم و مسرور دینی مرکز، انجیل خلافت مرکز بھی، اس کے منتفی کا کلمہ کہ تحریک خلافت سرور و کفر میں داخل
اور اس کے علم پر دار و دائرہ اسلام سے خارج، اور خلافت داؤں کو یہ سوچ کر کہ اپنی ایک کافر منہ سے ہی شرمیں کیجیے۔ اچھا
صاحب، جسے جوا، اد گرا یا غیض کے طبل جنگ پر چوٹ پڑ گئی۔

غنائیں شہر آشکار پڑے کہ تیغ عام جسے کوئی بھر کہ وہ ہم پر ہم کیجیے اور ڈیسے کو فرق ہی کہہ سکیں آئیے اور جلد خلافت

ہمارے گراہی مقررین تجیز سے تارتدک کے رکھ دیجیے ! ————— اور خلوت دلے بھی نکرند کہ آج تو

ہے سائپ کے منز میں اٹھلی اپنی

بہم دیکھیے کیا جو مناظرہ، ٹکاو، تصادم تو رکھا ہی تھا ہے۔ لیجیے جلسہ شروع ہو گیا۔ مخالفین کی طرف سے میدانِ خطابت کا ایک بلحاظ شدہ زور اور پیل تو اٹھائے میں آتا گیا۔ گشتی پر گشتی تارے جسے 'واؤں کی' کی استاد ی میں نام پائے ہوئے۔ اور اس نے تقریر یہ مانا وہ ار کے انداز میں شروع کی۔ جلسہ پر ایک نشر کی سی کیفیت طاری اور خلافت والوں کی زبان پر فیض یا خینہ کے جاگا۔ یہ یاد نہیں کہ صدر جلسہ خود مولانا ابو الکلام ہی تھے یا کوئی اور بہر حال جو اتنی تقریر کے لیے کھڑے جسے لوگ گھمے کر لوہے کی کاٹ کے لیے بانٹا اور بس کوئی دم میں مائیت کے جواب میں پھر چلا۔ ادھر ویس بر طرح میں ہنگامے فساد کی فضا، ہڈی ٹکڑا کی متورق — لیکن — لیکن یہ کیا! تقریر تو شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی اور کہیں نہ تخلیق نہ تفسیق اور یہ تو بہت دور کی چیزیں تھیں نہ فریقین، تیشیک نہ تعصیب! شروع سے آخر تک بس نفیم، تدکیر، تشریح و تبیین، نہ مناظرہ نہ مناظرہ، نہ مبارزہ، نہ مبارزہ! تقریر دلائل و حقائق کے رنگ میں رنگی ہوئی، مستقریت اور سلاست رومی کے پتھروں میں گندھی ہوئی ————— سریف اب یہ بھی تو کیا کرتا، سارے ار میں بیٹھا کر رہ گئے، غائب کے پڑے اٹھنے کی جو خبر گرم تھی وہ مولانا کے علم و تدبیر کے آگے سرد ہو کر حری کی دھری رنگتی اور تھلا ہونا پایا ! —

تیشہ علم از تیشہ آہن تیسند تر

بل ز صد شکر غفر انعمیہ تر

نہر لپھا شوق میں تھا اس کا سلاں آنکھوں سے آج دیکھ لیا۔

قدت نے گویا پہاڑی بڑائی کے لیے کیا تھا۔ کم سے ہی تھے کہ تقریر و تقریر دوڑ کا شہہ بند ہو گیا اور دور و اے اسی حوکے میں پڑے بے کر یہ ڈاکوئی بوڑھا ہو گا۔ اور شاگرد تو علوم و فنون میں گناہا بیجے کہ کسی کے بھی نہ ہونے۔ فیض میں منہ فیض سے پائے ہونے۔ رہا کسی سے کچھ پڑھ پڑھا یا تو ادبات ہے ورنہ حقیقتہً شاگردی کے نام سے نا آشنا اور مصداق ج

شاگرد رشید غنی نقالی

ے بنے ہوئے۔

صدر جلسہ غفر کھنڈ کا ایک ادبی ایہا رہ تھا اس کے صفات پر جب نظر آئے تو خود ہی مرکز نظر ہو گئے۔ ساری آصداقی ملکیت سے کلا تو وقت کی صفت میں پدید نہ نکلا دیے۔ اندوہ کے کوچہ علم و فضل میں جب آنکھ لگا دیں تو آڈیٹ بنے بغیر آڈیٹ ہی گئے اور جب اس امر سے آگاہیں یا تو اس کا نام دور و دور پہلایا اور یہ سب اس کی باتیں ہیں جب لڑکے کالی کے درجوں میں پڑتے جاتے ہیں جب کالی کے پھل بننے کا وقت آیا اور اپنا ذاتی جنت دار ملک کے آفتی سے آب تاب کا لالہ تو چہرہ فروغ سے سے گلستاں کیے ہوئے

مولانا ابوالکلام کی شخصیت

مولانا عبد الماجد درپادی

ہر ملت ایمان توہشیم کی طرح نرم
نرم حق و ہر مسل جو توڑا رہے ہر مومن

کوئی اور مومن اس آقاؐ اس شانؐ اس جی دمیؐ اس نور کا جو یازہ جو ان آنکھوں نے ایک تصویر تو اقبل کے قلم حقیقت
رقم کی کہیں ہوئی اپنے زمانہ میں دیکھ لی۔ اور تصویر بھی کیسی! بھی سہانی، ہلکے سے درست، نوک پر یک سے راست، بچ کی عینیں جوں
اباباں سے صفت کا مہیج، تو آپ دیکھی کہ مولانا کے ٹٹے کے کس طرح پھل جڑ رہے ہیں، بیٹوں پر لیٹے، دینی، ادبی، سیاسی، علمی،
فنی، ہر قسم کے ہمارے، اہیت و شفقت ایک سے بڑھ کر ایک، کہیں شہ سار رہے ہیں، کہیں بل پالی کی نثر کو شہر تائے
ہم سے ہیں اور حقیقت کی آمد ہے کہ ہمیں پکار رہی ہے۔

جسے زبان میری ابو گھر بار

گنٹوں نہیں پہوں، مٹی اور دل نہ گہرائے، نہ اگلے نہ پچھلے۔

اور ہم کہیں کرتے، اس کا آئینہ کہ چوتھوے کے غیر اخلاقی یا من دینی پر پڑا وہ عورت جو باجوت، تھوہر ہو یا مہیج، تحریر ہو یا تقریر
اب سنا ہی اور اہل۔ ایک شہر ہے کہ گھر رہا ہے، انا ہے، دوسروں کو دلائل کی غصابت کی آگ برسا رہا ہے، اور زبان ہے کہ آ
پھر صد اٹھائے ہے کہ

جسے مسلم میرا تیغ جو مسہ دار

کیں جوش و خروش کے عالم میں بھی شرع جو انی کے دور کو چھوڑ کر تقریباً زبان کا جیسے باہر نہیں، قابو کے اندر ملکتی پر اور نفس پر جیسے
پہر لگا ہوا، انتہا کے سمندر سے جیسے وہی اٹھ رہی ہیں اور علم و مہارت کی چٹان سے ٹکرا کر واپس چلی جا رہی ہیں۔
اب ان کی ہائے، کیوں کہ ہم تصور کے سامنے زمانہ آج سے تینائیس سال قبل سنہ ۱۸۷۷ء کا ہے۔ وقت تحریک خلافت
و تحریک ترک ممالک کی بھرپور جوانی کا، پھر پھر کی زبان پر خلافت کے پُر جوش نعرے اور، جان و مالا خلافت پر دے دو کے توڑنے
لیکھی، بی بی کا ایک مسوم و مسودہ دینی مرکز، انیس خلافت مرکز بھی، اس کے منہ کی کلمہ کہ تحریک خلافت صد و دہائی داخل
اور اس کے علم پر اور، وارثہ اسلام سے خارج، اور خلافت داؤں کو یہ سوچا کہ اپنی ایک نعرہ میں ہی شرم کیجیے۔ اچھا
ماسب، جسے جڑا اور گویا عین کے بل جگہ پر چوٹ پڑ گئی۔

نہایتیں شہر، آٹھ چلے کہ تم عام جہ کو جی بھر کہہ رہے ہیں کہ ہم جی بھر کیجیے اور ہر جہ کو خرقہ ہی کے لباس آئیے اور جہ خلافت

کے حاسن کو اپنی مقررہ بنیاد پر آتا رہا کہ وہ دیکھے ! — اور خوفت و لے بھی فکر مند کہ آج تو

ہے سانپ کے منہ میں اٹھلی اپنی

انہم دیکھے کیا ہوا مناظرہ، ٹھکانا، تصادم تو رکھا ہی ہوا ہے۔ بیچے جلسہ شروع ہو گیا۔ مخالفین کی طرف سے میدانِ خطابت کا ایک پہلوان، شر زور اور پل تھکا لے میں آتا گیا، گشت پر گشتی تارے ہوتے، واؤں کی کی استاد ی میں نام پائے ہوئے۔ اور اس نے تقریر یہ مانا، وہ مار لے گا، خازن میں شروع کی۔ جلسہ پر ایک نشر کی سی کیفیت طاری اور خلافت والوں کی زبان پر فیض یا خلیفہ کے بارے میں یا دغیب کی صدمہ جلسہ خود مولانا ابو الکلام ہی تھے یا کوئی اور بہر حال جو اپنی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے لوگ گھمے کر لوہے کی کاٹ کے لیے وہ نکلے اور بس کوئی دم میں مانیٹ کے جواب میں پھر چلا۔ اور پولیس بر طرح لیس، ہنگامے فساد کی فضا، ہڈی گڑا کی متوقع — لیکن — لیکن..... یہ کیا! تقریر تو شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی اور کہیں نہ تکلیف نہ تفسیق، اور یہ تو بہت دور کی چیزیں ہیں، نہ تعزین، تفسیق نہ تعزیم، تفسیق! شروع سے آخر تک بس تعزیم و تذکیر، تفسیق و تبیین، نہ مناظرہ نہ مناظرہ، نہ مبارزہ، نہ مبارزہ! تقریر دلائل و حقائق کے رنگ میں رنگی ہوئی، معقولیت اور سلامت روی کے پھولوں میں گندھی ہوئی — حریف اب رت بھی تو کیا کرتا۔ سارے ارہلی پٹھان کا رو گئے، غائب کے پڑے اٹھنے کی جو خبر گرم تھی وہ سونا کے علم و دہرے آگے سرد ہو کر دھری کی دھری رنگی اور تھکسا ہوا پاپا! —

تین علم از تین آہن تیسرے

بل ز صد لشکر غفر انجمن تر

شر پر حاشیہ میں تھا، اس کا ساں آنکھوں سے آئی دیکھ لیا۔

قدت نے گویا پیدای برائی کے لیے کیا تھا۔ کم بس ہی تھے کہ تحریر و تقریر دو زکاشہ، بند ہو گیا اور دور و اے اسی حو کے میں پڑے بے کر یہ ڈاکو کو بڑھا جو گا۔ اور شاگرد تو علوم و فنون میں کنا پا بیے کسی کے بھی نہ ہوئے۔ فیض میں بند فیض سے پائے ہوئے۔ رہا کسی سے کچھ پڑا چھایا تو ادبات ہے ورنہ حقیقتہً شاگردی کے نعم سے آاشا اور مصداق ج

شاگرد رشید حق نفسانی

ے بنے ہوئے۔

نہ جب نہ کہنہ کا ایک ادبی ماہنامہ تھا، اس کے صفحات پر جب نظر آئے تو خود ہی مرکزِ نظر بن گئے۔ سناں الصدق کلکتہ سے کلاو ز وقت کی صفت میں چار پانچ لگا دیے۔ اللہ کے کو چہ علم و فضل میں جب آنکھیں تو اڈیڑ بنے بغیر اڈیڑ ہی گئے ادب (سینئر) ہتھ میں یا تو اس کا نام وہ وہ چھپا یا اور یہ سب اس میں کی باتیں ہیں جب لڑکے کالی کے درجوں میں پڑتے جوتے ہیں جب کالی کے پھل بنے کا وقت آیا اور اپنا ذاتی ہفتہ وار کلکتہ کے آفیس سے آب تاب کلاو تو چہرہ فروغ سے گلستاں کیے ہوئے

مولانا ابوالکلام کی شخصیت

مولانا عبد الماجد دریا بادی

ہو علقہ یاران تو پریشم کی طرح نرم

نرم حتی وہاں جو تو فلا رہے مومن

نوفی دور میں اس کی اس شان، اس کی وحی، اس کو جو کامیاب ہو ان آنکھوں نے ایک تصویر تو اقبال کے قلم حقیقت کی بھیجی ہوئی، پتہ نامہ میں دیکھ لی۔ اور تصویر بھی کیسی ابھی سبھی، ایک سکے سے درست، نوک پرک سے سادہ، بچ کی محفلیں ہوں ایمان سے عفت کا مجمع، تو آپ دیکھ کر مولانا کے منہ سے کس طرح پھول جھڑپے ہیں، لطیف، دینی، ادبی، سیاسی، علمی، دینی، فنی، تہذیبی اور تہذیب سے اجیت و شگفتہ، ایک سے بڑھ کر ایک، کہیں شعر سنار ہے ہیں، کہیں بول چال کی شرک و شرمناکائیوں میں اور جیت کی آمد ہے کہیں جلا رہی ہے۔

بے زبان میری ابو محمد بار

لکھنؤ نہیں ہوا، مٹنے اور دل نہ گھرائے، نہ اٹکے نہ پھٹائے۔

۴۰ دور کہیں موقع اس کا آگیا کہ چوتھوں کے غیر انقلابی یا جس دینی پر پڑی وہ خلوت ہو یا جلوت، تخلیہ ہو یا مجمع، تحریر ہو یا تقریر، اب سامان کی ضرورت ہے۔ ایک نہ ہوتے تو کج رہا بت، اثبات، دوسو دن، کہ دلائل کی، خطابت کی آگ برسا رہا ہے، اور زبان ہی ہے کہ آج پھر مدد اٹھانے ہے کہ

ہے تسلیم میرا تیغ جو ہر دار

بہن جو شہ و شاد کے عالم میں بھی شروع جوانی کے دور کو چھوڑ کر قلم یا زبان کا لباس پہنیں، قابو کے اندر رکتی پر اور نفس پر جیسے پھانٹا ہوا، انتہا کے سمندر سے جیسے نہ ہی ٹھہری ہیں اور علم و مہارت کی چٹان سے ٹکرا کر واپس چلی جا رہی ہیں۔

اب دین کی بارائیں، لیکن ختم تصور کے سامنے زمانہ آج سے تینالیس سال قبل سنہ ۱۹۰۷ء کے آئیے۔ وقت تحریک خلافت و تحریک ترک عادات کی بھرپور جوانی کا، پھر تحریک زبان پر خلافت کے پرجوش نعرے اور "جان بیانا خلافت پر دے دو" کے نعرے، میکس، یو۔ پی۔ کی ایک مسموم و مسموم دینی مرکز، انجمن خلافت مرکز بھی۔ اس کے منہ کی کا حکم کہ تحریک خلافت سد و دگر میں داخل اور اس کے طور پر، دائرہ اسلام سے خارج، اور خلافت والوں کو یہ سوچ بھی کہ اپنی ایک نفرین میں اسی شہر میں کیجیے۔ اچھا صاحب، جلد ہوا اور گویا غصے کے طبل جنگ پر چوٹ پڑ گئی۔

تھیں بیٹے، بڑا شاکر ہے کہ آج عام جلسہ کو جی بھر کر درہم برہم کیجیے اور بڑے کو غرق ہی کہے کہ واپس آئیے اور جلسے خلافت

کے دامن کو اپنی مقررہ جگہ سے تار تار کے رکھ دیجیے! — دھر خلافت والے بھی فکر مند کہ آج تو

ہے سانپ کے منہ میں اٹھلی اپنی

انجام دیکھیے کیا ہو، مناظرہ، ٹکڑاؤ، تصادم تو رکھا ہی ہوا ہے۔ یہی جلسہ شروع ہو گیا۔ مخالفین کی طرف سے میدانِ خطابت کا پہلوان، شہزاد اور پیل تن اکھاڑے میں اتارا گیا، گشتی پر گشتی مارے ہوئے، داؤں پیچی کی استاد ی میں نام پائے ہوئے۔ اور اس تقریر یہ بابا، وہ مار لکے انداز میں شروع کی۔ جلسہ پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری اور خلافت والوں کی زبان پر دبیضی یا خبیث کے اب یاد نہیں کہ صدر جلسہ خود مولانا ابوالکلام ہی تھے یا کوئی اور، بہر حال جو اپنی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے لوگ سمجھے کہ وہ ہے کی کاٹ کے روکا نکلا اور بس کوئی دم میں اینٹ کے جواب میں پھر پلا۔ دھر پوچھیں بر طرح بیس، ہنگامے فساد کی منتظر، ہڈی ٹکڑاؤ کی متوقع۔ بکا — میکین..... یہ کیا! تقریر تو شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی اور کہیں نہ تکفیر نہ تفسیق، اور یہ تو بہت دود کی چیزیں ہیں، تقریریں نہ تشبیہ نہ تشبیہ نہ تشبیہ! شروع سے آخر تک بس تفسیم و تذکیر، تشریح و تبیین، نہ مناظرہ نہ مناظرہ، نہ مبارکہ، نہ مبارکہ تقریر دلائل و حقائق کے رنگ میں رنگی ہوئی، معقولیت اور سلامت روی کے پھولوں میں گندھی ہوئی، — حریف اب کرنا بھی تو کیا کرتا۔ سارے ارمانی پھٹکا کر رہ گئے، غالب کے پُرزے اٹھنے کی جو خبر گرم تھی وہ مولانا کے حلم و تدبیر کے آگے سرد، دھری کی دھری رہ گئی اور ناکسا ہونا پایا! —

تینج علم از تینج آہن تینج تر

بلی ز صد لشکر غفر انجیند تر

شرطِ چاشنوی میں تھا، اُس کا سماں آنکھوں سے آج دیکھ لیا۔

قدرت نے گویا پیدا ہی بڑائی کے لیے کیا تھا۔ کم سن ہی تھے کہ تحریر و تقریر دونوں کا شہرہ بلند ہو گیا اور دُور والے اسی صوفی میں پڑے سبے کر یہ لڑکا کوئی بڑا صاحب ہو گا۔ اور شاگرد تو علوم و فنون میں کتنا چاہیے کہ کسی کے بھی نہ ہوئے۔ فیض بس مہرِ فیض سے پار ہوئے۔ رہا کسی سے کچھ بڑا چڑھا لیا تو ادبات ہے ورنہ حقیقتہً شاگردی کے نام سے نا آشنا اور مصداق ع شاگردِ رشید حق تعالیٰ

کے بنے ہوئے۔

خدا ربِ نظر کھنکھو کا ایک ادبی ماہنامہ تھا، اس کے صفحات پر جب نظر آئے تو خود ہی مرکزِ نظر بن گئے۔ لسانِ الصدق اُس نے کمالا تو وقت کی صفات میں چارچاند لگا دیے۔ اللہ وہ کے کوچرِ علم و فضل میں جب آنکھ لے تو اڈیٹر بنے بغیر اڈیٹر بن گئے اور وکیل (ایئر نرس) ہاتھ میں لیا تو اس کا نام دُور دُور چمکایا اور یہ سب اُس سن کی باتیں ہیں جب لڑکے کالج کے درجوں میں پڑھتے تھے، جن، جب کلی کے پھل بننے کا وقت آیا اور اپنا ذاتی ہفتہ وار کلکتہ کے آفس سے اب تاج کمالا تو چہرہ فروغ سے سے گلستاں کیے ہوئے



بابائے اردو

200

200

ذکر عبدالحق

مولوی عبدالحق تریب: معین الرحمن

چند ہم عصر: مولوی عبدالحق کا معروف نثری مجموعہ ہے۔ مختلف اوقات میں لکھی گئی ان تحریروں کو سب سے پہلے مولوی عبدالحق کے ایک عزیز شاگرد شیخ چاند (مرحوم) ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ (درمیرج اسکالر، جامعہ عثمانیہ) نے جمع کیا، لیکن وہ اسے اپنی زندگی میں طبع نہ کرا سکے۔ ان کی موت کے بعد یہ مجموعہ سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) نمبر ۱۹۲ کے تحت اب سے کوئی پچیس برس پہلے شائع ہوا۔ پہلے ایڈیشن میں چودہ مضامین شامل تھے۔ ان میں سے کچھ نو رسالوں میں پہلے چھپ چکے تھے، کچھ اس مجموعے کے لیے خاص طور پر لکھے گئے اور بعض شیخ چاند مرحوم نے کتابوں کے تبصروں یا مولوی عبدالحق کے خطوط سے اقتباس کر کے اس میں داخل کر دیے۔ شیخ چاند کا خیال تو یہ بھی تھا کہ ہر تصویر کے ساتھ صاحب مضمون کی تصویر بھی لگادی جائے لیکن اس کی فہمت نہ آئی۔ دوسرا ایڈیشن اسی سلسلہ مطبوعات کے تحت: منبر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کی مختصر انتہاس کے ساتھ جال پریس دہلی سے ۱۹۴۲ء میں طبع ہوا۔ اس میں اس مسودہ اور میرن صاحب کے حالات کا اضافہ کیا گیا جو رسالہ اردو میں شائع ہوئے تھے۔ نام دیروالی کا تذکرہ خاص طور پر اسی ایڈیشن کے لیے لکھا گیا۔

یہ مجموعہ بہت مقبول ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد، نظر ثانی و اضافہ کے ساتھ اس کا تیسرا ایڈیشن سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان نمبر ۱۹۱ کے تحت قاضی احمد میاں اختر جو ناگزہمی (مرحوم) کے دیباچے کے ساتھ ۱۹۵۰ء میں چھپا۔ سرسید پر مولوی عبدالحق کا سیر حاصل مضمون اسی ایڈیشن میں شامل کیا گیا۔ چوتھا ایڈیشن انجمن کے اسی سلسلہ مطبوعات کے تحت نقیہ سرودی کے دیباچے کے ساتھ ۱۹۵۴ء میں چھپا، جس میں عبدالحق صمدی، حسرت موہانی، پروغیراقبال، پروغیرری۔ ہٹ سک اور عبدالحق مجنوری پر مضامین کا اضافہ کیا گیا۔ چند ہم عصر کا پانچواں ایڈیشن بھی انجمن ہی کی جانب سے شائع ہوا۔ اس پر سال اشاعت کہیں درج نہیں کیے انجمن کے مکتب خانہ خاص میں نسخے کے اندراج سے سال اشاعت معلوم کیا جاسکتا ہے۔ نواب حماد الملک پر مضمون اسی ایڈیشن میں پہلی بار شامل ہوا۔

چند ہم عصر کا چھٹا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن مولوی عبدالحق کے اپنے مختصر دیباچے کے ساتھ

مؤلف کا گیدھی سندھ، کراچی کی طرف سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن میں منشی امیر احمد بیانی پر مضمون مولوی عبدالحق نے امیر بیانی کی وفات ہی کے روز لکھ کر رسالہ "افسر" میں شائع کر دیا تھا، اس اعتبار کے ساتھ حذف کر دیا ہے کہ: یہ بہت ہی سرسری مضمون ہے جس میں نہ پوری سیرت نکلائی ہے اور نہ ان کے کام پر مکمل تبصرہ۔

آخری ایڈیشن میں کچھ چھپ چکی تھیں خاکے شامل ہیں جن میں سے مرزا آجرت پر مضمون مولوی عبدالحق لکھا ہوا نہیں ہے، اس کی شانہ بیانیوں نے دیلیپ میں کی ہے۔ بقیہ تینسٹاؤنوں میں سب پر اپنی تحریر پر وغیرہ۔ بہت کچھ بہت "جو پہلی بار رسالہ "افسر" شمارہ جون ۱۹۵۹ء میں چھپی اور جسے چند ہم عصر کے چوتھے ایڈیشن میں شامل کیا گیا۔ آخری خاکہ خالدہ ادیب خانم کا ہے جو نکلتا "چند ہم عصر" کے اس ایڈیشن ہی کے ہے کیا تھا تینسٹاؤن پہلی بار یہ جنت روزہ "دیل و ہمار" کے شمارہ ۱۱ اپریل ۱۹۵۹ء (جلد ۱ شمارہ نمبر ۱۵) میں شائع ہوا۔ اس طرح یہ سیرتیں ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۰ء تک کوئی ساٹھ سال کی عرصہ میں مختلف مواقع پر لکھی گئیں۔ اس صدی کا یہ عرصہ ہی قریب قریب مولوی عبدالحق کی زندگی کا نصف دوہا بھی ہے۔ اردو کے رشتے سے اپنی زندگی میں مولوی عبدالحق کا بہت بڑا فائدہ ہے راست اور قریبی قطعی رہا۔ شناساؤں کی کثرت اور وقت کے اس پھیلاؤ کے باوجود صف میں ان چند مدد میں کا انتخاب اپنی جگہ قابل غور اور توجہ طلب ہے۔

مولوی عبدالحق کو سمجھنے کے لیے ایک بات پیش نظر رہنی بہت ضروری ہے۔ بیماری اور بیماری کی ان کی طبع ہم رسا کی نہ تھیں۔ وہ فوجی رہا رہے اور جو کام بھی کیا جی سے کیا، پیشہ وری کے درجے سے اپنے دامن کو کبھی آلودہ نہ ہونے دیا۔ یہ خاکے بھی نہ سیرت نگاری کی خانہ پری کے لیے لکھے گئے اور نہ سیرت کشی کے لیے، افادہ کار انتخاب ہی اضطراری تھا۔ دراصل وہ زندگی کے وسیع میدان میں ان اہل اس سے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طور متاثر ہونے اور اسی داخلی ربط نے ان سے یہ خاکے نکلائے۔ متاثرہ محض ان مضمون میں نہیں کہ ان شخصیتوں کو انہوں نے اپنے تئیں آویخت و افسانیت کی سطح کافی اور خلوت و بندگی اور برائی کا معیار بنانا، یقیناً انہوں نے ایسا بنانا اور سمجھا اور شاید شعوری یا غیر شعوری ہو۔ یہ ان کی پیروی بھی کی ہو لیکن اس سے بہت کہ اس انتخاب اور چناؤ کے پس پشت بہت کچھ ان افراد سے خود مولوی عبدالحق کی اپنی ذہنی ہم، بگلی، طبعی، رومان و میلان اور کثرت ان حیات کے اصولوں اور مضامین میں کیے گئے اشتراک کو بھی دخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "چند ہم عصر" کے شمارخانے میں قدم قدم پر ہیں

مولوی عبدالحق کی اپنی سیرت کی جھلکیاں اور پرچھائیاں ملتی ہیں۔ انھوں نے اپنے بعض بزرگوں اور ہم نشینوں کی سیرت و کردار کے جو خاکے اور نقشے تیار کیے ہیں، ان میں غیر شعوری طور پر انھوں نے اپنی ہی طبیعت کا رنگ کچھ یوں بھر دیا ہے کہ ان کے آئینہ خانہ فن کے عرص میں ان کی شخصیت کا جو ہر ٹپٹا نظر آتا ہے اس طرح ہم معبروں کے اس انتخاب کے سہارے ہیں خود مولوی عبدالحق کی سیرت تک رسائی میں بڑی مدد ملتی ہے اور یہ اس دستاویز کا بہت ہی دلچسپ اور نادر پہلو ہے۔

مولوی عبدالحق کی مرقع نگاری سے متعلق اپنے ایک مضمون (ادبی دنیا: شمارہ نم) میں ضمناً چند ہم عصر کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ:

شخصیتوں کی آڑ میں ان کا، شوق بے اختیار، دیدنی جہاں ہے اور ان پر عشق پیشہ، تیر کے ایسے آفت زماں کا گماں ہونے لگا ہے جو اپنے سارے مطلب پر دے میں ادا کرے ہے۔

اپنے اس بیان کے حق میں خوف طوالت میں نے مثالیں پیش کرنے سے معذوری کا اظہار کیا تھا۔ ذیل کا یہ مضمون اس فرض کی ادائیگی کے لیے وقف ہے۔ دیکھیے کہ در بیان حکایت دیگران مولوی عبدالحق نے اپنی ذات و صفات سے کیسے نقاب اٹھائے ہیں۔ یہ مضمون تمام کا تمام مولوی عبدالحق کی اپنی زبان و عبارت میں ہے، جسے میں نے "چند ہم عصر" کے صفحہ ۱۱ سے اقتباس کیا ہے۔ عبارت کے اصل حوالہ جات صفحہ دار ذیلی حاشیے میں دے دیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں "چند ہم عصر" کا ایڈیشن مبلور ۱۹۵۹ء کا نسخہ میسر پہنچا نظر رہا ہے۔

مضمون میں ربط اور تسلسل قائم رکھنے کے لیے مجھے صمیموں اور صیغوں میں خفیت رد و بدل کرنا پڑا ہے لیکن اسے جہاں تک ممکن ہو سکا، قوسین کے ذریعے نمایاں کر دیا گیا ہے تاکہ تشابہ اور القباس کا امکان باقی نہ رہے۔ اس کے علاوہ مضمون کی واقعیت کے اتمام کے لیے ایک فنی رعایت کے ساتھ کچھ تعزیتی پسیناات اور تاریخی قطعات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ میں اس ضمن میں اہل لاشرحضہ حیفہ جالندھری، پروفیسر حامد حسن قادری اور حضرت رئیس امر و ہوی کامنوں ہوں کہ ان بزرگوں نے اس مضمون کے لیے مجھے اپنے رشتہات سے نوازا اور "رعایت خاص" کے استعزاز میں میری مشکل کشائی فرمائی۔ بیجا نہ ہو گا اگر میں یہاں اپنے بزرگ حکیم اسرار احمد کی یوی کا شکریہ بھی ادا کر دوں، جن کی رہ نائی مجھے حاصل رہی۔

مصیبتیں الکرمنہ

نیک تھی۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ میں کبھی بیمار نہیں ہوا اور نہ کبھی میرا سر دکھا۔ کبھی کبھار زکام مبتلا ہوتا ہے۔ اس سے یہ قائم ہے کہ باغ صاف ہوتا ہے۔ اُن کا... پر رعب چہرہ، اُن کی شان اور اُن کا وقار ایسا تھا کہ درحقیقت وہ زیارت کے قابل تھے۔ ان کے اکثر ہم عصر اہم و متبرک لوگ اُن کا بہت احترام اور ادب کرتے تھے اس طرح ملتے تھے جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں یا درحقیقت یہ ہے کہ علاوہ شکل و صورت کے لوگوں پر اُن کے علم و فضل اور قابلیت کا بھی رعب پڑا تھا۔

..... میں نے ذہین و ذکی مشہور تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ اپنے ہمسروں میں ممتاز رہے اور (اعزاز) کے ماتحت بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ تمام طالب علم (سوائے بعض کھنڈروں کے) اور پروفیسر اُنھیں وقت کی نگاہ سے دیکھتے تھے..... خود سرسید مرحوم اُنھیں اُن کی قابلیت کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے۔ مرحوم کی یہ خوش نصیبی تھی کہ اُنھوں نے زمانہ بام (علی گڑھ) ایسے اہل فن اور علمائے نامور سے تلامذہ حاصل کیا جو اس وقت آسمانِ فضل و کمال کے آفتاب و اہتاب تھے مثلاً پروفیسر (آرٹھ) پروفیسر (بیک) پروفیسر (دارین) اور شبلی وغیرہ) جن میں سے ہر ایک اپنے فن میں بیجا تھا۔ علی گڑھ کالج میں اُن سے پہلے اور غالباً اُن کے بعد بھی کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مطالعہ ایسا گہرا، معلومات ایسی وسیع اور جو کام کرنے میں ایسا اُن تک ہو۔..... وہ ہمیشہ علمی معاملات پر گفتگو کرتے..... وہ درحقیقت علی گڑھ کالج کے سپوت تھے۔

یہ بوٹھی عبدالحی کی خوش نصیبی تھی کہ اُن کی والدہ بڑی دانش مند اور نیک سرشت بی بی تھیں اور اُن میں انسانی اخلاق بہت سی خوبیاں تھیں (مولوی عبدالحی) کی زندگی پر اُن کا بڑا اثر تھا۔ جس طرح اُنھیں طالب علمی میں مولانا (شبلی) جیسے بے مثل ریب استاد نے اسی طرح اس کے بعد سرسید اور مولانا مائی جیسے عالی خیال پیشوا بھی نصیب ہوئے۔ ان بزرگوں نے اُن کے خیالات و ادب پر بہت بڑا اثر ڈالا مگر وہ عمر بھر طالب علم ہی رہے۔ مصحبت و وقت اور زمانہ شناسی اُن کے نصیب میں نہ تھی اور جو کبھی نصیب سے اُنھوں نے اس کو چپے میں قدم رکھا تو پیچھے ہی قدم میں بغرض کھائی۔ اس چیز کے لیے کچھ تو فطری مناسبت ہونی چاہیے در کچھ صحبت اور تجربہ، ان میں سے اُن کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ایام طالب علمی و ملازمت میں وہ جہاں کہیں رہے اُنھوں نے اپنے وطنِ منصبی کو ایسی مستعدی و جفاکشی اور دیانت کے ساتھ ادا کیا کہ لوگ قائل ہو گئے اور جب قومی خدمت پر کمر باندھی تو اسے بھی خوش اسلوبی، بے نفسی اور بے ریائی کے ساتھ انجام دیا اور ثابت کر دیا کہ حب وطن اور قومی درد کسی خاص طبقے یا کسی خاص عمر پر موقوف نہیں ہے۔

اُن میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک شریف انسان میں ہونی چاہیے۔ گھر میں اُن کی تربیت والدہ کی زیر نگرانی ہوئی اور یہ ایسی تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اخلاق اور تہذیب کے جو نکتے اس فرزند اور نیک بیوی نے اپنے عمل اور قول سے اُن کے دل میں بٹھادیے تھے وہ عمر بھر نہ بھولے اور اُن پر عامل رہے۔ بڑے ہو کر جو صحبت ملی وہ اس زمانے کے بہترین افراد

تھے۔ اُن میں سے ہر ایک جو ہر قابل تھا۔ اُن کے نام اب تک ہمارے ادب میں عزت سے لیے جاتے ہیں۔ تو یہ سب کچھ بڑی چیز ہے۔ علم سے لگاؤ تھا۔ اہل علم اور اہل باب سُننے کی محبت نے صحیح ذوق پیدا کیا۔ مطالعہ کا شوق پختہ سے تھا۔ علم و ادب کا کھنڈر سنی کا مکہ قدرت نے ودیعت کیا تھا اُن سب کے بل پر انہوں نے وہ کام کیے جو رستی دُنیائے یادگار دہیں گے۔

حائب علی سے فارغ ہونے کے بعد وہ حیدرآباد آئے۔ اگرچہ ابتداء میں وہ معمولی خدمت پر مقرر ہوئے لیکن خداوند کا حائب علی نے اُنہوں نے یہاں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ اس میں شک نہیں کہ جامعہ عثمانیہ کو مولانا فیصلہ و فیصلہ نہیں مل سکتا تھا۔ شاید قدرت کو یہ منظور تھا کہ جس یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو ہے وہاں اردو کا پروفیسر بھی ایسا ہی ہونا چاہیے جو اس کی شان اور عزت کے مناسب ہو۔ اُنہوں نے اس جامعہ کے طلبہ میں جو علمی اور ادبی ذوق پیدا کیا وہ انہیں کامیاب اور بہت بڑا احسان ہے۔ تعلیم اصل مشا ذوق پیدا کرنا ہے اور پھر وہ اپنا رستہ خود نکال لیتا ہے۔

حیدرآباد کی زندگی عجیب و غریب زندگی تھی۔ فکری نہیں کہ یہاں کے اطراف وحوالی کا اثر انسان پر نہ پڑے اور کچھ نہیں تو قابلِ توجہ رہی جو حالتیں میں مروج کی جانشینی اور مستند میں آنسو و مرگ فرق نہ آیا۔ وہ کبھی راست بازی اور دیانت کے راستے سے نہ ہٹے۔ اُن کی زندگی سب سے سادہ اور بے بیہوش تھی دینے ہی تو ایک رہی۔ غالباً مولوی (عبدالحمید) سے بڑھ کر کسی شخص نے نہ لکھا کہ کب لاکھ بے تعلق اور بے رشتہ رہا۔ انجام نہ دیا جو کا۔ وہ رعایت اور جانے اری جانتے ہی نہ تھے۔ معاملات میں وہ بالکل بھول جاتے تھے کہ اُن کا تعلق کسی انسان سے ہے۔ صرف واقعات اُن کے پیشِ نظر رہتے تھے اور انہیں پر سے وہ جو رو رعایت نکال دیتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ راجی حیدرآباد جوان باتوں کے عادی نہیں اُن سے کبھی خوش نہیں ہے۔ لیکن اُٹھند میں حیدرآباد کی زندگی نے ایک غریب سا نفس خوشامد پسندی پیدا کر دیا تھا مگر بے عیب ذات خدا کی ہے کون ہے جس میں کوئی عیب نہیں اور خاص کر یہ خدمت نہ ہو۔ اُن کی زندگی نہایت سادہ اور بے ریاض تھی۔ باوجود جاہ و منصب اور قیام حیدرآباد کے کبھی بھولے سے بھی راحت و عیش کی طرف مائل نہ ہوئے اور ہمیشہ طالبِ علمانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

جب اہل علم میں سے کوئی شخص حیدرآباد میں وارد ہوتا خواہ وہ کہیں کا ہو تو اُن کی یہ بڑی خواہش ہوتی تھی کہ اُن کا مہمان ہو چنانچہ اقامت کو انہوں پر مشہور قوم پرست ترک خاتون خانہ وادیب خانم اور رؤف بیگ، سابق امیر اہلِ ترک (جب حیدرآباد تشریف لائے تو مولوی عبدالحمید حیدرآباد کے مہمان ہوئے۔

کئی پچاس سال جوتے ہیں جب..... آل انڈیا محمدان یوگیشن کانفرنس کے چند مہینے الگ الگ قائم کئے (ترقی اردو) کا صیغہ اُن کے سپرد ہوا۔ اُنہوں نے اپنے اس فرض کو جس مستندی اور قابلیت سے انجام دیا وہ غرضی نہیں ہے۔ کانفرنس کے اُن مہینے تھے اور ان کے بعض سیرازی بھی اُن سے زیادہ نامور نامور لوگ تھے لیکن جیسا (ترقی اردو) کا صیغہ

چکا وہ بات کہ جس کو صیب میں ہوئی۔

(شیخ سرمدی ص ۱۰۷) کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو کے صدر (عبدالحمید) ہی منتخب ہوئے۔ انجمن سے انھیں بڑا شغف اور اس پر ان کا بڑا احسان ہے۔ اس کے لیے انھوں نے جگہ جگہ سے چندے وصول کیے (اور) بلا مبالغہ سُننے، قدے، دیا دودینے میں کبھی دریغ نہیں کیا بلکہ سب کے رستے تھے۔ انجمن پر جب کوئی کٹھن وقت آیا تو وہ اس کے لیے سینہ سپر ہو گئے وہ تو اپنی فائز تھے ایک انجمن تھے!

مرحوم نے حیدر آباد سے ایک ادبی رسالہ (آرٹو) نامی (۱۹۲۱ء) میں جاری کیا تھا جس کے چیف ایڈیٹر مرحوم ہی تھے ساٹھ سال تک (یہ رسالہ) ان کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اس رسالے نے ادبی ذوق کے پھیلاؤ میں بڑا کام کیا۔ اس میں اچھے تنقیدی اور ادبی مضمون نکلتے رہے۔ رسالہ آرٹو سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ (خود) ان کے بعض بہترین مضامین "آرٹو" میں ہی شائع ہوئے (یہ رسالہ ہماری کر کے (انھوں نے) اپنے اندازِ تحریر بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے (مضمون) نویسی کا پایہ بڑا (اس) کے ذریعہ اردو ادب میں انقلاب پیدا کیا (اور) ٹائپ کو رواج دیا۔ لیکن آفوس ہے کہ (یہ رسالہ ان کے انتقال) کے بعد بند ہو گیا۔ ایسے رسالوں اور اخباروں کی اب بھی ضرورت ہے۔

(مرحوم) بحیثیت ایک عام انسان کے ایک عجیب و غریب شخص تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی نسبت رائے قائم کرنے میں لوگوں کو مغالطہ ٹھہرا ہے۔ عموماً ہر شخص دوسرے سے اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق توقع رکھتا ہے اور چونکہ وہ تقریباً ہر شخص سے جدا اور نرالی طبیعت رکھتے تھے اس لیے بہت کم لوگ ایسے تھے جو ان کی صحیح طور سے قدر کر سکتے تھے۔ مثلاً مولوی صاحب مرحوم ایک تو جسامت خاموش طبع تھے اور دوسرے انھیں اپنے وقت کی قدر بہت تھی۔ (وہ) ایک کم سخن..... فلاسفر مزاج کوہ وقار اور عالی خیالی شخص تھے (اور وقت) ایسی بیش بہا شے کہ فضول باتوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہر وقت مٹھا یا غلامی دھڑکیا لکھنے میں مصروف رہتے تھے اور ایسے وقت میں کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے وہ عام طور پر لوگوں سے ملنے سے بہت گھبراتے تھے اور جو لوگ ملنے آتے تھے ان سے صرف کام کی بات کے سوا دوسری بات نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے بہت جلد ملاقات ختم ہو جائے۔ یہی نہیں کہ بات چیت کم کرتے ہوں بلکہ فضول اور زائد باتوں سے انھیں طبعی نفرت تھی اور جو کوئی خواہ مخواہ دیر لگاتا تھا اور نہیں ملتا تھا تو وہ بہت جبر بڑھتے تھے..... اور سوائے بعض ہم مذاق احباب کے کسی سے زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے لیکن چھوٹے بچوں سے بے تکلف باتیں کرتے تھے اور ان سے مزے مزے کے سوالات کرتے اور ان کے سوالوں کے جواب نہایت شرح و بسط اور خوبی کے ساتھ دیتے..... لیکن جب لڑکا سیانا ہو جاتا اور اس میں ادب و تہیز پیدا ہو جاتی تو پھر اُس سے باتیں کرنا چھوڑ دیتے تھے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ چھوٹے بچوں میں جو معمول اپن

ص ۱۱۷ صفحہ ۱۱۷ حکیم امتیاز الدین
ص ۱۲۱ صفحہ ۱۲۱ مولانا حیدر الدین سلیم
ص ۴۰ صفحہ ۴۰ مولوی چراغ علی
ص ۴۲ صفحہ ۴۲ مولوی چراغ علی
ص ۴۴ صفحہ ۴۴ مولوی چراغ علی

ص ۳۹۹ صفحہ ۳۹۹ عبدالرحمن صدیقی
ص ۳۹۲ صفحہ ۳۹۲ مولانا حسرت جعفرانی
ص ۴۴ صفحہ ۴۴ مولوی سید علی جگرانی
ص ۴۰ صفحہ ۴۰ مولوی چراغ علی
ص ۴۲ صفحہ ۴۲ مولوی چراغ علی

ص ۲۰۲ صفحہ ۲۰۲ سر سید اس محمود
ص ۴۴ صفحہ ۴۴ مولوی سید علی جگرانی
ص ۲۸۹ صفحہ ۲۸۹ سر سید احمد خان
ص ۴۲ صفحہ ۴۲ مولوی چراغ علی
ص ۴۰ صفحہ ۴۰ مولوی چراغ علی

خیال کے ظاہر کرنے میں بے تکلفی اور سادگی، نگار میں بے ساختہ پن اور سبکدوشی جو سادگی میں ہی ہے وہ بڑے ہرگز نہیں ہوتے۔
بڑے ہرگز خیال کے ظاہر کرنے میں کچھ تصنع اور کچھ ادب اور لٹاؤ لازم ہوتا ہے۔ پھر وہ مسادات کا خیال بھی نہیں دیکھتا اور وہ
وڈر کی کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باتیں کرتے ہوئے چھوٹے بچے پیارے ہوتے ہیں اور اگر کوئی بتائے والا
ہو تو اس وقت انہیں بہت کچھ کھا سکتا ہے۔

اگرچہ بہت کم باتیں کرتے تھے مگر مسادات میں خوب نگار کرتے تھے لیکن اس میں بھی کوئی غلط فہمی نہ تھی اور غلطی نہیں کرتے تھے
اور ان کا بھوکا کڑا دہن یا ایک دو لفظ سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ صرف کام کے دو ایک لفظ کہہ دیتے تھے جس میں مافی الضمیر
ادا ہو جاتے۔ جب کسی نے میں کچھ بنا دیتے تو گویا ساری تحریر میں جان ڈال دیتے تھے۔ اگرچہ وہ خاموش طبع تھے اور ان میں
حالہ مسامت پائی جاتی تھی لیکن اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں خوب باتیں کرتے تھے جس سے ان کی ذہنی دلی کا
ثبوت ملتا تھا۔

ذہنی دلی ان کی فطرت میں تھی۔ اگرچہ عمر کے ساتھ ساتھ کام کی کثرت روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور نئے نئے حالات اور
واقعات ان پر ہمہ دم کمرے ٹوٹ پڑتے تھے لیکن ان کی ذہنی دلی میں فرق نہ آیا۔ وہ اپنے بعض بے تکلف دوستوں سے بڑی
دلی تھی اور شرمی کی باتیں کرتے تھے بلکہ بھڑوں سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ یہ ذہنی دلی ان کے کٹھن کام میں سہانے کا کام دیتی۔ ان
کے اچھے سے پر (ماہر) ٹیسٹا ہٹ۔ جتنی تھی جیسے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ وہ بچوں میں بچتے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں
بوڑھے تھے۔ غم اور فکر کو پاس نہ آنے دیتے تھے اور ہمیشہ خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے تھے ان سے ملنا اور
باتیں کرنے میں غم غمہ ہوتا تھا اور آخر دم تک ان کی ذہنی دلی ویسی ہی رہی۔ ان کے دوستوں کو ان کی ذہنی دلی خوش طبعی، ان
کے پیٹھے اور ان کے سطر کے عجیب و غریب واقعات ہمیشہ یاد آئیں گے۔ ان کی خرافات، خوش طبعی اور شرمی کے عجیب
اور پیٹھے ایک دو نہیں سیکڑوں ہیں جو انہیں کسی نے جمع نہیں کیے اگر ان کے خرد و جوتہ میں بے شمار تھے ایک سائبرٹ ہر
توالی میں ملتا اور بہت سے خلوتوں کے ان کی خرافات کے پُر لطف پیٹھے بھی ملتے۔ ان کے خرد و جوتہ کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے وہ
اصل خلوت کا حشر عجیب بھی نہیں۔ خرافات دلیل ذہانت ہے اور ذہنی دلی سلامت طبع اور رجائیت کی نشانی ہے۔ یہ کام
کے بارگاہ کو جھکا کہنے میں بہت بڑی مہین اور ایک کثیر الاشعل شخص کے یہ بعض کٹھن منزل کے طے کرنے میں سبک چھاپا کرتے
جس ساجو کو اس بے نظیر شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ہر فن میں خواہ ادب ہو یا فلسفہ یا تاریخ وہ ایسا
ایسی باتیں پکارتے تھے کہ خود اس فن کے ماہر بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ قدرتی نے (مولوی عبدالحق) مرحوم کو بہت
سی خوبیاں صفا کی تھیں۔ وہ بہت ذہانت، خوش بیانی اور فیاضی ان کی ایسی عام اور ممتاز صفات تھیں کہ ایک راہ چلتا بھی

منٹ کی بات بہت ہی معلوم کر لیا تھا۔۔۔۔۔ ان میں پارس پتھر کی خاصیت تھی۔ کوئی برہمن کا جو اُن سے چھو نہیں اور کندہ ہو نہیں! اُن کی باتیں حمایت پر محنت اور مرے کی ہوتی تھیں۔ ان میں ایک جادو ہوتا تھا جو سامعین کے دل پر بے اختیار اثر کرتا تھا اور لوگ گریہ ہو جاتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ عام و خاص ہر فرقے میں مقبول تھے۔ وہ بڑے پُر اثر اور پُر جوش مقرر تھے اور بلا شک و تردید کہتے تھے لیکن تقریر سے زیادہ اُن کی تحریر پُر زور اور شاندار ہوتی تھی۔ چنانچہ اُن کے بعض مضامین اردو انشا پردازی کے بہت عمدہ نمونے تھے۔ اُن کے قلم اور آواز میں بڑا زور تھا۔ اُن کے حکم سے اُن کی طباعی اور ذہانت معلوم ہوتی تھی۔ باتیں مزہ لے لے کر اور ٹیڑھ کر کرتے تھے۔ جلدی اُن کے مزاج میں نہ تھی۔ آواز میں شیرینی اور دل کشی تھی۔ اکثر لوگ جہاں سے ملنے یا کسی مسئلے میں گفتگو کرنے آتے تو ان کی ذہانت اور لیاقت کے قائل ہو جاتے۔

حافظ اُن کا بڑے غضب کا تھا۔ جو چیز ایک نہ پڑھ لی یا نظر سے گزر گئی وہ پتھر کی بھر تھی۔ (وہ) صبح کے نو بجے سے شام کے ۵ بجے تک کھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ اُن کا علم اس قدر وسیع تھا کہ گویا زندہ انسائیکلو پیڈیا تھے۔ اور اس لیے اُن کی باتیں نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز ہوتی تھیں۔ کسی قسم کا مسئلہ اور کسی فن کی بحث اُن کے سامنے پیش کیے وہ کوئی نہ کوئی بات۔۔۔۔۔ مزور نہ جادیتے۔

وہ بڑے ظریف بھی تھے۔ اُن کی خرافات عجیب شان کی خرافات تھی۔ ان کے ایک ایک ٹھٹھول میں وہ مضامین و نکات ہوتے تھے جو عمر بھر کے محاضر اور کتابوں کے کھٹکانے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک چٹکے میں بڑے بڑے مسائل کا فیصلہ کر دیتے تھے۔ اُن کے خاص لفظ اور جگہ جن میں بدلت اور طباعی کی بُرائی جاتی تھی اب تک دلوں میں چبھتے ہیں اُن کا لب لہجہ (اور) اُن کی شیریں بیانی بعض اوقات۔۔۔۔۔ انسان کو پھر کا دیتی تھی۔ اُن کی گفتگو میں جو سحر تھا وہ میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ علاوہ اس کے اُن سے باتیں کرنے میں جو سہج حاصل ہوتا تھا وہ یہ تھا کہ واقعات کے ہر پہلو پر نظر ڈالنی چاہیے۔ وہ ہمیشہ قیاس کا انداز نہ رکھتا تھا۔ رسوم کی پابندی، عادت کی بندھن ہمیشہ بلا ارادہ بھڑکال پر مجبور کرتی ہے اور تقلید اس قدر دھندلا کر دیتی ہے کہ معمولی سے معمولی بات جو عجب عادت ہے نظر نہیں آتی۔ وہ ہر بات میں ایک نیا پہلو دکھاتے جو ہمیں نظر نہیں آتا تھا اور معمولی سے معمولی بات میں وہ شان پیدا کر دیتے تھے جو دوسروں کو نہیں سمجھتی تھی اور یہی مقصد ہے تعلیم و تربیت کا کہ انسان واقعات کے پہلو پر صحت کے ساتھ نظر ڈال سکے اور جو یہ نہیں تو کوئی تعلیم انسان کے مفید نہیں ہو سکتی لیکن افسوس کہ اب ہم اُن کی صحبت سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے مگر وہ ہم میں سے تھے مگر اُن کی باتیں ہم سے نرالی تھیں۔

یادہ جو ہر ہی الگ تھا جو ہر انسان سے یا نکلے تب نہیں ایسے جو ہر کان سے

۲۶ صفحہ ۶۱ مولوی محمد عزیز مرزا
۶ صفحہ ۱۴۶ محسن الملک
۱۵ صفحہ ۴/۵ سید محمود

۲۶ صفحہ ۵۱۳۶: عبدالحی صدیقی
۵ صفحہ ۲۲۱ مرین صاحب
۵ صفحہ ۳۴۳ درویش پروفیسر بی بی

۲۶ صفحہ ۴ سید محمد
۱۸ صفحہ ۱۸۸ مولانا عبدالرحیم سیالپوری
۱۵ صفحہ ۶۰ مولانا سید علی بھگوانی

وہ ہنسے ذکی المس (اور کشتی قدر نازک طبع واقع ہوئے تھے۔ وہ ہنسے خود دار بھی) تھے انہی کی بی بی اس کا کھانا
کے خلاف ہوئی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جس کام کو دیتے تھے اس میں ہر حق ٹھنک جوتا تھے اور چاہتے تھے کہ جو کچھ
ان کی ان میں ہے وہی دوسروں میں بھی ہو لیکن یہ کمال ہوتا ہے خصوصاً ایسے زمانے میں جہاں ہمیں پتہ دوس سے سرحد پڑا ہے۔
ظاہر ہے کہ ایسی ہوئی ہے اور یہ ایسی انہیں پریشان کر دیتی تھی۔ چنانچہ انہیں اکامیوں اور ناکامیوں نے انہیں ایک بار (معدوم
ملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں سے رجوع ہونے پر) مجبور کیا۔

قاضی نے کٹے لائیں میں عجیب و غریب ادوہ تھا۔ کیسا ہی اختلاف بروہا کے ساتھ رہتے تھے جواب دیتے تھے لیکن حجت نہیں
کرتے تھے بعض اوقات اعتراضات اور کٹ جاتی پر (مرد) فائدہ آتا تھا خاص کر جب کسی دوست کی طرف سے مخالفت ہوتی تو انہیں بڑا
صبر رہتا تھا۔ وہ دوست کا اختلاف کو ادا نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں وہ بہت مبالغہ کرتے تھے اور اثر عقل پر جذبات غالب آجاتے تھے
کاردار دنیا میں دوسرے جڑے کام نہیں چلتا یاں جو کچھ بھی سننے پڑتے ہیں زخم بھی کمانے پڑتے ہیں سر بھی دینا پڑتا ہے جو اس کے لیے
تیار نہیں اس کے لیے پیسا ہوتا ہے ہنر سے بدلہ سے اس میدان میں قدم ہی نہیں کھنا چاہیے (لیکن) رٹانے کے اخلاف سے
ذاتی تعلق اور طوفاں میں کسی فرق نہ آتا۔ ان معاملات میں وہ خوب بحث کرتے اور بعض اوقات شدت کے ساتھ لیکن ان کا دل صاف ہوتا
وہ عمر کثیر غنیمتیں برداشت کرنے سے اور (آخر آخر) یہ ان کے لیے معمولی بات ہو گئی تھی۔

وہ شائستگی، فہم، مناسب آرائش، جفاکش، مستقل مزاجی اور اپنے اساتذہ کے بچے تھے۔ کام سے تپا کھاتا تھا اور اسی میں
ان کی حیات تھی۔ بڑے محنت و محنت کے بعد رائے قائم کرتے اور رائے قائم کرنے کے بعد پھر اس سے کبھی نہ ملتے تھے گویا وہ رائے پتھر کی
پھر جوتی تھی۔ آدمی منکر بھی ہوا اور علی بھی ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے۔ (وہ) جو کہتے اور سمجھتے تھے اس پر مائل بھی تھے۔ وہ
جستہ علی مباحثوں میں بڑی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کی دایوں میں خاص بات ہوتی تھی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک ایسے
شخص کے درمیان نتیجہ میں جو غور و فکر کا عادی ہے۔ (لیکن) مروجہ میں ایک بڑا نقشہ تھا کہ بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہلانے سے
جھک جاتے تھے اور ایسی باتیں کر کرتے تھے جو ان کی شان کے شایان نہ ہوتی تھیں۔

قائم محمد پریشان فطرتا لابل اور کام چور ہوتا ہے۔ آرام میں ہم میں کچھ مورد وثیق ہو گئی ہے (لیکن وہ) مستعدیہ تھے کہ
اپنے اپنے جہاں ان کا تہذیب نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جو بیانات ہر وقت کام کے لیے تیار۔ ہونے کے کام کرنے والے تھے۔ تصنیف و تالیف
کام بھی کرتے تھے (ای رباب، اونٹنار و...) کے لیے مسامحہ بھی لکھتے تھے۔ معترضین کے جواب بھی دیتے تھے۔ (اڈو) لالی کے صاحب

۳ صفحہ ۲۴۲ سرسید احمد خاں
۴ ۱۹۸ سرسید احمد خاں
۵ ۲۴۲ سرسید احمد خاں
۶ ۱۵ سرسید احمد خاں
۷ ۲۴۲ سرسید احمد خاں

۸ صفحہ ۲۰۱ سرسید احمد خاں
۹ ۱۶۲ سرسید احمد خاں
۱۰ ۱۵ سرسید احمد خاں
۱۱ ۱۵ سرسید احمد خاں
۱۲ ۲۴۲ سرسید احمد خاں
۱۳ ۲۴۲ سرسید احمد خاں

۱۴ صفحہ ۱۵۰ سرسید احمد خاں
۱۵ ۱۱۱ سرسید احمد خاں
۱۶ ۲۴۲ سرسید احمد خاں
۱۷ ۲۴۲ سرسید احمد خاں
۱۸ ۲۴۲ سرسید احمد خاں
۱۹ ۲۴۲ سرسید احمد خاں

اور جس سے جو تعلق ہو گیا ہے آخر دم تک نبھایا۔..... وہ اُن کے پتے ہر دور اور اُن کی سبھی اور سلامتی کے خواہاں رہے۔
..... وہ دوست کے متعلق میں رشتے اتنے کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا قول تھا کہ اگر ساری دنیا قبضے میں ہو اور
میرے دوست نہ ہو تو دنیا بے اگر ساری دنیا کے بدلے میں ایک دوست ہوتا تو مجھے کچھ بچا ہوتا۔ لیکن اُن کی دوستی آسان
نہ تھی۔ وہ مانگتے تھے دوستوں میں ہالے اور بہت سے دوست پیدا کرنے میں وقت ضائع نہ ہو جائے اور بہت سی فضول اور
بے صرف باتیں کرنا پڑتی ہیں بلکہ دو تین خاندانوں کے اور کسی سے راہ و رسم نہ تھی بلکہ جو جس کے ساتھ محبت تھی غلو میں دل
سے تھی۔

وہ مصیبت کے وقت قائم آتے اور ایسی حالت میں بے طلب مدد کے لیے ہنستے اور جہاں تک امکان ہو تا وہ ہر قسم
کی مدد کرتے۔ اُن کی دوستی پر بسنے لوگوں کی سی دوستی تھی جو دوست کے لیے ہر قسم کی تکلیف برداشت کرتے اور ہر قسم کی قربانی
کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ وہ جس حد دوستی میں پہنچتے تھے اسی طرح نفرت میں بھی شدید تھے۔ یہ نفرت کسی فاقی بنا پر نہ تھی بلکہ جو لوگ
بے اصول ہوتے، ذاتی فائدے کے لیے ایمان بچنے کیلئے تیار ہو جاتے یا قوم سے فدا داری کرتے اُن سے نفرت ہی نہیں انھیں
سخت عداوت ہو جاتی تھی وہ ایسے لوگ کو بھی پس نہیں کرتے تھے جو بقیہ یا گنہگار ہوتے جو کہ وہ خود صاف کرتے اس لیے غیبت کو پس نہیں
کرتے تھے خصوصاً اپنے کسی دوست کے خلاف ایک لفظ بھی گوارا نہ کرتے تھے (وہ خود بھی) دوست کا اختلاف گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ
دوستی پرانے دشمنوں کی دوستی تھی۔ پرانے بزرگ اسی پر مال تھے کچھ بھی کہے یا کچھ بھی کہو وہ ابد کے دوست کا ساتھ دیتے۔
خداوند اور جدت جب طرح سے اُن کے خزانے میں ہوتی ہوئی تھیں۔ تداومت ایسی کہ اچھے چمچے پرانے بزرگ اُن کی گرد
کو نہیں چمکتے تھے اور جدت ایسی کہ نئی رشتہ کے سارے بھی اُن کے گمے مانگتے۔ وہ کسی گمہ کو نہ کسانیں سننے کے بعد
برحسب ذکر کرتے یہ بات اُن میں پائی تنہی کی تھی۔ میں نے ایسے کئی بزرگوں کو دیکھا ہے کہ جب انھوں نے کسی پر اعتماد کر
یا تو پھر کوئی کچھ لکھا کہ وہ ایسی ہی شکایت کہے اُن پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا بلکہ اُن اٹا خفا ہوتے تھے اسی قسم کی مروت (مروہی
عبدالحمید) میں بھی تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے: خاندان مروت نہاں چاہتا اُن کے (ایک پروردہ نور جان) کے معاملہ میں یہی ہوا۔ یہ
شخص (اکھنڈ) کے (ایک) ممتاز خاندان کا تھا۔..... بار بار اُن تک شکایت پہنچی کہ یہ آدمی قابل اعتماد نہیں ہے (کسی
ذریعہ معاش کے باوجود) بڑی شان سے رہتا ہے۔ اُس کی دیانت مشتبہ ہے۔ میں نے بھی اس شخص کو دیکھا تھا۔ وہ فی الحقیقت
رہیوں کی طرح رہتا تھا۔ ان شکایتوں کے جواب میں وہ کہتے کہ شریف زادہ ہے مگر سے خوشحال ہے۔ وہ صاف سُقرا اور
سیٹھے سے رہتا ہے تو لوگ اُس سے جھگڑتے ہیں۔

اُن میں قدیم وضع اور جدید تہذیب کی بعض خوبیاں اس خوش اسلوبی سے باہم ملی ہوئی تھیں کہ اس تضاد نے اُن

لہ روش زندگی میں ایک قسم کا شہس پیدا کر دیا تھا۔ وہ کبھی کبھی مغربی مزاج کے آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن اکثر وہ ٹھیک ہندی تھے۔ ان کی طرز معاشرت پُرانے اور نئے دونوں طبقے کے لوگوں کے لیے قابل تقلید نہ تھی۔

وہ اگرچہ کبھی کبھی رنجیدہ ہو جاتے تھے لیکن یہ عارضی صورت ہوتی تھی کچھ دنوں کے بعد یہ کدورت دل سے محو ہو جاتی درویشی ہی خلوص اور محبت سے ملنے جیسے پہلے بڑھ کر تے تھے۔ کبھی دل میں کینہ یا بغض نہیں رکھتے تھے۔ ان کا فیض عام تھا۔ دست و دشمن بلا امتیاز اس سے مستحق ہوتے تھے۔ انتقام کا کبھی خیال نہ کیا بلکہ جن لوگوں نے ان سے بُرائی کی انہوں نے اس کا بدلہ بیشہ بھلائی سے دیا اور بیسیوں مثالیں ہمارے سامنے ایسی موجود ہیں کہ دوستوں سے بڑھ کر انہوں نے دشمنوں کو نوازا۔ حقیقت یہ ہے کہ (مجموعی طور پر) ان کو دوست بھی ایسے ملے تھے کہ ان پر جان چھڑستے تھے اور یہ ان کی بڑی خوش نصیبی تھی۔ یہ سب (مولوی عبدالحق) کے خلوص، سچائی، راست بازی اور محبت کا اثر تھا۔ اس جان لیوا بیماری میں (ان کے رفیق حکیم امرا احمد کروی) ان کے نیاز مند متین الرحمن مرقضی اور ان کے ملازم (بنارس خاں) نے جیسی خدمت کی نہ جو رو کر سکتی تھی نہ مسند نہ کر سکتا تھا (یہ) ان کی خلگی، ورستی اور چڑچڑے پن کو ہنس ہنس کے مٹا کر دیتے تھے اور انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔

(مولوی صاحب کو) عامیاد خیالات سے بہت پڑ (اور) جھوٹ سے سخت نفرت تھی۔ جھوٹے کو کبھی مٹ نہ نہیں لگاتے تھے ہمارے شرفاً مروت میں اگر یا تا لیب غلوب کی خاطر یا اس خیال سے کہ دل شکنی نہ ہو چکے کو چھپاتے یا جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں یا ایسے کام کی حامی بھر لیتے ہیں جو وہ نہیں کر سکتے یا ان کا کرنا ان کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اس کا قہر کذب یا پیشانی ہوتا ہے (مولوی عبدالحق) کا مسلک بالکل صاف تھا جب وہ کسی کام کو نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے یا اسے اپنے اصل اور وصدا ری کے خلاف سمجھتے تھے تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ وہ راست گفتاری اور صاف گوئی میں نیک نام نہیں بنام تھے۔ انہوں نے اپنے خیالات کو کبھی نہیں چھپایا۔ جو دل میں تھا وہی ان کی زبان اور قلم پر تھا۔ کبھی اس کی پروا نہیں کہ اس سے ان کی ذات کو نقصان پہنچے گا۔ ان کی زندگی میں اکثر ایسے موقعے آئے جب ان کے خیر اندیش اور شخص دوستوں نے ان کو کسی فعل سے باز رہنے کی صلاح دی اور دنیاوی اعتبار سے معاملے کی ادنیٰ نیچ سمجھائی لیکن انہوں نے وہی کیا جو ان کے ضمیر نے کہا اور ہمیشہ کمال اخلاقی جرات سے کام لیا۔ بے ریائی اور صداقت عمر بھر ان کا شعار رہا۔

مصوحت کا داغ ان کے دامن پر نہ تھا جو جی میں آتا کہ بیٹھنے اور چاہتے کر گزرتے تھے جہاں کسی نے غلطی کی ٹوک دیتے تھے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کا عمل و موقع بھی ہے یا نہیں یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف نہ تھے ان کی باتوں

۲۴ صفحہ ۶۴ مولوی محمد عزیز مرزا
۲۵ صفحہ ۲۴۰ سرستید احمد خاں
۲۶ صفحہ ۴۱۵ ذاب محمد الملک
۲۷ صفحہ ۱۱۹ مولانا وحید الدین سلیم

۲۸ صفحہ ۶۲ مولوی محمد عزیز مرزا
۲۹ صفحہ ۶۴
۳۰ صفحہ ۴۰ ذاب محمد الملک
۳۱ صفحہ ۲۳۷ سرستید احمد خاں

۳۲ صفحہ ۲۰۴ سرستید اس مسود
۳۳ صفحہ ۳۹۰ ذاب محمد الملک
۳۴ صفحہ ۲۶۶ ذاب محمد الملک
۳۵ صفحہ ۴۰ ذاب محمد الملک

ایسے دوستوں کی مصیبت اور تباہی سے بچا یا جو شاید اس کے متفق نہ تھے۔ حاجت مندوں کی حاجت روا کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیتے تھے۔..... (اور) اپنے پرانے خصوصاً مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے بہتے تھے۔ سفارشیں کر کے لوگوں کے کام نکالتے تھے۔ اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ (انھوں نے) غریبوں اور مستحقوں اور مملوک الحال شرفا کی ہمیشہ مدد کی۔ اکثر اس طرح دیتے تھے جس پر یہ قول صادق آتا ہے کہ وہ بننے ہاتھ سے یوں دے کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ مولائی صاحب مرحوم اپنے دوستوں اور عزیز واقربا سے بھی سلوک کرتے تھے لیکن کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ روپے پیسے کی بالکل محبت نہیں تھی، بہت سیر چشم اور عالی ظرف واقع ہوئے تھے۔ جب روپیہ ان کے پاس آتا تو اس کے دینے میں وہ بڑی فیاضی سے کام لیتے تھے، اگرچہ اکثر اس سے کوئی منتق ہوئے تھے جو چالاک یا پلٹے پڑے ہوتے اور بیٹی و جے کہ ان کے پاس کبھی روپیہ جمع نہ ہوا اور خالی ہاتھ اس دنیا سے کوچ کیا۔ مرحوم کی عادت تھی کہ جب کوئی شخص علی کام یا تجارت کے لیے روپیہ طلب کرتا تو حتی الامکان بڑی خوشی سے اس کی مدد کرتے تھے۔ مرحوم بہت بامروت (بھی) تھے اگر کوئی شخص ان سے کسی قسم کی درخواست کرتا اور وہ اسے پوری نہ کر سکتے تو خاموش ہو رہتے مگر جب دوسری بار پھر آتا تو اس شرمندگی میں سب سے مقدم اس کا خیال کرتے اور حتی الامکان اس کی مقصد براری میں کوشش کرتے۔

مرحوم اپنے دوستوں کو مدد دینے اور ان کے کام نکالنے میں بڑے بہادر تھے اور اس میں وہ کسی قسم کی رکاوٹ یا مشکل کی پروا نہیں کرتے تھے (اس) کے لیے ہر وقت مستعد ہوتے تھے اور بعض اوقات دیرانہ کام کر گزرتے تھے۔ بکیوں اور دامادوں کا سہارا اور مایوسوں کی آس تھے نہایت بے تعصب اور روشن خیال مسلمان تھے اور اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ اس زمانہ قوم کی دشگیری کو نافرمانی ہے۔ لڑا جھگڑ کر خوشامد سے، چا پوسی سے، غرض ہر طرح کام نکال لیتے تھے۔ اس طرح انھوں نے سینکڑوں آدمیوں کو فائدہ پہنچایا۔ اپنا کام نکال لینے کا بھی خوب ڈھب یاد تھا۔ دوسروں سے کام لینے کا نہیں بڑا اپنا سلیقہ تھا۔ وہ کچھ ایسے مہر آمیز طریقے سے کہتے تھے اور اس طرح بہت افزائی کرتے تھے کہ لوگ خوشی خوشی ان کا کام کرتے تھے۔ اپنے ملازموں اور ماتحتوں سے بھی ان کا حسن سلوک ایسا تھا کہ وہ ان کی فرمائش کی تعمیل ویسی تنہا ہی اور شوق سے کرتے تھے جیسے ان کا کوئی ذاتی کام ہو اور وقت پر جان ملا دیتے تھے۔ کام کرنے والوں کی تدر بھی کرتے تھے اور انھیں فائدہ پہنچانے کی تاک میں رہتے تھے اور بے دھڑک فائدہ پہنچاتے تھے وہ اپنے دوستوں سے بھی خوب پھسلا کر کام لیتے تھے۔ وہ اپنے دفتر کے ملازموں پر بچ کے نوکروں سے بڑی شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کرتے تھے۔ کبھی سختی یا درشتی سے پیش نہیں آتے تھے اور ان کے عیوب سے چشم پوشی کرتے تھے۔ وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ ملازموں کے ساتھ بڑا برتاؤ کیا

۲۲ صفحہ ۲۲ مولوی چراغ علی
۲۳ صفحہ ۹۰ مولوی سید علی بکراہی
۲۴ صفحہ ۱۰۵
۲۵ صفحہ ۲۰۱ سر سید راس مسعود

۲۶ صفحہ ۲۷۷ سر سید احمد خاں
۲۷ صفحہ ۹۴ مولوی محمد عزیز مرزا
۲۸ صفحہ ۹۰ مولوی سید علی بکراہی
۲۹ صفحہ ۱۷۴ محمد حسن اللہ
۳۰ صفحہ ۲۶۱ سر سید راس مسعود

۳۱ صفحہ ۱۶۲ حالی
۳۲ صفحہ ۱۰۰ مولوی سید علی بکراہی
۳۳ صفحہ ۲۰۵
۳۴ صفحہ ۲۰۱ سر سید راس مسعود
۳۵ صفحہ ۲۲۱

جائے۔ نوکروں کی ارسپٹ اور بد زبانی کو منہایت ملکہ و فضل اور بد اخلاقی کہتے تھے۔ نوکروں پر کبھی سختی نہیں کرتے تھے نہ کبھی کبھی
 معاملے میں ان سے باز پرس کرتے اور نہ کبھی کوئی سخت کلام کرتے۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ کسی نوکر نے ان کی کوئی عزیز یا بیش قیمت
 چیز کو ڈکالی، خطا ہو کر وہ کلام انھوں نے پوچھا ہم نہیں کہیں کہ کوئی اور کس نے توڑی۔
 آدمی کے پہچانے میں انھیں خاص ملکہ تھا۔ تھوڑی سی لطافت اور بات چیت میں آدمی کو پوری طرح جانپ سیتے تھے۔
 ان کے ہنسنے والے ہنس اور بچلے ہر قسم کے آدمی تھے۔ دنیاویوں ہی کے لیے نہیں اس میں بدوں کا بھی حصہ ہے اور شاید دنیا کا
 بہت سی مدنی انھیں کے دم سے ہے۔ وہ دونوں سے کام لیتے تھے۔

ادب و عزم کی چال و حال وہ ان کی ہیئت، ان کی طرز معاشرت، ان کا برتاؤ سب نزلے تھے۔ وہ اپنے فن
 میں اکمال تھے۔ وہ فریبوں کے غمخوار اور دوستوں کے ہمدرد تھے۔ انھوں نے ایک ایسی ذات سے خالی ہو گیا
 جس کی نظیر اب نہیں ہے۔ لوگ انھیں بہت یاد کریں گے۔ احباب کے بلے ان کے بغیر سونے ہوں گے اور سب سے زیادہ ان کے
 غریب دوست ان کا نام کریں گے۔

انگلیا میں جہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی فتنہ رہا۔ بنا ہے اور ایک بھڑے سے نباتات نہیں مٹی کہ دوسرا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے۔
 وہ اسی طرح رہے جیسے طرفاں موی خیز میں لٹ (اوس)۔ وہ اپنے تمام سرکاری نیز (ذاتی) امور میں ہر قسم کے
 تعصبات سے بری تھے (اور) سب جھگڑوں کو فضول اور سچ سمجھتے تھے ان کی توجہ اور ان کا دل انھیں اور نکاح
 پاک میں باتوں میں بندشوں میں بے لگاؤ

رہتے ہیں دنیا میں نیلے درمیان کے ایک

بے تعصبی کا دامن ان ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جہاں کی جمیعت میں انصاف ہوتا ہے۔ ان کے احباب میں ہندو اور
 عیسائی بھی تھے اور ان سے ان کا برتاؤ ایسے ہی عفو اور محبت کا تھا جیسا مسلمان دوستوں سے۔ انھوں نے کبھی کوئی ایسی بات
 نہ کہی جس سے دوسرے مذہب والوں کی دل آزاری ہو۔ اگرچہ بعض معاملات میں انھیں ہندو سرگروہوں سے اختلاف تھا
 لیکن اس اختلاف کا اثر کبھی ان کے اخلاق یا برتاؤ پر نہیں پڑا۔ کسی مذہب و ملت سے انھیں خصوصیت یا پر غاش نہ تھی یہاں تک
 کہ وہ اسلامی فرقوں میں سے کسی سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے ان کے گھلوں میں انٹر ماس اسلام کا ذکر کرنے تھے اور
 انھوں کیا کرتے تھے کہ لوگ اصول سے زیادہ فروع پر زور دیتے ہیں اور توہمات کو مذہب سمجھ رکھا ہے۔

شیخہ سنی کے جھگڑے کے متعلق ان کی رائے یہ تھی کہ یہ پویشیں جھگڑا ہے (وہ ان کے اپنے فنی حکم اسرار احمد کو ہی سے)
 ایک ہر قسم عالم کی کتاب (کا ذکر کرتے تھے) جس میں اُس نے اس پر نوب بحث کی ہے۔ مرمع کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ

۱۔ سوز و غم تبارک و تعالیٰ
 ۲۔ سوز و غم تبارک و تعالیٰ
 ۳۔ سوز و غم تبارک و تعالیٰ

۱۔ سوز و غم تبارک و تعالیٰ
 ۲۔ سوز و غم تبارک و تعالیٰ
 ۳۔ سوز و غم تبارک و تعالیٰ

۱۔ سوز و غم تبارک و تعالیٰ
 ۲۔ سوز و غم تبارک و تعالیٰ
 ۳۔ سوز و غم تبارک و تعالیٰ

ہر دو میں (کرائیں) لیکن انوس یہ خیال عمل میں نہ آیا۔ مرحوم صبح بخاری کے بڑے مداح اور تہجد دان تھے اور کہتے تھے کہ عربی زبان سیکھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ مرحوم مولوی نذیر احمد کے ترجمہ قرآن کو (بھی) بہت پسند کرتے تھے۔
 مگر پھر مرحوم تعصب سے بری اور مشرب وسیع رکھتے تھے لیکن غیرت و محبت قومی ان میں مزور نہ تھی اور اسلام و باطنی اسلام پر دل سے یقین رکھتے تھے۔ مگر مولویوں کی جاہلانہ اور متعصبانہ باتوں سے سخت ناراض ہوتے تھے۔ وہ اس اسلام کو جس کی تعلیم قرآن نے دی ہے حتمی مذہب خیال کرتے تھے باقی تمام تفریقوں کو فضول اور پتھر سمجھتے تھے۔ مرحوم ہندوستان کے مروجہ پرستے کو بہت برا سمجھتے تھے نیز ان لوگوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو تعدد زوجات کے حامی ہیں۔

(مرحوم) طالب علموں اور اہل علم کا بہت خیال کرتے تھے اور خواہ ان کی دنیاوی حیثیت کیسی ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو اور وہ کیسے ہی پچھلے عمل میں کیوں نہ ہوں ان سے بڑی عزت اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور جائزہ دینے میں کبھی دریغ نہ کیا کرتے تھے، ان کی صحبت سے خوش ہوتے تھے۔ وہ اپنی علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور ایسے اشخاص پر جس میں طالب علمانہ جستجو اور صیح ذوق ہوتا بہت مہربان ہوتے اور ان کے لیے جو بھی ممکن ہوتا کرنے کو تیار ہو جاتے۔ اور جب ان کے علم میں آجاتا کہ فلاں عالم کوئی مفید علمی کام کر رہا ہے تو سفارش کر کے حکومت سے امداد دلانے میں دریغ نہ کرتے (اور اسی لیے) ان کی مجلس میں عموماً علمی چرچے رہتے تھے۔ انوس کہ اب کوئی بگاری نہ رہی جاں ایسی صحبت کا لطف حاصل ہو سکے۔ جب کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ یوں تو عام طور پر اور ہم لوگوں میں خاص کر یہ بڑا عیب ہے کہ اپنے لوگ ہم عمروں کے لال کی داد دینے میں بڑا انجھل کرتے ہیں لیکن مرحوم اس میں بڑے فیاض تھے۔ وہ صرف اہل علم کی قدر و منزلت نہ کرتے تھے بلکہ ان کے کام کو بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ تہجد دان کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گزری تو فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے۔

(مرحوم) جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں ہندو دور بھر کوشش کرتے رہے لیکن آخر عمر میں ہمارے کالجوں کے طلبہ کو دیکھ کر انھیں کسی فتنہ راوی سی ہونے لگی تھی۔ (انہیں) اکثر یہ خیال رہتا تھا کہ تحصیل علم کے لیے سہولتیں پیدا کی جائیں۔ غلبہ میں وہ خاص طور پر مقبول تھے۔ طالب علموں سے انھیں دلی ہمدردی تھی اور طرح طرح سے ان کی مدد کرتے تھے وہ اپنی جیب سے سناوار طلبہ کو وظیفہ دیتے تھے۔ سفارشیں کرتے تھے، نوکریاں دلاتے تھے، ان کی مشکلوں میں کام آتے تھے، جائزہ معاملات میں ان کی حمایت کرتے تھے، ان کے وقار کو اپنا وقار اور ان کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے تھے۔ نام و نمود کی خاطر یا ماننے کی غرض سے نہیں بلکہ وہ ان کے پتے خیر اندیش اور پی خواہ تھے اور

۲۸ صفحہ ۹۸ مولوی سید علی بگڑی
 ۲۹ صفحہ ۱۰۰
 ۳۰ صفحہ ۱۰۱
 ۳۱ صفحہ ۱۰۲
 ۳۲ صفحہ ۱۰۳
 ۳۳ صفحہ ۱۰۴
 ۳۴ صفحہ ۱۰۵
 ۳۵ صفحہ ۱۰۶

۳۶ صفحہ ۱۰۷
 ۳۷ صفحہ ۱۰۸
 ۳۸ صفحہ ۱۰۹
 ۳۹ صفحہ ۱۱۰
 ۴۰ صفحہ ۱۱۱
 ۴۱ صفحہ ۱۱۲
 ۴۲ صفحہ ۱۱۳
 ۴۳ صفحہ ۱۱۴

۴۴ صفحہ ۱۱۵
 ۴۵ صفحہ ۱۱۶
 ۴۶ صفحہ ۱۱۷
 ۴۷ صفحہ ۱۱۸
 ۴۸ صفحہ ۱۱۹
 ۴۹ صفحہ ۱۲۰
 ۵۰ صفحہ ۱۲۱
 ۵۱ صفحہ ۱۲۲

بہ بھی ان سے دوسری محبت کہتے تھے اور ان کی سعادت سزاۃ اعامت کہتے تھے۔

(امروں جلد اولیٰ) کا اصل ذوق علمی و ادبی تھا۔ ان کا مطالعہ غالباً علمی سے لے کر آخر تک ہلدی رہا۔ مطالعے میں بے حد شغف تھا۔ گویا ان کا اور حاکم کا تھا..... تین چار گھنٹے سونے میں اور ایک آدھ گھنٹہ ہواغوری میں قربان کر دیتا تھا اور نہ باقی تمام وقت کام میں اور خاص کر مطالعہ کتب اور تالیف و تصنیف میں صرف ہوتا۔ تحقیق و تنقید کی پیشک بھی وہ جس مضمون کا خیال کرتے اس کی تہ تک پہنچتے اور اس کے مادہ و طبع کے سراغ میں پہنچتے اور ڈال ڈال کر پھرتے اور پانی آلی آب کی خبر لاتے۔ اپنی کتاب (ایضاح) کے واسطے سالانہ جمع کرنے کے لیے کتابوں کے دفتر چھان ڈالتے۔ اور ٹوکوں کو بھی کر دیر تحانات سے ایاب کتابیں تلاش کر کر جم پہنچاتے..... اور بعض اوقات ایسے ایسے مقامات سے خوش چینی کرتے جہاں دوسروں کا خیال بھی نہ پہنچتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس مضمون پر انھوں نے قلم اٹھایا دوسروں کے لیے بہت کم تلاش چھوڑی ہے۔ ان کی تصانیف پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا اور وہ افراجم کرنے کے لیے انھوں نے کس قدر محنت اور مشقت اٹھائی ہے۔ وہ قدامت پرست نہ تھے بلکہ انھوں نے بہت سی پرانی رسوم کو ترک چھوڑنے کو دیا۔ ہر بات کو تحقیق اور عمل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے جو اس میں پوری آزادی اور آزادی تھی۔ تنقید کے اہل قلم تھے۔ جدت اور نئی روشنی کے حامی تھے۔ وقار اور عزائم ان پر قائم تھی۔ استقلال میں پھر تھے۔ آزاد خیالی ایسے تھے کہ ان بات نے انھیں میں بھی نہ چوکتے۔ مطالعہ اور تحقیق میں اپنا گمان نہ دیتے تھے۔

وہ علمی قدر کرتے تھے..... انھیں بھی طالب علم تھے اور انھوں نے اس مرتبہ پر پہنچنے کے ان کے مزاج میں طالب علمانہ سا دلچسپی اور ادبی علمی انگڑیاں ان کا دل و غماز میں اسی سیاسی ہوتا تھا جیسے ایک طالب علم سے ہوتا ہے۔ اس وقت وہ فرقہ واریت کا اصل خیال نہیں کرتے تھے۔

مذہب کو کتابوں کا حصہ نہ دیتے تھے۔ ان کا وجود کتابوں کی فہم میں رہتے تھے۔ علمی کتاب کی دوسری چیزوں کی طرح کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی۔ یہ قدر وانی بہت کم ہے۔ انھوں نے سو دہائیوں میں ان کی کتاب ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور اس کا پتہ دانا اور بھر دانا ہے۔ امروں جلد اولیٰ کتاب کے پڑھنے اور اس قدر وانی کا تجربہ تھا کہ جب کوئی ایسی کتاب آگئی تو یہ چیز نہ چھوڑتے اور نہ ہی قیمت دیتے۔ دنیا پر انھوں نے ایک نہایت عمدہ کتب خانہ چھوڑا ہے جس میں کتابوں کی قدر وانی سے کہیں زیادہ قدر وانی ہے۔ اور نہ ہی ان کا وجود ہے اور تمام ہندوستان میں کیسی دوسری جگہ ایسی جگہ نہ ملے گی۔ اس میں بہت کم ایسی کتابیں ہیں جن پر ان کے نشان یا نوٹ نہ ہوں۔

۱۲ صوفیہ	۱۳ صوفیہ	۱۴ صوفیہ
۱۵ صوفیہ	۱۶ صوفیہ	۱۷ صوفیہ
۱۸ صوفیہ	۱۹ صوفیہ	۲۰ صوفیہ
۲۱ صوفیہ	۲۲ صوفیہ	۲۳ صوفیہ
۲۴ صوفیہ	۲۵ صوفیہ	۲۶ صوفیہ
۲۷ صوفیہ	۲۸ صوفیہ	۲۹ صوفیہ
۳۰ صوفیہ	۳۱ صوفیہ	۳۲ صوفیہ
۳۳ صوفیہ	۳۴ صوفیہ	۳۵ صوفیہ
۳۶ صوفیہ	۳۷ صوفیہ	۳۸ صوفیہ
۳۹ صوفیہ	۴۰ صوفیہ	۴۱ صوفیہ
۴۲ صوفیہ	۴۳ صوفیہ	۴۴ صوفیہ
۴۵ صوفیہ	۴۶ صوفیہ	۴۷ صوفیہ
۴۸ صوفیہ	۴۹ صوفیہ	۵۰ صوفیہ
۵۱ صوفیہ	۵۲ صوفیہ	۵۳ صوفیہ
۵۴ صوفیہ	۵۵ صوفیہ	۵۶ صوفیہ
۵۷ صوفیہ	۵۸ صوفیہ	۵۹ صوفیہ
۶۰ صوفیہ	۶۱ صوفیہ	۶۲ صوفیہ
۶۳ صوفیہ	۶۴ صوفیہ	۶۵ صوفیہ
۶۶ صوفیہ	۶۷ صوفیہ	۶۸ صوفیہ
۶۹ صوفیہ	۷۰ صوفیہ	۷۱ صوفیہ
۷۲ صوفیہ	۷۳ صوفیہ	۷۴ صوفیہ
۷۵ صوفیہ	۷۶ صوفیہ	۷۷ صوفیہ
۷۸ صوفیہ	۷۹ صوفیہ	۸۰ صوفیہ
۸۱ صوفیہ	۸۲ صوفیہ	۸۳ صوفیہ
۸۴ صوفیہ	۸۵ صوفیہ	۸۶ صوفیہ
۸۷ صوفیہ	۸۸ صوفیہ	۸۹ صوفیہ
۹۰ صوفیہ	۹۱ صوفیہ	۹۲ صوفیہ
۹۳ صوفیہ	۹۴ صوفیہ	۹۵ صوفیہ
۹۶ صوفیہ	۹۷ صوفیہ	۹۸ صوفیہ
۹۹ صوفیہ	۱۰۰ صوفیہ	۱۰۱ صوفیہ
۱۰۲ صوفیہ	۱۰۳ صوفیہ	۱۰۴ صوفیہ
۱۰۵ صوفیہ	۱۰۶ صوفیہ	۱۰۷ صوفیہ
۱۰۸ صوفیہ	۱۰۹ صوفیہ	۱۱۰ صوفیہ
۱۱۱ صوفیہ	۱۱۲ صوفیہ	۱۱۳ صوفیہ
۱۱۴ صوفیہ	۱۱۵ صوفیہ	۱۱۶ صوفیہ
۱۱۷ صوفیہ	۱۱۸ صوفیہ	۱۱۹ صوفیہ
۱۲۰ صوفیہ	۱۲۱ صوفیہ	۱۲۲ صوفیہ
۱۲۳ صوفیہ	۱۲۴ صوفیہ	۱۲۵ صوفیہ
۱۲۶ صوفیہ	۱۲۷ صوفیہ	۱۲۸ صوفیہ
۱۲۹ صوفیہ	۱۳۰ صوفیہ	۱۳۱ صوفیہ
۱۳۲ صوفیہ	۱۳۳ صوفیہ	۱۳۴ صوفیہ
۱۳۷ صوفیہ	۱۳۸ صوفیہ	۱۳۹ صوفیہ
۱۴۰ صوفیہ	۱۴۱ صوفیہ	۱۴۲ صوفیہ
۱۴۳ صوفیہ	۱۴۴ صوفیہ	۱۴۵ صوفیہ
۱۴۶ صوفیہ	۱۴۷ صوفیہ	۱۴۸ صوفیہ
۱۴۹ صوفیہ	۱۵۰ صوفیہ	۱۵۱ صوفیہ
۱۵۲ صوفیہ	۱۵۳ صوفیہ	۱۵۴ صوفیہ
۱۵۷ صوفیہ	۱۵۸ صوفیہ	۱۵۹ صوفیہ
۱۶۰ صوفیہ	۱۶۱ صوفیہ	۱۶۲ صوفیہ
۱۶۳ صوفیہ	۱۶۴ صوفیہ	۱۶۵ صوفیہ
۱۶۶ صوفیہ	۱۶۷ صوفیہ	۱۶۸ صوفیہ
۱۶۹ صوفیہ	۱۷۰ صوفیہ	۱۷۱ صوفیہ
۱۷۲ صوفیہ	۱۷۳ صوفیہ	۱۷۴ صوفیہ
۱۷۷ صوفیہ	۱۷۸ صوفیہ	۱۷۹ صوفیہ
۱۸۰ صوفیہ	۱۸۱ صوفیہ	۱۸۲ صوفیہ
۱۸۳ صوفیہ	۱۸۴ صوفیہ	۱۸۵ صوفیہ
۱۸۶ صوفیہ	۱۸۷ صوفیہ	۱۸۸ صوفیہ
۱۸۹ صوفیہ	۱۹۰ صوفیہ	۱۹۱ صوفیہ
۱۹۲ صوفیہ	۱۹۳ صوفیہ	۱۹۴ صوفیہ
۱۹۷ صوفیہ	۱۹۸ صوفیہ	۱۹۹ صوفیہ
۲۰۰ صوفیہ	۲۰۱ صوفیہ	۲۰۲ صوفیہ
۲۰۳ صوفیہ	۲۰۴ صوفیہ	۲۰۵ صوفیہ
۲۰۶ صوفیہ	۲۰۷ صوفیہ	۲۰۸ صوفیہ
۲۰۹ صوفیہ	۲۱۰ صوفیہ	۲۱۱ صوفیہ
۲۱۲ صوفیہ	۲۱۳ صوفیہ	۲۱۴ صوفیہ
۲۱۷ صوفیہ	۲۱۸ صوفیہ	۲۱۹ صوفیہ
۲۲۰ صوفیہ	۲۲۱ صوفیہ	۲۲۲ صوفیہ
۲۲۳ صوفیہ	۲۲۴ صوفیہ	۲۲۵ صوفیہ
۲۲۶ صوفیہ	۲۲۷ صوفیہ	۲۲۸ صوفیہ
۲۲۹ صوفیہ	۲۳۰ صوفیہ	۲۳۱ صوفیہ
۲۳۲ صوفیہ	۲۳۳ صوفیہ	۲۳۴ صوفیہ
۲۳۷ صوفیہ	۲۳۸ صوفیہ	۲۳۹ صوفیہ
۲۴۰ صوفیہ	۲۴۱ صوفیہ	۲۴۲ صوفیہ
۲۴۳ صوفیہ	۲۴۴ صوفیہ	۲۴۵ صوفیہ
۲۴۶ صوفیہ	۲۴۷ صوفیہ	۲۴۸ صوفیہ
۲۴۹ صوفیہ	۲۵۰ صوفیہ	۲۵۱ صوفیہ
۲۵۲ صوفیہ	۲۵۳ صوفیہ	۲۵۴ صوفیہ
۲۵۷ صوفیہ	۲۵۸ صوفیہ	۲۵۹ صوفیہ
۲۶۰ صوفیہ	۲۶۱ صوفیہ	۲۶۲ صوفیہ
۲۶۳ صوفیہ	۲۶۴ صوفیہ	۲۶۵ صوفیہ
۲۶۶ صوفیہ	۲۶۷ صوفیہ	۲۶۸ صوفیہ
۲۶۹ صوفیہ	۲۷۰ صوفیہ	۲۷۱ صوفیہ
۲۷۲ صوفیہ	۲۷۳ صوفیہ	۲۷۴ صوفیہ
۲۷۷ صوفیہ	۲۷۸ صوفیہ	۲۷۹ صوفیہ
۲۸۰ صوفیہ	۲۸۱ صوفیہ	۲۸۲ صوفیہ
۲۸۳ صوفیہ	۲۸۴ صوفیہ	۲۸۵ صوفیہ
۲۸۶ صوفیہ	۲۸۷ صوفیہ	۲۸۸ صوفیہ
۲۸۹ صوفیہ	۲۹۰ صوفیہ	۲۹۱ صوفیہ
۲۹۲ صوفیہ	۲۹۳ صوفیہ	۲۹۴ صوفیہ
۲۹۷ صوفیہ	۲۹۸ صوفیہ	۲۹۹ صوفیہ
۳۰۰ صوفیہ	۳۰۱ صوفیہ	۳۰۲ صوفیہ
۳۰۳ صوفیہ	۳۰۴ صوفیہ	۳۰۵ صوفیہ
۳۰۶ صوفیہ	۳۰۷ صوفیہ	۳۰۸ صوفیہ
۳۰۹ صوفیہ	۳۱۰ صوفیہ	۳۱۱ صوفیہ
۳۱۲ صوفیہ	۳۱۳ صوفیہ	۳۱۴ صوفیہ
۳۱۷ صوفیہ	۳۱۸ صوفیہ	۳۱۹ صوفیہ
۳۲۰ صوفیہ	۳۲۱ صوفیہ	۳۲۲ صوفیہ
۳۲۳ صوفیہ	۳۲۴ صوفیہ	۳۲۵ صوفیہ
۳۲۶ صوفیہ	۳۲۷ صوفیہ	۳۲۸ صوفیہ
۳۲۹ صوفیہ	۳۳۰ صوفیہ	۳۳۱ صوفیہ
۳۳۲ صوفیہ	۳۳۳ صوفیہ	۳۳۴ صوفیہ
۳۳۷ صوفیہ	۳۳۸ صوفیہ	۳۳۹ صوفیہ
۳۴۰ صوفیہ	۳۴۱ صوفیہ	۳۴۲ صوفیہ
۳۴۳ صوفیہ	۳۴۴ صوفیہ	۳۴۵ صوفیہ
۳۴۶ صوفیہ	۳۴۷ صوفیہ	۳۴۸ صوفیہ
۳۴۹ صوفیہ	۳۵۰ صوفیہ	۳۵۱ صوفیہ
۳۵۲ صوفیہ	۳۵۳ صوفیہ	۳۵۴ صوفیہ
۳۵۷ صوفیہ	۳۵۸ صوفیہ	۳۵۹ صوفیہ
۳۶۰ صوفیہ	۳۶۱ صوفیہ	۳۶۲ صوفیہ
۳۶۳ صوفیہ	۳۶۴ صوفیہ	۳۶۵ صوفیہ
۳۶۶ صوفیہ	۳۶۷ صوفیہ	۳۶۸ صوفیہ
۳۶۹ صوفیہ	۳۷۰ صوفیہ	۳۷۱ صوفیہ
۳۷۲ صوفیہ	۳۷۳ صوفیہ	۳۷۴ صوفیہ
۳۷۷ صوفیہ	۳۷۸ صوفیہ	۳۷۹ صوفیہ
۳۸۰ صوفیہ	۳۸۱ صوفیہ	۳۸۲ صوفیہ
۳۸۳ صوفیہ	۳۸۴ صوفیہ	۳۸۵ صوفیہ
۳۸۶ صوفیہ	۳۸۷ صوفیہ	۳۸۸ صوفیہ
۳۸۹ صوفیہ	۳۹۰ صوفیہ	۳۹۱ صوفیہ
۳۹۲ صوفیہ	۳۹۳ صوفیہ	۳۹۴ صوفیہ
۳۹۷ صوفیہ	۳۹۸ صوفیہ	۳۹۹ صوفیہ
۴۰۰ صوفیہ	۴۰۱ صوفیہ	۴۰۲ صوفیہ
۴۰۳ صوفیہ	۴۰۴ صوفیہ	۴۰۵ صوفیہ
۴۰۶ صوفیہ	۴۰۷ صوفیہ	۴۰۸ صوفیہ
۴۰۹ صوفیہ	۴۱۰ صوفیہ	۴۱۱ صوفیہ
۴۱۲ صوفیہ	۴۱۳ صوفیہ	۴۱۴ صوفیہ
۴۱۷ صوفیہ	۴۱۸ صوفیہ	۴۱۹ صوفیہ
۴۲۰ صوفیہ	۴۲۱ صوفیہ	۴۲۲ صوفیہ
۴۲۳ صوفیہ	۴۲۴ صوفیہ	۴۲۵ صوفیہ
۴۲۶ صوفیہ	۴۲۷ صوفیہ	۴۲۸ صوفیہ
۴۲۹ صوفیہ	۴۳۰ صوفیہ	۴۳۱ صوفیہ
۴۳۲ صوفیہ	۴۳۳ صوفیہ	۴۳۴ صوفیہ
۴۳۷ صوفیہ	۴۳۸ صوفیہ	۴۳۹ صوفیہ
۴۴۰ صوفیہ	۴۴۱ صوفیہ	۴۴۲ صوفیہ
۴۴۳ صوفیہ	۴۴۴ صوفیہ	۴۴۵ صوفیہ
۴۴۶ صوفیہ	۴۴۷ صوفیہ	۴۴۸ صوفیہ
۴۴۹ صوفیہ	۴۵۰ صوفیہ	۴۵۱ صوفیہ
۴۵۲ صوفیہ	۴۵۳ صوفیہ	۴۵۴ صوفیہ
۴۵۷ صوفیہ	۴۵۸ صوفیہ	۴۵۹ صوفیہ
۴۶۰ صوفیہ	۴۶۱ صوفیہ	۴۶۲ صوفیہ
۴۶۳ صوفیہ	۴۶۴ صوفیہ	۴۶۵ صوفیہ
۴۶۶ صوفیہ	۴۶۷ صوفیہ	۴۶۸ صوفیہ
۴۶۹ صوفیہ	۴۷۰ صوفیہ	۴۷۱ صوفیہ
۴۷۲ صوفیہ	۴۷۳ صوفیہ	۴۷۴ صوفیہ
۴۷۷ صوفیہ	۴۷۸ صوفیہ	۴۷۹ صوفیہ
۴۸۰ صوفیہ	۴۸۱ صوفیہ	۴۸۲ صوفیہ
۴۸۳ صوفیہ	۴۸۴ صوفیہ	۴۸۵ صوفیہ
۴۸۶ صوفیہ	۴۸۷ صوفیہ	۴۸۸ صوفیہ
۴۸۹ صوفیہ	۴۹۰ صوفیہ	۴۹۱ صوفیہ
۴۹۲ صوفیہ	۴۹۳ صوفیہ	۴۹۴ صوفیہ
۴۹۷ صوفیہ	۴۹۸ صوفیہ	۴۹۹ صوفیہ
۵۰۰ صوفیہ	۵۰۱ صوفیہ	۵۰۲ صوفیہ
۵۰۳ صوفیہ	۵۰۴ صوفیہ	۵۰۵ صوفیہ
۵۰۶ صوفیہ	۵۰۷ صوفیہ	۵۰۸ صوفیہ
۵۰۹ صوفیہ	۵۱۰ صوفیہ	۵۱۱ صوفیہ
۵۱۲ صوفیہ	۵۱۳ صوفیہ	۵۱۴ صوفیہ
۵۱۷ صوفیہ	۵۱۸ صوفیہ	۵۱۹ صوفیہ
۵۲۰ صوفیہ	۵۲۱ صوفیہ	۵۲۲ صوفیہ
۵۲۳ صوفیہ	۵۲۴ صوفیہ	۵۲۵ صوفیہ
۵۲۶ صوفیہ	۵۲۷ صوفیہ	۵۲۸ صوفیہ
۵۲۹ صوفیہ	۵۳۰ صوفیہ	۵۳۱ صوفیہ
۵۳۲ صوفیہ	۵۳۳ صوفیہ	۵۳۴ صوفیہ
۵۳۷ صوفیہ	۵۳۸ صوفیہ	۵۳۹ صوفیہ
۵۴۰ صوفیہ	۵۴۱ صوفیہ	۵۴۲ صوفیہ
۵۴۳ صوفیہ	۵۴۴ صوفیہ	۵۴۵ صوفیہ
۵۴۶ صوفیہ	۵۴۷ صوفیہ	۵۴۸ صوفیہ
۵۴۹ صوفیہ	۵۵۰ صوفیہ	۵۵۱ صوفیہ
۵۵۲ صوفیہ	۵۵۳ صوفیہ	۵۵۴ صوفیہ
۵۵۷ صوفیہ	۵۵۸ صوفیہ	۵۵۹ صوفیہ
۵۶۰ صوفیہ	۵۶۱ صوفیہ	۵۶۲ صوفیہ
۵۶۳ صوفیہ	۵۶۴ صوفیہ	۵۶۵ صوفیہ
۵۶۶ صوفیہ	۵۶۷ صوفیہ	۵۶۸ صوفیہ
۵۶۹ صوفیہ	۵۷۰ صوفیہ	۵۷۱ صوفیہ
۵۷۲ صوفیہ	۵۷۳ صوفیہ	۵۷۴ صوفیہ
۵۷۷ صوفیہ	۵۷۸ صوفیہ	۵۷۹ صوفیہ
۵۸۰ صوفیہ	۵۸۱ صوفیہ	۵۸۲ صوفیہ
۵۸۳ صوفیہ	۵۸۴ صوفیہ	۵۸۵ صوفیہ
۵۸۶ صوفیہ	۵۸۷ صوفیہ	۵۸۸ صوفیہ
۵۸۹ صوفیہ	۵۹۰ صوفیہ	۵۹۱ صوفیہ
۵۹۲ صوفیہ	۵۹۳ صوفیہ	۵۹۴ صوفیہ
۵۹۷ صوفیہ	۵۹۸ صوفیہ	۵۹۹ صوفیہ
۶۰۰ صوفیہ	۶۰۱ صوفیہ	۶۰۲ صوفیہ
۶۰۳ صوفیہ	۶۰۴ صوفیہ	۶۰۵ صوفیہ
۶۰۶ صوفیہ	۶۰۷ صوفیہ	۶۰۸ صوفیہ
۶۰۹ صوفیہ	۶۱۰ صوفیہ	۶۱۱ صوفیہ
۶۱۲ صوفیہ	۶۱۳ صوفیہ	۶۱۴ صوفیہ
۶۱۷ صوفیہ	۶۱۸ صوفیہ	۶۱۹ صوفیہ
۶۲۰ صوفیہ	۶۲۱ صوفیہ	۶۲۲ صوفیہ
۶۲۳ صوفیہ	۶۲۴ صوفیہ	۶۲۵ صوفیہ
۶۲۶ صوفیہ	۶۲۷ صوفیہ	۶۲۸ صوفیہ
۶۲۹ صوفیہ	۶۳۰ صوفیہ	۶۳۱ صوفیہ
۶۳۲ صوفیہ	۶۳۳ صوفیہ	۶۳۴ صوفیہ
۶۳۷ صوفیہ	۶۳۸ صوفیہ	۶۳۹ صوفیہ
۶۴۰ صوفیہ	۶۴۱ صوفیہ	۶۴۲ صوفیہ
۶۴۳ صوفیہ	۶۴۴ صوفیہ	۶۴۵ صوفیہ
۶۴۶ صوفیہ	۶۴۷ صوفیہ	۶۴۸ صوفیہ
۶۴۹ صوفیہ	۶۵۰ صوفیہ	۶۵۱ صوفیہ
۶۵۲ صوفیہ	۶۵۳ صوفیہ	۶۵۴ صوفیہ
۶۵۷ صوفیہ	۶۵۸ صوفیہ	۶۵۹ صوفیہ
۶۶۰ صوفیہ	۶۶۱ صوفیہ	۶۶۲ صوفیہ
۶۶۳ صوفیہ	۶۶۴ صوفیہ	۶۶۵ صوفیہ
۶۶۶ صوفیہ	۶۶۷ صوفیہ	۶۶۸ صوفیہ
۶۶۹ صوفیہ	۶۷۰ صوفیہ	۶۷۱ صوفیہ
۶۷۲ صوفیہ	۶۷۳ صوفیہ	۶۷۴ صوفیہ
۶۷۷ صوفیہ	۶۷۸ صوفیہ	۶۷۹ صوفیہ
۶۸۰ صوفیہ	۶۸۱ صوفیہ	۶۸۲ صوفیہ
۶۸۳ صوفیہ	۶۸۴ صوفیہ	۶۸۵ صوفیہ
۶۸۶ صوفیہ	۶۸۷ صوفیہ	۶۸۸ صوفیہ
۶۸۹ صوفیہ	۶۹۰ صوفیہ	۶۹۱ صوفیہ
۶۹۲ صوفیہ	۶۹۳ صوفیہ	۶۹۴ صوفیہ
۶۹۷ صوفیہ	۶۹۸ صوفیہ	۶۹۹ صوفیہ
۷۰۰ صوفیہ	۷۰۱ صوفیہ	۷۰۲ صوفیہ
۷۰۳ صوفیہ	۷۰۴ صوفیہ	۷۰۵ صوفیہ
۷۰۶ صوفیہ	۷۰۷ صوفیہ	۷۰۸ صوفیہ
۷۰۹ صوفیہ	۷۱۰ صوفیہ	۷۱۱ صوفیہ
۷۱۲ صوفیہ	۷۱۳ صوفیہ	۷۱۴ صوفیہ
۷۱۷ صوفیہ	۷۱۸ صوفیہ	۷۱۹ صوفیہ
۷۲۰ صوفیہ	۷۲۱ صوفیہ	۷۲۲ صوفیہ
۷۲۳ صوفیہ	۷۲۴ صوفیہ	۷۲۵ صوفیہ
۷۲۶ صوفیہ	۷۲۷ صوفیہ	۷۲۸ صوفیہ
۷۲۹ صوفیہ	۷۳۰ صوفیہ	۷۳۱ صوفیہ
۷۳۲ صوفیہ	۷۳۳ صوفیہ	۷۳۴ صوفیہ
۷۳۷ صوفیہ	۷۳۸ صوفیہ	۷۳۹ صوفیہ
۷۴۰ صوفیہ	۷۴۱ صوفیہ	۷۴۲ صوفیہ
۷۴۳ صوفیہ	۷۴۴ صوفیہ	۷۴۵ صوفیہ
۷۴۶ صوفیہ	۷۴۷ صوفیہ	۷۴۸ صوفیہ
۷۴۹ صوفیہ	۷۵۰ صوفیہ	۷۵۱ صوفیہ
۷۵۲ صوفیہ	۷۵۳ صوفیہ	۷۵۴ صوفیہ
۷۵۷ صوفیہ	۷۵۸ صوفیہ	۷۵۹ صوفیہ
۷۶۰ صوفی		

علم و ادب کا ذخیرہ پچھلے تھا۔ تحقیق اور خوش و جستجو کی لگن نے اس ذوق کو بہت پختہ کر دیا تھا۔ طبیعت بہت حساس اور نظر بہت وسیع تھی۔ دنیا کے ادبی شاعر بہت کم ایسے ہوں گے جو ان کی نظر سے نہ گزرے ہوں گے۔ اس سے ان کے ذوق میں عجیب لطافت اور وسعت پیدا ہو گئی تھی جو ان کے معانی سے صاف ظاہر ہے۔ اس فاضل شخص کی زندگی عجیب و غریب تھی۔ انہوں نے تمام عمر علم کے مطالعہ اور علم کی خدمت میں صرف کی۔ گو خود درویشوں کی طرح (زندگی) بسر کی مگر دوسروں کو ہر سطح فائدہ پہنچایا۔ ہمارے مدارس اور کالج کے استادوں اور طالب علموں کو اس بے ریا اور بے نفس شخص کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ سچے عالم ایسے ہی ہوتے ہیں۔

ان کی صحبت معتبرات میں سے تھی۔ اس میں سکیماء اور طالب علماء دونوں شامل نظر آتی تھیں۔ اپنے زمانے کے پُرانے حالات (اگلے) بزرگوں کی خود داری، وضع داری اور شجاعت کے کارنامے اور ان کے توجہات، اسراف اور شہنی کے قصے بڑے نرے سے بیان کرتے تھے۔ ان کا تخیل اس قدر بلند تھا کہ غم وہاں پہنچتے پہنچتے ٹوکھڑے لگتا تھا۔ شعر کا ذوق ایسا پاکیزہ اور اعلیٰ درجے کا تھا کہ میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قدیم استادہ کے کلام پر بہت اچھی نظر تھی اور خاص محنتوں میں ان کا مغرب کلام سنانے اور کبھی کبھی شعر کے محاسن و معانی پر تنقیدی نظر ڈالتے جسے سن کر ان کے ذوق کی داد دینی پڑتی تھی۔ اگر کوئی ان چیزوں کو غم بند کر دیتا تو وہ ایک نادریا میں ہوتی۔ (وہ خود ہمیشہ) اپنے پاس ایک بیاض رکھتے تھے جہاں کہیں کوئی اچھا شعر یا کوئی خیال یا کام کی بات نظر پڑی وہ جھٹ اپنی بیاض میں لکھ لیتے تھے۔ غرض (موگو عبدالحق) کی صحبت میں بس اوقات ایسے ملی و ادبی محلات مل جاتے تھے جو گھر کے مطالعہ اور فکر کا نتیجہ ہوتے تھے۔ ان کے علمی ذوق علم و ادب کی سرپرستی اور صحبت سے جو فیض لوگوں کو پہنچا وہ (شاید) ان کی تالیفات سے کہیں زیادہ استوار اور دودرس ہے !

علم کے ساتھ صحیح ذوق بھی مزدوری ہے۔ علم کتابی وسیع ہو صحیح ذوق دہو تو علم بے ثمر اور بے ثمر ہے۔ آدمی کو علم دولت آسانس و آرام، محنت سے مل جاتا ہے لیکن صحیح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے نہ مال و زر سے اور نہ محنت سے۔ صحیح ذوق زندگی کی جان ہے۔ اس سے زندگی کے ہر شغل و شعبہ میں ایک نرم اور سہانی سی روشنی آجاتی ہے اور باوجود نشیب و فراز اور اوگٹ گھاٹیوں کے سوز حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہوجاتی ہے۔ (مولوی صاحب) کا ذوق بہت سلیم اور پاکیزہ تھا اور یہ ذوق علم و ادب تک ہی نہ تھا۔ زندگی کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں نعت لانا تھا۔

طبیعت میں نفاس پسندی بہت تھی۔ مناعی کے دل دادہ تھے۔ اچھی چیز کو دیکھ کر بھڑک جاتے تھے۔ بڑی صفائی اور سلیست سے رہتے تھے۔ کھانے کے بڑے شوقین تھے۔ خوب کھاتے تھے کھاتے تھے۔ جب کوئی دعوت میں انگریزی کھانے

تھے انھوں نے بہت سے ایسے ہندی الفاظ اردو ادب میں داخل کیے جو ہماری نظروں سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کسی کسی اردو ادیب یا شاعر نے کیا ہندی ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ لفظ کا صحیح اور بر محل استعمال اس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اُٹھے مگر کھٹے دالے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے ادب کا بڑا کمال ہے اور یہ کوئی (مولوی عبدالحق) سے کیسے ! — دلوں میں گھر کر لینے کے جو گھر ادب میں ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے !

ایک بار دہرایا کہ " جو لوگ تذکیر و تائید اور دلی لکھنؤ کی زبان کے متعلق دودھ از کار اور فضول بحثوں اور جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں وہ بڑی لعلی رہیں زبان دلی اور لکھنؤ کی تابع نہیں بلکہ خیالات کی تابع ہے۔ کسی تحریر یا ادب کی پشت پر جب کوئی صبح جذبہ یا خیال نہیں ہوتا تو لفظوں سے کھینا پڑتا ہے۔ جن لوگوں کے خیالات رکیک ہیں اُن کی زبان کبھی فصیح نہیں ہو سکتی "

حقیقت یہ ہے کہ (مولوی عبدالحق) جیسی طبیعت اور ذہانت اور جدت کے بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ اُن کی تحریر باج و مانع اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی۔ یہ حال اُن کی قلم تصانیف کا ہے۔ اُن کی تحریر میں بڑا وقت تھی اور حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا۔ بات کی تہ تک خوب پہنچتے تھے اور زبان کے توازن اور تسلسلے وہ الفاظ کے کینڈوں اور اُن کی فطرت کو خوب سمجھتے تھے اور لفظوں کی تلاش یا نئے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے۔ اور یہ لفظ ایسے موزوں اور جلد بنانے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے دماغ میں ساپنچے بنے بنائے رکھے ہیں جن سے الفاظ ڈھلتے چا رہے ہیں۔ وہ دوسرے ادیبوں کی طرح الفاظ اور محاورے سوچ سوچ کر اور ڈھونڈ کر نہیں لکھتے تھے اور نہ عبارت کے بنانے اور سنوارنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شروع سے آخر تک بلا توقف اپنے خیالات لکھتے چلے جاتے تھے اور پورا تحریر ایک مسلسل خوب صورت لڑی ہوتی تھی۔ میں اس کی بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن حواست کے خوف سے معذور ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو نثر میں جو انقلاب اور ترقی ہم اس وقت دیکھتے ہیں اور اس میں جو وسعت اور ادبی صلاحیت پائی جاتی ہے وہ (اُن ہی) کا فیصل ہے مبینہ سادہ اور خوشگوار نثر لکھنا جو طبعی اور ادبی مضامین اور اُن کے لئے کی توڑ رکھتی ہے۔ (انھوں) نے سکھایا۔ اردو زبان میں ابھی تک وہ توانائی پیدا نہیں ہوئی تھی جو ایک زبان کے ادب کے لیے لازم ہے (مولوی عبدالحق) نے اس کے قالب میں ایک نئی روح کھینچی اور اردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ انھوں نے زبان پستی سے نکالا۔ انما زبانی میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی، پیچیدہ مضامین کا ڈول ڈالا۔ جدید علوم و فنون کے ترجمے انگریز سے کرائے۔ خود کتابیں لکھیں اور دوسروں سے لکھوائیں۔

صفحہ ۸۷ مولوی سید علی گلوی
صفحہ ۲۶ مولوی چراغ علی
صفحہ ۱۶۲ سر سید احمد خاں

صفحہ ۲۸۲ سر سید احمد خاں
صفحہ ۱۱۸ مولانا وحید الدین سلیم
صفحہ ۲۹۳ سر سید احمد خاں
صفحہ ۲۸۵

صفحہ ۸۷ مولوی سید علی گلوی
صفحہ ۱۲۱ مولانا وحید الدین سلیم
صفحہ ۱۲۱
صفحہ ۴۱۱ ذاب محاد النک

ان کی ٹہنی خواہش تھی کہ اردو زبان میں اعلیٰ درجے کے ادبی خصوصاً ذرا سے لکھے جائیں اور اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ اردو میں زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا تاکہ وہ نونے کا کام دیں۔ بعض وقت جو کہ اعلیٰ درجے کی کتاب چھپتی تو اس کی تعریف کرتے اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا شوق دیتے۔

علی دہلوی اعتبار سے اردو زبان میں ان کا بہت بڑا درجہ ہے۔ ان کا ذوق ادب (بہت) اچھا تھا۔..... ان کی بے شک تحریروں میں سے اکثر ادبی نقطہ نظر سے ایک انتخاب کیا جائے تو یہ انتخاب ہماری زبان و ادب کا بے مثل شاہکار ہو گا۔ یہ ادبی ذوق ہی تھا جس نے انہیں زلفات اور دو کی تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا۔ ان کی تحریروں میں اکثر جگہ ادبی جواہر پڑے اور حسن بیلا سے بھرا۔ یہ نثریٹ زبان کے الفاظ اور محاورے اور مزاح و عرافت کی پختہ پائی نظر آتی گی۔ (بھیکو ان) سے یہ توقع کرنا کہ ان کی ہر تحریر ادب کا اعلیٰ نمونہ ہو جاوے۔ (انہیں) ادائے مطلب میں معافی اور سادگی کا اس قدر خیال تھا کہ بعض وقت وہ مضامین کو عام فہم بنانے کی خاطر صحیح بیان کو قربان کر دیتے تھے۔ اس وجہ سے (کہیں کہیں) ان کی عبارت سست اور چسپاں نہیں معلوم ہوتی تھیں جو ادبی یا علمی تحریریں اور مضامین دل لگا کر لکھے ہیں وہ کبھی بیان اور خیالات اور زبان کی سلاست و فصاحت کے اعتبار سے اردو ادب کے خزانے میں بے نظیر جا ہر پارے ہیں۔ ان میں تمام ادبی خوبیاں ہیں۔ تمیيزات بھی ہیں، تمیيزات و استعارات بھی ہیں، محاورات بھی ہیں، طعنت زبان بھی ہے مزاح اور عرافت کی چاشنی بھی ہے لیکن ہر چیز اپنے محل پر ہے اور مختلف و تفصیل سے بری۔

یوں تو رقم کے ساتھ ساتھ ان کے کام بھی بڑھتے گئے جو مختلف نوعیتوں اور حیثیتوں کے تھے لیکن اصل کام جس پر ان کی پوری محنت اور توجہ صرف ہوئی وہ (اردو زبان کے پھیلاؤ) کا تھا۔ اردو کے عاشق تھے اور اسے برصغیر کی ترقی زبان خیال کرتے تھے اور اس کی ترقی و فروغ کے لیے طرح طرح کی تدبیریں سوچا کرتے تھے۔ اردو کی حمایت میں (مولوی عبدالحق) نے کبھی کبھی کتابیں لکھی ہیں اور پرانے آئے دیکھی تو اس کی حمایت کے لیے فوراً کمر بستہ ہو گئے۔ اردو کی حمایت کو (وہ) اپنا بہت بڑا فرض اور ایک اہم قومی خدمت سمجھتے تھے اور اس معاملے میں انہوں نے کبھی کو آجی نہیں کی بد سب سے پہلے قدم آگے بڑھایا۔

(یہ) بات ان کی سیرت میں ایسی تھی کہ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔..... (اردو کو انہوں نے) اپنی بیٹی کی طرح پال دیا۔ اس کی پرورش کی..... اور مرتے دم تک کبھی اپنے سے جدا نہ کیا جو کچھ کاتے وہ اس کے لیے) اور دیکھ دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے پیسے (اردو) کے لیے سے (زبان و ادب) پر بڑے بڑے پُر زور مضامین خود لکھے اور دوسروں سے کہہ مانے اور اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جاکر پکڑ دیے اور تقریریں کیں۔ انہیں کسی لڑی تھی کہ (اردو) کو

طا سوز ۱۵۶	حالی	۱۰۵	سر سید دہلوی	۲۴	۲۲	سر سید احمد خان
۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰
۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰
۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰

چھوڑ کر اسے اسے پھرتے لیکن محض (اُردو زبان) کی خاطر وہ زمین کے گز بنے ہوئے تھے۔ وہ خود طرح طرح کی تکلیف اٹھاتے تھے اس پر کسی قسم کی آپریشن نہ آنے دیتے تھے۔۔۔۔۔ اُنہیں ہر وقت اس کا فکر رہتا تھا اور اُن کی زندگی کا مقصد ہی یہی تھا۔۔۔۔۔ (کہ جس طرح بچہ اپنے اس کی خدمت کریں۔ حق (پدری) شاید کسی نے اس طرح ادا کیا ہو۔ یہ وضع داری یہ محبت و شفقت اور ایثار اب کمان نظر آتا ہے۔ اپنے کو مٹا کر (مقصد) کی خدمت کرنا یہی جو برانسانیت ہے۔

ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجہ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے درجہ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے اور نہ ہیچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان، انسان بنتا ہے یہ سمجھ کر نہ ہو جاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی۔ خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی کی عبادت کا فائدہ نہیں۔ وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں دویمت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور ضلعت اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو (عبدالحق) نیک بھی تھے اور بڑے بھی!

افسوس کہ ان کی زندگی کے آخری ایام اتنا درجے کی غمی اور کرب و الم میں گزرے۔ (مرحوم کا) بڑے بڑے عاذق ڈاکٹروں نے علاج کیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ حالت بہت ردی ہو چکی تھی۔۔۔۔۔ حکیموں اور ڈاکٹروں کی صداقت اور چارہ سازی دھری رہ گئی اور حکمت و تدبیر کچھ کارگر نہ ہوئی۔ وہ وقت جو ٹپنے والا نہیں ہے اور جس سے کوئی جا بجا اپرچ نہیں سکتا ان پہنچا اور وہ (۱۹ اگست ۱۹۹۱ء کو) ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

قرم ان کا آئندہ دم تک نہ رکھا۔ موت سے چند روز پہلے تک جب تک کہ بالکل میوز نہ ہو گئے۔ بار بار کہتے رہے۔ ایسا جامع صفات اور جامع حیثیت بے لوث و بے نفس پُر عزم و استقلال، سراپا خلوص و صداقت جیوں اس سے پہلے (ط) اور نہ اس کے بعد نصیب (ہوگا)۔۔۔۔۔ اور آخر دم تک مردانہ وار بلکہ دیوانہ وار کام کرتے کرتے دنیا سے چل بسا۔ اس کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو۔

ہمارے ملک میں خوشامدیوں کی کوئی کمی نہیں وہ ہر بڑے آدمی پر اس طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے شہد پر کھیاں لیکن پتہ اور جھوٹ کا امتحان جب ہوتا ہے جب وہ بڑا آدمی اپنے اقتدار سے محروم ہو جاتا ہے۔ (ان) کی (رحلت) کے وقت کرام چ گیا تھا اور ہزار آدمی کا ٹھٹھا برابر اور اند لگا ہوا تھا۔ سینکڑوں آدمی جی میں امیر، غریب، بیواؤں اور یتیم سب ہی تھے زار و قطار رو رہے تھے۔ وہ کیا چیز تھی جس نے پھوٹے بڑے سب کا دل موہ لیا تھا، مرحوم کی وفات پر تمام اُردو انگریزی اخبارات میں اظہارِ افسوس و ملال کیا گیا لیکن ہم یہاں بخوبی طرالت صرف دو تحریریں نقل کرتے ہیں ایک (صدر

امت فیڈریشن محمد ایوب خاں) کا اخبار افسوس جو انہوں نے (ذیارت) سے کیا اور جو (مختلف رسائل و اخبارات میں) طبع
در شائع ہوا۔ دوسرا (ابوالثر حضرت حفیظ ہاندری) کا اہم نام جو اس دردناک خبر (پر) انہوں نے وقار کم لکھا
ما۔ حقیقت میں دونوں تحریریں سچی اور دل سے لکھی گئی ہیں۔

(انجریہ: قومی زبان: تعزیتی پیغام فیڈریشن محمد ایوب خاں صدر پاکستان: جلد ۱۹ شمارہ ۳۴۱)
زمروئی عبدالحق کی وفات ایک عظیم قومی نقصان ہے۔ اُن کے انتقال سے ہم علم و ادب کے ایک پتے
پرستار سے محروم ہو گئے ہیں۔ مرحوم اپنے مقصد کے حصول کے لیے ایک عرصہ تک اور غیر مترسل
چٹان کی طرح جے رے۔ اُن کی ذات بزمینیر پاک و ہند کے گزشتہ ایک سو سال کی اسلامی ثقافت
کی منہر تھی۔ اُن کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا ایک عظیم اداسی کے ختم ہو جانے کے
بابا ہے۔

ذاتی طور پر اُن کے انتقال سے میں اپنے ایک قابل احترام دوست سے محروم ہو گیا ہوں
اپنے مقصد سے انہیں جو نفاذ تھا میں اس سے ہمیشہ فیض حاصل کرتا رہا ہوں۔
میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔
(ابوالثر حضرت حفیظ ہاندری کا اخبار افسوس اور خراج عقیدت از مکتوب مسترد یکم اپریل ۱۹۶۲ء)

(اُردو کا ذکر کرتے ہی ہمارے دور کے ادب شعری دنیا میں آئی کون ہے جو زمروئی عبدالحق مرحوم
کے نام پر ادب و احترام کا خراج ادا نہ کرے۔ ہم لوگ میں اور میرے ہم عصر جو اُردو میں شعر و شاعری
یا شعر و شاعری کے دعویدار ہیں اب کے سب بابائے اُردو زمروئی عبدالحق مغفور کے زیر بار احسان
ہیں۔ وہ اول سے آخر تک اس زبان کی ترویج و ترقی اور حفاظت کے لیے جہاد کر رہے ہیں اور ہر سہارا
رہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اُردو (کبھی کی) نیا مینا نہ سہی کون کھڑوں میں پناہ گزین ہو چکی ہوتی
اور ہم سب محانت بھانت کی بوبیاں بولتے نظر آتے۔

نیم براعظم ہند کے باشندے، وہ کوئی بھی ہوں، اس قدر جلد اُردو اور ہندی کی وہ معرکہ آرائی
نہیں قبول کتے جو اس صدی کے آغاز سے مسلسل جاری ہے اور میں سمجھتا ہوں ابھی تو ان جاری
رہے گی۔ یہ معرکہ آرائی چند نمایاں پہلو اختیار کر چکی ہے۔ اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اُردو
نہ کسی محاذ پر شکست نہیں کھائی۔ زمروئی عبدالحق صاحب اس یورش کے مقابل اُردو کی حفاظت
کنے والوں کے محاذ کے سپہ سالار تھے۔

آج پاکستان کی دو قومی زبانوں میں اُردو جو ایک زبان تسلیم کر لی گئی ہے یہ زمروئی عبدالحق
کی کی سفاکی جمید اور ایسی کارگزاری کا ثمر ہے جس کے لیے اس مرحوم کی پرست نے اپنی جان تک

دے دی، قربان ہو گئے اور ط

ہم یہاں کام آگئے، آگے تھا دار کام ہے
فرما کر جہانی طور پر ہم سے رخصت ہو گئے ہیں۔ لیکن الحمد للہ اردو کا پرچم آگے ہی آگے ہوا
رہا ہے۔ مولوی عبدالحق کی روح پھول برسا رہی ہے اور ہم سب کو حوصلہ بخش رہی ہے اور
آگے بڑھتے جانے کی تلقین فرما رہی ہے

مرحوم کے انتقال پر بہت سی تاریخیں لوگوں نے کہیں۔ ان میں سے چند یہاں لکھی جاتی ہیں۔ سید (ہاشمی فرید آبادی صاحب)
نے جو (عربی) ضائع میں تاریخ کی صفت کو بہت پسند کرتے تھے یہ تاریخ نکالی:
"عَفَسَ اللَّهُ لَكَ"

۱۳۸۱ھ

(حضرت رئیس امرہوی) مدظلہ العالی نے اسے نظم میں اس طرح موزوں فرمایا ہے۔

در صلت مولوی مسترم عبدالحق
مرگ تازہ پئے تو سیح زبان اُردو
زندہ شد۔ شیوہ اسلاف گرامی اذوے
بدہ است از صفت سر سید و عالی ہم اد
ہاشمی۔ فکر چہ نہ ہو پئے سال رئیس
باتف غیب مداد غنمہ انداز

۱۳۸۱ھ

(حضرت رئیس امرہوی) نے خود بھی ایک قطعہ (تاریخ) مرحوم کی وفات پر لکھا ہے جس میں گویا مرحوم کے کام
سیرت کی کامل تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ یہ ہے۔

ہزار رنگ یہ دُنیا نے نو بہ نو بدے

مگر کہاں بدل مولوی عبدالحق

نقوش خدمت اُردو کہیں جاں اندوز سنت نچ مسل مولوی عبدالحق
رفیق سید و عالی و اکسبہ و آزاد وجود بے بدل مولوی عبدالحق
ہرک محاذ پر اُردو کا پاساں طرا بسا برعل مولوی عبدالحق

اللہ کے ترقی و تہمت اب دلی
اس جے نعل مولوی عبدالقی
قید و حیل مولوی عبدالقی
دین اہل حیدرت نجد میں تھے
خیم اہل میں بھی سال اہل ہے درپیش
کو منہم اہل مولوی عبدالقی

۱۳۸۱ھ

اچھے دینر صاحب غنیمت اردو ہری نے بھی جو ایک عالم فاضل ہیں اور ایک زندہ نگار (مجموعہ) میں مضمون تھے
الذباب (اردو کالی کراچی میں صدر شعبہ اردو) ہیں ایک اچھا قلم تاریخ نگار ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔
نئے غنیمت و صنعت کیا اپنے اردو کے گھون
ذات ماہ فخر پاکستان و صنعت نشان
صاحب نقد و لنگر بھی صاحب اسلوب بھی
آفتاب نثر اردو بایقین و بے گناں
تعلیم و تشریح زندگی کا کس قدر انجام ہے
شام غم سے ہے سہا زہیل جلد تلی حیاں

۱۳۸۱ھ

اچھے دینر صاحب قادر سی نے بھی مرحوم کی دُعا تاریخیں ایک سہ میوہ میں دوسری بھری نبوی میں (کیں)

جیہ لگا

بہاؤم سے بابائے اردو ہوئے
بہاؤ فیض سے ان کے مسدوم ہیں
انھوں نے جو اردو کی کہیں حسد متیں
وہ سب قوم کے دل پر مرقوم ہیں
بہت اُن کے احسان آئیں گے یاد
کہ اب مکتب اُن کے سے مسدوم ہیں
یہ اللہ کے فضل سے ہے اُمید
کہ باغ جنت میں دُعا مرحوم ہیں
کلمات آوری نے یہ سال و فائت
کہ تھے "خادم قوم" مسدوم ہیں

۲۰۱۹ء

مولوی عبدالقی احسان شعرا
جن سے پاک و ہند دونوں زمین باب بھی
بزرگیدہ فلسفہ علم و ادب
پھر دیکھیں بابائے اردو "بو خطاب"

نعت آدم و دین دی حساب حوزہ ایسی ہستی ہے جہاں میں انتخاب
ہم عشاقِ دہاں میں کر گئے بے نظیر و بے مثال و جواب !
قادسی اُن کی ہے تاریخ و فات
خادم قومی زبان، مسندت آب !

۱۳۸۱ھ

بہت سے ایسے ہیں جو ایک چپک پر دستخط کر دینے سے دُنیا میں یکایک نامور ہو جاتے ہیں۔ بہت سے ہیں جنہیں
اقتاباتِ دہانہ نے جڑا آدمی بنا دیا ہے۔ بہت سے ہیں جنہیں نام و نمود کے لیے زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں اور شہرت یا
نام حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں اور آخر ٹپے آدمی بن جاتے ہیں لیکن کم ہیں جو محض اپنی لیاقت، محنت اور
غلامی کے ساتھ کام کر کے عزت اور بڑائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑائی پایدار ہوتی ہے۔ مروجہ اسی مظلوم اور چھوٹے گروہ میں
سے تھے۔ باوجود اس لیاقت و عظمت کے اپنی زندگی و رویشِ مبرک کی۔ شہرت، دولت اور حکومت جن سے ایک عالم میں
بیابان اور انقلاب برپا ہے اور جن کی آگ تقریباً برسیں میں مشتعل ہے وہ ان کی آپس سے باطل مغلوط تھے ورنہ چاہتے تو اس
قد شہرت اور دولت حاصل کر سکتے تھے جو دوسرے کی قدرت سے باہر ہے لیکن انہوں نے حقارت سے اس پر نظر ڈالی اور
سناڑدار ٹھکر کر چلے گئے۔

بلٹن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "شہرت انسان کا فطری ضعف ہے" اور حقیقت میں یہی سچ بھی ہے۔ اس سے بچنا قریب
قریب محال ہے لیکن بعض خدا کے بندے جنہیں غیر معمولی دماغی قوت عطا ہوئی ہے اور جن کا علم و فضل بحر کے رُتبے کو پہنچ گیا ہے
ایسے بھی ہیں کہ شہرت پر روت مار کر گنجِ تنہائی کو ضیئت سمجھتے ہیں اور اپنے فلسفے اور خیالات میں غواہ باد ہو جاتی کیوں نہ ہوں
مگن ہیں۔ یا تو وہ اس صنعت کی قوت سے واقف نہیں کہ وہ انسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے یا وہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھ
کر پستی کی طرف مائل نہیں ہوتے اور اپنے تئیں ایک غلام یا جیل گھوڑے کی طرح ناگوار محنت پر مجبور نہیں کرتے اور چند بد مذاقوں کی
داد یا چند سمجھ داروں کی داد واد کے لیے کاغذ کو سیاہ اور لب کو داگر ناگوار نہیں کرتے۔ بعینہ یہی حالت اُن کی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے۔
"کیا حاصل ہے شہرت سے؟ یہی آکر لوگ ہمارے نام سے واقف ہو جائیں۔ بالآخر اگر یہ ہوا بھی تو اس سے کیا خوشی ہو سکتی ہے اور اگر
یہی ہے تو کیوں نہیں ہزاروں لاکھوں کارڈ چھپو کر اپنا کام اور نام درج کر کے تقسیم کر دیں کہ ایک دُنیا اُن دونوں سے واقف ہو جائے
اور پھر پیٹ بھر کر خوشی ہو میں۔۔۔۔۔۔ اس پاک نفس، عالی دماغ شخص کی حالت پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ
وہ ایک پارسا صفت، درویش منش، صوفی مشرب اور باطنِ نظر حکیم تھا۔ وہ خواجہ مافک کی غزلیں اور قطعات پڑھتے اور مزے
لیتے۔ وہ بڑی روزانہ ضروریات کی..... کچھ پروا نہ کرتے اور بے تعلقت سادہ زندگی بسر کرتے جس میں نہ نئے فیشن کو دخل

تھا اور دنیا کی طرح کمال پر پہنچا تھا۔ مگر جس قدر وہ اپنے چیزوں سے بے پروا ہوتے اسی قدر اخلاص میں مستحق تھے۔
 انسان کی اسی لطیفیت اور برتری اس کے اخلاق (ہی) میں ہے۔ افراد ہوں یا اقوام، اخلاق کے ذوال میں ان کا زوال اور
 اخلاق کی پابندی اور استواری میں ان کی عظمت و وقعت ہے۔ اور وہی عبدالحق کی کامیابی کا راز ان کے اخلاقی حمید میں تھا۔ اخلاق
 سے صرف یہی مراد نہیں کہ آدمی دوسروں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے، خاطر ممانعت کرے، وقت پر کسی حاجت مند کی صحبت
 ردا کرے۔ زبان و قلم سے ہمدردی کا اظہار کرے یا جیسا کہ اکثر تعریفین کے طہر پر کہا جاتا ہے، "مرغی و مرغبان" جو — اخلاق
 کی حمد اس سے بہت آگے تک ہیں۔ مدام و استغفار، صبر و تحمل، جرات (خبر سادہ، غلطی عزت) کام کی لگن، فرض شناسی، دیانت،
 صداقت اور داد و ای، انصاف، ہمدردی، ایثار، انسان کے اصل جوہر ہیں۔ ان سب میں ایثار کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے۔ یعنی ذاتی
 اہمیت پر قومی مفاد کو ترجیح دے۔ اختیار ہے کہ اپنے آپ کو بھول جائے۔ انسانیت اس کے جواز سے ہے۔
 می تو اس شدت قلب عالمی تو اس شدت غرض وقت
 حسد پر خواہی تو اتنی شدت جسد انسان شدن !

چمیت انسانی قہیدہ از تب محبتیں
 دزد محرم نمبر در بان محسن پڑاں شدن
 غریبہ غیش ما از خواری اجتناب نے جنس
 در شبستان ملک دل از محنت زندان شدن

اخلاق کچھ تو انسانی کو فطری طور پر اپنائتے ہیں اور کچھ تعلیم اور سال، محل اور صحبت سے خیر آتے ہیں لیکن اس جدید دور
 اور جدید تہذیب میں تعلیم، تعلیم نہیں رہی۔ کار، تعلیم کا ہیں دکائیں ہیں جن میں وسادہ کی مال کی خرید و فروخت ہوتی ہے یا ایک قسم کے کارخانے
 ہیں جن میں فراہمی مال تیار ہوتا ہے۔ ہمارے سہول اور کاروں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس کی رسائی زیادہ سے زیادہ مالٹے یا ذہن
 تک محدود ہے۔ اخلاق صرف و خود خلق یا ریاضیات و تاریخ کی حرا نہیں رہ گئے جاسکتے۔ رہا سال، محل اور صحبت — تو
 سب سے ناپید ہیں۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ ان بزرگوں اور اہل علم و ہنر کے سراغ حیات اور کارنامے کھنے پڑنے اور
 پڑھنے کا شوق پیدا کیا جائے جنہوں نے اپنی قوم یا ملک یا اپنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے طرح طرح کی آفتیں اور مصیبتیں اور
 سب سے اپنے لیے نفس چھوڑ گئے جو ان کے دلوں کے لیے ہمیشہ ہدایت و رہنمائی کا کام دیں گے۔ ان قربانیوں، صبر و استقامت
 اور بے نفسی کے ذکر اور یاد کرنے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر کچھ نہ کچھ اثر کیے بغیر نہیں رہیں گے۔ (عبدالحق) کی ہستی
 ایسی ہی تھی:

ان کی اخلاقی جرات، آزادی خیال، داد و ای، انصاف پسندی، بے تعصبی، قیاسی اور ہمدردی کے ہندوستان سے

قَالَ تَحْسَبُ أَنَّكَ كَرِيمٌ لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا غَوًى
ادب ہے جس کام کو احمقوں نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ اُسے کامل طور سے ادب سمجھنا ہی سے انجام دیا۔ ایسے وقت میں جب کہ بے فکر
ادب پر کام کرنے والوں کو شدید ضرورت ہے، جب کہ قومی ترقی کے ہر شعبے میں انسانوں کا گوشہ ہے، جب کہ کام بہت
ہیں اور کام کرنے والے کم، ایک صاحب المائے مسئل مزاج، بے فکر اور بالخصوص کام کرنے والے کا اظہار کیا

غضب ہے ! —

اُدنی کامرگوئی انہی کی بات نہیں۔ موت اٹلی ہے ادیب کو آنے والی ہے اور اس لیے کوئی ڈر کی چیز نہیں ہے۔ اسی موت جو بے وقت ہو اور خیراً جب اس کا دار ایسے شخص پر پڑے جو اپنی تحریروں ادبیات میں عظیم الشان ہو اور جس کی ذات سے ایسی توقعات ہوں جو اتنی بڑی قوم ادبیات میں دین ملک میں کسی دوسرے سے پوری ہوتی نظر نہ آتی ہوں۔ اور خاص کر جب کہ یہ ساغر ایسی قوم میں واقع ہو جو ان پہلے ہی سے قطارِ ہال ہو تو ایسی موت (واقعی) غضب ہے اور قیامت ہے اور اس کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

اور اس کا جس ہر کام کیا جائے ہے۔
 بیٹن جو اس قوم کے اعضاء ہیں جس میں آج کل ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں ایسے لوگوں کی بہت قدر کرنی چاہیے۔
 کاہونا ہمارے لیے فخر ہے اور ہم کے سہارے اور مدد سے توہیں کر ایسی مدد ملتی ہے کہ ایک ایک الہ میں سے لاکھوں پر بحاری ہوتا ہے۔
 دنیا میں اکثر جڑا ہے کہ ایک سپاہی کی بہت سے شکست کھاتے کھاتے فتح پائی ہے، ڈوبتے ڈوبتے جہاز مرنے ایک شخص کی دانشمندی
 سے پار اُتر گئے ہیں۔ یہ زمانہ ہمارے لیے بڑا کڑا زمانہ ہے ہیں ایسے لوگوں کی سخت ضرورت ہے ان کا ہونا ہمارے لیے نعمتِ اعظمیٰ
 اور ان کا مرنے ہمارے لیے ایک بلا ہے۔ ان کا ختم ہونا توں ہمارے لیے نازد رہے گا۔

مرثوم میں اس قدر محاسن اور خوبیاں جمع تھیں کہ آج باوجود تلاش کے کوئی اُن کا بائیں نہیں تھا۔ لوگ اُنھیں زمانہ ہزار تک یاد رکھیں گے۔ انسان نہیں رہتا لیکن اس کے اعمال رہ جاتے ہیں جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے، یہی اس کی پرہیزی کی اس کی آل اور اولاد یہی اس کی کمائی ہے۔ اور وہ کس کے نہیں مروتی اور کون بازدار ہے جو اس پر قادر نہیں، بلکہ جتنے ادنیٰ اور حقیر جائز ہیں اتنی ہی اُن کے زیادہ اولاد دہوتی ہے۔ چنانچہ بعض کیرٹے ایسے ہیں کہ اُن کے چند گھنٹوں میں ہزاروں لاکھوں نچے پیدا ہوتے ہیں اور مچاتے ہیں لیکن انسان کا نام اُس کے کام سے ہے۔ آج جو ہم مروت کو یاد کر رہے ہیں تو کیا اُن کی اولاد اور ملاقات اور ہوا و ثروت کی وجہ سے؟ ہرگز نہیں یہ سب آبی مانی چیزیں ہیں بلکہ اُن کے گیر گریز اور کام کی وجہ سے۔ اُن کا گیر گریز اور کام خود ہیں اُن کی یاد دلا رہا ہے۔ اُن کی محبتیں اُن کے کارنامے اور اُن کے احسانات اُن کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ بیش بہی ایک چیز ہے جو مروت کو زندہ رکھے گی اور یہی ایک چیز ہے جو دنیا میں اللہ کے نیک بندوں کو زندہ رکھتی ہے۔ میں اُن کی محبت کو قومی حادثہ سمجھتا ہوں۔ اُن کے جوہر سے ہمیں بڑا سہارا تھا۔ ہر ملی وادبی کام میں ہم اُن کا نام سب سے

[illegible]

بہت سے کام کچھ لیکن دنیا میں یادگار دیکھی نہیں گئے ہیں کا اثر دوسروں کے قلوب اور دماغوں تک پہنچے گا۔ اور یہ اُن کی حقیر بریں ہیں جو اُن کے قلم سے نکلیں، تنگ میں پھیلیں اور سورت کی روشنی کی طرح ایک سرے سے دوسرے سرے تک حیاتِ عالم میں اپنا مفید کام کرتی رہیں گی اور مرحوم کی یاد کو اُن کے قد و اُن کے دلوں میں تازہ رکھیں گی۔

جو لوگ یہاں کامیابی اور عزت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں انھیں مولوی (عبداللہ) مرحوم کی مثال پیش نظر رکھنی چاہیے اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زمینِ شور میں قبلہ رانی کا مقبرہ سوائے ندامت کے کچھ نہیں۔ انھیں مولوی (عبداللہ) مرحوم کی طرح اُس زرخیز زمین میں غم ریزی کی کوشش کرنی چاہیے جس کے نتائج اب تک بارور ہیں اور جس کی وجہ سے اُن کا نام ہمیشہ عزت و حرمت کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔

بارے دنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو

ایسا کچھ کر کے چلو، یاں کہ بہت یاد رہو (نیسر)

وہ ہم میں نہیں رہے لیکن وہ اپنی زندگی کا ایسا عظیم انسان کا نام چھوڑ گئے ہیں جو اسے ایسے مفید ہدایت ہے۔ اُن کی رائے میں کہیں کہیں غلیاں بھی نہ آئیں گی۔ لیکن اُن کے خلوص و صداقت اور راست کرداری میں مطلق شک و شبہ کی گمانش نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کی اصلی ترقی و مادی قوت پر منحصر ہے۔ دولت اس کی محض معین ہے۔ انسان کی روح کو اگر ایک گاڑی تصور کیا جائے تو یہ جوڑی اس کو کھینچنے والی ہے، لیکن اگر اس کی باگِ عقل کے ہاتھ میں ہے تو یہ زمین تو کیا ملک و مملکت تک پہنچ جائے گی، لیکن خدا خواستہ اگر اس کی باگِ عقل کے ہاتھ سے چھین لی جائے تو وہ پاش پاش ہو جائے گی۔ لیکن ہم اُن کی (آخر) زندگی سے متعلق اس سے زیادہ نہیں کہیں گے کیونکہ اب وہ وہاں ہیں جہاں ہماری آواز نہیں پہنچ سکتی اور جو کچھ انھوں نے چھوڑا ہے وہ ایسا کچھ ہے کہ اُس کی نظیر نہیں.....

..... دنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بدی۔ اسی طرح نہ انسان بے عیب ہوا ہے نہ جوہر۔ دیکھنا یہ ہے کہ جب کسی شخص میں ایسی خوبیاں ہوں جو عام طور پر دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور جن کا ہونا محاسبات اور فرائض میں سے ہے تو ایک ایسے شخص کا ہم جسے اُٹھ جانا کیسے کچھ سنج اور کیسے کچھ اُلم کا باعث نہ ہوگا۔ زمانے کی ترقی کبم نکلتی نہیں اس کا قدم ہمیشہ آگے پڑتا ہے ممکن ہے ہم میں بہت سے لائق اور فاضل لوگ پیدا ہوں یہ سب کچھ ہوگا مگر (مولانا عبداللہ) کہاں! اُن کی باتیں فلسفے کے طور پر رہ جائیں گی اور مدتوں اُن کا ذکر کر کے لوگ انھیں یاد کریں گے۔

دو رکھنا یہ کہ صاحبِ دلے پیدا شو

بازیدانہ رخاں ہا او پس اندر شدن

..... وہ ہم میں ایسے تھے جیسے پودوں میں دیو۔ افسوس ایسی نسلیں ہم سے متنی جاتی ہیں۔ عظیم انسان چیزیں گو

لی لاکھ کے گھینے کی سکت اور صامت ہوں کیلئے صرف اُن کے دم دہی سے دُنیا پر اس قدر اثر پڑتا ہے جو جیسے ٹہرے کاموں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ تاروں میری رات کو جب ہم نیگروں آسمان پر نظر ڈالتے ہیں جس کی دُست کی کوئی انتہا نہیں تو کیا ہماری لہ دماغ پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑتا؟ جب ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر اس کی وسیع سطح اور بے پیمان موجوں کو دیکھیں ہیں تو کیا اس سے قلب پر عجیب کیفیت پیدا نہیں ہوتی؟ یہی حال اُن، وسیع النظر عالی دماغ لوگوں کا ہے، گو وہ کچھ نہ کہیں لیکن اُن کا اثر نہایت پر زور اور عجیب و غریب ہوتا ہے۔

آئینہ زمانے میں (اُن کے بعض بڑے تخت دوست انھیں) ایک شاندار انسانی کھنڈر دکھا کرتے تھے۔ جیسے کیا کھنڈر ہم کو حیرت نہیں جوتے؟ کیا کھنڈر روں کی وقت ہمارے دلوں میں نہیں ہوتی؟ کیا ہم گرا کر کہتے ہیں کہ کسی زمانے کی وہ زندہ نہیں ہوئے؟ کیا کھنڈر روں کی وقت ہمارے دلوں میں نہیں ہوتی؟ کیا ہم گرا کر کہتے ہیں کہ کسی زمانے کی وہ زندہ نہیں ہوئے؟ کیا کھنڈر روں کی وقت ہمارے دلوں میں نہیں ہوتی؟ کیا ہم گرا کر کہتے ہیں کہ کسی زمانے کی وہ زندہ نہیں ہوئے؟

تیار اور مشافہہ دُور سے آئیں گے اور وہ آنسو بہا جائیں گے! مرحوم بھائی قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی اُن پر قلم تھی۔ چہرے سے شرافت بڑی لادشفتت نکلتی تھی اور دل کو اُن کی طرف کشش ہوتی تھی۔ اُن کے پاس مٹینے سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔ اُن کی ذہنت چمکتی تھی اور علم و فاضل کو دیکھ کر دل میں عزت و احترام پیدا ہوتا تھا اور جب اُن کی شرافت نفس عالی طرف نشست دوستی اور خود داری کو دیکھتے تھے تو دل بے اختیار اُن کی طرف کھینچا تھا اور اُن سے محبت ہونے لگتی تھی۔ ایسے لوگ جن سے ہر شخص مذکر تا جب اُن سے ملنے تو اُن کے مٹن سوک اور محبت کا کھڑ پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔ وہ پزلے و سبے کے ٹکٹے ہیں جو دُوروں کی عیب گیری کیلئے بنائے ہی نہیں اُن کے ڈمک یہاں اگر گر جاتے تھے۔ اخلاق اگر کیکنے کی چیز ہے تو وہ ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں آسکتے ہیں ورنہ دُنیا میں پند و نصائح کی کمی نہیں، دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں، کیسا ہی بُرا زمانہ کیوں نہ ہو، دُنیا کبھی اچھل سے خالی نہیں ہوتی۔ اب بھی بہت سے صاحبِ علم و فضل، اکمالِ ذی و جاہت، نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں۔ مگر افسوس کہ کوئی (عبدالحق) نہیں!۔

اُردو کا قدیم ترین ادب

ڈاکٹر سہیل بخاری

اُردو ادب کے موزیں اپنی بات کی ابتدا حضرت امیر خسرو دہلوی سے کرتے ہیں اور کچھ کہ مکر نیوں۔ دو مخمزل اور پھیلوں کا ذکر کرنے کے بعد ایک غزل بھی اُن کے نام سے منسوب کرتے ہیں جس کا مطلع ہے "ز حال مسکین مکن تغافل درائے نیاں بنائے تیان" اس کے فوراً بعد وہ دہلی سے سیکڑوں میل دور دکن پہنچ کر بجا پوری شعرا کا کلام سناتے ملتے ہیں۔ لیکن ان کی اس سلسلہ بندی سے ادب کی تاریخ میں جو جھول پیدا ہو جاتا ہے وہ ایسا نہیں ہے جسے آسانی سے نظر انداز کیا جاسکے۔

حضرت امیر خسرو دہلوی کے فارسی کلام سے یہ مزور ثابت ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ہندی زبان میں بھی طبع آزمائی کی تھی لیکن اس بات کی کوئی داخلی یا خارجی شہادت نہیں ملتی کہ وہ جس زبان کو ہندی کہتے ہیں وہ یہی زبان ہے جسے بعد میں زبان اُردو یا زبان اُردوئے متلی کا نام دیا گیا۔ نہ ان کا ہندی کلام ہی کسی مخطوطے یا مطبوعہ کتاب کی صورت میں ہم تک پہنچ سکا ہے جس سے اُن کی زبان کے منطلق کوئی حتمی فیصلہ کیا جاسکے البتہ ان کا وہ ہندی کلام جس کا اُوپر ذکر کیا گیا روایتاً اُن کے نام سے منسوب چلا آ رہا ہے جس کی حیثیت ابھی تک محض الحاقی ہے۔ جب سے حافظ محمود شیرانی نے اپنی تحقیق کے بعد یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ خالق باری حضرت امیر خسرو کی نہیں بلکہ مالگیری عہد کے ایک بزرگ خسرو نامی کی تصنیف ہے اس وقت سے حضرت امیر خسرو کا مندرجہ بالا ہندی کلام بھی مشبہ ہو گیا ہے۔

اس الحاقی کلام کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہے جو اس شعبے کی تقویت بخشتی ہے۔ چنانچہ ان کی مشہور غزل "ز حال مسکین" کا اگر سانی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس کی زبان اُردو نہیں برج بھاشا ہے۔ یہ مزور ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے اُردو کو برج بھاشا سے مشتق بتایا تھا لیکن یہ بات حافظ محمود شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اُردو" کی تصنیف سے پہلے کی ہے۔ اس لحاظ سے ادب اُردو کی تدینوں میں اس غزل کے تذکرے کا کوئی جواز نہیں ہے اور کہ مکر نیوں اور پھیلوں پر ابھی تحقیق کی ضرورت ہے کہ کہیں یہ بھی انھیں بزرگ خسرو کی تصنیف نہ ہوں جنھوں نے خالق باری لکھی ہے۔ البتہ تاریخ ادب میں ان کو اس وقت تک بگڑ دی جاسکتی ہے جب تک کہ وہ تحقیق کے کسی غیر کی ثابت نہ ہوں۔

ان موزوں اُردو کے پاس جو حضرت امیر خسرو کے بعد تاریخ ادب کا سلسلہ بجا پوری شعرا کے کلام سے ملاتے ہیں اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے کہ اگر اُردو دہلی کی قدیم زبان تھی اور وہاں اس کا اس حد تک چرچا تھا کہ حضرت امیر خسرو جیسے شاعر اس میں پیدا ہونے تو پھر ان کے بعد اُردو شعر گوئی کی روایت دہلی میں بیکامیغ تم کیوں ہو گئی۔ متداول کتب تاریخ میں ہندوستانی کی باقاعدہ شاعری دبستان دہلی سے شروع ہوتی ہے جس کی صحیح نائندگی اُردو، اُردو، مظهر یا ناناں وغیرہ کرتے ہیں لیکن یہ تو حضرت امیر خسرو کی وفات کے تین سو سال بعد پیدا ہوتے ہیں۔ جو موزیں اُردو تاریخ کے اس طویل خلا کو بجا پوری شعرا کے کلام سے پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں

یہ نہیں بتائے گا کہ ادبی ہے اور ادبی کی حجم مجہول کہا جاتا ہے حضرت امیر خسرو کے بعد اردو شاعری کے نیاک سوجانے اور پھر نئی سوسالی
بعد اپنا ایک بیدار سوجانے کے وجہ کیا ہیں۔

یہاں سننے کا یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ گورنمنٹ ادب بیا پوری شرا کے جس کام کو تاریخ ادب میں شامل کر رہے ہیں وہ اردو
بیا پوری زبان میں ہے۔ یہاں بعض بلائیں پر گراں مزدور سے کی اور وہ محض سخن پروردی یا دوسری صنعتوں کی خاطر اس کو تسلیم کر لے رہے
گاری جوں کی کھینک یا کیا جائے کہ حقیقت بھی ہے۔ میں نے "اردو نامہ" کراچی کے اشعار حویں شمارے میں نہایت تفصیل سے ساقی تہذیب
لکھے اردو ادب دکنی دھول کے کثیر تعداد اختلاف رائج کر دیے ہیں اور یہ جتا دیا ہے کہ ہم نے تاریخی تسلسل قائم کرنے کی کوشش میں وقت
کی تسلی کو جس مراد سے چٹا چاہا ہے وہ اتنا کردہ ہے کہ اس پر سے گزرتا تو دیکھنا اس پر کھڑا جو نامی نامی ہے اس لیے اب ادبی کی شکر گوئی کے
اس بار کی تسلی کی تشریح دکنی شرا کے کام سے نہیں ہوسکتی۔

اس مقام پر جس کام غور غمی کا اظہار کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ بیا پوری بولی جس زبان کی قدیم شکل ہے ہماری بولی پالی اس کا جدید
روپ ہے یعنی ہماری زبان اور بیا پوری میں جو جدید و قدیم کا رشتہ ہے نہیں بیا پوری کو قدیم کہنے والے شاید اس حقیقت سے بہ غبر ہیں کہ
بیا پور میں آج بھی وہی زبان بولی جا رہی ہے جس میں قدیم دکنی شرا وادبانے آج سے چار سو سال پہلے اظہار خیال کیا تھا اور جسے چارے
مرد بھی اڑھنے قدیم کا نام نہتے تھے۔ آج اسی زبان میں وہاں کوئٹہ گائے جا رہے ہیں اور لوگ اپنے اپنے گھر میں اور بازاروں میں سی
بولی سے کام چل رہے ہیں اسی لیے یہ زبان جس قدر قدیم کہنے کی تسلی ہے اسی قدر اسے جدید بھی کہا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف ہماری
زبان (اردو) میں قدر جدید ہے اسی قدر قدیم بھی ہے جگہ اس زبان کا سرخ جو ہم آج کل بول رہے ہیں آج سے چار سو سال نہیں بلکہ
پچھ سو سال تک بھی مل جاتا ہے جیسا کہ سحرزائندہ میں ظاہر ہو گا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک طرف تو لوگ امیر خسرو کی پسیوں اور کہ مکرچیا
کو جو قدیم دکنی شاعر ہیں بھی قدیم تر ہیں اردو زبان کے او میں نوٹے کہتے ہیں اور دوسری طرف دکنی کو اردو کے قدیم بھی ماننے
جا رہے ہیں حالانکہ ہماری بولی پالی دکنی کے مقابلے میں امیر خسرو کی مذکورہ بالا تفصیلات سے بہت قریب ہے۔ ایسی صورت
میں دکنی کے بجائے امیر خسرو کی زبان کو اردو کے قدیم کہنا زیادہ معتدل معلوم ہوتا ہے۔

خود دکنی کے بعض شرا و مصنفین نے بھی اس وقت کی تائید کی ہے کہ دکنی اور اردو دو مختلف زبانیں ہیں چنانچہ مولوی محمد باقر
آگاہ دیوری نے اپنے رسالے "مکمل درپن" (اس کی تصنیف ۱۲۰۹ھ میں جو مجازات نبی کریم سے متعلق مسکرات ذراجم کرتا ہے
اس خیال کو یوں واضح کر دیا ہے۔

اگر بجائے میں اردو کے میں گتا

کرتی اس کو یہاں کے لوگوں سے نہ جتا

ماہنامہ "قومی زبان" کراچی اپریل ۱۹۹۴ء کے صفحہ ۲۱ پر اس تمام کی عبارت یہ ہے :

"انہوں نے اسے آسان دکنی زبان میں لکھا ہے جسے وہ اردو نہیں کہتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان

کے خیال میں دکنی و اردو دو جدا جدا زبانیں ہیں۔"

حقیقت حال یہ ہے کہ اردو ادب کے متعلق ہمارا ایک مخصوص نظریہ قائم ہو گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اردو صرف اس زبان کو تسلیم کرتے ہیں جو ایرانی لپی میں لکھی جاتی ہے اور ایرانی لپی مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی ہے۔ اس لیے اس زبان کا جو ادب مسلمانوں کی آمد سے پہلے دیوناگری لپی میں لکھا جاتا ہے ہم اپنے ادب میں شامل نہیں کرتے۔ دوسری طرف ایرانی لپی کا بجا پوری ادب اردو ادب کے زیادہ قدیم اور لائق اعتبار میں ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان کو قلم بند کرنے کے لیے ایرانی لپی کا استعمال مسلمانوں کی آمد کے صد ہا سال بعد ہوا ہے جبکہ بجا پوری میں مقامی زبان ابتدائی سے ایرانی لپی میں منتقل ہو چکی تھی۔ شمالی ہندوستان میں فارسی زبان سن ۱۸۳۲ء تک سرکاری اور دفتری کاروبار میں کاواہ ذریعہ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی فارسی زبان کے متاثرہ میں جسے سرکاری پشت پناہی حاصل تھی اردو زبان کی طرف لوگوں نے بہت کم توجہ دی اور ان کی اس کا جو حقوذا بہت سرایہ جمع بھی ہوا تو وہ انفرادی کاشتوں کا نتیجہ تھا لیکن دکن میں بجا پوری زبان کا ابتدائی سے سرکاری منصب مل گیا تھا اس لیے اسے حکومت اور عوام دونوں کی سرپرستی یک وقت نصیب ہو گئی تھی۔ غرض یہی ہے کہ اس مشترک نے ہمارے ادب میں ایک خلائی کو جنم دیا اور ہم بجا پوری ادب کو اڑھائے قدیم کہنے لگے۔

اردو ادب کا یہ نظریہ جس کی بنیاد پس پر قائم کی گئی ہے ساقی اقتدار سے بالکل باطل ہے کیونکہ زبان روح ادبی اس کا جسم ہوتی ہے اور جس طرح جسم کی تبدیلی سے روح کی ماہیت نہیں بدلتی اسی طرح لپی کے فرق سے زبان کی ماہیت میں فرق نہیں آسکتا۔ اس سلسلے میں خود ہمارے خیالات میں ایک عجیب تضاد ظاہر ہے کہ ہم نہ صرف اس ایرانی ادب کو جو عربی لپی میں لکھا جاتا ہے ایرانی تسلیم کرتے ہیں بلکہ اس سرائے کو بھی ایرانی مانتے ہیں جو ایران میں مسلمانوں کے درود سے ہزاروں سال پیشتر جمع ہو چکا تھا لیکن جب اردو ادب کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو فوراً اپنا موقف تبدیل کر کے دیوناگری لپی میں جمع ہونے والے اردو زبان کے ادب کو سنسکرت یا ہندی وغیرہ کہہ کر اپنی تاریک سڑک سے خارج کر دیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ جس طرح ایران قدیم میں مسلمانوں کے وہاں پہنچنے سے قبل خالص ایرانی ادب کے نمونے ملتے ہیں اسی طرح ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی آمد سے پہلے خالص اردو کے ادب پاسے دستیاب ہوتے ہیں جو تاریخ ادب اردو کی تکمیل کے لیے اسی طرح ضروری ہیں جس طرح قدیم ایرانی نمونے تاریخ ادبیات ایران کا اہم جز ہیں۔

تاریخ ادب کی اسی کمی کے باعث زبان اردو کی ابتدا کے بارے میں بھی بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں کیونکہ محققین دمو نہیں نے تحقیق و تاریخ زبان کی بنیاد اسی ادب پر قائم کی جو ایرانی لپی میں دستیاب ہوتا ہے چنانچہ اردو کا آغاز باعزم شاہ جہانی عہد سے کیا جاتا ہے جبکہ اردو کے متعلق کے حالات کی نسبت سے اس کا نام زبان اردو رکھا گیا اور نمونے تو اس کے بھی بعد کے زمانے سے شروع ہوتے ہیں۔ محدثین نے امیر خسرو کو اردو کا پہلا شاعر ضرور مانا ہے لیکن وہ امیر خسرو کے بعد کے زمانے دہلی تک ہندوستانی کی اردو کے نمونے پیش کرنے سے قاصر ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور بیانی عہد کے نمونے دیوناگری لپی میں ملتے ہیں جو تک ان کی نظر نہیں گئی یا اگر ان کی نظر پڑی بھی تو انہوں نے انہیں اس لیے نظر انداز کر دیا کہ وہ صرف ایرانی لپی میں ہی لکھی جاتی زبان کو اردو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں قدیم دیوناگری خطوطات و مسموعات کی جستجو از حد ضروری ہے کہ تاریخ ادب کی صحیح تکمیل صرف اسی طرح ممکن ہو سکتی ہے۔

موصول اردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں جسے ہر مہذبہ ان کے کڑی لپولی کا نام دیتا ہے۔ ان کے موجود

دعویٰ میں دو فرق واضح ہیں۔ ایک یہی اور دوسرا ذیل خط۔ ہندی دیوناگری ہی میں لکھی جاتی ہے اس لیے اس میں سنسکرت الفاظ کی کمی ہو گئی ہے اور اردو نے ایرانی ہی میں تحریر ہونے کے باعث بے شمار عربی فارسی الفاظ مستعار لیے ہیں لیکن علم زبان کے لحاظ سے دونوں کے یہ اختلافات قابل اہمیت نہیں کیونکہ ان سے زبان کی بنیادی خصوصیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس نقطہ نظر سے ہندی اور اردو کی تاریخ ایک ہی ہے خاص کر کھڑکابولی کی قدیم تاریخ اردو زبان کا بھی ایسا ہی اہم حصہ ہے۔ جیسا ہندی زبان کا اور اس کے قدیم ادب میں سنسکرت یا دیگر مصرعویوں کے مستعار الفاظ کی موجودگی کے باوجود اسے اردو نے قدیم اسے بھرپور دیا ہے۔

میں نے سطور ذیل میں اسی کھڑکابولی کے کچھ قدیم نمونے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمارے ادب کے اجڑائے ہوئے ہیں اور صرف ایسے ٹکڑے منتخب کیے ہیں جن میں سنسکرت الفاظ کم سے کم اور عربی فارسی الفاظ زیادہ سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ان کے باوجود اگر کہیں سنسکرت الفاظ کا تعداد زیادہ نظر آئے تو اسے غور و فکر کی بجائے میری قوش کی کمی سمجھنا چاہیے کیونکہ میں نے کچھ شعرا کا ذکر اس علم کے باوجود کر دیا ہے کیونکہ ان کے شاعرانہ فن اس وجہ سے نہیں کیا کہ ان کا کلام میرے سامنے نہیں ہے۔ ان کے علاوہ ابھی ایسے بہت سے شاعروں کے نام بھرا رہ گئے ہیں جن کی دریافت مزید تحقیق کی محتاج ہے۔ چنانچہ جب تک ان تمام شعرا کا مکمل کلام سامنے نہ ہو نہ غور و فکر واقعی انتہا ہو سکتا ہے نہ اس ادب پر صحیح تنقید ہی ہو سکتی ہے۔

میر تقی نے مقدمہٴ باغ و بہار میں زبان اردو کی ابتدا عبدالکبریٰ سے کی ہے لیکن میں اپنی لنگھو کا آواز حضرت امیر خسرو کے حصے ہی کرتا ہوں کہ ہمارے مورخین اردو زبان کا پہلا شاعر مانتے ہیں۔ امیر خسرو کے زمانے میں مٹھ دیس کے ایک نامور درویش گیانیشر نامی گڑھے میں جو موجودہ مٹھی (دکن) سے چار کوس پر دریائے گواوری کے بائیں کنارے گاؤں میں سن ۱۱۶۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے آج کل چار کتابیں ملتی ہیں جن میں بھگت گیتا کی شرح جو انھوں نے گیانیشری کے نام سے لکھی تھی بہت مشہور ہوئی۔ ان کے اردو کلام کا ایک نمونہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

سو ہی تپا کے بے پتا دے نہیں مگر د کا بچا
دنیائے کرکھا (خاک) لگانی جا کر بیٹا ہی موی
کچھ مرہ۔ ابھرا میں دھیان دھرت ہے موی موی
چرخہ کر کے اور کھڑی جوگ بھگت میں ساری
دھم کا موی اوکھنہ تیاگے جوگ کیا بھاری
بھگت ہونے کر پڑت ہوئے کوکل متراکاسی
نہ ہونے ہی پران جو نکلے سیدوک کے باسی
شاستروں میں تو نہیں رہا کچھ پران لگایا
بھید برہمی کا ارگ پتا تھا کاٹھا کاٹھا
کٹائی کوئی کھوب (خوب) پڑھا ہے برہم رند مگر جو دے

چلت ہے پانی کے اوپر ہمت سو ہی ہو دے
حکم فرمائی گا گینشور کون تو کون اور چہا نا
سدرگو کی جان کر پابھی تان آپ ہی آپ پچھانا

اس نمونے میں کچھ الفاظ سنسکرت کے ہیں کیونکہ دیوناگری لپی کے اشتراک کے باعث ہندوستانی زبانوں میں سنسکرت کے دخل
لفظ کا پایا جانا فطری ہے ان کے علاوہ چند الفاظ برج بھاشا کے بھی بیانیگی سے نظم ہو گئے ہیں جن کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ برج بھاشا
در اردو دونوں زبانوں کے مدار اشتراک سے تعلق رکھتی ہیں اور اس لیے انھیں کافی اور زانی قرب ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ دوسری
وجہ یہ بھی ہے کہ گینشور ایک بھگت تھے اور بھگتوں کا کلام باخ و بہار زبان میں ملتا ہے۔ بہر حال ان تھوڑے سے لفظوں کو چھوڑ کر
بہرے نظم میں اردو کا شائعہ قائم ہے بلکہ اس میں کچھ فارسی اور عربی کے لفظ بھی موجود ہیں جو اس ابتدائی زمانے میں ہندوستانی زبانوں
میں ان کے اثرات ثابت کر رہے ہیں۔ اس نظم کا شعرا نے بیجا پور کے کلام سے موازنہ کر کے دیکھے جو گینشور کے بعد کے
زمانے میں گزے ہیں اور پھر فیصد کیجیے کہ ان میں سے کس کی زبان کو اردو کہا جا سکتا ہے۔

گینشور کی ایک بھی کتابائی بھی مرہٹی زبان کی شاعرہ تھیں جو ان سے عمر میں چار سال چھوٹی تھیں۔ ان کے کلام میں بھی اردو
بان کا دخل ملاحظہ فرمائیے۔ نمونہ یہ ہے۔

واہ واہ صاحب جی سدرگو دلال گسائی جی

فل بیچ میں ادلا کالا اونٹھ پیٹھ سون کالا

پیت امنی بھر مرگمچا رس جھونے واہ

سسر دل موہا لکھی کھائے آج لون پرانا

جاں تہاں سادھو دسوا آپ ہی آپ ٹھکانا

سدرگو چیلے دونوں برابر ایک ساموں بھائی

ایک سے ایسے درس پانے ہمارا کتا بائی

اب یہاں سے بھگتوں اور سنتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان میں نام دیو کا نام سب سے پہلے آتا ہے جو گینشور کے

سامرا و ذات کے درزی تھے۔ ان کے اردو کلام ملاحظہ کیجیے:

میں اندھلے کی ٹیک تیرا نام کندھ کارا (خداوندگار)

میں گریب میں میکیں تیرا نام ہے ادھارا

آج نامے میٹل دیکھا مودک کو سمجھاؤں رے

پانٹے تری گا تیری دودھ کا کھیت کھاتی تھی

نے کر لیجھا گھٹی قدی دھت و دھت ہاتی تھی
 پائے ترو مارو دھوے بد چڑھا آوت دیکھتا
 مودی کے گھر کا اپا دادا کا لڑکا مارا تھا
 پائے ترو مارا چند سو بھی آوت دیکھتا
 ماویستی سر بہ ہونی گھر کی جونی گھوئی تھی
 نام دیکے بعد ان سادھویں میں کیر داس کا نام بہت مشہور ہوا۔ یہ قوم کے جو ہے تھے۔ بارہا ان کا موصاف گھر (نسل) بتا
 ہوا۔ ان کی جانے وفات ہے۔ ان کے مرنے کے متعلق مرنے میں شدید انقطاع تھا ہے۔ بہر حال ان کا زمانہ سن ۱۳۹۹ء سے ۱۴۰۰ء
 تک رہا جاسکتا ہے کیونکہ یہ سکندر لودھی کے معاصر تھے۔ ان کا نونہ کلام یہ ہے:

برہ کی چٹا مٹی مرے من میں بیدار کیا تھی سارا
 اوشدھ مول کچھ نہیں دھنے کیا کرے بیدار

ہڑبے جیسے لڑائی کا ترہہ نہیں ہے جیسے گھاس کا پروہ

بات نہ پوچھو سادھو کی پوچھ پیتے گسلاں مول کر دو ترواد کا پڑا رہی دوسیاں

بید کیتب افزا بھائی دل کا فکر نہ جانے ملک دم کراری جو کرو عاشر حضور خندائے

سب آئے اس ایک میں ٹارپاٹ پل پھول اب کہو پاچھے کیا رہا کہ پڑا جب مول

سم درشتی ست گرہ کیا میٹا بھرم بکار جان دیکھو تان ایک ہی صاحب کا دیدار

رام سر پچھتا نے گامن

پانی جیٹا او بھرت ہے آج کال اٹھ جانے کا
 وہاں دھے جنم گھوایا یا بھرم بھلے کا
 دھن جو بہا کا گرب نہ کیجے لاگہ بیرون کل جانے کا
 جو جم آئے کیس گھر چلے آدن کچھ نہ بس آئے کا

سہن بچو دیا نہیں گئی تو کھر چرمان بکسے
دھرم دانے جب یگانگے کیا کھلے کے جانے کا
کمت کیر سنو دے سنتو سادہ شکت تر جانے کا

رہنا نہیں دیں برانا ہے

یہ سنار کا گد کی پڑیا بوند پڑے گل جانا ہے
یہ سنار لانت کی باڑی اُلجھ پلجھ رہنا ہے
یہ سنار بھاڑ اور بھانڈا آگ لگے رہنا ہے
کمت کیر سنو بھی سادہ سوت گرد نام ٹھکانا ہے

میں پھولا پھولا پھولے جگت میں کیا ناتارے
ماترے یہ پتر مسارا سہن لکے بر مسیرا
بھائی کے یہ بھامساری تار کے بر مسیرا
پیٹ پکڑ کے آثار دوسے بانہ پکڑ کے بھائی
پٹ جھپٹ کے تریار دوسے سہن اکسیرا بھائی

ہمیں ہیں عشق مستانہ حسن کو ہوشیاری کیا	رہیں آزاد یا جگ میں حسن دُنیا سے یاری کیا
جو پھرے ہیں پیارے سے بھلتے در بدر پچتے	ہمارا یار ہے ہم میں حسن کو استغاری کیا
خلق سب نام اپنے کو بہت کر سر رکھتا ہے	ہمیں گردِ دام سا نچا ہے ہمیں دُنیا سے یاری کیا
نہ پل پکڑے پیام سے نہ ہم پکڑیں پیام سے	انہیں سے نہ لگی ہے حسن کو بے قراری کیا
کیرا عشق کا آقا دُونی کو دُور کر دل سے	جو چلنا راہ نازک ہے حسن سو بوجھ بھاری کیا

کیر کے گرد بھائی سے دس کاشی کے ایک چار خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ نے ان کے سادھو پن سے متاثر ہو کر
مہرے نکال دیا تھا اس لیے جوتیاں بنا کر کافیات بسر کرتے تھے۔ کیر داس کے بعد ان کا اتا اثر ہوا کہ جو دھپور کے راجپوت تھے
کی الوتی بی بی میرانی ان کی چلی ہو گئی تھیں۔ نوٹہ کلام یہ ہے:-

زپت ایک شگاس سویا پسے بھیا بھکاری
اچیت راج بھرت دکھ پایا سوگت بھئی بھاری

گھنٹی گرو دھمک پڑھا یاد ستر میں بھیکاری کا پڑ پھاڑ سبنا کنتھا جھولی آیا دھاری
 ٹھکر ٹھکر ناٹھے بگڑے منہ سے پیاری بھرم بھلا سب نہ چنے جوئے بازی باری
 انہیں محبتوں میں پسند حویں مدی صبری کے کرشمے سخی کا بھی نام آتا ہے جو سادہ رنگ گڑھ (پنجاب) کے باشندے تھے اور تجارت
 کی غرض سے جو مدائن شریں پہنچے تو وہیں کے ہو رہے۔ یہ مدائن بھاد پختہ کے مہینے تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

جڑ مولیٰ بن دیکھا ایک درخت گوز کا
 اس کو انت آپا گوز لگے شہر نہیں چھوڑوں کا
 زمیں آسماں برابر دیکھے دو دو چند اس درج دیکھے فلاکھ تارے۔
 چو دھا بھون ساتوں دریا ویر و پرست غدی نالے کئی مسرار

بلکتوں کے کلام کے مندرجہ بالا نمونوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قدیم زمانے کی ہماری زبان کا روپ وہی تھا جو ہم آج دیکھ رہے
 ہیں چنانچہ لوگوں نے ہر ایک مسلم بلذحاجے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں سے صرف اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو اپنے روپ علمی تصویر
 کی طرح جلد جلد بدلتی رہی ہے وہ ان تحریروں کے پیش نظر یک لخت ٹوٹ جاتا ہے۔ بہر حال سولہویں صدی کے نصف اول تک اردو زبان کے
 نوئے ہیں محبتوں کے یہاں ملتے ہیں۔ اس کے بعد تاریخ ہندوستان میں ایک نیا موڑ آتا ہے اور اگرہ سکندر رودی کے بعد ایک بار پھر مہا کبری
 میں راجہ جانی قرار پاتا ہے تو مغل حکم کے دور کی تمام رخصتیاں ادب و فن کی صورت میں ایک تمام پر جمع ہو جاتی ہیں۔ غالباً آگے کی اسی چوٹ تک
 کو دیکھ کر میرا سنے نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اردو زبان کا آغاز اکبر بادشاہ کے زمانے سے ہوا ہے چنانچہ وہ باغ و بہار کے منتہی میں کہتے ہیں۔

”جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس
 خانہ کی شہی کہ حضور میں آکر جمع ہوئے تھیں ہر ایک کی گویائی اور بولی بولی تھی۔ اکٹھے ہونے سے
 آپس میں ہمیں سودا سلف سوال جواب کرتے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔“

حقیقت صرف اتنی ہے کہ محمد اکبری میں اطراف ملک کے اہل کمال آگے میں کھٹ آئے تھے چنانچہ اس زمانے میں جہاں ادبیات فارسی
 کو ابو الفض، فیضی، عرفی وغیرہ سے اور ادومی زبان کو قسسی داس اور ملک محمد جاسسی سے اور برج بھاشا کو سور داس جیسے عظیم شاعروں
 اور اٹاپر دازوں سے فروغ ہوا وہاں اردو زبان کے پرنے کو بھی اس وقت کی آب و ہوا داس آئی اور اس کے کچھ سرپرست پیدا
 ہوئے چنانچہ برج بھاشا میں شعر کہنے والے کبھی کبھی کھڑی بولی یعنی اردو میں بھی طبع آزمائی کر لیا کرتے تھے۔ یہی حال شرمی بھی ہے کہ ایک
 ہی کتاب یا عبارت میں اردو اور برج بھاشا دونوں شیر و شکر نظر آتی ہیں۔ چونکہ برج بھاشا بھی فرقہ واولوں کی مذہبی زبان بن گئی تھی۔ اس لیے ان
 کی مذہبی کتابوں میں ایسے نمونے ملتے ہیں جہاں برج بھاشا کے ساتھ ساتھ اردو بھی استعمال کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ اس دور میں جن شاعروں
 اور نثر نگاروں کی تخلیقات ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان کو مذہب کے علاوہ دوسرے موضوعات پر اظہار خیال کیلئے بھی استعمال کیا
 گیا ہے لیکن دیوانگری لپی کے باعث بعض نظموں میں سنسکرت الفاظ کی بھر مار ہے۔

یہاں میں اس حمد کے جن شعر کا اردو کلام پیش کرنا چاہتا ہوں ان میں عبدالرحیم خاں خاں کا نام سرفہرست آتا ہے جو محمد اکبری

کے ایک بہت سے امیر گزرتے ہیں۔ ان کے نام پر آگے کا ایک تختہ کھڑا تھا۔ کھڑا تھا۔ ایک ایک آدھلا کر رہا ہے۔ ان کا سوا دولت
۱۵۵۳ء اور سن ۱۶۲۵ء ہے۔ یہ بیرم خاں کے بیٹے اور اکبر کی دربار کے فزرتوں میں سے ہیں۔ اکبر ان کی بہت عزت کرتا
تھا۔ عربی فارسی سنسکرت 'برج بھاشا اور اردو کے اچھے عالم تھے۔ ان کی مجلس میں ملا کا جو ہم رہتا تھا۔ بڑے غیر شریف النفس اور کرشمی
کے مستحق تھے جن کی شاعری کا اصلی موضوع برج بھاشا کے بہت اچھے شاعر ہونے کے باوجود اردو میں بھی انہوں نے کچھ چھند لکھے ہیں
جوان کی کتاب دنا شک میں پائے جاتے ہیں۔ ایک چھند پیش کیا جاتا ہے۔

کھت وعت اور دا جو حسد جزا تھا چل چکےن والا چاندنی میں کھٹا تھا

کھت وعت پنج یو پت سید زید ابی اسیل یار سید اکبر

پرانندہ اس کا لکھی برہمن اور نوز کے باشندے تھے اور بھوآ چاریہ کے شاعر تھے۔ ان کا ذکر "چوراسی دیشنوں کی دولت"

میں ملتا ہے۔ ان کی کھڑی ہولی کا چھند ملاحظہ کیجیے۔ کرشمی کی تعریفیں کرتے ہیں۔

دیکھو ری یہ کیا بانگ رانی بہت جایا ہے سند بدن کل دل وچن دیکھت چند بایا ہے

پارل برہم اکھرباسی پرٹ نہ گھرایا ہے پرانند کرشمی کوہن چرن کل پت ویا ہے

عالم دربار اکبری کے ایک مسلمان شاعر تھے جنہوں نے "۱۹۱۹ء میں" "داد حوالی کام کنندہ" نامی نکتے کو برج بھاشا میں نظم کیا

تھا۔ ان کے کلام اردو کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے :

غم کے نصیب سے غنی ہے پیسے راج پائے عاشق عزیز کو گمان منی ال کیا

نازتے نواز کے لیک ہی نہال کیا جیونے کی جوک میں حبائی کا زوال کیا

وہ اس روز سے خواب بھا خاک ہی میں غمید نہیں غوفی یچ تیرا خیال کیا

دل لے جو آئے سودا سا بھی پاوے داتو یار دلدار ایسے سیدل کا حال کیا

اسی زمانے میں سوامی پنٹ زرنجن نامی ایک اور شاعر ہوئے ہیں جن کے کلام اردو میں بھی بھاشا کا پٹ بھی جڑا ہے۔

ملاحظہ کیجیے :

چمن دھچکا جا کے چھتے تے اچک بوت اچک چھکا ہے محوم محومت حساری کا

نس دن نس دن جب سدھ آوت نہ تے تب اپا کاسے سدھ صاحب شکاری کا

پنٹ زرنجنی امر مرنے کا سنس ایک بار بار دنام آوے نادوباری کا

بوں تو متوا اوپے دکان میں والا پور کر سپا رکھج رہے ناخاری کا

ایک اتھ سوامی پتی (مداشر) کے ایک سنت اور بنار دھمی سوامی کے شاعر تھے۔ انہوں نے شمالی ہندوستان

کا بھی دورہ کیا تھا چنانچہ یہ کچھ دن لاشی میں بھی رہے اور وہیں انہوں نے اپنی کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان کا محدثہ بتایا جاتا

ہے۔ ان کی اردو شاعری کا نمونہ یہ ہے :

اللہ رکے گا دیا رحمت	مولا رکے گا دیا رحمت
کوئی دن سر پر چھتر اڑا دے	کوئی دن سر پر گھٹرا چڑھا دے
کوئی دن ترجمہ اوپر چڑھا دے	اس کا اس چٹھا دے
کوئی دن شکر دودھ پیدا	کوئی دن اللہ ماتحت جہا
کوئی دن سیرک ہاتھ جوڑ کھڑے	کوئی دن نیچک نہ آوت ٹھڑے
کوئی دن راجہ بڑا ادھکاری	ایک دن جوئے کشال بھکاری
ایک جہنار دی کرت کرتاری	عقل کیوں کرتا مسندوری
دیو چھنال کا چھنال کا	کھیل کھڑی بانیا
چھنڈ بڑا سکھر کو بانٹا	جا کر جھوکے میں بیٹا
بڑا دھوم کا داتا	نہیں بات پات کچھ نانا
ایک ناتھ کا دالی	یا سے کوئی دیوے مالی

دل کی گمانٹھ کھو لو	یار و رام نام بو لو
کوئی نہیں آدے ساتھ	بھنڈے کا ہے کون کے بات
جو روڑکے ماں باپ	سب پیارے ہاتھ
بھتی گھوڑے پاکھینا	نہیں آدے ساتھ
دو دن کا ہزار یارو	کا ہے کون کرتا بات
جھوٹی مایا جھوٹی کایا	جھوٹا سب دن رات
ایکا جہنار دی بولے بھائی	کوئی نہیں آئے ساتھ

حضرت بھولا مولا	سب دُنیا پالنے والا
سب گھر میں ساٹھیں برابر	کرت ہے بول بالا
غریب فواذ میں غریب تیرا	تیرے چرن کون رت والا
اپنا ساتھی سمجھ کے لینا	سلیل و دہی والا
جن روپ سے ہے جگت پیدا	و دہی سلال اتو

جنی جہنار دی ایک ناتھ سوامی کے گرد بھاٹی۔ جہنار دی سوامی کے پیٹے اور ہار اشٹکے رہنے والے تھے اور بھاپور

بن حیدر کے اُن کی تاریخ و مدت سن ۱۶۰۱ء ہے ان کا بھی کچھ کام اُردو زبان میں ملتا ہے مثلاً

جب تو آیات کیا لایا کیا لے جانے کا
کہنے بلایا جو نسا و حند حارث یا چندا دیکھت کیا ہوا خدا
کنت جنار و نسا اے کسی نہ چھوڑ اس سائیں کے چرن

اس حمد کے سنتوں میں داد و دیال کا نام سب سے نمایاں ہے۔ یہ ۱۵۳۳ء میں احمد آباد (بھارت) کے ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے اور ۱۵۵۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ہندوستان کا داد و چندا نہیں سے چو ہے۔ بے پردی فوج کے ناکام انھیں کے ہندو سے نفرت رکھتے تھے۔ یہ اُردو، پنج بھاشا، فارسی، گجراتی، اردو اڑی اور برہمنی کے عالم تھے۔ ان کی زندگی بیشتر راجپوتانے میں گزری ہے اس لیے ان کی زبان پر پنج بھاشا اور راجپوتانی کا زیادہ اثر ہے کہیں کہیں گجراتی اور راجپوتانے میں بھی موجود ہے۔ دیکھنے کا نمونہ دیکھ فرمائیے۔

عشق اللہ کی ذات ہے عشق اللہ کا رنگ	عشق اللہ اوجہ ہے عشق اللہ کا رنگ
عاشق معشوق ہو گیا عشق کا دے سونے	داد و اس معشوق کا اللہ ہی عاشق ہوئے
سب آیا اس ایک میں ڈال پان پل پھول	داد و پیچھے کیا۔ واجب پنج پھول
کاٹھنہ سندھ کا نیچے کیے پاؤ	داد و تین حلاق دے بھادوی تیر ہر باؤ
جب سائیں کو سہرہ کیا تب سر دھرا آوار	یوں داد و جوت سے حرص و ہوا کو مار

حمد اکبری کے ایک مشہور شاعر و صنعت نگار برہمن بحث نے اُردو نثر میں بھی ایک کتاب "چند چہند ورنی کی مہمان نامی

لکھی تھی۔ اس کا نمونہ یہ ہے :

۱۰۔ شری شری شری ۱۰۰ شری شری پات ساہی شری دل پت جی اکبر ساہی ام کاش (عام خاص) میں
تخت (تخت) اوپر براہمان ہوئے اور ام کاش بھرنے لگا ہے جس میں تمام امر آواز آنے آنے کر نش
اکر نش، بجائے بجائے جو بار کر کے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جایا کریں اپنی اپنی محل سے۔ جن کی جگہ نہیں
سریشیم کے، سے میں رسم (رسم) کی کوں میں پکڑ پکڑ کے کھڑے تاجیم (تقییم) میں رہیں۔
۱۰۔ اتنا سن کے پات ساہی شری اکبر ساہی آد (آدھ) سر سونا زبرد اس چاروں کو دیا۔ ان
کے ڈیڑھ سونا ہو گیا۔ اس و پنہا پورن بجا۔ ام کاش (عام خاص) اب کاس (برخاست) ہوا
جس کا سمیت ۱۶۲۰ کاشی گھر اس سدی ۳ اگر دوار کے دی پورن بھنے۔

اکبر کے انتقال پر ہی سرسوی سدی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ ۱۵۵۵ء میں صنعت جاناگیر کو قتل ہو گیا ہے اور پھر ۱۵۵۶ء میں شاہجہاں بادشاہ بن جاتا ہے لیکن اگر بدستور پائے تخت رہتا ہے یہاں تک کہ ۱۵۵۵ء میں شاہجہاں اگر سے سے اُٹھ کر ولی بناتا ہے۔ اس زمانے کی اُردو کا کچھ حال تذکروں اور تاریخوں سے بھی معلوم ہونے لگتا ہے اور پائے تخت سے منسلک چھنے والوں کے علاوہ اطراف ملک کے ملکوں کے یہاں سے بھی اکٹھا کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ فوراً جہاں سے بھی سندھ و فیلی اشار منسوب کیے جاتے ہیں :

دیں جگہ زحیم جنا کو دل صد پاک میں ہم
نقش پاکِ سرخ اسے راحت دانی عاشق
دیکھیں مگر کچھ بھی وہاں سب سے پاک میں ہم
تیرے قدوں سے تھا ہوا کے لئے خاک میں ہم
جائیں گے بیٹے شہر یار کے اردو کلام کا بھی نمونہ دیکھیے۔

چوری سے چور ملے دل سے دلدار جو
پاندے سے چکور ملے میگو سے بھی مور ملے
جو گیوں تے جو گل ملے کامیوں تے مار جو
رو گیوں تے رو گل ملے جو گیوں تے بھول ملے
دن کا بھی پھر ملے ہو برا افسار جو
پر بت سے مسید ملے دھن سے کبیر ملے
ملے نہیں ہو سدا ہو دے ہو نہار جو
لیکن (اے) شہر یار مار یہ اعتبار

سُندر داس ایک ڈھوسہ پٹے پر پانڈ نامی کے گھر ۱۵۹۹ء میں بتام دوسرے ریاست جے پور پیدا ہوئے۔ جس وقت دادو دیال دوسرے آئے ہیں ان کی عمر چھ سال کی تھی۔ یہ اسی وقت سے ان کے چیلے ہو کر ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ کاشی میں تیس سال کی عمر تک (۱۶۱۸ء) برہمن (سنسکرت) ویدانت اور پرائی پڑھتے رہے۔ سنسکرت کے علاوہ ہندی، فارسی، گجراتی، اردو اور دیگر زبانیں بھی خوب جانتے تھے۔ ۱۶۳۳ء میں ایک اور سادھو کے ساتھ فرخ پور (شیواجی) چلے گئے اور وہیں پڑے۔ فتح پور کے فواب الف خان، دولت خانی اور طاب خان سے ان کی اچھی رسم و راہ تھی۔ الف خان بھی بھاشا کے شاعر تھے۔ سند داس فن شاعری کے ماہر تھے۔ انھوں نے ویدانت پر اچھے شعر کہے ہیں۔ ان کی مختصر تصنیفات کی تعداد ۱۰۰ سے زائد ہے۔ ۱۶۸۹ء میں بتام سانگنیر (جے پور) انتقال کیا۔ ان کے کلام ریختہ کا نمونہ یہ ہے:

سُندر جو خافل ہوا تو دوسریں دور جو بندہ حاضر ہوا تو حاضریں حضور

سُندر اندر پس کر دل میں غوطہ مار تو دل ہی میں پائیے سائیں سرجن مار
سُنی ہمارا انیسے مت کھو بے کون اور سائیں سینے یخ ہے سُندر سدا حضور
سُندر دل کی بیک پر عورت ہے اور دل اس کو جاگیا پائیے صاحب بے پرواہ

لوگ داس کو اضعاف آباد کے رہنے والے سمجھتے ہیں سُندر داس کے یہاں پیدا ہوئے جو ذات کے کٹر کھتری تھے۔ لوکپن میں کبیل بچتے گاؤں گاؤں پھرا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد بھگوت گیتا کا ورد شروع کیا۔ دُور دُور تک شہرت پھیلی اور لوگ زیارت کو آنے لگے۔ یہ دروازہ دیس کے ہاتھ تامل داس کے چیلے تھے۔ انھوں نے ۱۶۸۲ء میں ۱۰۰ سال کی عمر پا کر انتقال کیا ہے۔ کڑا (ارباب) جے پور، گجرات، پٹنہ، لاہور، پینال، کابل، قندھار اور جٹانہ پوری میں ان کے پیڑ کی خاص گزیاں رہی ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:

اگر کرے نہ چاکری پچھی کرے نہ کام داس لو کا کہ گئے سب کے دانا رام

تیرا میں دیدار دانا
گھڑی گھڑی تھے دیکھا پاہوں میں صاحب رحمان

ہوا امت خبر نہیں تہ کی سپا پر یہ سپا
ٹھاڑا ہردوں تو گر گر پڑا تیرے دمک متوا
کیس ہوک اب قضاہ کہوں دل بک سون دل ویا
تجے جتے میں دیکھا پورائے شد پایا
جہاں جہاں چھا پھرے تہاں تہاں پھرے گئے
کیس ہوک جہاں سخت جہاں ہنس دہاں دہاں

شواجی کے ساتھ تکارام کے ابھنگ بھی اردو زبان کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے ابھنگوں کی تعداد پانچ چھ ہزار کے قریب بنائی جاتی ہے۔ یہ ہمارے شہر کے باشندے اور ذات کے خود کرتے۔ سن ۱۹۰۸ء میں پونے کے قریب ایک گاؤں دھیرے نامی میں ان کی پیدائش ہوئی۔ تھارت ان کا ذریعہ معاش تھی۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ ٹھک میں قلو پڑ گیا اور ساتھ ساتھ ان کے کاروبار میں بھی خللہ آیا۔ اسی عالم نفسی دہے کسی میں ان کی بیوی نے فاقوں سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہاں دے دی تو تکارام کا دل دنیا سے اُچاٹ ہو گیا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھگت بن گئے۔ شواجی ان پر بڑا مہربان تھا۔ اس نے ایک بار انہیں برہمن کے معاملہ سے بھی بچایا تھا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ:

کیا گاؤں کوئی سننے والا دیکھیں تو سب جگ ہے بھوہ
کیسرا اپنے رام ہی ساتھ جیسی ویسی کر رہیں مات
کس سے لاؤں دھڑیانی ریگے ایسے روک پرانی
گردھروں بھاؤ کا بھوکا راگ کلا نہیں جانت تو کا

سترہویں صدی عیسوی کے دہائی میں تاج نامی کوئی مسلمان غاتوں بھی گزری ہیں جو کرشن جی کی حقیقت مند تھیں۔ ان کے خاندان اور وطن کے متعلق علم نہیں ہو سکا ہے۔ ان کا کلام زلیخا اور رسیہ ہے جس میں اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی کے بھی کچھ الفاظ ملتے ہیں۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ ان کا تعلق سرزمین پنجاب سے ہوگا۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

سنہ سنہ جانی میسر دل کی کسائی تم دست ہی بکائی نہ نامی بھی سہوں گی میں
دیو پوجب ٹانی میں ذرا جہو عہدانی تجھے کھ کر ان ساڑے گنہ گہوں گی میں
سیاہ سونا سرتاج سہ لکے دیے تیرے نیر داگ میں نہاگ ہردھوں گی میں
منہ کے کار کر باہ تاڈی سورت پے تانہ مال پیارے بہند دانی ہردھوں گی میں

پھیں جو بھید سب رہیں زلیخا بڑا چت کاڈیا کوں دیوتوں سے نیارا ہے
ال لکے سر بے تاک موتی سیست سر ہے کلاں کون ہے کھ کڈال کھ میس دھارا ہے
دشت جہاں دے ست جی رکھائی تاج چت ہت دارے پریم پریت کر دارا ہے

مسند جو کا پیارا جن کنس کو کھپ را وہ بندہ را بن وارا کرشن صاحب ہا ہے
 اسی زمانے میں اگرے کے پنڈت چند رجھان برہمن کا نام بھی سامنے آتا ہے جو داراشکوہ کے منشی تھے۔ پنڈت برج برہمن تاتر
 کہنے آبنمانی کی تلاش کے مطابق برہمن کی یہ غزل "خدا نے کس شہر اندر ہمیں کو لائے ڈالا ہے" اور دو کی پہلی غزل شاعر کی باقی ہے۔
 ۱۹۳۸ء کے آس پاس ایک اور شاعر نے دجے نامی بھی گزے ہیں جو سنسکرت کے بہت اچھے عالم تھے۔ ان سے
 ایک کتاب "دنے دوس" یادگار ہے۔ ان کا اردو کلام ملاحظہ کیجیے :

گھوڑا جھوٹا ہے سے تو مت بھولے اسوارا
 تو نے دایہ لاگت پیارا انت ہو بیٹا پیارا
 چرے چیز اور ڈرے قید سول دہلے امارا
 زمین کے تب سو یا چاہے کھالے کو ہشیارا
 خوب خزانہ خرچ کھلا دے سب نعمت چارا
 اسواری کا اوسر آدے گھیا ہوئے گنوارا
 چھن تانا چھن پیاسا ہوئے خزمت کراون مارا
 دوڑ دوڑ جنگل میں ڈارے جھوٹے دھنی بھارا
 کرو چوڑا پاتر چوکس دیو پاکب دو چارا
 اس گھوٹے کو دنے سکھاؤ جیون پاؤ بھوارا

کل تپتی مسر اگرے کے رہنے والے اور ذات کے برہمن تھے۔ ان کے والد کا نام پرش رام مسرتھا۔ ان کا سال ولادت
 ۱۹۲۰ء اور عبد تصنیف ۱۹۳۸ء بتایا جاتا ہے۔ ریاست بے پور کے راہارام سنگھ کے یہاں رہتے تھے۔ سنسکرت کے اچھے عالم
 تھے اور فی شہر گوئی میں بڑی بصیرت رکھتے تھے۔ ان کی کھڑی بولی کا چھند ملاحظہ کیجیے :

ہوں میں مشتاق تیری صورت کا تو دیکھ دل عجب پور ہے کہنے جواب سے
 مسد کا طالب فقیر ہے مہربانی پاکب جیون جیوتا ہے سوات دے آب سے
 تو تو ہے ایانی یہ خوبی کا خزانہ تے کھول کیوں نہ دیے سیر کیجے ثواب سے
 دیر کی نہ تاب جان ہوتی ہے کباب بول حیات کا آب بول تو کھ متاب سے

ماتا نامی داس ریاست کشن گڑھ (راجپوتانہ) کے راجا۔ بھی فرقتے کے گوسوامی دھچھور داس جی کے چیلے اور
 کرشن جی کے بھگت تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۸ء میں برج میں انتقال کیا ہے۔ یہ سنسکرت، فارسی، کھڑی بولی اور ڈنگل کے طالب علم
 تھے اور گجراتی، پنجابی اور گڑھوالی زبانوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے جیسا کہ ان کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کی
 کھڑی بولی کا نمونہ یہ ہے :

اس شخص کے متبادل کرنا یہاں کیا ہے پھر چشم بھری شاعر زبان کیا ہے

جنتی اسی کی جھک ہے جیوں سورج کی دھجی جاں عشق تہاں آپ ہے قادر اور روپ

آیا عشق پیٹ میں کافی چشم چھپٹ سو ہی آیا خلق میں اور مہرباں سب پیٹ

سلسلہ کے آس پاس جھانسی (بونی) میں ایک سماں شاعر رنگ نامی گڑسے ہیں یہ بزرگ برج جھانسا اور کھڑی دولہا
بازوں میں شام ہی کرنے تھے۔ ان کی کھڑی بولی کا نمونہ یہ ہے :

تیبے محبوب ہانٹے نے چشم کی چوٹ ماری ہے لہڑا ہے سلنے ہی میں ذرا نہیں پک ماری ہے
جلایا انھیں نے مجھ کو جنھوں یہ گانسی ماری ہے ترپت کد ہی نہ جیتا بھوہا درد بھاری ہے

سہوہہ اس آگرے کے پاس اور ذات کے جینی آپ شاعر جوئے میں جنھوں نے سلسلہ میں جیسی شک نامی ایک کتا
بھی تصنیف کی تھی۔ یہ بون جھانسا کے ساتھ ساتھ کھڑی بولی میں بھی شوکتے تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے :

جگمگ تر مسک سے بڑا وہ لال کپڑے پہتا اس رنگ سے محرم نہیں کپڑے رنگے سے کب ہوا
پرغی کے پتہ بچتا کھڑکھڑکتا کت پھرے نئی برسم کو چننا نہیں برسم ہوا تو کب ہوا

سبیل ایک مشہور مہنت تھے جو مردونی شاہ آباد کے قریب کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ان کا حمد سلسلہ کے
گم گم کما مانتے۔ انھوں نے ایک بوری کتب کھڑی بولی میں لکھی ہے جس کے قلمی تھے ہیں۔ لہذا ہمیں 'آندھ گم' اور 'ہار گم' اس کتا
میں 'گم' اور 'گم' پر ۲۵۰ چھپد ہیں سیتی جاتا، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ جو قلمی کے بھی اہر تھے۔ ان کا کلام جوشیو اور شبہات و
استعارات سے مرشح ہے۔ انھوں نے بڑے بڑے تلامذے ہاندھے ہیں اور خدمتِ مغان میں کے ساتھ ساتھ تھیل کی بندہ پر داری بھی دکھائی
ہے۔ ان کے کلام سے تین چوندیے درج کیے جاتے ہیں :

گھوسرہ چند پر نیلہ گیا جانی کے بوندہ پسینے کا
یا کدن کل کی اوپر جھکا ہٹ رکھ بیٹے کا
دیکھے سے جوش کماں رہو سے جو پر رولمی سینے کا
یا سمل بد نشان پر کھینچا چو کا اماکس نیچے کا

ہے کہ یہ مصنفین بنگالی تحریک کے مبرور تھے جو مختلف مذاہن سے اٹھے اور جنہوں نے اپنے اپنے عقائد و نظریات کے پرچار کے لیے جگہ جگہ کی باتیں کیں اور ہر زبان کی بولیوں کے الفاظ اپنی تبلیغی نظروں میں اس لیے شامل کیے کہ ان کا پیغام حرام کی سمجھ میں آجائے لیکن عام شعرا کے یہاں بڑی بھاشا کا اثر زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ دیوناگری پسندی بھی ہلنے والی دوسری زبانوں کی طرح اس ادب میں بھی سنسکرت کے کافی الفاظ ملتے ہیں جس کا سبب مذہبی وابستگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ البتہ عربی، فارسی الفاظ جو اس کے بعض حصوں میں کم اور بعض شعرا کے یہاں زیادہ نظر آتے ہیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مسلمانوں کی زبانوں کا اثر یہاں کے حرام پر ابتدا ہی سے بڑھ چلا تھا جو بڑھتے بڑھتے ادیبوں اور انشا پردازوں تک جا پہنچا۔

۵. زبان کی بحث میں ریختے تکسے ہوتی ہے۔ ریختہ کے لغوی معنی گری پڑی پریشان چیز کے ہیں۔ فقہ تعمیر کی اصطلاح میں ریختہ کچھ کہتے ہیں جو پے جوئے کھنڈ اور چونے کے گھٹنے سے تیار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی اور ایرانی سرود کو کہہ کر جو موسیقی تیار ہوتی ہے اسے بھی ریختہ کہتے ہیں۔ ادب میں ریختہ کا لفظ نظم کے لیے استعمال ہوا ہے جس کی حقیقت میں میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں تفصیل سے بیان کی ہے۔ مختلف ادوار کے ریختے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ لفظ صرف مسلمانوں کی شاعری ہی سے مخصوص نہ تھا بلکہ ریختے تو بہت سے ہندوؤں کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ میں نے کبیر داس رے داس، دادو دیال، غریب داس وغیرہ کے ریختوں کے نمونے دیکھے ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ریختے کی تعریف میں لہجہ یا اور زبان کی کوئی پابندی نہیں ہے کیونکہ ریختے دیوناگری لہجہ میں بھی لکھے گئے ہیں اور پگمل کی بھون میں بھی۔ البتہ ریختہ دوسری عام نظروں سے صرف زبان کے معاملے میں مختلف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ریختہ اس نظم یا شعر کو کہتے ہیں جن کی زبان اردو (کھڑی بولی) ہو اور اس میں عربی فارسی کے کچھ الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہوں۔ اب اگر اس ادبی یا سانی اصطلاح کو فقہی اور فنی موسیقی کی اصطلاح سے ملا کر دیکھا جائے تو لفظ ریختہ کے معنی مرکب یا آمیزے کے سمجھتے ہیں جس کا فارسی معنی گری پڑی پریشان چیز سے کوئی تعلق نہیں اور اس لیے لفظ ریختہ کو ان معنوں میں خالص دینی لفظ نہ کہتا۔ کیونکہ اس کا تعلق نہیں سمجھنا چاہیے۔

اردو زبان کے مندرجہ بالا نمونوں سے یہ بات بالکل واضح اور صاف ہو جاتی ہے کہ اردو کا جو قدیم ادب ہماری تاریخوں میں ملتا ہے اس سے پہلے پہلے کا ادب دستیاب ہو سکتا ہے اور ہماری زبان اور ہمارے ادب کی تاریخ میں جو تین سو سال کا خطہ ہے اسے باجمہری زبان کے ادب سے پر کرنے کے بجائے خود اردو زبان کے ادب ہی پر کیا جاسکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کام میں سخت تنہا وہی رہا فنشائی و کار ہے کیونکہ یہ سہریہ محرمات اور مہرعات کی صورت میں جا بجا بھرا جھاڑ ہے کہیں اسے بجا کر اولاد کو ادب کا ہم فریضہ بھی ہے۔ دما عینا اقا المدح۔

اس مضمون کی تیاری میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان کے نام درج ذیل ہیں۔

۱. ہندی سائتھ کا دور چٹانک اتھاس مرتبہ سوربہ کانت۔

- ۲۔ ہندی سابتیہ لا ایتاس - رام چندر شکل
 - ۳۔ مشربندھو دودھ جتہ اقل مرتبہ مشربندھو
 - ۴۔ ہندی کے مسلمان کوی - گنگا پرست دمسنگھ
 - ۵۔ سنت سابتیہ - بھونیشور ناتھ مسر
 - ۶۔ اشٹ پچاپ - دھیرنیر ورا
 - ۷۔ دادو دیال کی بانی مرتبہ پنڈت شری دھرشولال جی
 - ۸۔ مہاتما کبیر - ہری فراس دودھی
 - ۹۔ گرو گرنٹھ صاحب - (گورکھی)
 - ۱۰۔ تذکرہ بلوہ خضر جتہ اول - میسر بگرامی
-

مشترک الفاظ

رشید حسن خان

اردو میں مشترک الفاظ - خاص قصبہ ادبی ہیں۔ مشترک الفاظ سے وہ لفظ مراد ہیں جس کی تذکرہ تائید میں اختلاف ہے۔ یہ اختلاف کئی طرح کا ہے۔ کچھ لفظ دہلی لکھنؤ کے دہائی اختلاف کے تحت آتے ہیں کہ وہی واسے ذکر استعمال کرتے ہیں اور لکھنؤ واسے نوٹ یا اس کے برعکس۔ کچھ لفظوں کی ضرورت یہ ہے کہ ایک ہی دہانہ کے کچھ لوگ ذکر کرتے ہیں کچھ لوگ نوٹ۔ یہ بھی ہے کہ ایک ہی استاد نے ایک لفظ کو کبھی ذکر غنیمت کیا، کبھی نوٹ۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک لفظ ایک زمانے میں ذکر تھا بالافتاق دفتر، دفتر اس کی تائید کی طرف مڑ گیا پڑھا گیا اور اب وہ بالعموم نوٹ ہو جاتا ہے۔ یہی ثبات میں یا دوسری مشعلہ کتابوں میں یہ انیس موجود نہیں۔

ہمارے یہاں ایک بڑی کمی یہ سمجھنے کے مختلف ثبات میں مختلف قول ملتے ہیں۔ یہ اختلافات کبھی تو اپنے مختصر خیال کی طرف اشاری لایہ جو موت ہیں اور کبھی مدح و تحسین کا۔ صاحب شہ کے قاعدوں اور لفظ کے مسائل میں بھی سب بڑی دقت یہی ہے کہ مراد ثبات میں نقل نقل پر مبنی دیکھا گیا ہے۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جس کے تذکرہ و تائید کا تینوں شرط میں نہیں ہو سکا۔ استعمال میں دونوں طرح آتے ہیں کچھ دونوں کے بعد کسی نے ایک صورت کو قبول کر لیا، کسی نے دوسری صورت کو۔ فقیر یہ خود کہ کبھی کتاب میں ایک قول کو ترجیح دی گئی، کبھی میں دوسرے قول کو جو دی گئی۔ غرض وہی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے اس طرف نہایت غور کے ساتھ اشارہ کیا ہے :

جنس یا تائید و تذکرہ کا اختلاف ہر دور میں رہا ہے۔ اور یہ اختلاف مسلمان اور زمانہ دونوں پر مبنی ہے۔ بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ زمانہ و مسلمان کا تفاوت نہیں پھر بھی اختلاف کو جو دہے۔ ایک ہی شاعر ایک لفظ کو کبھی نوٹ، کبھی ذکر کہہ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اردو نے فصاحت اور مستند زبانوں سے لفظ لیے ہیں۔ جب کوئی نیا لفظ آیا اگر اس میں اردو کی رو سے کوئی غلط تائید یا تذکرہ کی نہ تھی تو ایک مدت تک اس کی جنس مینی نہ ہو سکی۔ اور اسی لیے اکثر لفظوں کا فیصلہ ہی تک نہ ہو سکا۔ جنس ہی کے مینی ہونے پر جمیع کی صورت کا انحصار ہوا کرتا ہے۔ اسی لیے اردو میں جنس اور مدح و دونوں خیال حالت میں ہیں۔ (مقدمہ کلیات وکی - طبع دوم - ص ۳۴)

ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک شاعر نے فعلی سے ایک جگہ کبھی لفظ کو رواج عام کے تحت ذکر یا نوٹ غنیمت کر دیا۔ اس احتمال کو قبل عام حاصل نہیں ہوا، لیکن بعض لغت نویسوں نے اس کو سند کے طور پر قبول کر کے اس لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کر دیا۔ ایسا بھی ہے کہ جن اشعار کو کسی ایک شعر کو کبھی لفظ کی تذکرہ یا تائید کے لیے بہ طور سند پیش کیا گیا ان اشعار کو اس شعر کو اصولاً بہ طور سند پیش ہی نہیں کیا جاسکتا تھا، لیکن غلط فہمی کا کرشمہ تھا۔ لیکن اس سے ایک خطا اندراج کا اضافہ ہو گیا اور بعد والوں کے لیے وہ

ایک مختلف مسئلہ بن گیا۔ ایسے الفاظ کا جائزہ، ایک نہایت دلچسپ اور مفید کام ہوگا۔ ذیل میں ایسے کچھ الفاظ کو مزوری تفصیلات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ اس سلسلے کو جاری رکھا جائے۔ قسط اول میں ۹ لفظوں کو شامل کیا گیا ہے :

آب، ساد، آفرش، الپ، ایباد، اظ۔

(۱) آب :

یہ لفظ حقیقی معنی کے لحاظ سے پانی کا مرادف ہے اور بلا تعلق مذکر۔ مجازاً آتاب اور آبداری کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور ان معانی میں، موثث ہے۔ اردو لغات میں بھی اس کو موثث ہی لکھا گیا ہے۔ لیکن جلال نے اپنے رسالہ تذکیر و تانیث، مفید اشعار میں اس کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کیا ہے (اگرچہ موثث کو مرجع لکھا ہے) اور سند میں آتش کا ایک شعر اور ایک مصرع اور بحر کا ایک شعر پیش کیا ہے۔ جلال کی تقلید میں، رشحات صیغہ اور مخان احباب میں بھی اس لفظ کو مختلف فیہ لکھا گیا ہے۔ اور مذکر کی سند میں آتش کا وہی ایک شعر پیش کیا گیا ہے، جس کو جلال نے درج کیا ہے ————— لیکن جلال کا یہ فیصلہ عمل نظر ہے۔ جلال نے مذکر کی سند میں سے ذیل شعر پیش کیے ہیں: [انہوں نے آتش کے دوسرے شعر کا صرف مصرع ثانی لکھا ہے۔ مصرع اول کا اضافہ کیا گیا ہے] :

حکیم سیف علی بقل محسنی فی شمسہ تذکرہ کلاں رام پور) کا یہ قابل قدر رسالہ پہلی بار ۱۲۹۳ھ میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت اس کا نام کاآد شعرا تھا۔ جلال نے نثرانی کے بعد اس کو مفید اشعار کے نام سے شائع کیا۔ اس رسالے کے کچھ مندرجات سے اختلاف کیا گیا ہے، لیکن اس کو ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے اور مستند سمجھا گیا ہے۔ جلال کے سب سے بڑے لغات، مولوی سید غفر احسن شوق میمنوی نے اس رسالے کے مستحق جو کچھ لکھا ہے اس سے اس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے مختلف مسائل تذکرہ و تانیث کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے : ان میں مفید اشعار، جناب جلال کی تالیفات سمیت... یہ رسالہ اب فقار جم اگرچہ چھپتا ہے اور سند کے اشعار بھی بہت کم ہیں۔ مگر الفاظ اس میں سب رسالوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ چونکہ اس کا موقوف نامی امانتہ ٹھکانے سے ہے اور زبان حال گہمی ہے۔ اگرچہ بعض جگہ مقتضائے بشریت فاضل غرض بھی ہے، مگر پھر بھی اس کو ترجیح ہے کیونکہ دوسرے رسالوں کی بنا صرف تیج پر ہے۔ زبان قدیم و جدید و شاذ و غیرہ کی کیفیت ان سے ظاہر نہیں ہوتی۔ رشحات صیغہ میں اس کی کوشش کی گئی ہے۔ معروضات جو مفید اشعار میں ہے، نہیں۔ (حاشیہ رسالہ اصلاح ص ۲۱)

شیخ امداد علی بحر لکھنوی قلمیہ ناسخ (تذکرہ نادر) تحتی الفاظ میں رشک کے بعد ناسخ کے شاعروں میں یہی ممتاز تھے (آب بنام ص ۱۴۲) ان کا مطبوعہ دیوان موجود ہے جس کا نام ریاض النہج ہے۔ قراہہ زبان و لغت پر مشتمل ایک رسالہ بھی مرتب کیا تھا جس کا عنوان رضاہ ثریا رام پور میں محفوظ ہے۔ راقم الحروف نے اس قابل قدر رسالے کو، مجلہ آد و ادب (مئی ۱۹۷۸ء) کے شمارہ ۷۱ ۱۹۷۲ء میں شائع کر دیا ہے۔ کتابوں میں بحر کا سال وفات ۱۳۰۸ھ لکھا جاتا ہے۔ غالباً سب سے پہلے صیغہ گجراتی نے

لفظ ہی میں یا اپنی کثرت کو موت سے کیا مگر کی قدر جب آپ مگر جاتا رہا (آتش)

جب دیکھا ہے یا تو ہے انت پیتا ڈوبوں گا میں ڈوبے گا آپ مگر ہے (۱۰)

جب کہ تجھے زندگی مرنا نہ شمشیر یا اپنے حق میں آپ حیوان آب آہن ہو گیا (بحر)

اس سلسلے میں کئی باتیں قابل توجہ ہیں :

(۱) آب یعنی تاب و آجاری، موت ہے۔ لیکن جب یہ مرکب جو جیسے آب مگر آب آہن آب تیغ وغیرہ اور اس کو مذکر

استعمال کیا جائے تو وہاں درحقیقت آب حقیقی سے استعارہ ہوتا ہے۔ لفظ آب کے مجازی معنی (آجاری) مراد نہیں

لیے جاتے۔ ایسے مقامات پر آب حقیقی کے لازم مذکر ہوتے ہیں۔ اس لیے ان مرکبات کو روزانہ استعمال کیا جائے

گا۔ اس سے مفرد لفظ آب کی آئینت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ جیسا کہ امیر سیانی نے لکھا ہے :

• شعر : جب آب مگر یا آب تیغ کو مذکر باندھتے ہیں تو وہ آب حقیقی سے استعارہ ہوتا ہے۔ اور

لازم آب حقیقی کے ثابت کرتے ہیں۔ جیسا کہ بحر کے اس شعر میں، گٹوں تک یا گٹوں تک ہونا آب

حقیقی کے لازم سے ہے۔ سہ تو بے کثرت تھے ہیں میرے با اثر پہلے آب تیغ : آج گٹوں

تک ہونا : آج گٹوں تک ہونا : (امیر سیانی ص ۱۳)

آتش کے شعر ثانی اور بحر کے شعر میں آب آہن اور آب مگر کی ہی صورت ہے کہ معمولی شعر کے مطابق دونوں مجھ آب

حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہے اور آب حقیقی کے لازم موجود ہیں۔ اس لیے ان اشعار کو مفرد لفظ آب کی تذکیر کی سند میں کسی

طرح میں پیش کیا جاسکتا۔

بجز غلطی اس سے کوئی شک نہیں۔ بعد کو اسی کو نقل کیا جاتا رہا۔ امیر سیانی کے ایک شاعر، مولوی صدیقی علی خان ممتاز رام پوری نے

ایک مجرورہ تعلقات تاریخ وفات مرتب کیا تھا۔ جس کا مخطوطہ رضا فیر پوری رام پور میں محفوظ ہے۔ اس کا نام تاریخ طبعیت ہے۔ اس میں

سیر کا ہر اقلہ تاریخ وفات موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انتقال ۱۹۱۸ء میں ہوا تھا۔ اس طبع کا شعر آخر یہ ہے

• سامع فکر تاریخ وفات میں سیر : گفت دل : بحر یک موج بحر پر رسید : یہ واضح رہے کہ سیر کا انتقال

۱۹۱۸ء میں ہوا ہے۔

سید فرید احمد فیر پوری : اتوں ۱۹۱۸ء (تذکرہ غالب) کی معروف تصنیف میرے پیش نظر اس کا وہ ایڈیشن ہے جو صفحہ کی

نفاذاتی کے بعد طبع احمدی پرنٹ سے شائع ہوا تھا۔ آئندہ اس کتاب کے لیے صرف لفظ رشتہ استعمال کیا جائے گا۔

مختصر منشی قادر علی صفی پوری : لازم ریاست بھرپال، طبع شاہ جہاں بھرپال میں ۱۹۱۸ء میں چھپا تھا۔ اچھا نامدار ہے۔ بہت

تجسس سے بنایا گیا ہے۔ آئندہ اس کے لیے لفظ رشتہ استعمال کیا جائے گا۔

(۲) آتش کے پہلے شعر میں 'آبِ گمر' مزدور اس طرح آیا ہے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہاں اُن سے تسامُع ہوا۔ اور اُنھوں نے بے خیالی میں 'آبِ گمر' کو اس طرح غلط کر دیا جیسے آپ حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہو۔ حالانکہ یہاں لفظ آب مجازی معنی میں آیا ہے۔ اس خیال کی تائید کئی طرح ہوتی ہے :

(الف) آتش کے کلیات میں، زیر بحث شعر کے علاوہ، جہاں بھی یہ لفظ ترکیب آیا ہے، آپ حقیقی کے لوازم کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً :

گلیاں آبِ گمر کی بھی جو خوشد و کرتے تیرے دانتوں کی نہ دانتوں میں صفائی ہوتی (کلیات و غنچہ پریں ص ۱۱)

ہوائے اشک کے قطرے ہیں لہزہ آبِ گمر کے بھرا چاہے جو پانی دھستہ چاہہ نہ خنداں میں (ص ۱۹۱)

روح کو تفریح اُن اتوں کے دیکھے سے ہوتی آبِ گمر کے، حسد اول کا صنوبر ہو گیا (ص ۹۰)

ابنی بازو قاتل میں زور دست قدرت سے روانی ہے اسی کے دم سے آبِ خشکِ بخت میں (ص ۱۱۹)

(ب) آتش نے مفرد لفظ آب کو (مجازی معنی میں) مذکر نظم نہیں کیا۔ البتہ ایک جگہ مورتِ مزدور نظم کیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے :

جائے ہر محسوس تن لے لاش میں گردن رکھتا آبِ ابرہہ کے ہر اک بال میں توار کی تھی (ص ۲۶۸)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آتش درحقیقت اس کی تائید کے قائل تھے۔

(ج) آتش اور اُن کے تلامذہ کے یہاں (زیر بحث شعر سے قطع نظر کرتے ہوئے) آبِ گمر (موتی کی آب کے معنی میں) کہیں مذکر

نظم نہیں ہوا ہے۔ البتہ تائید کی مثال مل سکتی ہے۔ مثلاً :

چاہیے انسان کو بھی پاس حفظِ ابرہہ یاد رکھے، جائے پیر آبِ گمر، حق نہیں

رند (دیوان و غنچہ پریں ص ۱۰۴)

(د) آتش کے زیر بحث شعر کو، مفرد لفظ آب کی تائید کی سند کے طور پر، جلیل اور اُن کی تقلید میں مولف ارغمان کے سوا کسی نے

تسلیم نہیں کیا۔ نہ 'آبِ گمر' کی تائید کی سند میں قبول کیا بلکہ سب نے یہ مراحت کرائی ہے کہ آتش نے یہ غلط جہور کہا ہے۔

ضیغہ بگرائی، جنھوں نے جلیل کی تقلید میں اس لفظ کو مختلف فیہ لکھ دیا ہے؛ لکھتے ہیں :

یا بعض الفاظ جن میں سب شعر اوصاف متفق ہیں۔ مگر ایک دو شاعروں نے اُن کے خلاف باندھا۔ تو ہم

کو جہور کی تقلید کرنی ہوگی۔ جیسے آبِ گمر کہ جو قراءہ کی رو سے بھی مورت ہے اور مضامین کا بڑا دھجی بھی ہے؛

اُس کو آتش مذکر باندھ گئے ہیں۔ (زشتات ص ۳۹)

شوقِ نیوی نے رسالہ سطور میں 'آبِ مین آبِ باری کو' مورت لکھ کر لکھا ہے :

سویا یہ جبر جس شوقِ نیویِ عظیم آبادی۔ غمزدہ شوقِ لکھنوی۔ اپنے زمانے کے نہایت معروف اہل علم میں تھے۔ جلیل کے رتبے بڑے

عزیز تھے۔ کئی رسالے ان کے رد میں لکھے ہیں۔ متوفی ۱۲۸۶ھ اور رمضان ۱۲۸۶ھ شوقِ سنو۔ "ماذہ تاریخ وفات ہے۔ ان کی شہرہ

سوز و گداز کے آخر میں قطعات تاریخ بھی شامل ہیں۔ ایک قصہ میں ان کی تصانیف کے نام بھی ہیں۔ (شہرِ سوز و گداز مطبوعہ

ہے جس کو ذکر استعمال کیلئے وہ مہر شعر کے خلاف ہے۔ (ص ۲۱)

یہ درحقیقت میرا وہ ہے جلال کے اس قول پر کہ یہ لفظ 'انفاذ' مشترک میں سے ہے۔ اسی ذیل میں شوق نے مؤید لکھا ہے: 'ہاں جان پانی کی رعایت کی گئی ہو' وہاں ذکر بھی استعمال کرنا درست ہے۔ اور مثال میں 'اسخ' کا ایک مصرع اور تجربہ کا وہی شعر لکھا ہے، جس کو جلال نے اب 'بہنی' آبادی کی تذکرہ کی سند میں پیش کیا ہے۔ یہ بھی درحقیقت ایسا ہے اس پر کہ جلال نے سند میں یہ شعر پیش نہیں کیا اور 'نوازم' اب حقیقی۔ دسے تھے ہم ان کی نظر نہیں پہنچی۔ مرنے میں 'اشرا' نے اب 'بہنی' آبادی کو 'مرث' لکھ کر مائے میں لکھا ہے: 'خلاف مہر کے ایک جملہ آتش نے ذکر بھی لکھا ہے۔' اور آتش کے زیر بحث شعر کو درج کیا ہے۔

د) بخاک جوشہ جلال نے ذکر کی سند میں درج کیا ہے: 'جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے' اس کو لفظ 'اب' کی تذکرہ کی سند میں پیش کیا جا سکتا، نہ جلال کے سوا کسی نے اس کو پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ تجربہ نے ہر جگہ اب (بہنی) آبادی کو 'مرث' بنائے ہیں۔ ان کے دلیوں میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جس میں یہ لفظ بتذکرہ لکھا گیا ہو 'مرث' کی چند اسنادوں کی باقی ہے۔

جواب آنے کی جانے ہم سب سے ہوں وہ کون ہیں جو کسی کی چیں آبرو یستے (ایساں ہر ص ۱۰۰)
 مٹائی موتیوں کی آب اس کے دماغ نے از ادیا اب۔ جھیں نے رنگ لالوں کا (ص ۱۳)
 گروانوں بنے 'یہ' اندو پیو پیا ہے ہر ایک قطہ ہے۔ موتی کی آب ہو گا (ص ۲۰)
 نیز ان کے دیوان میں اب گویا اس نورا کا کرنی مرث' بس میں اب حقیقی سے استعارہ نہ ہو بلکہ آبادی کے معنی مراد ہوں! ذکر نظر نہیں جاتا ہے۔

اس) اگر اس کے کسی وقت لکھانے لفظ 'اب' بہنی آبادی کو ذکر نہیں لکھا، سب سے مرث لکھا ہے۔ نیز اب گزرا اب آہن آب تینا بھیجے مرثبات کو' جس میں آبادی کے معنی ہوں 'مرث' لکھا ہے۔ اسی طرح جی رسالہ تذکرہ و تائید کا ذکر آچکا ہے،

د) (بقیہ) انسانی پر سب سے زیادہ اسرار و صلاح اس زمانے میں خاصا مقبول ہوا تھا۔ میکے پیش نظر وہ ایڈیشن ہے جس کو مولانا حسرت موہانی نے، دو برس قبل گڑھ سے شائع کیا تھا۔ یہ واصل ان کے دور سالوں کا مجموعہ ہے۔ ایک فوری رسالہ ان کے الفاظ 'جو لغت کے موضوع پر ہے۔ دوسرا 'صلوح' جس میں مختلف قواعد زبان درج کئے گئے ہیں۔ کارآمد رسالہ ہے۔

ما) مولفہ فطی فہام حسین آفاق بخاری، تلمیذہ جیس دلیپوری۔ موتی و رکتور بر ۱۹۳۲ء (مقدمہ میں اشعار) تذکرہ و تائید کے موضوع پر غالباً سب سے خیر کتاب ہے۔ بلکہ اچھا خاصا لغت ہے۔ اساد کے ساتھ ساتھ ہر فن کے اصدا بھی لکھ دیے ہیں۔ یہ کتاب مرنے کے انتقال کے بعد مدینہ منورہ لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ سال طبع درج نہیں۔ سہمیل تالین ۱۳۵۲ء ہے۔ بھی غلطی کتاب ہے۔

دوسرے قابل ذکر رسائل میں بھی مفرد لفظ آب یا اس کے مذکورہ مرکبات کو صرف مونث لکھا گیا ہے۔ مثلاً رسالہ بسیط^۱ میں۔

مختصر یہ کہ مفرد لفظ آب بمعنی تاب و آبداری متعلق علیہ مونث ہے۔ اس کے مرکبات جن میں آب حقیقی سے استعارہ ہوا ہے۔ جن میں آبداری کا مفہوم ہوا وہ مونث آتے ہیں۔ آتش کے ایک شعر کی حیثیت شاذ کی ہے یہ آتش کا تسامع ہے۔ اس شعر کی بنا پر اس لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ جلال نے آتش و بحر کے جو دو اور شعر اس کی تذکیر کی ہیں یہ جلال کا تسامع ہے۔ ان اشار میں ایسے دوسرے اشار کی طرح آب حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہے اس لیے آب بمعنی آبداری کی بحث میں پیش ہی نہیں کیا جاسکتا۔

عربی کے حروف تہجی میں چودھواں حرف ہے۔ آنکھوں کو بھی اس سے تشبیہ دیتے ہیں۔ صبح یا منظور ہونے کی علامت بھی ہے۔ ان معانی میں اس کو ذکر استعمال کیا گیا ہے۔ اسناد ثنات میں موجود ہیں۔ لیکن ایک خط غلطی کی بنا پر اس کو بھی مشترک الفاظ میں شامل کر لیا گیا۔ اس خط غلطی کا آغاز کس سے ہوا البتہ یہ معلوم ہے کہ بیشتر ادباء ثنات و رسائل اس میں مبتلا ہوئے۔ ایک ایسے شعر سے اس کی پرستش لال کیا گیا جس کو تائید کی سند میں ہرگز نہیں پیش کیا جاسکتا تھا۔ لیکن "نقل قول" کو کیا کہا جائے کہ رفتہ رفتہ اس کا یہ ہونا تسلیم ہو گیا۔

جلال نے سفید اشعار میں اس کو صرف ذکر لکھا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ صاحب فرہنگ آصفیہ نے اس کو "اہم ذکر مونث" شامل میں شمری مگر انہیں یہ شعر لکھا ہے :

ساد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی مینائی کے چسکے پر نظر کی

شعر کے نیچے مزید مراحط کی ہے کہ "تائید کی مثال بھی اسی شعر سے ثابت ہے۔" موفیق رشحات و نور اللغات

یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا خطوط رضا لاہوری رام پور میں ہے۔ مولفہ آنحضرت علی عرف آغا جہند ی لکھنوی ابھی محمد علی خاں ابن نواب شجاع الدولہ (مذکرہ انتخاب یادگار) یہ دوبار رام پور سے متعلق تھے یہ خطوط فرست کنگ خانہ کی مراحت کے بوجہ موقوف کے ہوتے لکھا ہوا ہے۔ اس میں الفاظ کریم جنہوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) مذکر (۲) مونث (۳) مشترک۔ مشترک الفاظ میں اس کی بھی مراحت کر دی گئی ہے کہ موقوف کی رائے میں ترجیح کسے ہے۔ رسالے کا سال اتمام ۱۲۹۳ھ ہے بعض اعتبارات سے خصوصاً موقوف کی شخصیت کے لحاظ سے یہ رسالہ قابل ذکر ہے۔ اہل تصنیف غیر مطبوعہ کتاب خانہ رام پور میں محفوظ ہیں۔ ۱۳۰۰ھ میں انتقال ہوا (تاریخ طبعیت لکھنؤ میں غزاں مکتبہ امام بارے میں قریب ہے (آب بقا)

حافظ جلیل حسن جیل (تیسرے وراثتیں اخیر حیاتی) کی تائید اس کا نام رسالہ تذکرہ و تائید ہے۔ سال ترتیب ۱۳۲۹ھ ہے۔ آخر تذکرہ پر میں حیدر آباد میں چھپا تھا۔

لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کر دیا۔ حالانکہ صغیر نے اس رسالے میں متعدد جگہ یہ مراحت کی ہے کہ جی اشعار میں غلط الکاتب کا احتمال ہو۔ بعض کی 'کے' پر سند کا انحصار ایسی اسناد کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ یہی نہیں، انھوں نے دوسروں پر اس سلسلے میں اعتراضات بھی کیے ہیں۔ شفا جلال نے مفید اشعار میں لفظ مشتری کی تائید کی سند میں یہ دو شعر لکھے ہیں :

نقد جان لائی ہے تارے مول نور اس سے مشتری رکھا ہے نام اپنے لیے برہس کا (ناسخ)

تیرا غلام کچھ مر کھنا فقط نہیں کہتی ہے مشتری بھی میں تیری خیر خواہ ہوں (۲)

صغیر نے ان اسناد پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے :

• مولف کتاب ہے کہ کار آمد شعرا کی ان مثالوں سے موثق ہونا کچھ ضرور نہیں کہ ثابت ہو۔ کیونکہ کتابت

کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی نقد جاہ لایا ہے، اور کتاب مشتری بھی کہہ سکتے ہیں۔" (رُشحات ص ۴۷)

جلال نے طوطی کی تائید کی سند میں رشک کا یہ شعر بھی پیش کیا ہے :

طوطی سبزو خط صاف ہی کہتی ہے ہیں دہی عارض آئینہ جان اب تک

صغیر نے اس پر بھی یہی اعتراض کیا ہے۔

• اور رشک کے شعر کی سند جو دی گئی، اس کو نامناسب شکل ہے۔ کیونکہ طوطی سبزو خط صاف ہی کہتا

ہے ابھی ہو سکتا ہے۔ از روئے غلطی کتابت یہ مثال کافی نہیں۔ حضرت جلال ایسی ہی مثالیں دیا

کہتے ہیں۔" (رُشحات ص ۶۸)

ایک حرف تو یہ احتیاط کہ انحال میں بھی غلطی کتابت کے احتمال کی بنا پر ان کو بطور سند قبول نہ کرنا۔ دوسری طرف یہ مودت کہ جس سند کی بنا بعض کی "اے" کے فرق پر ہے، اس کو بے تکلف قبول کر لیا !!

بہر حال، سادہ ذکر ہے۔ جن لوگوں نے گلزار نسیم کے زیر بحث شعر کی بنا پر موثق فرض کر کے، اس کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کر دیا، ان سے غلطی ہوئی۔ اس شعر میں "سادہ" انھوں نے "کے" مربع ہے۔ بالغرض کوئی صاحب مربع، زامین، تب بھی اصولاً اس شعر کو تائید کی سند میں نہیں پیش کیا جاسکتا۔ اور جب تک کوئی مثال تائید کی نہ ملے۔ اس وقت تک اس کو مختلف فیہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔

۳۔ الاب :

جلال نے مفید اشعار میں "اوپ" کو مشترک الفاظ میں شامل کیا ہے۔ اس کی مراحت نہیں کی کہ ترکیب کسے ہے۔ البتہ آغا جگر ہندی نے سادہ بیسٹ میں ذکر کو مربع لکھا ہے۔ جلال نے ذکر کی سند میں ایک شعر لکھا ہے اور موثق کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی سند کلام اساتذہ میں نہیں ملی۔ ان کی عبارت یہ ہے :

• "اوپ" مختلف فیہ ہے۔ ذکر و موثق دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قدرت نے ذکر کہا ہے ۔

ایک ہی پرے کے تم سمجھو تو ہیں یہ سب اوپ مگر مدانے بائگ ہے درغمنہ ناتوس ہے

اور مرثیہ کی کوئی مثال مرثیہ کرکام اساتذہ میں ملی نہیں۔ اقداد پڑتا ہے کہ مرثیہ بھی کیا گیا ہے۔

جلال نے ذکر کی سند میں خوشنود رکھا ہے۔ وہ شاہ قدرت احمد قدرت دہلوی کا ہے۔ تذکرہ میر حسن، تذکرہ ہندو، اشعار شاعرانہ میں انہیں کے نام سے درج ہے۔ یہ اُن کی بہت مشہور غزل کا شعر ہے جس میں وہ معروف ترین قصیدہ بھی شامل ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:

کل جس اس سحر سے تریف دیتی تھی مجھے کیا ہی لگب دوم ہے کیا سرزمینِ روس ہے

ان تذکرات میں زیر بحث شعرا کا متن مختلف ہے جو درج ذیل ہے:

ایک ہی پردے کی گر کجھ تو ہے یہ سب الپ مرصدا نے بانگ ہے، ورنہ ناسخ ہے (تذکرہ میر حسن)

ایک ہی پردے کے یہ سب مجھے تو ہیں الپ مرصدا نے بانگ ہے، ورنہ ناسخ ہے (تذکرہ ہندو)

ایک ہی پردے کی گر کجھ تو یہ ہیں سب الپ مرصدا نے چک ہے یا نرسند ناسخ ہے (اشعار)

تذکرہ میر حسن کے مطبوعہ نسخے کے ساتھ اس کا ایک قطعی نسخہ (مخزنہ رسالہ نوری رام پور) بھی پیش نظر ہے، دونوں میں ایک متن ہے۔ اور اس سے الپ کی تذکرہ کے ہائے تائید ظاہر ہوتی ہے۔ اس وقت اس شعر کا سند میں نہیں پیش کیا جاسکتا۔ قدرت کا دیوان ابھی تک نہیں چھاپا ہے، مگر میں کوئی صاحب اس کو تہہ کر رہے ہیں، مگر اس سے کوئی قطعی رائے قائم کرنے میں مدد مل سکے۔

اس وقت حالت حال یہ ہے کہ حیدر اشرف، رسالہ بیجا، اور کوشیات میں اس کو مختلف فیہ لکھا گیا ہے۔ جلال نے ذکر کی سند میں قدرت کا شعر پیش کیا ہے، کوشیات میں بھی وہ منقول ہے؛ مگر یاد ذکر کی سند میں صرف ایک شعر پیش کیا گیا ہے جس کو اصولاً پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں اس کی تذکرہ سند ہے، اور اس اعتبار سے ظاہر عمل نظر۔

آصفیہ، امیرالغنائت، ذرا لغات، رسالہ جیل اور میر، اشعار میں اس کو مرثیہ لکھا گیا ہے۔ ذرا لغات میں تائید کی سندیں واجد علی شاہ، اختر کا یہ شعر لکھا ہوا ہے:

مہلوں پہ گھبراہ پڑنے تھا میں پنہیں گردوں پہ وہ الپ میں

یہ شعر میر تقی میر حسن کا یہ شعر سند تائید میں پیش کیا گیا ہے:

وہ قصبات اور وہ سُتری لاپ وہ گوری کی تائیں وہ مہلوں کی تھا

یہی شعر امیرالغنائت میں ہے۔ مولف ہزار ہند نے بھی تذکرہ تائید کی مراحت کے بیڑ، اسی شعر کو درج کیا ہے۔ لیکن میر حسن کے اس

سورہ مرزا محمد مرتضیٰ عارف پھر تحریک مافوق فکری اور جلی میں سہ لاریٹ کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ یہ منت جملہ منتہی میں مبیع

شرکت جعفری مکتوب میں چھپا تھا، مرتب کی مراحت کے مطابق اس کو بار بار دوں میں شائع کرنے کا ارادہ تھا، لیکن مرثیہ جملہ اول چھپ

سکا۔ یہ مرثیہ مرثیہ پر مشتمل ہے۔ مرتب لکھنے کے ارباب، اعتبار میں سے تھے۔ اگر یہ منت مکمل ہو جاتا تو واقعہ کام کا منت ہوتا۔

بقول چکیت: "کھنڈ کی زبان اور ماردوں کی جتنی تحقیق مرزا سے مرحوم کو تھی، اس کا اندازہ اُن کی مشہور تائید "بہار ہند" کے

دیکھنے سے بڑھ کر کیا جاسکتا ہے، انہوں نے اس منت کی کافی قدر کی اور نہ اگر اس کے باقی تھے جتنے بھی چھپ جاتے تو اردو

زبان کی اصطلاحوں اور ماردوں کا ایک جواب لکھ کر مرتب ہو جاتا۔" (مضامین چکیت ص ۱۲۵)

شرعے آئینہ ثابت نہیں ہوتی۔ شکر علیہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس شعر کو آئینہ کی سند میں پیش کرنا درست نہیں۔ آخر کے شعر سے جتنا آئینہ ظاہر ہوتا ہے، میں فی الواقع یہ کہنے سے گھبرائوں کہ یہ شعر ان کی کس ثنوی سے ماخوذ ہے اور یہ کہ اسٹرا ہی طرح ہے۔ اس شعر کا معنی بالکل صحیح ہے اور شکر علیہ اس شعر کا ہے، تو بالیقین آئینہ ثابت آئینہ کے لیے کافی ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ اس سند سے یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ یہ غلط حرف موند ہے۔ جیسے رفک کے اس شعر سے:

وصل کی حالت بنا، مہر شوق کیسو شام نفیس ہیں، سپیدی ہی کس کا ندک

(مجموعہ دوا دین سنگ میں ص ۳۱)

یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ غلط حرف موند ہے۔

ہندی کے متعدد اساتذہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سنسکرت اور ہندی میں الپ ذکر ہے۔ لغات میں بھی صرف ذکر لکھا ہوا ہے۔ خط جو۔ ہندی شبد ساگر (شاخ کردہ ناگری پر چارنی سجا) بہت ہندی کوش (شاخ گیان منڈل بنارس) سنسکرت شبد ارتھ کو شبد (مرتبه دوار کا پرشاد شرا)۔

یہ غلط فہمی موسیقی کی ایک اصطلاح ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس فن سے تعلق رکھنے والے حضرات سے استصواب کیا جائے۔ اس سلسلے میں جناب شاہد احمد دہلوی سے رجوع کیا۔ موصوف اس فن کے قابل ذکر جاننے والوں میں سے ہیں۔ شاہد صاحب نے اذراہ التفات خاص ضروری تفصیل سے مطلع کیا۔ موصوف کے مکتوب کا اقتباس یہ ذیل ہے:

”پیشہ درون کی زبان پر“ الپ ذکر ہے اور کتابوں میں بھی اس لیے میں بھی ذکر ہی کرتا ہوں۔

(۱) مصادر اللغات مصنفہ خاکر نواب علی خاں، جو اردو کی واحد مستند کتاب ہے، اس میں بھی ص ۱۰ پر

یہ عبارت دیکھی ہے: ”آج کل الپ بھی“ دھرپ کی طرح، چار جھٹوں پر منقسم کر دیا گیا ہے۔“

(۲) آج کل کے موسیقی فہرستوں میں اس کا نام ”اسٹرا“ دھرپ کا الپ بھی کار کا جوڑ

وہ اصل پیدا کر دیا ہے جو دوسری لائیکریں یا باج نے ابھی تک پیدا نہیں کیا ہے۔ ”مضمون غلط ہیں استاد

ریمہ تہ خاں ڈاگر“ جو کلام ہی الپ کرنا اور دھرپ کا نام ہے۔

(۳) کتاب ابرار کرامت حرف نفحات نعمت، مبلوہ مشہور، ص ۷۷، ۷۸، ۷۹، ہر ایک کے الپ کے واسطے قبیحے مقرر

کی گئی ہیں۔ یہ کتاب نعمت اللہ خاں نے لکھی تھی اور اس کی تکمیل ان کے بیٹے کرامت اللہ خاں نے کی تھی نعمت

خاں، دربار خیال کے عالم تھے۔

الپ ذکر ہی بولا جاتا ہے۔ مگر غیر پیشہ درون سے موند بھی سکتا ہے۔ لغت میں شاید اسی وجہ سے دونوں طرح درج کر دیا

گیا جو؟

اس عبارت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ غلط دونوں طرح مستقل رہا ہے۔ فہرست موسیقی سے تعلق رکھنے والے بالعموم اس

کو ذکر استعمال کرتے رہے ہیں (یہ غالباً ہندی کا اثر ہے) اور دوسرے لوگ بالعموم موند۔ اسی لیے اکثر اباب لغات نے اس

کوہنوت کا کھانا

اور سنائی میں آپ کو ذکر کھڑے کرنا سند میں قدرت کا زیر بحث شوق نقل کیا گیا ہے۔ لیکن یہ مصرع اس طرح لکھا ہوا ہے:

لیکھی پرے کی تم بھو تر ہیں یہ ب اوپ

اس سے تو آیت ظاہر ہوئی ہے! یہ تو غیر فطری کتابت ہو سکتی ہے۔ لیکن واقعی دلچسپ بات یہ ہے کہ جلال نے تو مزید اشعار میں یہ حرکت نہیں کی تھی کہ قدرت دہری میں یا لکھنوی۔ مگر مؤلف اور سنائی نے یہاں بندہ سے کام لے کر انھیں "لکھنوی" بنا دیا۔

مؤلف آرمینیہ نے آپ کو "فدا انعام" لکھا ہے اور آپ (بہ الف ممدودہ) کو "میرغ نفاذ" لکھا ہے۔ لیکن اس فیصلے میں وہ سنجیدہ ہیں۔ مجدد، باب لغت اور اساتذہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مستقل نام و خاص آپ (میرغ) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صاحب آرمینیہ نے بغیر مزید کیے ہوئے، فنیوں کی تقلید کی ہے۔ سنسکرت میں آپ (سنسکرت شجرہ ارتقا کو سمجھ) ہندی میں آپ بھی مستقل ہے (ہندی شجرہ ساگر) متعدد مستشرقین نے اپنے کلمات میں آپ کو آپ کی جگہ دی ہوئی صورت بتایا ہے، فنیوں بھی انھیں میں شامل ہے۔ مزید صاحب نے اس کا خیال کیے بغیر کہ اردو میں کس طرح مستقل ہے، اس کے نوشتے کو عربی آفرمان کیا۔

۴ آخر خوش:

جلال نے "نید اشعار میں لکھا ہے:

آخر خوش، بسنوں کے حندیے میں نو کے قیاس پر موت ہے، حالانکہ یہ قید نظم ذکر پایا جاتا ہے:

ذکر کی سند میں آتش و زندہ کا ایک ایک شعر پیش کیا ہے۔۔۔۔۔ جلال کی عبارت بہم ہے، حقیقت یہ ہے کہ اساتذہ دہلی نے اس لفظ کو موت نظم کیا ہے اور اساتذہ لکھنوی نے ذکر۔ صرف میر علی اور سطریشنگ لکھنوی (تیمز آج) کا ایک شعر عام طور سے موت کی سند میں پیش کیا گیا ہے، وہ شعر یہ ہے:

"اب وقت کی آمد پائے آخر خوش لمس پھیلی" قضا کی مسد بانہی ہے، اہل سرگرم اسماں ہے

(مجموعہ دواویہ رشک ص ۲۰۴)

رشک کے مجموعہ دواویہ میں اور کہیں یہ لفظ اس طرح نظم نہیں ہوا کہ تذکیر یا آیت کے متن کوئی فیصلہ کن بات کہی جاسکے، مثلاً:

منظر اعلیٰ مٹی بہم آخر خوشی ہاں تب تو میری آخر خوش تانا کو بنایا (ص ۸۰)

آخر خوش زمیں تو باغ آبی نورم مردود اسماں ہیں (ص ۲۲۲)

دو فوں شعروں میں "میری اورانی" کو "یہاں" بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ جلال کا یہ لکھا کہ: "بقیہ نظم ذکر پایا جاتا ہے۔" صرف اس سے ایک ہیج ہے کہ عموماً اساتذہ لکھنوی نے اس کو ذکر نظم کیا ہے۔ لیکن اساتذہ دہلی نے اس کو موت بنا دیا ہے اور اس کی شائیں عام ہیں یہی ہم مراجعت ایرضات میں ہے۔ موت نے کہا ہے:

"شعر نے ذکر بھی لکھا ہے اور موت بھی استعمال کیا ہے، چنانچہ شاہوں سے پیدا ہے، مگر مؤلف کے

ذہنیک اس کی تذکرہ کر تریج ہے :-

میں صوبت عالیہ ہے کہ کھٹو سے متعلق حضرت میں سے بیشتر نے اس لفظ کو تو صرف ذکر کیا ہے (رسالہ بسیط) یا ذکر کو ترجیح بتایا ہے (امیر اللغات، مفید الشعراء، معین الشعراء، رسالہ اصغر)۔ جعفر نے رشحات میں اس کو مختلف فیہ لکھا ہے لیکن یہ صراحت نہیں کی کہ ترجیح مجھے ہے۔ صرف مولف فوائد اللغات نے نوٹ کر مریج لکھا ہے۔

دہلی کے متعلق حضرت نے اس کو صرف مرث تسلیم کیا ہے۔ ابتداء فرہنگ آصفیہ میں آغوش ذکر چھاپا ہوا تھا۔ مولف اختلاف الاسان نے اس سلسلے میں لکھا تھا :

”آغوش۔ کھٹو میں ذکر بولا جاتا ہے..... منشی سید احمد صاحب دہلوی نے فرہنگ آصفیہ میں آغوش کو ذکر لکھا ہے۔ اس کے متعلق صاحب فصیح اللغات نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ یا تو کاتب کی غلطی ہے۔ یا حقیقت میں اہل دہلی بھی اس لفظ میں اختلاف رکھتے ہیں۔ حضرت استاد مرحوم (فصیح الملک آغ دہلوی) نے فرہنگ آصفیہ میں آغوش کو ذکر چھاپا دیکھ کر قافیہ وردین کے لحاظ سے یہ لفظ نوٹ کیا ہے۔“

سنسائی نہیں وہ ثبت سے فوش ہماری خالی ہے شب وصل بھی آغوش ہماری اہل دہلی آغوش کو عموماً مرث ہی بوستے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں جو اس کو ذکر لکھا ہے تو یہ یقیناً کتابت کی غلطی ہے کیونکہ ایسی فصیحاں کتب مذکورہ میں اکثر پائی جاتی ہیں۔ (اختلاف الاسان ص ۲)

مولف اختلاف الاسان کا خیال صحیح تھا۔ یہ کتابت کی غلطی تھی۔ کیونکہ اس کے بعد جو باضابطہ ادیش شائع ہوئے ان میں یہ مرث لکھا ہوا ہے لیکن اس تبدیلی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس منشی میں مولف آصفیہ کی دو اور فروگزاشتوں کا ذکر بھی ہے۔ جو : ہونا :
 ۱) مولف آصفیہ نے آغوش کی آئینہ کی سند میں دو شعر درج کیے ہیں۔ لیکن ان اشارے سے نہ آئینہ ثابت ہوتی ہے نہ تذکرہ (یہ اشارہ شاعت اول میں نہیں تھے) شعر یہ ہیں :

مولف منشی وجاہت حسین وجاہت جمنہا نوی، تمیز داغ، سال طباعت ۱۱۹۰ھ بمطابق ۱۷۷۶ء عام ایشیم پر میں لاہور۔ مولف کے الفاظ میں اس کتاب میں دہلی اور کھٹو کی زبان کے الفاظ اور محاورات کا فرق بیان کیا گیا ہے۔ ہم صحنے کا رسالہ ہے۔ بعد اختلاف سے متعلق طوفاً ہمیش بھی شامل ہیں جو اس زمانے میں مختلف رسائل میں شائع ہوئی تھیں۔ ان سے بہت سے اختلافات اور نزدیکی امور سے متعلق بہت سی کامیاب باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ مولف نے سرود پر زبان دہلی کو ”اوتے سقا“ اور زبان کھٹو کو ”اوتے سقا“ میں اور مولف دہلی کے نام سے اس کا ایک جلد شائع ہوا تھا۔ ۱۱۹۰ھ میں مولف نے چھوٹی تقطیع پر ایک رسالہ مکانا شروع کیا۔ میں جہان نے نعت شائع ہوتے تھے۔ ۱۱۹۰ھ میں فرہنگ آصفیہ کی چوتھی جلد شائع ہوئی تیسری جلد ۱۱۸۰ھ میں چھپ چکی تھی۔ ۱۱۹۰ھ وقت مولف نے ان دو رسالوں کے جہان کے مجھے کر بعد ازاں دو دم قرار دیا۔ پھر ۱۱۹۰ھ پہلی جلد بڑی تقطیع پر باضابطہ شائع ہوا دوسری بار یہ ۱۱۹۰ھ میں چھپا۔

گھٹ پیچ: لی راحت آفریں ہند میں
 بننا گھٹے چلتے ہی چلتے ہی ہے (تیم و بوی)
 مجھ میں اس میں رہا ہے کیا بنگ بنگ
 صدر آفریں میں بھی گیزاں ہی رہا (دوق)

۱۱۱ آفریں کھول کرینا کی سند میں تین ٹھنڈی کایہ شر کھلے ہے

ہو گئی ہے شہر، تیسہ سوچ دوڑی آفریں کھول کر ہند سوچ

صاف ٹھہرے کہ یہ شر آفریں کھول کرینا کی سند میں ہو سکتا۔ میرا صفت و قدر اعلیٰ میں آفریں کھول کرینا دوسری نہیں

ہاں آفریں کھول کر لپٹا۔ مزہ دوسری ہے اور سند میں آفریں کایہ شر کھلے ہوا ہے

بساں ساں دیا جو ٹھکل چھوٹا ساں پٹ جانوں اگر میں کھول کر آفریں ہاں سے

میرا اعلیٰ میں آفریں سے نکلا کی سند میں داغ کا ایک شر دوسری کیا گیا ہے جس میں کاتب صاحب نیلے صوف کی جگہ، یا نے
 بھول گھ دی ہے۔ جس سے آئینہ تذکرے سے بدل گئی ہے۔ شریہ ہے

جس میں تو دوسری آفریں سے نکلا اے شون ہاں ہی ہاتھوں سے ٹھکتی ہے جیت میری

مری آفریں ہونا چاہیے۔

۵۔ ایجاد :

لفظ ایجاد کا داستانہ خاصی دل چسپ ہے۔ اساتذہ دہلی دھڑنے باموم اس لفظ کو بالاتفاق ذکر استعمال کیا ہے، لیکن متعدد
 تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس کی تائید کے بھی قائل رہے ہیں، اگرچہ تائید کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی ہے۔ غالباً
 اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں یہ تائید رائج ہو گیا، جو کچھ اساتذہ بالاتفاق اس کو ذکر کرتے رہے ہیں، اس لیے تذکرہ
 نظم کرنے کی جرأت نہیں کی گئی۔ اس سے زیادہ دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ جس لفظ کو دونوں داستانوں کے اساتذہ بالاتفاق ذکر کرتے تھے
 ہیں، رفتہ رفتہ اس کی تائید کی طرف رجحان بڑھ گیا، یہاں تک کہ تکلیف عام طور سے اس کو مرنٹ استعمال کیا جاتا ہے۔

میںدا شہزاد، صبیہ، میرا اعلیٰ اور ارمانی میں ایجاد کو مرنٹ ذکر لکھا گیا ہے۔ اخوت کا معلق ذکر نہیں۔ صبیہ نے رشحات میں
 اس کو ذکر لکھ کر مزید صراحت کی ہے: "مرنٹ کتا ہے کہ ایجاد جو مرنٹ مشہور ہے، اس کی سند لکھی ابھی تک نہیں ملتی" (ص ۱۵۱) آگے
 چل کر مزید لکھا ہے: "حرام میں ایجاد کا لفظ مرنٹ مستعمل ہے، حالانکہ ذکر ہے۔" (ص ۱۶۲) مرنٹ وراثت نے بھی اس کو ذکر لکھا

مرنٹ میں شہزاد نے ایجاد کو ذکر لکھ کر حاشیہ میں یہ صراحت کی ہے کہ مرنٹ میرا لفظ ہے، اسے مرنٹ ہی لکھ لیا ہے اور سند
 میں تیم کا یہ شر لکھا ہے، رشک، اسے کیا تیم مرنٹ کو شہید دیکھے ایجاد، اس ترکہ تم ایجاد کی۔ لیکن مرنٹ کا یہ خیال صحیح نہیں، صوفی
 سوا، اتیان علی خاں صاحب مرنٹ کے مکتوب سے معلوم ہوا کہ اس غزل کی روایت کی ہے بھانے کا ہے۔ یہی دوسرا صریح حقیقت
 اس مرنٹ ہے، دیکھے ایجاد اس ترکہ تم ایجاد کا۔ تقسیم کی غزل ان کے دیں موسم بہار، افروز میں ص ۳۰۹ پر ہے۔

ہے، بہت یہ مراعت کر دی ہے کہ، بعض حضرات کی زبان پر یہ لفظ مونث ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ رشحات کی تحریر برعکس، بعض خاص بھی اس کو لفظ میں مونث استعمال کرتے تھے۔

آئیر میاٹی نے میرا رعیت میں تو اخف کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا، البتہ ایک خط میں اس کا مراعت کی ہے:

”یہاں مذکر ہے۔ اس لفظ کی تائید و تذکر میں بحث چھڑی ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔ مناسبتاً کہ نواب مرزا خاں

صاحبِ داغ کا قول ہے کہ وہی میں مونث ہے۔ مگر کلام میں مونث کا پتا نہیں چلتا۔ اگر ایک مقبر شاعر نے بھی

مونث کہا ہوتا، تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے۔ اور بغیر کلام میں آئے ہوئے، کہیں کہیں بول چال میں ہوتا،

کافی نہیں۔“ (مکتوب آئیر میاٹی ص ۱۴۲)

یہ تصریحات سے یہ بظہر ہو رہا ہے کہ اس کی تائید بھی معروض بحث میں رہی ہے۔ یہاں پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ آئیر نے داغ سے

زقلی مشرب کیا ہے۔ وہ صحیح نہیں۔ معلوم ہے آئیر کو یہ غلط اطلاع کاں سے لی، جس کو انھوں نے مان بھی لیا۔ داغ حقیقت کے ساتھ اس کی تذکر

کے قابل تھے۔ انھوں نے اپنے شاعر مولانا آقہ مارہروی کو ایک خط میں لکھا ہے:

”ایک اشتہار اس گلدستے میں آپ چھاپ دیجیے کہ اکثر استاد کے شاعر، بجائے خود استاد ہوا کہ اپنی خیریں

بے اصطلاحی چھپوا دیتے ہیں، اس میں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کسی نے غنبدِ ایباد اور استاد کو مونث بانڈھا،

حالانکہ اہلِ دہلی کی زبان پر دونوں لفظ مذکر ہیں۔“ (انشائے داغ ص ۱۴۳)

تقریر کہ ایباد کو ساڈہ دہلی دکنوی بالاتفاق ذکر آتے آئے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی تائید کی طرف رجحان بڑھا گیا۔ اس سلسلے میں داغ

کے شاعر و رشید مولانا آقہ مارہروی کے دو اقتباسات قابلِ توجہ ہیں، جن سے اس رجحان کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے:

آقہ صاحب نے، داغ کے خط کے جواب میں لکھا ہے:

”میر کا غزل میں ایباد کہیں مونث نہیں ہے اور نہ میں نے لکھا۔ غالباً حضور نے لفظ نہیں فرمایا۔ مسیاں

آقہ شاہجہاں پوری نے مونث لکھا ہے، جس کی اگلے پرے میں تصحیح ہو جائے گی۔ مولوی عبدالحمید جوڑنے

ایباد کو مونث لکھا ہے۔ اُنہا نے کیا بات ہے کہ ایسے کدڑی بھی، ایسی فاش غلطیاں کرتے ہیں۔“

یہ مولانا آقہ، ایک زمانے کے بعد اپنی کتب تاریخِ نشر و رد میں لکھتے ہیں:

”غنبدِ ایباد، کہ اس کو تمام یا بجز شعرائے دہلی دکنوی نے ذکر استعمال کیا ہے۔ لیکن اب چند شعرا کے

سوا، اس کی تذکر پر ہر شخص کو قائل ہے۔ یہی حال غنبدِ فہم وغیرہ کا ہے۔“ (ص ۲۵۸)

جناب آثر لکھنوی نے میر کے اشتہار کے جواب میں لکھا ہے:

”ایباد اور اپیل میری زبان پر مونث ہیں، مگر اس کے برخلاف بھی سنا ہے۔ تذکرہ تائید کے لئے

سے مختلف فیہ کتنا مناسب ہوگا۔“ (مکتوب اثر بنام راقم الحروف)

میں نے با محرم اس کو مونث سنا ہے اور آئی کل کی تحریروں میں بھی مونث دیکھا ہے۔ مثلاً: زبانوں کا سینکا سکھانا، جدید زمانے کی ایباد

ہے۔ "مہربان صاحب (قراچا اردو ص ۲) "امریکہ کی ایک نئی ایجاد" سب کہتے ہیں۔ یہ کئی نہیں کہتے کہ "امریکہ کا ایک نیا ایجاد" ہو کہ اس کو سادہ نے بذکر استعمال کیا ہے اس لحاظ سے اس کو مشترک الفاظ میں شامل کیا جا رہے ہیں اس صراحت کے ساتھ کہ اصل یہ عام طور سے سنٹ استعمال کیا جاتا ہے۔

4-11-51

مجلس نے مفید اشعار میں اس کو خلعت فیہ لکھا ہے ۔

۱۰۔ گفتارِ فیہ: یعنی ذکرِ مومن و دوزخِ ملعون ہوتا ہے، لیکن ذکرِ بیشتر اور مومن شکرت، جیسا کہ غنی بتلا مومنات دلاتے ہیں۔

ماں ہاں ہے کیا کھامری تقدیر کا
خدا کی اتنا اور ہے گھنے کی ادا اور ہے

دشک کے دونوں ممبر دواویہ میں یہ نسخہ اودھیں اس طرح نہیں آیا ہے کہ تذکرہ یا آئینہ کے متعلق کوئی نیکو بات کہی جائے۔ بلکہ نہ اس سلسلے میں مختلف ارانے ہیں۔ صاحب فرہنگ اصنیہ نے اس کو حرف ذکر کہا ہے۔ آئینہ کا مطلق ذکر نہیں کیا۔ — مولف ضمیمہ الحقائق

یہ بل اوسطاً تین سو تالیس سالہ (تقریباً ۱۸۷۵ء) کی ایک نیریشکوہ (بادی) سموات زبان و قوالہ شاعری میں بیکار تھے۔ عبدناج سے سزا بہت سی اصلاحات زبان و قوالہ کے واضح و راسل رنگ تھے (آبجیات ذکرناج) رنگ کے دو دیوان ایک ہی جلد میں چھپے تھے۔ ایک نام "نغمہ مہار" ہے "دوسرے کا" نغمہ گرامی۔ یہ تاریخی نام ہے۔ یہ مجبوراً لکھی گئی تھیں جن میں ۱۸۷۵ء میں چھپا تھا۔ ایک دیوان حلی میں ہے "دوسرا" شاہی پر۔ تیسرا دیوان جو ان کی "ذکر" ہی میں مرتب ہو چکا تھا (دیباچہ نفس العنہ) شائع نہیں ہو سکا۔ اس کا ایک نسخہ پاکستان میں ہے اور ایک آزاد پریس علی گڑھ میں اسوشتی تہ کر اہن ایچ اے عرفان ص ۴۷)

دائع کے مزید شاعر و مرثیہ گو، مہتمم اور ہر وہی نے اس نعت کی ترتیب کا لام شریح کیا تھا۔ قبل مرثیہ گو، اس "اول اول" تو حضرت برود (داغ) کو اس کتاب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوئی۔ مگر رفتہ رفتہ جب میرے حقوق اور غلطی حقیقت کا اندازہ فرمایا تو اس کتاب کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور ایسی توجہ دلائی کہ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، اچھے سے اور فیض افغانات، فیض افغانات ہے اور اس کی تائید (مستند) اور داغ، داغ کا خیال یہ تھا کہ اس طرح "زبانِ دلی" کا ایک صحیح نعت مرتب ہو جائے گا۔ فرہنگِ آمینہ بھی زبانِ دلی کا نتیجہ ہے، ایسی خوب آمینہ کے متعلق داغ کی جو رائے تھی، وہ مولوی عبدالرزاق کا لہجہ ہی (اصول ابراہیم) کے اس بیان سے معلوم ہوگی۔ مولوی صاحب نے دلی دربار کے موقع پر داغ سے ملاقات کی تھی، اس کا حال سمجھتے ہوئے، انہوں نے کہا ہے: "میں نے دریافت کیا کہ مولوی سید احمد دہلوی نے تیس سال کی محنت میں فرہنگِ آمینہ کبھی ہے، تحقیقات لغات اور محاورات اور زبان کی حیثیت سے اس کتاب کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے؟" فرمایا کہ سید احمد عرب سزے کے باشندے تھے۔ اور یہ کہ

نے بھی اس کو مذکور کھا ہے، اور جلال کے علی الرغم نے اس کی نقی کی ہے کہ خاص اس لفظ کو دونوں طرح برتتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے :

”یہ لفظ نا اقصوں کی بول چال میں بحالت تذکیر و تانیث، دونوں طرح مستعمل ہوتا ہے۔ بحکایت ایک شعر کے متقدمین و متاخرین میں، رشتہ بھنوی کے سوا، اور کسی کے کلام میں اطلاق کی تانیث نہیں پائی گئی۔“
(فیض الملک، مئی ۱۹۱۷ء)

صغیر نے رشتات میں اس کو صرف مختلف فیہ لکھنے پر اکتفا کی ہے۔ مولفین امیر اللغات و فرائضات و مجتہد الشعراء نے اس کو مذکر لکھ کر ”یہ مراحت کر دی ہے کہ صرف رشتہ نے اسے مونث لکھا ہے [یہ واقعہ ہے کہ رشتہ کے مذکورہ شعر کے علاوہ، اور کوئی مثال اس کی تانیث کی نہیں پیش کی جاسکتی ہے] یہی بات نفس اللغات کے دیباچہ نگار نے لکھی ہے : ”یہ لفظ عموماً زبالوں پر تذکیر کے ساتھ ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن رشتہ نے مونث باندھا ہے۔“ مگر ایسا سب حضرات کے نزدیک اس کی تذکیر مرعج ہے، اور یہ کہ رشتہ کا شعر، از قبیل شاذ ہے۔ ان میں سے کسی نے جلال کی طرح یہ نہیں لکھا کہ یہ لفظ مونث بھی بولا جاتا ہے۔ (اکثر سہی) اس سے واضح طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ذمے میں بھی یہ لفظ نہ تانیث مستعمل نہیں تھا۔

لیکن صاحب رسالہ بیضا نے اسے مختلف فیہ لکھ کر ”مونث کو مرعج لکھا ہے۔ اس کے علاوہ، مرزا غالب کی ایک تصنیف میں بھی یہ لفظ نہ تانیث موجود ہے : ”ا“ اہل ہند کی اطلاق کے موافق رہی۔“ (تیلغ تیز، مطبوعہ اکل المطابع، ص ۲۴)

صاحب رسالہ بیضا کے اس قول، اور مرزا صاحب کے اس جملے سے، جلال کے اس قول کی مکمل تائید ہوتی ہے کہ یہ لفظ دونوں

(بقیہ) درخواست جو مجھے، مگر سوال کرنا میں نے بھی ادب کے خلاف سمجھا : (یا دیقہ ص ۱۵۴) یہ بات پیش نظر رہنا چاہیے کہ عربی پرانی دہلی کے باہر ہے۔ اس سے داغ کی رنہ کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ مولوی صاحب معروف کو اہل زبان میں سے نہیں سمجھتے تھے۔ انوس یہ ہے کہ یہ لغت مکمل زبوسا۔ حیدرآباد کے ایک پریس میں اس کے کچھ اجزا چھپے بھی تھے، لیکن معلوم نہیں کیا ہوئے۔

مولانا حسن نے مئی ۱۹۱۷ء سے رسالہ فیض الملک جاری کیا (مقدمہ یادگار داغ) اس لغت کے کچھ اجزا اس میں شائع ہوئے تھے۔ اب اس سلسلے کے تمام شمارے بھی یکجا بے شکل ہیں گے۔ یہ نہایت انوس کی بات ہے۔ داغ اس لغت کے یہ سہ کے اشعار شامل تھے کہ کتے تھے مگر یہ مکمل ہو جاتا تو واقعہ کام کی چیز ہوتا۔ سولت پبلک و بریری رام پور میں اس کے کئی سال کے ٹھکانے محفوظ ہیں۔

یہ رشتہ کا نسخہ ہے۔ اس کا نام تہذیبی ہے۔ اس کا حرف جہد آل، ان کی موت کے بعد نیز پریس لکھنے سے شائع ہوا تھا۔ یہ صرف حرف تک ہے۔ باقی جہدوں کا پتا نہیں چلتا۔ امیر میانی نے ایک خط میں لفظ سالہ کے ذیل میں اس لغت کی ایک عبارت درج کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لغت مکمل ہو چکا تھا اور اس کا خطوط امیر کی نظر سے گزر چکا تھا۔ امیر کا یہ خط، مسکتیب امیر میانی (مستبہ حسن اللہ خان ثاقب) میں شامل ہے۔ جلال رشتہ کے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے لغت لکھنے میں، نفس اللغات کی بہت سی عبارتوں کو شامل کر لیا ہے اور کہیں حوالہ نہیں دیا۔ نفس اللغات کا دیا چوترا گھنٹہ نے لکھا ہے، جس میں بہت سی کلام کی باتوں کو یکجا کر دیا۔

اور متصل تھا۔ البتہ ذکر خیر اور موت کثر۔ رشتہ کا ذکر شعر اگر قابل استناد (تائید کے لیے) نہ لایا جائے (جیسا کہ بحث
اچھے آئے گی) تب بھی اس کی تائید ثابت رہے گی اور اس میں دہلی دھنڈی کی شخصیں نہیں جوگی۔
مقررہ کریشتر استاد دہلی دھنڈی کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ ہرگز ہے۔ اور باب لغت نے رشتہ کے ذکر شعر کا رد قبول
نہ لایا ہے۔ لیکن توفیق فیض اللغات کی طرح یہ گنا کسی طرح میں ہو گا کہ یہ خطا محض نادانوں کی بھول چال میں بتائید متصل تھا۔
ایک گروہ مختصر اس کی تائید کا قائل تھا۔ اور یہ دیکھ بھی آتے ہیں متبرقعہ جتنے دوسرے گروہ کے لوگ۔ یہ بات عقل کی مراحت سے
بھی ثابت ہوتی ہے۔ البتہ آج کل باہموم ذکر ہوا جاتا ہے شاید ہی کوئی شخص اب اسے بتائید متصل کرے جو کم از کم میری نظر
سے ایسی کوئی مثال نہیں گزری۔ نہ موت ہوتے ہمنے نہ۔

اس بحث کے بعد یہ بات بھی غرض ہے کہ کیا رشتہ کے اس شعر کو تائید کے سند میں پیش کیا جا سکتا ہے؟
لفظ سادہ کے ذیل میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ایسے اشارہ میں فدا الکاتب کا اقبال ہو سکتا ہو فائدہ استاد نہیں دیتے۔ جب
ہم کسی شعر میں ذریعہ بحث لفظ اس طرح نہ لے سکیں کہ جو کہ قطعیت کے ساتھ اس کو بدور سند پیش کیا جائے؛ اس وقت تک اس شعر کو سند
میں پیش کیا جا سکتا ہے نہ قبول کیا جا سکتا ہے۔ رشتہ کے اس شعر کی یہی صورت ہے۔ اس میں فدا لفظ کی تائید کی بنیاد کی
پر ہے۔ یہ صحت میں بھی ہو سکتا ہے۔

خدا کی انشا اور ہے لکھنے کا ادا اور ہے۔

ایسا کہ ثبوت موجود نہیں کہ رشتہ سند حقیقت کیا کھاتا تھا۔ حقیقت صورت حال کچھ بھی ہو؛ مسندت فرادہ اور مختارات اور باب فہ کے
اقتباس سے اس شعر کو ہر طور سے نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اس شعر سے تائید لاکھ کی سند لینا بالکل ایسی بات ہے جیسے اور باب لغت اور بعض
دوسرے حضرات نے، مثنوی گزراؤں ہم کے ایک شعر سے جو سادہ کی بحث میں ذکر ہوا ہے (محض اس بنا پر کہ "سادہ انھوں کی" چھاپا ہوا
ہے "سادہ کی تائید فرض کر لی۔

مجھے تعجب اس پر ہے کہ جنال نے اس شعر کو کس طرح بدور سند قبول کر لیا؟ جب کہ وہ اس کے قائل تھے کہ ایسے مواقع پر محض کا
کیا سے تائید و تذکرہ کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے لفظ قسم کے ذیل میں اس کی مراحت بھی کر دی ہے؛
"ہند سے کے معنی پر قسم کہ جناب مرزا والا جاہ مرحوم نے ذکر فرمایا ہے۔

بہاؤی رزق کا ہے فرد قسمت میں قم خالی ہمیشہ صفر کے مانند رہتا ہے شکم خالی
حاکم رقم بسنی ذکر۔ بافتان موت بڑا ہوتا ہے۔ پس توفیق ستام کتا ہے کہ جب نہیں ہے
کہ اس میں یہاں کی "ہو۔ اور کاتب نے "کا" لکھ دیا ہو۔"

میزر کی بھی اس سلسلے میں یہی رائے تھی کہ ایسے مقامات پر محض لایا کی سے فائدہ استاد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی عبارت
لفظ سادہ کے ذیل میں پیش کی جا چکی ہے۔ لیکن دونوں حضرات نے رشتہ کے اس شعر کو قبول کر لیا کبھی اختلاف کے بغیر۔ حالانکہ اس
کی بھی بالکل ہی صورت ہے۔

ہر مکتب میں ایک دل چسپ شخصیت ہے: اس میں مژدہ مکتبہ درج نہیں۔ البتہ "ادب و انشا" درج ہے، گویا یہ مرکب امتزاجی ہے: مولف نے اس مرکب کو موٹ کھڑ کر سند میں رشک کا زیر بحث شعور درج کیا ہے۔ موصوف نے اٹلی کی سلسلہ تذکرہ کا مطلق ذکر نہیں کیا۔ مذهب اہلسنت میں "ادب کو ذکر کیا گیا ہے۔ مولف نے اس کے بعد یہ مراحت کر دی ہے کہ "رشک اور اختر (شاہ اودھ) نے موٹ بھی نظم کیا ہے، لیکن موجودہ دور میں ذکر ہی ہے۔ تائید کی سند میں رشک کا زیر بحث شعور اور مابعد علی شاہ کا یہ شعر لکھا ہے:

مگر یہ بھی نکلا سر اپا غلط مکتی انشا غلط اور اٹا غلط

مولف مذهب اہلسنت کا یہ خیال ہرگز صریح نہیں کر اختر کے اس شعر سے اٹلی کی تائید ثابت ہوتی ہے۔ اس شعر سے تائید ثابت کی ہاسکتا ہے نہ تذکرہ مصرع ثانی میں یہ لازم نہیں ہے کہ "مکتی" کا اطلاق اٹا پر بھی ہو۔ مولف نے اسی ذیل میں مزید لکھا ہے: "اٹلی کی کاپی" اسے قاتم وغیرہ رائج ہیں۔ لفظ اٹلی میں ادا در وائیں۔ ورنہ پھر "انٹے کی کاپی" بھی لکھا جاسکتا ہے۔

مُنید اشعار میں رشک کے مذکورہ شعر کا مصرع اقل اس طرح ہے ع

نامہ کہاں ہے کیا کھامری تقدیر کا

اس رسلے کے جو اڈیشن میری نظر سے گزرنے ہیں، ان میں اسی طرح ہے۔ رشک کے دیوان میں "یا کھامری تقدیر کا" ہے۔ (ص ۳۵۵)

ادب اور زندگی کا تعلق

ڈاکٹر گیان چند

ادب اور زندگی کا تعلق اتنا واضح نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ایک عرصہ مخالفین پانڈے نے سودا پر جو کتب لکھی تھی اس پر پہلا باب تاریخی ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ تہذیبی تنقید کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ لکھنؤ کا دہسٹن شاعر، ادبی کا دبستان شعری، ابھی اس موضوع سے شروع ہونے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد قدوسی نے میر، حیات اور شاعری، لکھنؤ کا کافی جت میر کے زمانے کے تاریخی حالات کی نظر کر دیا۔ پھر کیا تھا ہر کتاب کے ایک سلسلے میں کیا کہ کتاب کی ابتدا میں دتی اور لکھنؤ کی ڈاکٹر تیس ڈہرا دی گئی جو سربا پر چکے ہیں۔ ڈاکٹر غلام قادر دہسٹن کا شاہ عالم کی آنکھیں نکالنا۔ ڈاکٹر نصیر الدین حسین کی جسر و جیان ڈاکٹر جان عالم کا پری نماز سماں۔ اور دھپنی کے عزیز نگاروں نے مسدس حالی پر اکھلی پتوں کی زبانی فخرہ پست کیا تھا۔

جناب معصفت نے جزا لیے کا قلم کار کر دیا ہے۔ مسدس یاد کو اور ادب انٹرنس کا مطالعہ

پاس۔ کوئی کتاب ہے کہ علم تاریخ میں تو مسدس یاد کو دہسٹن کا جسد ہے کہ ہٹری آف گیس اور ہٹری

آف روم تو گیا گھر کی نوٹ دی ہے۔

ان کتابوں کے پے باب پر بھی یہی پستی پستی ہوتی ہے اب تو یہ عالم ہے کہ تعلیمی متاد کھیلوں کو تاریخی پس منظر لکھنے کے یہ آریزوں کی دوری گردانی بھی نہیں کرتی پڑتی۔ اب تک کے شاخ شدہ مطالعہ کی سے کافی سلام مل جاتا ہے۔

تعلیم کو معنی پھر ل ہٹری آف انڈیا بنا دیا اس وقت تک بے سود ہے جب تک کہ ان واقعات کا زیر بحث صفت یا معصفت سے تعلق روشن نہ کیا جائے۔

آٹ برائے آٹسک رسم آٹا ہی پڑانی ہے جتنا لو آٹسک ایک نظریے کی صورت میں اسے سب سے پہلے اٹھارویں صدی کی ابتدا میں فرانس کے داکٹر کران نے لکھا۔ ۱۸۵۰ء ۱۸۵۵ء ۱۸۶۰ء ۱۸۶۵ء کے فترے سے ادا کیا۔ اس کے برعکس انگلستان میں میٹو آرنڈا نے ادب کو زندگی کی تنقید قرار دیا۔ آریزوں میں ادب بائے زندگی کا فخر و ترقی پسند تحریک کے ساتھ جڑ ہوا۔ ڈاکٹر اختر نے پہلے نے اعلان کیا:

یہ اعتراض جو پر بھی صادق ہو تب یہ کہ سیکر ڈی مٹ کے قلم سے 'اردو شاعری' شالی ہند میں میں بھی یہ باب ہے۔ جسد آئیں نے اسے جسد فقر کا شایکھ ایک شخص نے، اعتراض کیا کہ تاریخی پس منظر کو اہم شخص جو نہا جیے تھا۔ جسد آئیں نے بھی اسے بڑھایا لیکن سیاسی واقعات کا بجائے سماجی اور سماجی ملامت پر زیادہ زور دیا۔ ادب اور انتخاب۔ ص۔ ۵۔ دوسرا ایڈیشن۔

”تفنیق ادب ماشی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور ادب زندگی کا پروردہ اور آئینہ دار ہے۔“
مولوی عبدالغنی نے بھی شہادت دی۔

”ادب کی بنا زندگی پر قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو وہ ایک پرسی کا پی ہے۔ یہ جو کہ لیا ہے کہ
ادب زندگی کا ایک آئینہ ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔“

سوال پیدا ہوتا ہے: کیا اچھا ادب وہی ہے جو زندگی کی آئینہ داری کہ اس سے بھی بڑھ کر زندگی کی اصطلاح کرے؟ اس
سوال کا جواب دینے کے لیے میں دریا فضا کرتا ہے کہ

زندگی ادب کو کس حد تک متاثر کرتی ہے؟

ادب زندگی کو کس حد تک متاثر کرتا ہے؟

زندگی کے سہی کیا ہیں؟ ہستے ذی روح ہیں ان سب کو خاک کر زندگی کہہ سکتے ہیں۔ ان کے جذبات و خیالات کو سہی زندگی کا
جوہر قرار دیا جائے گا کیونکہ ہر کامشہر زندگی ہی ہے اہلک ہے۔ تو وہ تخلیقیتیں جن میں کسی جان دار کا باور اسطرح بھی ذکر نہ ہو زندگی سے معرا
کسی جانیں گی کہ نہیں شند:

گلابی سا جو جانا دیوار و در درختوں سے آنا شفق کا نغمہ
وہ چادر کا چھٹنا وہ بادل کا زور ہر اک جانور کا درختوں پہ شور
وہ سر و سہی اور آب و رواں وہ پانی کا مستی سے بہتا دیاں
(شعری میر حسن)

یا

صفت باندھے دونوں جانب بٹھے جیسے جوں ندی کا صاف پانی تصویر سے رہا ہو
جو دلفریب ایسا کُساں کا لفظ ارہ پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دھکیلتا ہو
آخرش میں زمیں کے سویا ہوا ہو سبزہ پھر پھر کے مھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
(اقبال - ایک آرزو)

ان اشار میں زندگی نہیں فطرت ہے بلکہ ان کے حسن میں شعبہ نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے بغیر بھی ادب پاسے
ہیں ہو سکتا ہے۔ بلکہ یہ ہستائی صورتیں ہیں۔ یہ نظموں کے اتماس ہیں۔ ان کے پیچھے اور بعد کے اشار زندگی سے خالی نہیں۔

اگر زندگی کو محض ذی روحوں کے تذکرے کے مترادف قرار دیا جائے تو وہ کوئی سا ادب پارہ ہے جو اس وسیع معمار
میں نہ سما سکے۔ جسم ہوش ڈبا اور مشنوی گلزار نسیم میں بھی زندہ کرداروں کا ذکر ہے بلکہ ادب برائے زندگی کے نظریے کا کوئی
بسنجہ اس سے آسودہ نہیں۔ انیس زندگی کا آئینہ دار نہیں قرار دیا جاتا۔ شاید ان کے فوق فطری کردار ان داستانوں کو زندگی کی بارگاہ

سے خارج کر دیتے ہیں لیکن اس وقت میں بھی یہی کہی کہ فنِ فطری ہمارے شوقِ باغ و بہار کے پتلے مددِ پیش کی سیر یا اسباب میں سوتے جاگتے کہ کافی یا جھٹھ مروت و قوت۔ نئے ادیب انہیں بھی زندگی آمیز اور زندگی آموز نہیں مانتے۔ انہوں نے کسی بھی زندگی کی زندگی کا تو ذکر ہے ہی۔ غالباً ادب کو زندگی کا آئینہ کھنکھنے کے معنی یہ ہیں کہ ادب ہم عمر زندگی کا آئینہ ہو کسی گئے گزشتے کا نہیں بچا پھر اختر رائے پوری کہتے ہیں:

ادب زندگی کا ایک شہزادہ اپنے احوال کا ترجمان ہے،

اس میں پہلی قیامت تو یہ ہے کہ اپنے احوال کی ترجمانی کا مطالبہ ادیب سے تاریخی نڈل اور انہیں کھنکھنے کا حق نہیں ملتا ہے۔ اس سے قطعاً نظمِ عمر زندگی کی نفسِ ترجمانی سے بھی بات نہیں ہوتی۔ داسرختِ امانت، شہزادی بہارِ عشق اور دیوانِ بان صاحب اپنے عمر کی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی حقیقت نگاری میں شبہ نہیں پھر بھی انہیں سراہنا نہیں جا سکتا۔ جنوں گر کہچہ رٹکی نے سوال اٹھایا۔

کیا ادب کے معنی صرف زندگی کی تحریک یا نقل کے ہیں۔ اگر زندگی کے معنی اعلیٰ یا شہنشاہی کو ادب کہتے

ہیں تو پھر اصل اور مثالی میں کیا فرق ہے اور اس کی تم کو کیا ضرورت ہے۔ ادب یا حسنِ کاری اگر زندگی

کی اصل ایک سادہ نقل ہے تو یقیناً ایک نقلِ جٹ ہے جو زیادہ سے زیادہ تفریق کا ذریعہ ہی بن سکتا ہے۔

اختتامِ مثنوی نے اس کا جواب دیا۔

چونکہ ادب جو انی قلم بنانے کا نام نہیں ہے اس لیے شاعر اور ادیب کا کام نہیں نہیں ختم ہو جاتا

کہ وہ ایک حقیقت پسند کی حیثیت سے جو کچھ دیکھتا ہے وہی لکھتے بلکہ وہ جس طرح محسوس کرتا ہے

کہ ایسا ہونا چاہیے اس کا اظہار بھی کرے۔

ہمارے ساتھ پر شہزادہ گم کے تاریخی اجلاس اپریل ۱۹۷۲ء میں جو اعلان امر پنڈت جواہر لال نہرو مثنوی پریم چند، ڈاکٹر

عبدالحق اور اختر رائے پوری وغیرہ کے دستخطوں سے شائع ہوا تھا اس میں کہا گیا تھا

کیا آج جب ترقی اور پستی کی حالتوں میں فیصلہ کن جنگ شروع ہو چکی ہے ادب اپنے کو غیر جانبدار رکھ

سکتا ہے؟ اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چہرے سے بیکاری اٹھائی

اور نظم کے داغ و حصے جائیں تو شاید لکھنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب

ہو زندگی اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلتا چاہتا ہے۔

داسرختِ امانت اور بہارِ عشق یہ فریضہ سراہم نہیں دیتیں۔ انہیں پڑھ کر کسی کی افسانہ نگار کی شکل میں جنسی نظم کے خلاف

جذبات ابھرتے ہیں تو یہ صفت کے منشا کی وجہ سے نہیں۔ لیکن اس کو تاریخی کا الزام صرف انہیں کتابوں پر کبھی نہ رکھا جائے، باغ و بہار

ضادِ جانب، شہزادی میر حسن، گلزارِ نسیم، قصائدِ دون، دو ادیب میر و غالب چند مثنوی اشارہ کے سوا نہ سماج کے چہرے سے بیکاری

افلاس اور نظم کے داغ و حصے ہیں نہ سماج کو بدلنے کا اشارہ کرتے ہیں لیکن ہم انہیں ٹھکرا نہیں سکتے سوختی نہیں قرار دے سکتے۔ ان سے

بھی آگے بڑھ کر دیکھا جائے تو حمدِ صفت اور حمدِ وصلی کے ضخیم عالمی شاہکار بھی بیکاری افلاس اور نظم کے خلاف تیغِ لہجہ نہیں نظر آتے۔

ہیئتہ، اوڈیسی، شاہنامہ، کالیداس، شیکسپیر کے ڈراموں میں سماج کو بدمنے کا جذبہ کوئی خاص نمایاں نہیں۔ جاگیر داری دوز کی ان پیداواروں کو پورے کئی برسوں سے ہم اپنے معیاروں کو نہیں بدل سکتے چنانچہ اختر رائے پوری نے کالیداس، کشیداس، جیگور اور اقبال سب کا رجعت پرستی کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔

ماضی کے ادب عالیہ نے ترقی پسند نقادوں کو عجیب و بد حاس ڈال دیا۔ انھوں نے اپنے ادب کے لیے جو اصول و معیار قائم کیے تھے وہ ان شاہکاروں کے سامنے دم توڑ دیتے تھے لیکن اب ان شاہکاروں کی حکمت اتنی مسلم ہے ان کے بقائے دوام پر صدیوں کی ایسی اہمیت ٹمک چکی ہے کہ جو نظریہ ادب ان سے منکر ہو اس نظریے کو ناقص ٹھہرایا جائے گا اس لیے ترقی پسند نقاد ادب عالیہ کو اپنے پرہیزگار ہوئے۔ مرزا جعفری نے ترقی پسند ادب میں اختر رائے پوری کے اعتراضات سے انحراف کیا اور تسلیم کیا کہ ماضی کا عظیم ورثہ ہمارا قیمتی سرمایہ ہے: انھوں نے کالیداس، شیکسپیر، جیگور، میر غالب، اقبال سب کی اہمیت اور حکمت کا اعتراف کیا۔ اپنا موضوع ترقی پسند ہی نہیں۔ صرف یہ اشارہ کرنا مقصود تھا کہ ادب کے وہ شاہکار بھی عظیم ہیں جو زندگی اور سماج کے مٹاؤں کو بہتر بنانے کے مددگار ہیں اور اس کا اعتراف ترقی پسندی کے سرکاری ترجمان بھی کرتے ہیں۔

اب یہی طرح کی تخیلات غلط ہوں مآول وہ ہیں جن میں زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش بھی ہے اور جاہلیاتی پہلو بھی خاطر خواہ ہے مثلاً

شاہان کی کل پر تنگ ہے عالم کی پہنتی
جہاں بانی دیکھتی آگ ہے گر تہی ہوئی بجلی
ہزاروں تجربوں کے بعد اب انسان یہ سمجھا ہے
کہ شاہی سے نہیں ہوتا شرافت کا چلن پیدا
نہ ہوگا بزم انسانی کا صدر انجمن پیدا
سُن اے فاضل کہ تارہ بقیامت نسل شاہی سے
(جوش - زوالِ جاں بانی)

یہ سناں اور اک قری انسان مین کا شکار
جس کی محنت کا مصدق تیار کرتا ہے شراب
خون جس کا بھلیوں کی انجمن میں باریاب
جس کی محنت سے بھجنا ہے تہ آسانی کا باغ
اور تھا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار
اڑکے جس کا رنگ بن جاتے جاں پروردگار
جس کے سر پر جگلاتی ہے کلاہ آفتاب
جس کی غفلت کی ہستی پر تہن کا چہرہ رخ
(جوش - کسان)

کبھی بھی بتانے سے دیکھا جائے۔ ادب میں ان کا اعلیٰ مقام ہے اور رہے گا۔

دوسری وہ تقریریں ہیں جن میں زندگی کو سنوانے کی کوشش نہیں جو بعض نقادوں کے نزدیک محبت پسندانہ بھی کہی جاسکتی ہیں لیکن جن کی حس کار کا کوئی شہ نہیں مثلاً

رہنے سے دل ب داں چلی کر جان کوئی نہ ہو ہم ٹھکی کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو
بے درد دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
ڈپے کر پیار تو کوئی نہ ہو تیار دار اور اگر مر جائے تو زور خواں کوئی نہ ہو
(غالب)

یہ فنے یہ ترانے یہ شباب و شعر کا عالم
یہ آرائش مکافوں کی یہ زیبائش مکینوں کی
یہ رخصتی حینوں کی یہ صحبت نازنینوں کی
یہ عمریں یہ بہاریں یہ شباب و شعر کا عالم
نہ لے جاؤں میں یا رب یہیں بنے ہے تو مجھ کو
یہ دنیا ہے تو جنت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو
(دنیا کی بہاریں۔ آخر شیرانی)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
(درد)

نہ ملے فتنہ ہوں نہ پر دوساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز
(غالب)

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں ہائے اس قید کو زنجیر بھی دوکار نہیں
(غانی)

اگر نہ زہرہ جینوں کے درمیاں گزرے تو یہ حیات کو کس طرح کہاں گزرے
(مگر)

ان تخیلات میں کیسے شکست ہے کیسے فرار۔ کیسے فدا ہاں مل ہے۔ کیسے افسردگی یکنی یہ انسان کے بنیادی جذباتوں اور آفاقی
تجربوں سے تنقید رکھتی ہیں۔ ان میں سے بعض پر ایک یا ڈیڑھ صدی گزر چکی ہے لیکن وہ ابھی تک تروتازہ ہیں۔ جانفزا و خیام کی شاعری
کئی صدیاں دیکھ چکی ہے اگر اُس کی بہار ابھی تک جواں ہے تو کیوں نہ ہم امید کریں کہ یہ ابھی اور کئی صدیوں تک وقت کے دھاسے کی مرین
ہر کے لی۔ ادبیات ماضی کے شہکار انہوں میں زندگی کو بدلنے کا کوئی جذبہ باجمد و عوی نہیں۔ نثر میں ان کی لہر باغ و بہار دنیا کا افسانہ
کہہ چکا ہے اسی طرح کی جوش و باغیچہ ہیں جو زہیں پر چاہے ہر قلب کو سحر کر دیتی ہے۔

تخیلات کی قسری قسم وہ ہے جو میں زندگی کو بہتر بنانے کا سودا ہے لیکن جو شریت کے حُسن سے عاری ہیں مثلاً
کام اچا کرنا چاہیے نہ کہ جلد

لام اچھا کوئی ہی کیا اگر انسان سے
کب کیا کیونکر کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں

مالی

فریوں کی فاد کشوں کی صدا ہے

مرے جلد ہے میں

امیروں کے میٹوں کا انبار سر پر

لے ہیں زمانے کے افکار سر پر

زمیندار کا ذخیروں پر سرکار سر پر

مرے جا رہے ہیں

(ڈاکٹر تاثیر - فریوں کی صدا)

اے کہ ہے دولت پرستی تیرا بے پایہ شعار
اے کہ تو دولت کو ہے سمجھا ہوا پروردگار
قصد مزدور سنا بھی ہے تجھ کو ناگوار
اور پھر غم خواری مزدور بھی ہے تجھ پہ بار
ہیں عرق جس کی جبین کا تیرے دُور شا ہوا
اور مزدور اک شکستہ جھونپڑی میں بے قدار

اے مجھے پسند اسے غمور اے سرمایہ دار
اے کہ دولت ہی تیری دُنیا ہے اور دولت ہی تری
ذم میں سرمایہ داری کے یہ وحشت یہ جنوں
خود پرکڑی تُو نے دولت خود سے مزدور کے
حق محنت اس کا دینے میں تجھے سو مُذّر ہیں
اپنی عشرت گاہ میں تو مجو خواب میش ہے

(سیاہ - اے سرمایہ دار)

یہ تخلیقات گرد آلود کتابوں میں دفن ہیں۔ یہ زندگی آمیز جملے ہوں لیکن خود ان کی قسمت میں زندگی نہیں۔ ان کی یہ اش
کے چند سال بعد ہی ان کا کوئی نام لیوا نہیں۔ زندگی اور سماں کو بہتر بنانے کی خواہش بڑانیک جذبہ ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے
کہ یہ ادب کی حیات ابدی کا ضامن نہیں۔ ہم لاکھ پا ہیں کہ بہترین ادب وہی قرار دیا جائے جو ان طاقتوں کا ساتھ دے جو دنیا سے
ہر قسم کے بے انصافی کو مٹانا چاہتی ہیں لیکن زمانے کا فیصلہ کچھ اور ہے اور کیا گیا ہے کہ وقت بہترین منصف ہے۔
تخلیقات کا ان کی شورش ہوئی بحث ایک ناول لکھ دیا گیا۔ کو کیا کی لڑائی ہوئی یا کو مباحی شہادت ہوئی ایک افسانہ وجود
میں آگیا۔ ہندوستان پر چین کا حملہ ہوا تو قریب قریب کا سب آگیا گویا گور بارود کی جگہ یہ نہیں ہی مرکز سر کریں گی۔ ان ہنگامی مروضات
سے تسق ہنگامی ادب کا اپنے دود میں مزدور مادہ تحسین لے جاتی ہے لیکن کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ سو دو سال بعد اس قسم کی تخلیقات
یاد رکھی جائیں گی۔ مگر نہیں تو انہیں ادب علیہ میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی مثال سینا کے ان پلٹے ہوئے شیشے گانوں کی ہے جو کچھ
ان کے لیے ہر ڈیڑے۔ ہر دو ڈیسکر۔ ہر بنا پر شورش قیامت چا دیتے ہیں۔ یہ غلہ کوئی پاؤ پھ ماحکک مبتلا ہے۔ اس کے بعد

ان کی تین اہلیوں کی نگاہوں میں اس طرح حقائق نیاں میں ڈال دیا جاتا ہے جیسے وہ کبھی نہیں ہی تھیں۔ اس کے مقابلے میں پتے داگ کبھی اس طرح زبان زد حرام نہیں ہوتے کیونکہ یہیں سے اس کا یہی چہرہ اُبھرے گا۔ زندگی کی سب سے بھرپور آئینہ داری اور اندازہ اخبار آج ہے۔ لیکن اخبار ایک دن کے بعد ہی ایسا باسی بے جان اور مردہ ہو جاتا ہے کہ روٹی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں زندہ جاوید ادب عالیہ زندگی کا اتنا بڑا عکاس نہ ہوتے ہوئے بھی زندہ و پائندہ رہتا ہے۔

ادب کو زندگی کا آئینہ کھینے والے بیشتر نقاد یہ غلطی کرتے ہیں کہ زندگی کو خارجی ماحول کا ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ زندگی میں دوا ماحول کی اہمیت مسلم ہے۔ ہم اکثر مسانی کو (سب کو نہیں) اپنے ماحولی جتنے کے زوایہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اویس کے ذہن اور جذبات کا تعمیر و تخیل میں ماحول بڑی حد تک اثر انداز ہوتا ہے لیکن فن کار کی شخصیت کے خط و خال تنہا یہی تعین نہیں کرتا، آخر کیا بات ہے کہ میر اور سعدی، اشعار مصطفیٰ، ذوق اور غالب اس قدر بزرگ شہر ایک ماحول میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اتنے ہی مختلف تھے جتنے دو مختلف علاقوں دو مختلف زمانوں کے باشندے ہو سکتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ اجتماعی ماحول کے ساتھ ساتھ ہر شخص کا انفرادی ماحول بھی اتنا ہی اہم ہے لیکن یہ بھی انسانی تخیل کی پوری تاویل نہیں کر سکتا۔

کیا آپ نے ایسی مثالیں نہیں دیکھیں کہ وہ حقیقی جانوروں کے مزاج اور سیرت میں بعد میں ترقی ہے۔ دونوں ایک ماحول کے گرد و چڑھیں۔ دونوں کا انفرادی ماحول یکساں ہے لیکن خیالات یکساں نہیں۔ ایک غریب باشعور آراؤ دوسرا غلویت پسند فلسفی مزاج ہو سکتا ہے۔ اگر ادا بادی نے کہا تھا۔

شیخ جی کے دونوں لڑکے باہر پر پائے گئے ایک ہیں کھیر پوس میں ایک بھانسی چلے

بہت ممکن ہے دونوں کا ماحول مختلف ہو گیا ہو۔ دونوں مختلف قسم کے ماحول میں اُٹھتے بیٹھتے یہی دونوں کے مزاج اور کردار۔ پسند و پسند میں بھی حد و فرق رہا ہو گا۔

سماجیات میں ایک بحث ہے کہ انسانی ذہن و کردار کی تشکیل میں ماحول زیادہ اہم ہے کہ وراثت۔ سماجیات کا موضوع چونکہ سادہ ہے اس لیے وہ وراثت کو نظر انداز کر کے ماحول کے حق میں فیصلہ دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں علم اوجسام (پیرامیٹرز) ماحول پر وراثت کو ترجیح دیتا ہے۔ نفسی خصوصیات پر زور دینا مبالغہ ہے لیکن بالکل بے اصل بھی نہیں۔ شیخ محمد اکرام نے غالب نامے میں غالب کے کلام میں نفس و ذہنیت کے تقابلی بحث کی ہے۔

انگریزی کی کماؤت Mac man باؤں تو لے پاؤں تھی سج ہے۔ کسی تحقیق کا اسلوب مصنف کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ انا سنوڑتے تو ان کی اکثر تحقیقات میں بھی وہی سنوڑ پنا مسکراتا نہ چڑا آدھا دکھائی دیتا ہے۔ حالی نہایت شریف اور منکر الزام تھے تو ان کی تقریریں سادہ ہوتی ہیں۔ شبلی کا جاتی ذوق بالیدہ تھا تو ان کا اسلوب بھی حالی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ ان کا مزاج ایسی چمکدہ گنتی ہے کہ اس کے حوال اور حرکات کا یہ جزیرہ مشکل ہے۔ بعض انسان غلویت پسند ہوتے ہیں تو بعض مکتبہ افلاک میں غفلت پا کر دنیا پا جاتے ہیں۔ بعض شقی اعلیٰ ہوتے ہیں تو دوسرے جہاں پر خود زہندی۔ دیگر ان پسند کو اپنا ماحول حیات بنا لیتے ہیں۔ بعض اشخاص جس سہرا کو دیکھ کر آکھ پیچ لینے کے قائل ہیں تو بعض ہمیشہ جہاں ہے جو کہ خوب سے جو خوب

کان کے پتھر میں پھنسے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار زندہ (dead end) بنادینے کی فتنے داری اس کے خارجی ماحول پر ہی نہیں ہوتی۔ جذباتی شخصیت کی تحلیل کرنے والے حوالے کی تئیں موجودہ مقالے کا مقصد نہیں ذرا قلم اسطور کو اس کی صلاحیت ہے لیکن یہ طے ہے کہ شخصیت محض ماحول کی زائیدہ نہیں ہوتی اور ادب شخصیت کا انعکاس ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انسانی دماغ میں مختلف جذبوں اور مصیبتوں کے حلقے نظر ہوتے ہیں۔ اعصابی نظام بعض فرد اور ان کی رطبتیں انسان کی داخلی شخصیت میں ترمیم کرتی رہتی ہیں۔ انسان کی نفسیاتی دنیا محض شعور پر مشتمل نہیں اس میں تحت الشعور اور لا شعور بھی موجود ہے۔ جوانی اور مصیبت میں انسان کے مزاج، پسند و ناپسند اور رجحانات میں جو تبدیلی ہوتی ہے کیا وہ خارجی ماحول میں تبدیلی کے باعث ہوتی ہے؟ نہیں ماحول اور معاشرے میں اکثر کوئی انقلابی فرق نہیں ہو جاتا اہاں جسم کی ساخت میں ضرور انقلاب ہو جاتا ہے۔ نئی لے شباب اور شبیب کی ادبی تخلیقات کا رنگ جُدا جُدا ہوتا ہے۔ صحت مند اور مرعین دنیا کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں۔

اب تک کی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ :

اگر ادب زندگی کا آئینہ ہے کہ کر زندگی سے خارجی ماحول مراد دیا جاتا ہے تو یہ کمال صداقت نہیں۔ ادب ماحول کا آئینہ ہے بہتر صداقت ہے "ادب شخصیت کا آئینہ ہے" اور شخصیت کی تعمیر میں ماحول کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے لیکن یہ تنہا حرکت نہیں۔

بحث کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ادب زندگی کو کمان تک متاثر کرتا ہے۔

مالی نے متعدد شعرد شاعری میں کچھ واقعات درج کیے ہیں کہ شاعر کی نظموں نے بدصدت کنزادیوں کی خانہ آبادی کرادی۔ نبیوں کو انتقام لینے پر اکسایا اور غریب الدیار بادشاہ کے دل میں وطن کی یاد گدگدا دی۔ بعض تنقیدی مضامین میں یہ پڑھنے میں آتا ہے کہ نئی نسل شبلی سے (یا کسی اور سے) متاثر ہے تو ذہن میں ہی سوال اُٹھتا ہے کہ الہی نئی نسل کے کتنے افراد ہیں جنہیں شبلی کی سانی ہو سکی ہے۔ شخصی محسوسوں کی بات دو سری تھی بادشاہ یارنیں جس شاعر کو فراتے تھے وہام بھی اس کے گرد یہ ہو جاتے تھے۔ رسل و سال کے آج جیسے ذرائع تو تھے نہیں تبویر نہا کر نثری کتابوں کی اشاعت کم سمجھائی تھی چونکہ نظموں کا یاد رکھنا آسان ہے اور وہ دلوں کو رگاتی بھی ہیں اس لیے زبان سے زبان پر گزر کر وہ دور دور تک پہنچ جاتی تھیں۔ آج جس کثرت سے کتابیں رسالے اور اخبار جاری ہیں ان میں منظومات کا حصہ عشر عشر بھی نہیں۔

ہمارے ملک کی آبادی میں پڑھے لکھوں کا تناسب ۲۰ فی صد سے زیادہ نہ ہوگا۔ ان میں اُردو پڑھے لکھے اور بھی تھوٹے ہوں گے۔ ان میں بھی ادبیات کا مطالعہ کتنے آدمی کرتے ہیں۔ حکومت اور سیاسی پارٹیوں کے پاس پروپیگنڈے کے کتنے وسائل ہیں۔ ریڈیو، اخبار و دستاویزی فلمیں وغیرہ۔ ہم پر دن رات اس پروپیگنڈے کی بوجھار ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے عقائد اسی سے تشکیل پاتے ہیں۔ اُردو پڑھنے والے بھی کوئی مستثنیٰ انھوں نہیں ان کی محبت و نفرت کے موربات کی تشکیل میں اقبال و جوش، نیاز اور کرشن چندر کی تحریروں کا زیادہ اثر ہوگا یا روزانہ اخبار اور ریڈیو کا۔ ہم اخبار میں پڑھتے ہیں کہ امریکہ میں گورے نو جوانوں کی ایک جیب بمشوں پر گولیوں کی

ہمچاؤ گئے ہم نے گزرتی یا افریقہ سے ہندوستانوں کو نگاہ جا رہا ہے تو ہمارے دماغ کا درجہ حرارت ایکس ۱۰۰ ڈیگری پر پہنچا ہوا ہے۔ ادب آتا دودا اثر کماں۔

آج کی زندگی بڑی پیچیدہ ہے۔ ادیب دکھ اپنے مڑ میاں مٹھو نہیں کہ وہ زندگی کیوں جنت بنا رہے ہیں اور یوں استقامت و برہنیت کے حلقوں کے خلاف جو حربہ ہیں لیکن واقعتاً سماجی زندگی کا سنگ متین کہنے میں ان کی حیثیت پہاڑ پر چوٹی یا سمندر میں قطرے سے شایہ ہی زیادہ ہو۔

جنگ آزادی میں شاعرانہ خوب نے اپنی نظموں میں غمی کے غلوں کی ایک جھلک پیش اور جھنجھلاہٹیں دکھائیں مگر اسے ہند کے ذیل غلامان رو سیاہ اور بے نام و رقم میں بچے پیدا کیا ہے کیوں — دیوہ۔ ان سے پوچھا جاسکتا تھا کہ حضرت ان کو سونے سے کہیں آزادی مل سکتی ہے۔ اس ٹانٹ ڈپٹ کی بجائے کچھ کہیے کوئی راہ عمل بھلی ہے کہ برہمنی حکومت سے کیونکر مل کر خلاصی ہو۔ اللہ کرنے والے کر رہے تھے۔ ان کی جد و جہد اور قربانیوں نے آزادی دلائی۔ جوش اور دود سے ادیبوں کی تخلیقات سے اس کی فائدہ میں کوئی نمایاں فرق پڑتا نہیں دکھائی دیا۔ ملک کی آزادی اور تقسیم جوش و اقبال کی مروجہ منت نہیں بلکہ مختلف سیاسی تحریکوں کی آویزش اور سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔

ملک کا سماجی اور معاشی ارتقا کس جہت میں ہو گا یہ نہ ادیبوں کے ناطے کرتے ہیں نہ شاعروں کی نہیں۔ یہ سیاسی پارٹیوں اور تکنیکی ماہروں کا میدان ہے۔

ہمز ملک غویش خسرواں و اسند گمانے گوشہ نشینی قوم فطاعنہ دوش
سیاسی پارٹیوں کا پروگرام اور ان کا قانون ساز اور حکومت کی مصروفیت کے سچے میں ڈھلنا ہے۔ منصوبہ بندی کی شے ہے۔ قومی ایسور بیڑیاں ہیں۔ طاعنہ کے ماہر ہیں ہماری زندگی کسی طاعنہ گزرے کی اس کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ جو کچھ بھگاتے ہیں ہم اس پر ہنسی کرتے ہیں۔ ان کے اور ہمارے درمیان مراست کا وسیلہ روزانہ اخبار ہیں۔

آج دنیا کی تقدیر سیاست دانوں اور تکنیکی ماہروں (Technocrat) کے ہاتھ میں ہے ادیبوں کے نہیں۔ ادیب کی تاثیر اور ہمہ گیری کی بات صرف ادیب کرتے ہیں۔ ارباب اقتدار کے سامنے یہ دعویٰ دہرایا جائے تو وہ اس مسموم دعوے پر ہلکا کر کر رہا نہیں ہے۔ مزدور یا کسان کے سامنے بڑے بڑے ادیبوں کا ذکر کیا جائے تو وہ حیرت سے ہلچلیں گے کہ یہ کن مخلوقات کا نام لے رہے ہو۔

ہمارے ذہن اور معتقدات کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والے ہمارا پسندیدہ روزنامہ اور ہمارے قومی ریڈیو کی خبریں ہیں۔ تاثیر کی وسعت اور گہرائی کے لحاظ سے ادبی تخلیقات صحافت کے آگے پانی بھرتی ہیں۔ یہ صورت حال صرف ان ممالک میں نہیں جہاں خواندگی کی کمی ہے۔ مغرب میں جہاں تعلیم بہت عام ہے اور ادیبوں کی آواز بہت زیادہ لوگوں تک پہنچتی ہے وہاں بھی ادیب سماجی ارتقا کا رخ متبیین نہیں کرتے۔ وہاں کی حکومت سیاسی گروہوں اور سرمایہ داروں کے پاس دالنے والے ہمارے متاثر کرنے والے وسائل افسردہ دہتے ہیں۔ وہاں پوچھنے کا ایک ہی تعینت ہو گیا ہے۔

پہلی اعلیٰ تعلیمات اثر افزا رہتی ہیں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

بڑے بڑے مصنفین کے قلم میں مادہ جو تہا ہے۔ وہ قاری کو کم از کم وقتی طور پر اپنا ہم خیال بنالیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز حکومت نے جوش کی نظم ضبط کی اور روسی حکومت نے نوبل پرائز بنانے والے ناول کو اپنی قلم رو میں شائع نہ ہونے دیا۔ ایک اچھے ناول یا انسانے کا اثر کئی روز تک دہتا ہے اور شاید تحت اشعار میں بس کر رہ جاتا ہے لیکن افوس تو یہ ہے کہ ہمارے ملکوں کے سیاست دان ادبیات کا مطالعہ نہیں کرتے۔ قانون ساز ایوانوں کے بیشتر اراکین تو محض حرف شناس ہی ہوتے ہیں۔ جو پڑھے لکھے ہیں انھیں بھی ادبیات کے مطالعے کی فرصت نہیں۔

آج ادبیات کے علاوہ دوسرے موضوعات مثلاً تاریخ، معاشیات، سیاسیات، سائنس وغیرہ پر کثرت سے لکھا جا رہا ہے ادبیات کے طلبہ کے علاوہ دوسرے قارئین اپنے اپنے پسندیدہ موضوع کا مطالعہ کرتے ہیں۔ سردار جعفری نے سچ کہا ہے۔

”ادب حقیقت کو رہنما فروہ ہے لیکن خارجی فطرت اور ماحول پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتا۔۔۔۔۔
وہ پہلے انسان کے جذبات پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس طرح انسان میں داخلی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔“

ادب کا اثر جتنا ہے لیکن اُن پڑھے لکھوں پر جن تک اس کی رسائی ہو سکے۔ ابھی ملک میں خواندگی بہت کم ہے مستقبل میں جوں جوں خواندگی بڑھے گی ادب کے قارئین کا حلقہ وسیع تر جتا جائے گا۔ لیکن اب ایک اور خطرہ ہے۔ ملک کی مزدوروں کے ورکشاپس، جہازوں پر یہ زور دیا جا رہا ہے کہ فنون کی تعلیم کے مقابلے میں سائنس اور تکنیکی تعلیم کو زیادہ فروغ دیا جائے۔ ادبیات کا ہر پروفیسر اپنے بچوں کو انجینیری یا ڈاکٹری کی تعلیم دلا رہا ہے اور کسی انجینیر یا میڈیکل کالج کے پروفیسر یا ماہر معاشیات کے سامنے شعر و ادب کا ذکر چھیڑا جائے تو وہ اسے بیکاری کے ٹکے سے زیادہ اہمیت نہ دے گا۔ آنے والی نسلوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب کی مقبولیت اسی تناسب سے گرج رہی ہے کہ ادب کا فروغ نہیں۔

ایسا سوچنا غوش فنی ہے۔ تعلیم کے فروغ کے معنی مطالعہ ادب کا فروغ نہیں۔ جب یہ صاف نظر آتا ہے کہ سماج کے ارتقا میں جو حقائقیں کام کر رہی ہیں ادب ان میں سے کچھ سے کم زور ہے تو پھر ادب میں مقصدیت کی بحث اپنی بہت کچھ منہیت کھودتی ہے۔

سماج کی بہتری کی کوشش کتنا مستحسن کام ہے لیکن یہ کام ادب کی نسبت مصافحہ سیاسی کتابیں، سیاسی نیا، ماہرین معاشیات، سرکارانہ سائنس زیادہ مضمون دہنی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ ادب کو بھی اس مبارک کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے لیکن ادب اگر کبھی کبھار اس جدوجہد سے تڑپ کر مڑے تو بھی سماجی ترقی کی رفتار میں کوئی نمایاں فرق نہ پڑے گا۔ یہ مسلم کہ ادب کو کوئی ایسی چیز پیش نہ کرنی چاہیے جو سماج کو مہلکا

ہمچاڑکتے جیسے گڑ گئی یا افریقہ سے ہندوستان میں کو نکال جا رہا ہے تو ہمارے سماج کا دور جو حرارت ایک دم ۱۰۰ ڈگری پہنچ رہا ہے۔ ادب اتنا زود اثر کمان۔

آج کی زندگی بڑی پیچیدہ ہے۔ ادیب کو اپنے مَنز میں ان سطور میں کہ وہ زندگی کو یوں جنت بنا رہے ہیں اور یوں استقامت و بربریت کی حالتوں کے خلاف عجب میں کیونکہ واقفان سماجی زندگی کا رُخ متغیر کرنے میں ان کی حیثیت پہاڑ پر چوٹی یا سمندر میں قطرے سے شاید ہی زیادہ ہو۔

جنگ آزادی میں شاعر انقلاب نے اپنی نظموں میں غلامی کے خلاف کیا کیا جھڑپیں اور جھنجھٹائیں دکھائیں مگر اسے ہند کے ذیل غلامانِ روسیہ اور عجمی نامزد قوم میں بکھے پیدا کیا ہے کیوں ————— وغیرہ۔ ان سے پوچھا جاسکتا تھا کہ حضرت ان کو سزا سے کیوں آزادی مل سکتی ہے۔ اس ٹانٹ ڈپٹ کی جھلنے کچھ کیسے کوئی راہ عمل بھلیسے کہ بدیسی حکومت سے کیونکر ملو غلامی ہو۔ اور کرنے والے کر رہے تھے۔ ان کی جدوجہد اور قربانیوں نے آزادی دلائی۔ جوش اور دُور سے ادیبوں کی تخلیقات سے اس کی رفتار میں کوئی نمایاں فرق پڑتا نہیں دکھائی دیا۔ ملک کی آزادی اور تقسیم جوش و اقبال کی مروجہ منت نہیں بلکہ محنت پسندی کی آویزش اور سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔

ملک کا سماجی اور سماشی ارتقا کس جہت میں ہو گا یہ نہ ادیبوں کے اہل طے کرتے ہیں نہ شاعروں کی نظلیں۔ یہ سیاسی پارٹیوں اور تکنیکی ماہروں کا میدان ہے۔

روزِ مملکت خویش خیزواں و آسند گردانے گوشہ نشینی قومِ فطامند و ش

سیاسی پارٹیوں کا پروگرام ایوانِ قافون ساز اور حکومت کی معرفت عمل کے سہنے میں ڈھلتا ہے۔ منصوبہ بندی کی شے ہے۔ قومی لیبر ریٹریاں ہیں۔ طرے طرے کے ماہرین ہیں ہماری زندگی کس طرح گزرے گی اس کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ جو کچھ نکالتے ہیں ہم اسی پر بٹکتے ہیں۔ ان کے اور ہمارے درمیان مراست کا وسیلہ روزانہ اخبار ہیں۔

آج دنیا کی تقدیر سیاست دانوں اور تکنیکی ماہروں (Technocrats) کے ہاتھ میں ہے ادیبوں کے نہیں۔ ادب کی تاثیر اور ہمہ گیری کی بات صرف ادیب کرتے ہیں۔ اربابِ اقتدار کے سامنے یہ دعویٰ دُہرایا جائے تو وہ اس معصوم دعوے پر ہنسکا کر گزر جائیں گے۔ مزدور یا کسان کے سامنے بڑے بڑے ادیبوں کا ذکر کیا جائے تو وہ حیرت سے پوچھیں گے کہ یہ کن مخلوقات کا نام لے رہے ہو۔

ہمارے ذہن اور معتقدات کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والے پورا پسند یہ روزنامہ اور ہمارے قومی بیڈیو کی خبریں ہیں۔ تاثیر کی وسعت اور گہرائی کے لحاظ سے ادبی تخلیقات صحافت کے آگے پانی بھرتی ہیں۔ یہ صورت حال صرف ان ملک میں نہیں جہاں خواندگی کی کمی ہے۔ مغرب میں جہاں تعلیم بہت عام ہے اور ادیبوں کی آواز بہت زیادہ لوگوں تک پہنچتی ہے وہاں بھی ادیب سماجی ارتقا کا رُخ متغیر نہیں کرتے۔ وہاں کی حکومت، سیاسی گروہوں اور سرمایہ داروں کے پاس رائے عامہ کو متاثر کرنے والے وسائل افسردہ است ہیں۔ وہاں پروپیگنڈا ایک حق تعالیٰ کی عیبت بھی گیا ہے۔

بھی ادبی تخلیقات اثر افزا رہتی ہیں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا

بل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

بڑے بڑے مصنفین کے قلم میں مادہ جو کہتا ہے۔ وہ قاری کو کم از کم وقتی طور پر اپنا ہم خیال بنالیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز محکمہ نے جوش کی نظم ضبط کی اور روسی حکومت نے فزلی پر انگریزوں کے دسے ناول کو اپنی فلم رو میں شائع نہ ہونے دیا۔ ایک اچھے ناول یا افسانے کا اثر کئی روز تک رہتا ہے اور شاید تخت اشور میں بس کر رہ جاتا ہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے ملکوں کے سیاست دان ادبیات کا مطالعہ نہیں کرتے۔ قانون ساز اداروں کے بیشتر اراکین تو محض حرف شناس ہی ہوتے ہیں۔ جو پڑھے لکھے ہیں انھیں بھی ادبیات کے مطالعے کی فرصت نہیں۔

آج ادبیات کے علاوہ دوسرے موضوعات مثلاً تاریخ، معاشیات، سیاسیات، سائنس وغیرہ پر کثرت سے لکھا جا رہا ہے ادبیات کے طلبہ کے علاوہ دوسرے قارئین اپنے اپنے پسندیدہ موضوع کا مطالعہ کرتے ہیں۔ سردار جعفری نے یہ کہا ہے۔

”ادب حقیقت کو بتا کر دہسے لیکن خارجی فطرت اور ماحول پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتا... وہ پہلے انسان کے جذبات پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس طرح انسان میں داخلی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔“

ادب کا اثر ہوتا ہے لیکن ان پڑھے لکھوں پر جن تک اس کی رسائی ہو سکے۔ ابھی ملک میں خواندگی بہت کم ہے مستقبل میں جو ان خواندگی بڑھے گی ادب کے قارئین کا حلقہ وسیع تر ہوتا جائے گا۔ لیکن اب ایک اور خطرہ ہے۔ ملک کی مزدوروں کے درپیش بجا طور پر یہ زور دیا جا رہا ہے کہ فنون کی تعلیم کے متبادل میں سائنس اور تکنیکی تعلیم کو زیادہ فروغ دیا جائے۔ ادبیات کا ہر پروفیسر اپنے بچوں کو انجینیئر یا ڈاکٹر کی تعلیم دلانا چاہتا ہے اور کسی انجینیئر یا میڈیکل کالج کے پروفیسر یا ممبر معاشیات کے سامنے شعر و ادب کا ذکر چھیڑا جائے تو وہ اسے بیکاری کے مسئلے سے زیادہ اہمیت دے گا۔ آنے والی نسلیں جن تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب کی مقبولیت اسی تناسب سے بڑھ جائے گی ایسا سوچنا غلط نہیں ہے۔ تعلیم کے فروغ کے معنی مطالعہ ادب کا فروغ نہیں۔

جب یہ صاف نظر آتا ہے کہ سماج کے ارتقا میں جو حقائق کام کر رہی ہیں ادب ان میں سب سے پہلے سب سے کم زور ہے تو پھر ادب میں مقصدیت کی بحث اپنی بہت کچھ منسوبیت کو دیتی ہے۔

سماج کی بہتری کی کوشش گفتا مستحق کام ہے لیکن یہ کام ادب کی نسبت صحافت، سیاسی کتابیں، سیاسی نیا، ممبرین معاشیات، ممبران سائنس زیادہ مہینہ خوبی سے سر انجام دے رہے ہیں۔ ادب کو بھی اس مبارک کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے لیکن ادب اگر کبھی کبھار اس جدوجہد سے مڑے مڑے تو بھی سماجی ترقی کی رفتار میں کوئی نمایاں فرق نہ پڑے گا۔ یہ مسلم کہ ادب کو کوئی ایسی چیز پیش نہ کرنی چاہیے جو سماج کو مڑا

انہوں کی طرف سے جانے گئیں مگر وہ بعض وقت ایسی چیزیں پیش کرے جو سوائے کسی کو ادبی اعتبار سے دنیا میں نہ سمجھائی بلکہ بنیادی
ادب سے متعلق تھیں تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ عہد ۲ :

منا ہے میری سخی رات کو آئے گی دادی میں
بہار و کیفیت کہ جلی آئے گی دادی میں
سودھ لگا کر ٹھیکہ جانے گی دادی میں
نیم باد یہ منظر کو دکھانے گی دادی میں
خواب و غم کی بجلی سی لڑائے گی دادی میں
منا ہے میری سخی رات کو آئے گی دادی میں

(آخر شریفی)

دنیا کی مفلوں سے اگلا تپا ہوں یا رب	کیا تلف نہیں کا جب دل ہی تجھ گیا ہو
شورش سے بھگتا ہوں دل دھوٹتا ہے میرا	ایسا سکوت جس پر تقریر بھی بسدا ہو
مرا ہوں غامضی پر یہ آرزو ہے میری	دامی میں کوہ کے ایک چھٹا سا جھونپڑا ہو
ذلت سڑو کی بوچھڑیوں کے چھپوں میں	چشموں کی شورشوں میں باجا سا جگ رہا ہو
راتوں کو پھنے ملے وہ ہائیں نکالے جس م	امید اُن کی میرا لڑا ہوا دیا ہو

(اقبال)

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس قسم کی شخصیات مفید ہیں کہ نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے انسان کو ہمیشہ آسودگی بخشی ہے اور ہمیشہ آسودگی بخشی مل گئی
ہونٹوں کے اس قتل سے کاغذ اتفاق ہے۔

اخبارات میں سارا دبا عصر کے کچھ نہیں ہوتا اور ادب میں علاوہ روح عصر کے کچھ ایک عنصر ہوتا ہے جس کا
تعلق مادائے عصر سے ہوتا ہے اور جس کی بدولت وہ ادب ہر زمانے کی چیز بن جاتا ہے یعنی وہی
واقیت (reality) اور کیفیت (quality) کا شکر و شکر ہونا۔ آج کل
کے مشہور انگریزی نقاد جے۔ بی۔ پریشل (J. B. Pershall) کا خیال بہت صحیح ہے کہ سماجی یعنی
آرٹ کو زندہ رکھنے کے لیے تنقیدی ہیروں کی ضرورت ہمیشہ پڑے گی۔

زندہ جاوید ادب میں اس ایفون کا شاہد ضرور رہتا ہے لیکن ایفون کی تعداد تنقیدی ہی ہونی چاہیے زیادہ ہوگی تو وہ زندگی
کے لیے ختم قاتل ہے۔

اہلِ نوابی کی اُردو خدمات کا ایک جائزہ

نصیر الدین ہاشمی

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جنوبی ہند میں مسلمان فوجی ترک و انتقام سے آنے سے صدیوں پہلے جب ازلوں کے ذریعہ پر امنی طریقے پر تجارت اور تبلیغ اسلام کے لیے آچکے تھے۔ ان آنے والے مسلمانوں میں اہلِ نوابی کا بڑا حصہ تھا۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب عرب اور ہند کے تعلقات میں حسبِ ذیل مباحث فرمائی ہے۔

”روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اور عربوں کا قیصر مرکز ہندوستان کا وہ آخری کنارہ ہے جس کو ہندوؤں کے پرانے زمانہ میں کیرالا کہتے تھے اور بعد کو طیار کہنے لگے۔ طیار کے یہی مسلمان عرب تاجر اور سوداگر اور تاریکینِ وطن ہیں جو مولا اور نائٹ کے ناموں سے ہندوستان میں مشہور ہیں اور جن کے ہاتھوں میں پرتگیزیوں سے پہلے ہمک سمندر کی باگ تھی۔ (صفحہ ۲۶۹)

(۲۶۹)

طیار کے دوسرے متبادل ساحل کو عرب مہر کہتے تھے اس کا موجودہ مشہور نام کار و منڈل ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ساحل کا یہ حصہ بھی چند صدیوں کے بعد عربوں کے استعمال میں آیا ہے۔ چند ہی صدی کے آخر سے اس کا نام سننے میں آتا ہے۔ ساتویں صدی میں یہاں عربوں کا اچھا خاصا عمل دخل معلوم ہوتا ہے۔ (صفحہ ۲۷۰ و ۲۷۱)۔ اگرچہ مولانا سید سلیمان نے صرف کیرالا کے سلسلہ میں اہلِ نوابی کا ذکر کیا ہے اور کار و منڈل کے تذکرہ میں ان کا نام نہیں دیا گیا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ کیرالا کی طرح کار و منڈل میں اہلِ نوابی آئے ہیں۔ چنانچہ ندوی صاحب نے ساتویں صدی کا جو تذکرہ کیا ہے وہ ابن بطوطہ کے سفر نامے سے ماخوذ ہے اس کی مباحث بھی ندوی صاحب نے فرمائی ہے۔ ابن بطوطہ کی مباحث خصوصیت سے پڑھنے کے قابل ہے جس کی مباحث آگے آتی ہے۔

یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے کہ اہلِ نوابی کس سن میں ہندوستان آئے۔ چونکہ تمام اہلِ نوابی شافعی مذہب کے پیرو ہیں اس لیے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ تیسری صدی ہجری کے بعد آئے ہوں گے۔ لیکن جو دوسرے تاریخی شواہد ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تیسری صدی ہجری کے بہت پہلے ہی ہندوستان میں آگئے تھے۔ بہر حال ان کے ہندوستان آنے کا زمانہ صحیح طور پر ہنوز متعین نہیں کیا جاسکتا۔

اہلِ نوابی کے ہندوستان میں منتقل ہونے کے متعلق جو مولانا سے اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اولاً ساحل کار و منڈل اور کنامک پر اترنے اور جنوبی ہند میں دُکد و دُکد تک پھیل گئے۔ جن مقامات پر اہلِ نوابی نے قیام کیا وہ کوکن، بیکل، - بھی۔

گندھار۔ بیدر۔ بیجاپور۔ حیدرآباد۔ دیور۔ اولکٹ۔ مدراس۔ بنگلور۔ میسور۔ مدھوت۔ کرنل وغیرہ مقامات ہیں۔ ان میں سے اکثر مقامات پر اب بھی ان کی خاصی تعداد موجود ہے۔

اہل فرایط کا ذریعہ مسائل تجارت تھا اس کے ساتھ ہی وہ درس و تدریس تبلیغ اسلام کے کاموں میں پوری قوت پر مستعدی اور ہمت سے مصروف عمل ہے۔ جب وہ ہندوستان آئے تھے تو ان کی مادری زبان عربی تھی۔ ہندوستان میں اگر لہجہ باش کہنے لگے۔ تجارت اور تبلیغ اسلام میں مصروف ہونے تو دوسری زبان کو حاصل کرنا ہی ان کے لیے ضروری تھا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جنوب میں آپس کے میل جول سے زبان پیدا ہونے لگی یعنی قدیم اردو میں ان کا بڑا حلقہ تھا۔ مگر سردست اس کے تعلق بھی صحیح طور پر سامنے پیش نہیں کی جاسکتی۔

دکن میں جب اسلامی حکومتیں، بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی، نظام شاہی، بھیکار اور بھیر آصفیہ وغیرہ قائم ہوئی اور ان میں سے اکثر حکومتوں کی سرکاری زبان فارسی تھی تو اہل فرایط نے بھی عربی کے ساتھ فارسی اور پھر اردو کو اپنا لیا۔ دکن کی ادبی تاریخ کا جائزہ دیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہاں عربی فہرست ایک نئے دھار تک علماء اور فضلا اور مصنف علم کی تصانیف اور تالیفات تک زبان ہی حتیٰ کہ خط و بھی فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ اگرچہ دکن میں سنہ ۸۰۰ھ کے اوائل سے دکن (قدیم اردو) کا رواج رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ اور نہ صرف بل بل چال بلکہ تحریر میں آج کے اکثر دیرہ ہم دست ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود علماء اور صاحب علم میں فارسی کا ہی رواج عرصہ دراز تک باقی رہا۔ کیونکہ اکثر علماء اردو میں تصانیف لکھنے کو 'اپنی شبکی تصور کرتے اور پس و پیش کرتے تھے۔ انہار خیالات کے لیے اس کو تہیہ تصور کیا جاتا رہا۔

میرے مضمون کا عنوان اہل فرایط کی آرڈینامٹ کا جائزہ ہے مگر غلط فہمی خدشات نہیں ہے اس لیے اہل فرایط کے علمی اور ادبی کارناموں کو جو عربی فارسی میں ہونے متروک کر کے صرف اردو کے متعلق مراحت کی جاتی ہے۔

اہل فرایط کی تاریخ پر نظر ڈال جائے تو واضح ہوتا اور اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ صدیوں سے اہل فرایط نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا تھا اور اس قوم کے کئی مشاہیر اس خصوص میں نام آور ہوئے ہیں۔ چنانچہ مشہور اسلامی سیاح ابی بطون نے اپنے سفر نامہ میں اس قسم کے دو بزرگوں کا حال اس طرح قلمبند کیا ہے:

دوسرے دن صبح کو ہنس میں پہنچے۔ یہ ایک بہت بڑی گاڑی پر واقع ہے۔ اس شہر کے عابدوں میں شیخ محمد ناگدی ہیں انہوں نے میری دعوت اپنی خانقاہ میں کی۔ فقہ اسماعیل جو کلام اللہ پڑھتے ہیں اس شہر میں رہتے ہیں۔ وہ نہایت پرہیزگار خوش خلق اور فیاض اس شہر میں تیرہ مکتبہ دیکھیں گے ہیں اور تیس مکتبہ لڑکوں کے ہیں۔ یہاں کا بادشاہ جمال الدین ہے یہاں کے راجہ کو کچھ معیت فراغ دینا ہے۔ بادشاہ سلطان جمال الدین محمد بن محمد بن ایک بت جہاں نماز پڑھتا ہے۔ جب میں اس کے پاس پہنچا تو انظار کے وقت مجھے بلایا بھی تھا۔ فقہ علی اور فقہ اسماعیل بھی موجود رہتے تھے۔

(ہندو کہ اب ہندو کہتے ہیں) احاطہ ہنسی میں شمالی کنڑا کے ضلع میں ایک تحصیل کا صدر مقام ہے، ملا علی جن کا تذکرہ ہے کہ ملا علی ہاشمی تفسیر رحمانی کے مصنف ہیں اور فقہ اسماعیلیہ کے ائمہ میں شامل ہیں اس لیے واضح ہے کہ اہل نوابہ کے علاوہ کار و منزل میں بھی آگئے تھے۔ یعنی ملک کو کئی کار مرکز بنا ہوا تھا۔)

اس زمانہ کے بعد بھی اس قوم کے شاہیر نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کو جوانی کا آبائی ورثہ تھا منزل کو نہیں کیا۔ اہل نوابہ کی عربی اور فارسی تصانیف کا سلسلہ ۱۳۰۰ھ کے بعد بھی جاری رہا۔ اگر شاہیر نوابہ کی صرف عربی فارسی تصانیف کی فہرست پیش کی جائے تو کئی سو کتابوں کا تذکرہ کرنا ہوگا۔ یہاں اس موقع پر دشوار ہے کہ کچھ ہم کو صرف اردو کا تذکرہ کریں۔ اولاً یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ اہل نوابہ نے اردو کی خدمت کی ابتدا کب سے کی ہے۔ اور کس نے اردو کا رولہ پیش کرنے کا آغاز کیا۔

واضح ہو کہ اہل نوابہ کا بڑا کام تبلیغ اسلام اور درس و تدریس کے ساتھ تجارت بھی رہا۔ زمانہ ساتویں میں عام طور سے تمام علماء و فضلاء اردو کے قطع نظر عربی فاضل کی حیثیت سے اپنا خیال کا ذریعہ قرار دیتے تھے چنانچہ ان ہی وجہ سے سنہ ۱۳۰۰ھ (سنہ ۱۸۸۳ء) تک ہی ان کے فارسی یا عربی تصانیف بہ دست ہوئے ہیں حتیٰ کہ خطوط بھی عرصہ دراز یعنی ۱۳۲۵ھ تک بعض اصحاب فارسی میں لکھا کرتے تھے۔

اگر میں یہ مراحت کروں کہ قاضی محمود بھری وہ پہلے ناطلی شاعر اور مصنف ہیں جنہوں نے قدیم اردو میں طبع آزمائی کی ہے تو شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ اب تک تو میں نہیں ادب نے قاضی صاحب کو ناطلی نہیں لکھا ہے پھر کس طرح قاضی صاحب کو اہل نوابہ میں شامل کیا جائے۔ اس خصوص میں مصنف تذکرہ گویا: اعظم کی مراحت قابل ملاحظہ ہے جو حسب ذیل ہے:

”مختار تخلص باقر حسین غمگین بہ خطاب پرخود حسن علی خاں از اولاد قاضی محمود بھری از قوم ناطلہ معززان این شہر است۔“ صفحہ (۳۴۶)

یہ تذکرہ ۱۲۵۶ھ (۱۸۵۶ء) میں طبع ہوا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قاضی محمود بھری کی اولاد اس زمانہ میں موجود تھی اور اہل نوابہ میں ان کو شامل کیا گیا تھا۔

اگر سر دوست قاضی محمود کے نام کو مزید تحقیق کے لحاظ سے حذف کر دیا جائے تو جن ناطلی شخص کو اردو کا پہلا ناطلی شاعر تسلیم کرنا چاہیے وہ سعادت اللہ ہیں۔

یہ وہ سعادت اللہ خان ہیں جن کو عالمگیر نے ذوالفقار خان کے خطاب سے ارکات کا صوبہ دار بنایا تھا۔ آپ کے دربار میں فارسی شاعر و ناطلی شاعر ہوتا تھا۔ جن میں قزلباش خان، فضل اللہ خان، آغا محمد مقیم، کھن، رستے بست، رائے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مصنف سینما (جو ان کے حمد کی تائید ہے) اس امر کی ملاحظہ کرتا ہے کہ ان کے دربار میں شعرا کے کلام

پر مباحثہ ہوتا تھا۔ غرض، شوخی و نصرت کی تعین کا ذکر ہا کہ۔ سادات اللہ خان غدی بھی شاعر تھے اور ان کو شعر کا اچھا مذاق تھا۔ فی البدیہہ شعر کا کہتے۔ ایک مرتبہ بھانپو کے شاعر جہا اللہ نے اپنے درخواست شعر میں پیش کی محرم میں اکثر اوقات دکنی زبان میں مرثیے لکھا کرتے جو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اپنی آپنائیز ہوتے انوس ہے کہ ان کا کوئی مرثیہ دستیاب نہیں ہوا۔ شمسہ میں ان کا انتقال محمد پور (ارکاٹ) میں ہوا۔ بہر حال موجودہ مسلمات کے لحاظ سے اہل فانیہ میں ان کو پہلا درجہ شاعر تسلیم کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔

اب مضمون کو سہولت کی غرض سے چند اوفادار میں تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ ہر دور کی اُردو خدمات کا احاطہ واضح ہو سکے۔

سب ذیل اوفادار قائم کیے جائیں گے۔

پہلا دور	ما قبل سنہ ۱۸۰۰ تا سنہ ۱۸۰۰
دوسرا دور	سنہ ۱۸۰۱ تا سنہ ۱۸۵۴
تیسرا دور	سنہ ۱۸۵۵ تا سنہ ۱۹۰۰
چوتھا دور	سنہ ۱۹۰۱ تا سنہ ۱۹۴۴
پانچواں دور	سنہ ۱۹۴۵ تا سنہ ۱۹۶۳

ان ہی اوفادار کے تحت یہاں مختصر مراجعت کی جاتی ہے۔ امید ہے کہ موجب دلچسپی ہوگی۔

پہلا دور

ما قبل سنہ ۱۸۰۰ تا سنہ ۱۸۰۰

اس دور میں اہل فانیہ کی اُردو خدمات کے سلسلہ میں صرف شاعری اور نثر نگاری کی مراجعت کی جاتی ہے۔ اس دور کے کئی ایک فرایط کے نظم اور نثر نگاری کے ذخیرے بہت مستعمل ہیں۔ جن شعرا اور نثر نگاران کو پیش کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہیں :-

مولوی محمد باقر آگاہ | ان کے والد بچاؤ پور کی فاضل شاہی حکومت کے خاتمہ کے بعد دیور (ملاوہ دراس) آگئے اور باقر آگاہ کی ولادت نشور نا اوند تقسیم و تربیت دیور میں ہوئی۔ آپ شمسہ میں ولید ہوئے اور دراس میں شمسہ میں انتقال فرمایا۔ آگاہ کی عربی فارسی تصانیف کی تعداد (۳۰۳) ہے۔ اس میں سے (۱۶) اُردو میں۔ تمام کتابیں نظم میں ہیں اور مثنوی کی صفت میں ہیں مگر اکثر کتابوں میں کئی مضمون کا دیباچہ نثر میں ہے۔ ان کتابوں میں اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہوئی ہے۔ مثنویاں بجز ایک کے باقی تمام سوانح سیر و تہذیب کے عنوان پر لکھی ہیں جو صیت سے عورتوں کے لیے ان کتابوں کو لکھنے کا تذکرہ کیا گیا ہے کیونکہ مساب علم عام طور سے عربی فارسی میں تقسیم پاتے اور ان کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ عورتوں کے لیے یہ سہولت نہیں تھی اس لیے باقر آگاہ نے صبر صیت سے عورتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

ہر آگاہ کا کلیات بھی ہے جس میں اصنافِ سخن کے کئی اقسام مثلاً قصیدہ، غزل، رباعی، قطع، مرثیہ سب کچھ شامل ہیں۔ اگرچہ آگاہ کو خاندانِ دلا بادی اور کاٹ کے دربار سے زیادہ تعلق رہا مگر ان کا کوئی قصیدہ والی ٹکسک مدح اور ستائش میں نہیں ہے بکھرے تمام قصائدِ قصیدہ ہیں، آگاہ کی چند کرداری کی یہ ایک عمدہ مثال ہے۔ آگاہ کی مثنویوں، قصیدہ اور غزل کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

آنحضرتِ مسلم کی سخاوت کا تذکرہ

سخاوت میں کوئی اوس کا ثانی نہیں	نہ تھا جو دکن اس کی . . . نہیں
سوانِ سون دیا اونٹ روزِ حسین	غریبان کون او خلق کا نورِ حسین
بقولِ ہوا زنی دیا چمے مہزار	ورم او شہنشاہ عالی تبار
فے یک مسلمان کون او بے بدل	دیبا یک جٹکل مہر کو بجری سیٹکل
کہاں قوم کون جاگو اے مگر باں	مختد او پر لاؤ ایمان حبان
سخاوت کون اوس کی نہیں انتہا	جو ظاہر سخاوت کا ہے مدعا
میں رحمت کا اوس کی کر دی کیا بیان	سرایا ہے اوس کون خدا در قرآن
دکھا رحمتِ العالین اوس کا نام	رونِ رحیم بھی اے شاد کام
شہنشاہ کی رحمت اے نام و در	ابھی سب پر تھی کہ شیطان و دہر

امت میں نبی کی جو ہیں حورِ رات	افضل ہیں سب عورتان سے سن بات
لکھا ہوں میں اس کتاب اند	احوالِ نسا کا اے برادر
اس شاہ کی دُختہ ان کا احوال	اس شاہ کی حورِ زنان کا احوال
امت میں جو عورتان تھے کامل	تھا قُربِ خدا کا ان کو حاصل

غزل کا نمونہ :-

فریادِ میری تیرے تغافل کو بڑھایا کیا خوب بلا تیرے میری فغان کا

کون سے لکھو کی جلوہ گاہ ہے تاب اند شراب
یونہی کہتی ہے جواب میرے گلاب اند شراب

دل میں میرے ساتی نہیں داستانِ شوق
کس طرح سے کروں میں پیائے پیا شوق

جب لکھنے حسد میں دل کو میرے شہزاد
پالی ہی بھرتے بھرتے نزا اپنی پانے چشم

ہے میری جان و دل پر حکم غزوہ کا تیری نافہ
مگر قندیر کے نایب ہیں تیری آغ کھل انکھیا

بستی سے تنگ دل ہوں اب نیستی کی
پھر کاش اس جہان سے ہر جان بے خبر میں

جو چشم بھٹی سے تیرے دُور پڑے ہیں
حیرت میں ہوں کہ دُور سے مجھ پر پڑے ہیں

عشق بن نہ تو کچھ گُمنہ نہ کب
بے گُن ہوں کہ کیوں ستاتے ہو

جب سے ہم تجھ کو یک نظر دیکھے
تجھ کو برشے میں جلوہ گر دیکھے
تو ہی منظور چشم و دل ہے سدا
کیا ہوا اگر ادھر ادھر دیکھے
کب شعلہ زار عشق کا دل تاب لاکے
درہ میں آفتاب کہاں سے سما لے

رباعی :-

تابل میں سہاتا ہے تیرا عکس حلال
نہ آنکھ میں مانا ہے تیرا نور حلال
یہ ملک و ملک میں جتنے ارباب کمال
تمہید میں تیرے ہو گئے یکسر لال
اس گریہ و زاری و دُعا سے قوبہ
اس قوبہ پر عجب دریا سے قوبہ
پستی کی علامات ہیں یہ سب چمنیں
یا رب یہ علامات بلا سے قوبہ

۲- دیوان

زین العابدین نام دیوان مختص - علی دوست خاں فرزند حسین خان دوست خان چندا صاحب کے داماد تھے۔ فارسی
اور اردو میں شاعری کرتے تھے۔ صاحب گلدستہ کرناٹک اور تذکرہ گلزارِ اعظم میں آپ کا حال درج ہے۔
افسوس ہے کہ ان کے دیوان کے غزلیات وغیرہ ہمارے دست نہیں ہوئے۔ صرف مرثیوں کا مواد ہمدست ہوا ہے۔ نمونہ
پیش ہے :

آج سلطان پیسبر پر ہے غم شاہ مردان شبیر اکبر پر ہے غم
سخت ہے خاقانِ جنتِ غم میں شاہِ دینِ شبیر و شبّر پر ہے غم

کیا کہلا میں آنِ حب پر ستم ہوا جب اوپر امام دوسرا پر الم ہوا
آلِ رسولِ حق پہ تظلم کا حال دیکھ ... کے دل میں بکامِ عدم ہوا
مانندِ گورِ غمِ سونِ بکرا ششداں عالم پر ہی جب نے ایجادِ غم ہوا

افسوس کہ اگر غمِ سونِ کھدو کے زارِ زار
دیوان پر کا یو ماتمِ جسم ہوا

مرثیہ ۱۔

ہوا ختم یار غم سون سدا بتان نبوت کا
ہوا بادِ ظلم سولہ گلِ شمع بزمِ ولایت کا
سدا غم گینی دو عالم کون کیا ہے چاند اتم کا
سکایا ہے خالِ عیش کون یا دخترِ غم کا
دھلیا تختِ امامت جب سے سروں دو عالم کی
گہری رہتی حرفِ غم کا
ہوا ختم شہادتِ قتلِ خاک کر بلا میں جب
خوشی کا نام تجسوس کم ہوا ہے جامِ جیونج کا

شکات کون کریں گے ساقی کوثر
رکھیا ہوں اسدا شکر کون اس شہداءِ مہکوم کا
سدا دیوانِ رویا حیف کا غمِ شمشیر ان کی
پھرتا ہے سر پہ اس کی کرد اہل بیتِ اکرم کا

مرثیہ ۲۔

کر بلا جب مقل شہداءِ اکمل ہوا
خاک اس کا رزمینِ آسمانِ افضل ہوا
غم کیوں نہ ہو روحِ سالم کون محیط
آفتابِ دین کی مغربِ عرصہ کر بل ہوا

(۳) اسی دہکے ایک اور شاعر مجھ ہیں :-

ظلم حقِ الدین نام تھا۔ ارکات میں شہداء میں تولد ہوئے اور شہداء میں مدراس میں انتقال ہوا۔ مالا جاہ کے قیسے
فرزندِ خیمِ ابد و لہ کی تعلیم اور تربیت سے متعلق کئی فارسی کتابوں کے مصنف ہیں اپنے انتقال تک درسِ قدیس میں مشغول رہے۔ فارسی
اور اردو میں دیوانِ مرثیہ کیے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جو فارسی اور اردو میں ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

ہے خبرِ حشرِ بتان سے غما میرا دل افسوس
اس کا وہ بہرِ بختِ متنبہ چاہیں آنکھیں

یار کے عشق نے جب سے مجھے مرثا کیا
چشم انگور کو خون بار کب
بہیں کعبہ و دہر سے نہیں کچھ کام
کو ہر جا ترا حبلہ ہم دیکھتے ہیں
کیا تیری چشم کا پیمانہ ہے
حسن جس اسرار کا متانہ ہے
مدت گزر گئی نہ سنی یار کی خبر
اس شوق دلیر بابت غم خوار کی خبر
معجز خیال ہستی مہر م کو دواع
در پیش ہے سفر مجھے دار ابقاطون
ایک دم جلنے پر مست لاف کھلے پر دانہ
شیخ کو دیکھ کر تاج محل جاتی ہے

مختار

باقر حسین نام مختار مختص۔ تاحی موٹو بھری کے پوتے تھے۔ فارسی شاعری میں اچھی دست گاہ حاصل تھی۔ مشاعرہ عظیم میں شریک ہوا کرتے۔ اپنے ادا کی طرح اردو سے بھی دلچسپی تھی۔ تصوف سے بھی شغف تھا۔ افسوس ہے کہ اردو کلام اب تک بہرست نہیں ہوا ہے۔

ان کے علاوہ کئی اور شعرا کا پتہ چلتا ہے جو اس دور میں اردو کی خدمت کرتے تھے۔ بہر حال اردو کی خدمت شاعرانہ کے لحاظ سے کئی اصحاب نے کی ہے۔

شاعری کی طرح شریک بھاری کی جانب بھی اہل نواہٹ نے قوت کی تھی اس دور کی نثر کا نمونہ پیش ہے۔

(۱) مرزا باقر گاہ کی نثر کا نمونہ یہ ہے :-

اگر پر باقر گاہ نے اردو نثر میں اپنی کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی ہے مگر اکثر نظم کی کتابوں میں طویل دیا چہ نثر میں قہقہہ کرتے رہے ہیں جس میں اردو کی تاریخ اور تنقید بھی آگئی ہے۔ چنانچہ یہاں اس قسم کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو نعتی کے مستحق گویا حقیقت ہے۔

”نعتیہ کو یک حرف لکھ کر کلیات سودا کو ہر ملاحظہ کر کر انتخاب کرنے اور ان سبھی کو یک

دانش گمشدہ عشق یا علی نامہ سے مقابلہ دیوے آ امانت سے اس کی اور اس کی باقی واقعت
 ہوئے۔ سودا کو چھوڑئے جس شاہ فارسی گرسے چاہتہ خواہ قصاید میں جوں خواہ غزلیں میں سے
 متقابل کیا جائے۔ بالفضل بھی مہر وادہ بیکانے فن طرازی یا قلم خان رازی کتب فقہ مر وادہ کلے
 گمشدہ عشق سے سوا جو کر دیکھے نامہ نثر دکنی کے ہاتھ لکھن کواری کیا کا خوب ہے۔
 کس نصرتی شے کے یہ دلوں ملا بعد مدت کے محب کو ملے
 کما سودا کتب انصاف سے کما صدقہ کر و مجھ کو اکا سے

(۲)

مولوی محمد فرحت شریعت النکاح عربی نثر کے عالم متبحر تھے۔ چند سال تک ریاست اراکٹ کی وزارت عظمیٰ کے
 فرائض انجام دینے مگر اپنے علمی مشاغل میں اس ملازمت کو باسج قرار دے کر مستعفی ہوئے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد (۲۱) ہے جو
 عربی اور فارسی میں ہیں۔ آپ کی ایک کتاب جو فقہ کا ترجمہ ہے اردو میں ہے۔ آپ سنہ ۱۱۶۶ھ میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۲۳۸ھ
 میں انتقال ہوا۔ نوذکر یہ ہے۔

جان تو بے شک بندہ ہا پنا گیا ہے ورنہ بیان اس کے کہ فرمانبرداری کرے وہ اللہ برتر کی پس
 ثواب پاوے اور درمیان اس کے کہ نافرمانی کرے اس کی پھر عذاب کیا جاوے اور جاپنچ
 اللہ کی موقوف ہے ساتھ عمل شرک کے اور ساتھ عمل غیر شرک کے۔

اگرچہ اس پہلے دور کے شعرا اور نثر نگاران کی تعداد زیادہ نہیں ہے مگر شعرا نے اصناف سخن کے تمام شعبوں
 میں اپنے فن کی جولانیائی کماٹی ہیں۔ غزل۔ رباعی۔ قطعہ اور مرثیہ میں اپنے خیالات کے تخیل کے جوہر
 پیش کیے ہیں۔ ان کی شاعری اسلوب کی جدت طرز اور ادب کی ندرت اور تخیل کی جبر واداری کے لحاظ سے قابلِ داد رہی ہے۔ انھوں
 نے اس وقت کی عام اور سلیس زبان کو اپنے اندر خیال کا ذریعہ بنایا تھا۔

دکن کے دوسرے شعرا۔ داستانوں میں اپنے افکار کو زیادہ سے زیادہ پیش کرتے رہے مگر انہیں بھی شعرا نے عشق
 داستانوں کے بجائے۔ سیر۔ مناقب۔ سوانح۔ افتادہ اور عقاید کے مضمون کو اپنے خیالات کی جولان گاہ بنا رکھا تھا۔ انھوں نے
 بادجو و تقریب شاہی اور قصاید پیش کرنے سے اجتناب کیا۔ نقیہ قصاید پیش کرتے رہے۔

دوسرا دور

سنہ ۱۸۰۰ء تا سنہ ۱۸۵۷ء

اس دور کے کئی شعرا کا تذکرہ مذکورہ مختار انظر میں موجود ہے جن میں سے بعض فارسی کے ساتھ اردو میں بھی

میں آنا ہی کرتے تھے۔ مگر افسوس ہے ان شعر کا اردو کلام سردست ہمدست نہیں ہوا۔ اس دور کے فارسی گو شعرا میں جی کا تذکرہ
کزار میں ہوا ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں:-

- (۱) آگاہ علی رضا خان (۲) احمد ، قاضی احمد (۳) انست ، حکیم اشرف الدین (۴) رفیع ،
حسن علی (۵) احسن ، سید محمد اسلمی (۶) برہان ، سید برہان الدین (۷) بیہوش ، محمد قادر علی متوفی
سنہ ۱۲۲۰ھ (۸) بدوت ، غلام حبیبی (۹) حیدری ، غلام حسن متوفی سنہ ۱۲۱۳ھ (۱۰) ذہن ، علی دوست
(۱۱) رسا ، محمد رحمت اللہ (۱۲) شایان ، محمد اسلم متوفی سنہ ۱۲۲۴ھ (۱۳) صاحب ، غلام علی (۱۴) عزت
عبداللہ (۱۵) عتیق ، محمد صیف اللہ (۱۶) فرحت ، محمد صیف اللہ (۱۷) لائق ، غلام دستگیر
(۱۸) مختار ، باقر حیدر (۱۹) نجیب ، شرف الدین (۲۰) گوہر ، محمد باقر خان (۲۱) نعتی ، افضل شاہ
(۲۲) دازغ ، حکیم شاہ زین العابدین (۲۳) افسر
- ان میں سے بعض کے اردو میں شعر کہنے کی مراحت کی گئی ہے مگر افسوس ہے کہ ان کا اردو کلام تذکرہ مذکور میں نہیں ہے
اور دوسرے ذرائع سے سردست کوئی کلام نہیں ملا ہے۔

جن شعر کا کلام ہمدست ہوتا ہے ان کی مواحت کی جاتی ہے:-

- (۱) ملک محمود نام جوہر تخلص تھا۔ کرونل کے جاگیر دار تھے۔ والی کرونل کے معاجروں میں شامل تھے۔ آپ کے فرزند غلام حبیب
جوہر اور پوتے غلام حیدر شہوار تخلص بھی شاعر تھے۔ جوہر کا قلمی دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ کلام کا
نمونہ پیش ہے۔

پاہ میں اوس سرکنان کی جو میں ڈوب رہا
میری آنکھوں کی دگر یہ یعقوب رہا

قیامت کا مجھے کیا ٹیپے اپنے دل کو اے جوہر
بھر دے بے پیسیر کا بھر دے بے پیسیر کا

بوسہ دے بیوں کا تو کس چشم کالی ہے
شکر سے بھی شیریں ہے با دام محبت

آج آنے سے تیرے میرا ہوا گھر آباد
تا قیامت رہے تو اور تیرا گھر آباد

تم آؤ بیٹھو میکے دل لال آنکھوں میں
رکھوں گاتپلی ساقم کو سنبھال آنکھوں میں

اُس چشم پر نگاہیں جو ہر عین ہے دل
یک سوختہ کب بج جام شراب میں

یوں دُراٹھک غم شاہِ نہن سے نکلے
ایسے وقی نہ کھو مافی مدف سے نکلے

یاد تیری بجھت ساقی کل رات مٹی
بچکی خیش کو بھی فی الغدیہ صحت مٹی
جہان اوس اخترِ روشن کی جسدِ گاہ رہی
بشکل قبضہ ناپنے بھی نگاہ رہی

عجب اپنی ہی ہے شکل اوس کے عشق میں جسد
زحمت وصل کی ہے جھکنا تاب جسدائی ہے

۲۔ ناظم
غلام حیدر قادری نام اور ناظم شخص۔ قادر اعظم خان خطاب اور ہار اراکٹ سے ملتا تھا۔ سن ۱۲۰۰ھ میں ولایت
برقی اور سن ۱۲۴۲ھ میں انتقال ہوا۔ ناظم شخص تھا۔ ریاست اراکٹ کے مرسان اور مہتمم کتب خانہ تھے۔ فارسی اور اردو
میں طبع آزمائی کرتے تھے۔

بہارِ اعظم۔ شرت سکندر نام۔ کاستن نسب ان کی تصانیف ہیں۔

۳۔ ذکا
جیب اشد نام۔ ذکا شخص۔ سن ۱۲۴۳ھ میں فوت ہوئے اور سن ۱۲۹۲ھ میں وفات پائی۔ اگرچہ آپ کا انتقال سن ۱۲۹۲ھ
کا ہے مگر آپ کی شاعری کا آغاز اور اُس کے پختہ ہونے کا زمانہ سن ۱۸۵۷ء سے پہلے کا ہے اس لیے آپ کا
تذکرہ قدر کیا گیا ہے۔

ذکا نے فارسی بھی اصلاح سُنی اور غالب کو اپنے شاگردِ رشید پر فخر تھا۔ ذکا احسانِ سخن کی ہر شاخ میں طبع آزمائی کرتے تھے
قصیدہ، غزل، مثنوی میں ذکا کا مزاج کلام بھی جتا ہے۔

دک کے مستحق غالب کی مراحت یہ ہے:-

۱۔ یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں کسی امیر کا نہیں کسی شیخ و شاب کا نہیں۔ یہ کلام میرے ایک دوست روحانی کا ہے اور فقیر دوست کے کلام کو معروض اصول میں نظر دشمنی دیکھتا ہے

پس جب بینچ ادائیں تو جو مجھ کو غصہ آتا ہے بے جھٹ

میں کہوں گانثر میں نعمت خان عالی کے طرز کا اسکا کیا ہے مگر میرا یہ کچھ اور کیا ہے۔ قصاید میں انوری کا چیرہ اٹھایا ہے مگر طبیعت نے اچھا زور دکھایا ہے۔ غزل میں متاخرین کا انداز عاشقانہ سوز و گماز منشی محمد حبیب اللہ صاحب ذکا سوز بہہ دان دیکتا کھتہ طراز۔ آفرین آفرین صد آفرین صد ہزار آفرین۔

اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ ذکا کا شاعری میں کیا درجہ تھا۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

اے خداوند کار بندہ نواز	فی الہی تو لطیف میں بسیار
ہے جگر رسم کی تیرے آگے	کہ میں چلاؤں روؤں زار نزار
شعر و انشا کی قدر ایک طرف	ہوں میں چودہ برس کا کار گزار
اتنی مدت ہوئی مگر نہ ہوا	کسی صورت سے موزم سرکار
چاہتا ہی رہا کوئی حسد مت	جس میں دو ماہ ہوئے بیش قرار
ہے میری ذات میں وہ استعداد	کہ نہیں شیرا میرا استعداد
ہے کوئی کام جو نہ دوں انجہم	کون سا گھاٹ جو نہ اُتروں پار
بس ذکا دیکھی تیری تسانی	با د ب ہے یہ اسمعی دربار

فانسل کسی مجھ سے وہ بست گرد ہوا تھا یعنی کہ میں اندیشہ محشر نہ ہوا تھا
اچھا کیا پچھل سے جو رخصت کی شادی مرنے کا مرے وقت بقدر نہ ہوا تھا

نازک تم ایسے ہو تو مجھے کیا اُمیدِ قتل
ایک ہاتھ کی تو ہاتھ میں توار چاہیے

تمام ہو گیا کام اپنے روتے روتے میں
بہانا شک کا پس موت کا بہانا ہوا

جہ سے سناٹا کتے دیکھتے نہیں
ہمسدوں کو اپنے عجز پر کتنا غم ہے

گیسٹ رُخ کا بوسہ دو
چاند گم ہے مسدہ دو
ہیٹنگ لگی ہے اوپر اگلے
آگے سے سر کو دستہ دو

دوسرا بنا زہ اُٹھتے
تم بھی آکر کسندہ دو

قابو نہیں جو چھا.... پرانے پاؤں میں
ٹھیکر سات گھاٹ کا پانی پلاؤں میں
باتھ گرمی سے میرے نفس کے جلی جائیگا
سوئی بج جلد مجھے یا حضرت جیسی دیکھو

فائل ہوں میں غائب کے دکا مسدہ ز سُنھن کا
ادیا کوئی دتی میں سُنھن در نہ ہوا تھا

حاصلت کی کہیں کو سر جھتی ہے خط نفیس میں
کعبہ کو کون جائے جو گھر میں حسم رہے

ترین جینگ پیسے کی دے خط سبزے
کیوں حال کچھ دمک کے بھی پھرے اٹا... میں

اسی دور کے نثر کے نمونہ کے لیے ہم حریف قاضی بدر القادر کو پیش کرتے ہیں جن کی تصانیف کی آج بھی مانگ ہے۔

مولوی محمد صہبہ اللہ مولوی محمد غوث شرف الملک کے چھوٹے فرزند تھے۔ سنہ ۱۲۸۸ھ میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۲۸۰ھ میں انتقال ہوا۔ مداس کی جامع مسجد میں مولوی ہیں۔

مولوی محمد صہبہ اللہ نے اپنے زمانہ کے حید علماء سے تعلیم حاصل کی اور اپنے ذوق و شوق سے بہت جلد فارغ التحصیل ہو گئے۔ حدیث، فقہ، تفسیر، تاریخ، فلسفہ کے علاوہ ریاضی، ہیئت اور طب میں بھی مہارت آتا رہتے تھے۔

اعظم جاہ اور غلام غوث خان کے زمانہ میں خدمات صدارت قنات اور مفتی سے سرفراز تھے اور عہدۂ اعلیٰ بدرالدولہ قاضی الملک مستجد جگہ کا خطاب ملا۔ پیر امام اعلیٰ منصف الدولہ، محدث خان قاضی الاسلام مستجد جگہ کے خطاب سے موسوم ہوئے مگر آپ زیادہ تر قاضی بدرالدولہ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

قاضی بدرالدولہ ایک بنیادی مصنف تھے۔ عربی، فارسی کے علاوہ آپ اردو زبان کے بھی مصنف ہیں۔ آپ کی دیگر کتابوں کے قطع نظر اردو کتابیں (۱۳) ہیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

شمار	نام کتاب	فنی	کیفیت
(۱)	ریاض السنواری	فقہ	خاص کر عورتوں کے لیے لکھی گئی ہے۔
(۲)	رسالہ در احکام صحت	"	بیرو عورتوں کے لیے مرتب فرمایا تھا۔
(۳)	فوائد بدریہ	سیر	آنحضرت صلیم کی مکمل سیرت ہے۔
(۴)	بہشت گلزار	"	ابو بکر صدیق کے حالات ہیں۔
(۵)	نثر الجواہر	"	طلحہ عبدالمعتز در حیلانی کے حالات
(۶)	خزانہ صولات	اخلاق	
(۷)	توشہ فلاح	مناسک	حج کے مناسک
(۸)	وقت الامداد	"	توشہ فلاح کی شرح ہے۔ کتاب کی ضخامت

بڑے سائز کے ۸۰۰ صفحے ہیں۔ عربی میں بھی کوئی کتاب اس فن میں اتنی ضخیم نہیں ہے۔

(۹)	گلزار ہدایت	حکایہ
(۱۰)	تذکرہ حسن حسینی	حدیث
(۱۱)	حوشی بر مسلم	"

فیض الحکیم تفسیر یہ ممکن نہیں ہوئی تھی کہ مصنف کا انتقال ہو گیا۔

باقراگاہ نے میں کام کو شرع کیا تھا اس کو قاضی بدرالدولہ نے پوری طرح ترقی دے کر نظم کی بجائے نظم میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا چونکہ آپ کی زبان الفاظ انتہائی زیادہ صاف تھی اس لیے اب آگاہ کی جگہ آپ کی کتابوں نے لے لی۔ مصنف ہر اس مادہ کو بھی میرا آپ کی تصانیف کے کئی کئی لایہ شیش شائع ہوئے ہیں۔

مزید بدر۔ سیرۃ النبی کی بہترین کتاب ہے۔ سنہ ۱۲۶۸ھ میں اس کی تالیف ہوئی ہے۔ اس کے دو باب ہیں۔ پہلے باب میں پیدائش سے وفات تک کے حالات مدح ہیں اور دوسرے باب میں صحت اور سیرت، اخلاق و عادات کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں مجرب واقعات، بعثت و ہجرت کے سینوں کے لحاظ سے بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے باب میں ثنائی کا ایسا بے مثل خلاصہ مرتب کیا ہے جس سے زیادہ واضح اور بہتر اور ناگہم ہے۔ عربی الفاظ کے لیے نہایت محذوں و مناسب الفاظ کھنڈا اور پیرایہ کرپڑھنے والے کو اردو کی زبان کا طغیائے اُسے اور ناما اُس الفاظ معلوم ہوں درحقیقت کامیاب کوشش ہے۔ اس امر کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ فی زمانہ بھی ایسی مستند و معتدل کتاب صمد پچھڑی ہوئی ہے۔

اس کتاب کا ایک جدید ایڈیشن سال ۱۲۸۱ھ میں حیدرآباد سے شائع ہوا ہے۔ قاضی بدرالدولہ کے دیگر اُردو کتابیں بھی اسی طرح قابلِ قدر ہیں۔ شرع ترشہ خدوع مناسک میں ایک ایسی گراں قدر کتاب ہے کہ فاسک تو کھا کر ہی میں بھی ایسی کوئی کتاب نہیں ہے۔ بہشت گلزار میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مفصل سیرت ملے گی ہے جو اپنی حیثیت سے اُردو زبان کی تہا کتاب ہے۔

قاضی بدرالدولہ نے زبان اُردو کی جو خدمت انجام دی ہے وہ فراورش نہیں ہو سکتی اب تک ان کی تصانیف کا مروج رہنا خود اس امر کی دلیل ہے کہ ایک صدی کے بعد بھی وہ اسی طرح قابلِ قدر ہیں۔ قاضی صاحب کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

”آنحضرت کے بڑے تھے اور آنکھوں میں شریعت تھی اور علقہ بہت سیاہ تھا۔ جب حضرت دیکھتے تو پورا دیکھتے اور آنکھیں نیچے کرتے۔ پیشانی مبارک کشادہ تھی اور ہون و دونوں لمبے ہونے اور کمانڈا تھے اور اس کے مسے پر سے تھے۔ جینی مبارک ہمارا باریک اور بیجا بیج بند تھی اور وہیں شریف بند تھا۔ دماغ مبارک نہایت سفید روشن براق آجڑائی اور رونق کے ساتھ تھے۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر کم کا حال اس طرح تبصیر فرماتے ہیں:-

”بہر عرصہ صابر کو کوری آگھ دیکھنے لگا کہ حضرت کے روبرو نہایت اوجھ بیٹھے ہیں اور کچھ کام فرماتے اس کو کہنے دو تھے اور دُخریکے تو اس پانی کو پیئے ایک پر ایک گرتے ہیں اور بات پکار نہیں کہتے تو تبخیم سے حضرت کی طرف نظر مالتے ہیں۔“

ایک جگہ کے واقعات کو یوں تحریر فرمایا ہے:-

مسلمان بھی اپنی فوج آگاہی کے مقابلہ میں گئے اس قدر جنگ ہوا آخر زید بن حارثہ نیزوں کے ماروں سے زخمی ہوئے اللہ شان کے تئیں جعفر بن ابی طالب نے کے جنگ پر مستعد ہوئے دونوں لشکر جب ہام غلط ہوئے جعفر گھوڑے پر سے اتر کر اس کے ٹاپے مار کے جنگ شروع کیے۔ سیدھا ہاتھ اڑھیا بائیں ہاتھ میں نشانی لیے۔ وہ بھی کٹ گیا تو چھاتی سے لگائی آخر شہید ہوئے۔

مصنف مرحوم کی سب سے پہلی تصنیف یا من السوان ہے جس کو آپ نے سنہ ۱۲۲۴ھ میں تصنیف فرمایا جب کہ آپ کی عمر ۱۱۹۱ سال کی تھی۔ یہ فقہ شافعی کی بہترین کتاب ہے جس میں عقاید و احکام طہارت و عبادت بشرح بسیط جمع کیے ہیں۔ اس کتاب نے جس قدر عام نفع پہنچایا ہے اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تمام ضروری مسائل عام فہم زبان میں بیان کر دیے گئے ہیں کہ سامنے پھر دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ویسا چہ میں فرماتے ہیں۔

کتابانہ فقہ شافعی کے عربی زبان میں بہت تصنیف ہوئے ہیں لیکن عمرتان اور اکثر عوام الناس کے تئیں زبان عربی سے کچھ آشنائی نہ ہونے کے سبب سے ان کے حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں اس واسطے یہ عاجز چند مسائل فقہ کے زبان ہندی میں جمع کیا نا لوگاں مستفید ہوں۔

اس کے بعد آپ نے مختلف باب میں اپنی کتاب کو تقسیم کیا ہے اور اس کو کتاب کا نام دیا ہے مثلاً کتاب الایمان، کتاب الطہارت، کتاب الصلوٰۃ وغیرہ اور پھر ان میں فصل مقرر کیے ہیں جس میں مختلف مسائل کو بیان کیا ہے۔ مسائل کے بیان کا طریقہ یوں ہے:-

۱۔ اقل رکوع اسلام کا بعد از رکوع حید کے نماز ہے اور نماز بے طہارت کے درست نہیں اور پانی مستقل یعنی محتث پانی جو ایک بار کسی فرض کام میں آیا ہے اگر چہ پاک ہے لیکن پاک کرنے والا نہیں ہے۔ فرض کام کیا مثلاً اس پانی سے غسل فرض یا وضو فرض کیا ہوئے یا کوئی نجاست دُود کیا ہوئے۔

آپ کی آخری تصنیف تفسیر فیض الکویم ہے جس کو آپ نے صرف سات پاروں تک ختم فرمایا تھا کہ سنہ ۱۲۸۰ھ

میں پیام اجل پہنچا۔

فہم مضمون کے پہلے اپنے نزول قرآن اور اُس کے جمع کرنے اور تفسیر و تاویل پر بحث کی ہے اور پھر سورہ فاتحہ کی تفسیر اور اُس کی فضیلت بیان کی ہے۔ آپ کی تفسیر کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے قرآن کی آیت لکھتے ہیں اور اس کے معنی بیان کرنے کے بعد اس پر بحث کو کرتے جاتے ہیں۔ سو کلام، کتب مباح، ریا، شفاعت، خدا رسول اور اولی الامر کی اطاعت مخلوق آدم علی سورہ جہاد کرنے والے کا مرتبہ، اجماع امت، تعریف الخیل، ذبح وغیرہ عنوانات پر کافی بحث کی ہے چونکہ مصنف کی یہ آخری تصنیف ہے اس لیے لہذا اس کا بھی درج کرنا بے جا نہ ہوگا۔

”واحققر مجمل اللہ جمیلاً“ اور مضبوط پکڑ واللہ کی دسی سب مل کر۔ اللہ کی دسی سے عواد اللہ کا دیں ہے یعنی دین اسلام کو اختیار کرنا اس کو دسی سے تعبیر کیا کیونکہ باریک تنگ راہ میں گناہ ہے۔ اور پیر پچھلے کا اندیشہ جو طے تو دسی جس کے دونوں طرف راہ کے دو جانب سے باندھے جوں پکڑے تو اس کو خوف نہیں رہتا۔ حق کی راہ بھی بہت باریک تنگ ہے اکثر لوگوں کے پیر اس پر غور نہیں پاتے ہیں جس نے دین اسلام مضبوط پکڑ اور بڑے خوف سے نجات پایا۔ بھٹکتے ہیں اس سے مراد قرآن ہے کیونکہ جو اس کے احکام پر چلے گا تو اس کو نجات ملے گی۔ انا۔

نزول الہی کے مستحق ہوتا ہے جسے گھٹتے ہیں۔

”اللہ تعالیٰ اُتر آئے کر کے جو آپ سے اللہ کی رحمت اور بندوں پر متوجہ ہوتا اور اُن پر لطف اور مہربانی کا نثار ملے۔“

اس منظر بیان سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ قاضی بدر اللہ ولد کی وجہ سے زبانِ اُردو نے مذہبی علوم کے دائرے میں کمان تک تر تلی کی تھی۔

تہمید

دوسرے دو مکاتذک ختم ہو چکا اس دور میں سر دست جی شعراء اور نثر نگاروں کا تعلق کیا گیا ہے ان کے کارنامے تاریخِ اُردو ادب میں خصوصیت رکھتے ہیں۔ ہندی داسے بھی ان کی اپنی تاریخ میں نمایاں جگہ دیتے ہیں۔ ان کی خدمات ہر آئندہ قابلِ تحسین ہیں۔ اگرچہ سنہ ۱۸۵۷ء کے قبل صرف شاعری اور نثر نگاری کے سوا دوسرے اُردو خدمات نہیں ملے ہیں کسی ذیل اخبار رسالہ یا انجمن کا تذکرہ نہیں ہو سکتا۔

تیسرے دور میں شاعری اور نثر نگاری کے علاوہ دوسرے اُردو خدمات کا حال بھی قلم بند کیا جائے گا۔
(باقی آئندہ)

ما قاضی بدر اللہ ولد کی تمام کتابیں شایع ہو گئی ہیں اور ریاض الصراۃ کے تو کئی کئی اڈیشن شایع ہوئے ہیں۔ ابھی حال میں یہ دونوں کتابیں حیدرآباد سے شائع کی گئی ہیں۔

حضرت آغا شاعر

محمد حبیب اللہ رشدی

حیدر آباد دکن میں ۱۹۳۲ء کا غالباً اکتوبر کا مہینہ تھا ایک مہذب میں میرے محترم بزرگ مولانا سید مختار احمد مرحوم، اپنے چھٹے بجائی جناب سید مرغوب احمد مرحوم کے ہاں گئے۔ انھوں نے بڑی مسرت اور مباحثات کے ساتھ مجھ پر خبر سنا لی کہ — میرے استاد حضرت آغا شاعر قزلباش تشریف لائے ہوئے ہیں اور شہید یار جنگ کے ہاں تم ہیں — میں نے بڑے اشتیاق سے اُن سے درخواست کی کہ میں بھی وہاں لے چلیں۔ انھوں نے کہا — وہاں جانے کی مزدورت نہیں، حضرت قبلہ روز صبح ٹپکتے ہوئے یہاں تک آجاتے ہیں۔ آپ کل علی الصبح یہاں آجائیں تو طوفاً جو بھائے گی اور اطمینان سے بات چیت بھی کر سکیں گے۔ ہم نے کہا — بہت اچھا کل صبح ہم ضرور یہیں آجائیں گے۔

میرے ان دونوں بزرگوں کے والد، عربی کے جید عالم، مولانا سید عبداللہ ٹوٹی تھے جنھوں نے انیسویں صدی کے واسطے میں میرے جامعہ ازہر میں عربی کی تکمیل کی تھی، اس کے بعد کئی مرتبہ معہ آتے جاتے رہے تھے۔ عربی زبان پر انھیں اتنی قدرت حاصل ہو گئی تھی کہ بے شکست شمر کتے تھے۔ ان کے ایک بے نقطہ و جہ قیدہ کو دیکھ کر قزلباش پاشا ندویمصر نے تعجب کا اظہار کیا تھا اور فارڈ ڈفرن و انٹرے ہند کے نام ایک سفارشی خط لیا تھا۔ جناب سید مرغوب احمد مرحوم نے اپنے والد کے ورثہ علم و ادب میں سے اپنا حصہ رسد ہی بڑے بجائی سے طلب کرنا شاید خلاف ادب سمجھا اس لیے اس سے دست بردار ہو کر اپنے لیے ایک ایسا میدان عمل تلاش کر لیا تھا جو نہ صرف خاندانی روایات کے لحاظ سے نیا تھا بلکہ خود شہر حیدرآباد کے لیے بھی نیا تھا۔ انھوں نے اُس زمانہ میں — یعنی بیسویں صدی کے آغاز میں — مولانا کی سی نئی نئی ایجاد کی مشینری سے واقفیت حاصل کی تھی اور پہلو موڑوں کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں کمال پیدا کیا تھا۔ ان کا کارخانہ جس میں موڑوں کی اور دوسری عام مشینری کی مرمت کی جاتی تھی، حیدرآباد کی ایک بارونی شہر پر تھا۔ کارخانہ سے بلا جو اپنے رہنے کا مکان بھی بنوا لیا تھا۔ اُن کی آمدنی ہزاروں روپیہ ماہوار کی تھی۔ وہ ہمارے سامنے کئی مرتبہ اپنے استاد حضرت آغا شاعر کا ذکر کر چکے تھے۔ شاگردی کا یہ تعلق تیس سال پہلے کا تھا جبکہ حضرت آغا شاعر اپنے استاد حضرت داغ دہلوی کی زندگی میں حیدرآباد میں قیام فرماتے تھے۔ میں خیال کرتا تھا کہ جناب مرغوب احمد صاحب کو زبانی میں شاعری کا چسکا پڑا ہو گا اور اتفاقات نے حضرت آغا شاعر کے غرض گو شاعر کا شکر دینے کا موقع فراہم کر دیا ہو گا۔

حضرت آغا شاعر نے ریاست جھارکھا پٹنہ (راجپوتانہ) سے ایک ماہوار رسالہ ”آفتاب“ جاری کیا تھا۔ یہ رسالہ میں نے حیدرآباد کے کسی گنبد خند میں یا کسی کالج میں یا کسی اہل علم کے ہاں نہیں دیکھا۔ مرث جناب مرغوب احمد کے ہاں ۱۹۷۲ء میں دیکھنا تھا جبکہ میں فرسٹ ایر میں زیر تعلیم تھا۔ اُس وقت حضرت آغا شاعر کو حیدرآباد سے گئے ہونے اٹھارہ ایس برس جو بچے تھے۔ لوگ کہتے ہیں

بلا چکے تھے۔ جس انوکھ اور اشتیاق سے ساڑہ آفتاب کا ساتھ لیا کرتا تھا اس کو دیکھ کر جناب مرغوب احمد صاحب نے اُس کے بہت سے پُرانے شائبے بھلے سیدھے تھے جن کو میں نے قسیم ہند کے وقت تک بڑی احتیاط سے رکھا تھا۔ لیکن جیسا آباد سے میری قسطنطنیہ کے دستان میں بہت سی کام کی کتابوں کے ساتھ ساتھ "آفتاب" کے سارے پرچے خبر نہیں کٹاں ہجرت کر گئے، بکھریں کٹاں چاہیے کہ وطن کی محبت نے انہیں بھیج کر ساتھ ہجرت کرنے نہیں دی۔ اس وقت میری کتابوں میں صرف ایک ذمہ دار ملازم کا پرچہ رہ گیا ہے۔

جناب مرغوب احمد مرحوم کی زبانی حضرت آفا شام کی آمد کا میں نے جو ذکر کیا ہے اُس زمانے میں حضرت جوش ملیح آبادی ہلکے مکان سے چند قدم کے فاصلہ پر ایک باغ والے بنگلے میں آٹھ آئے تھے۔ اُن دنوں ہارپا یہ سمول تھا کہ میں شیخ سوریے تیار ہو بیٹھا تھا کہ حضرت جوش ملیح آبادی تشریف لاتے ہم دونوں تفریح کے لیے "باغ عامر" ہاتے جو قریب ہی تھا۔ گھنٹہ آدھا گھنٹہ گھوم پھر کر سونے نکلنے کے بعد اپنے اپنے گھر لے کر واپس آجاتے۔

جس روز حضرت آفا شام سے ملاقات کا ارادہ تھا اُس روز بہت ہی سوریے سے میں اور حضرت مولانا مختار احمد صاحب تیار ہو کر باہر نکلے ہی والے تھے کہ جناب جوش کا ڈنڈا دروازے پر رسا۔ میں فوراً باہر نکلا۔ تشریف یہ تھی کہ حضرت جوش نزل کے محاف ہیں، اس لیے حضرت آفا شام کے سے قریب نزل گئے وہاں پہنچے بھی کریں گے یا نہیں۔ میں نے جناب جوش سے کہا: "حضرت آفا شام آئے ہوئے ہیں وہ صبح سوریے مرغوب احمد صاحب کے کارخانہ تک آتے ہیں۔ اس وقت میں مولانا سید مختار احمد صاحب کے ساتھ وہیں جا رہا ہوں، کیا آپ بھی تشریف لے چس گئے؟" یہ میں نے کہا ایسے منسل بھیجے میں کہا جس کا جناب میرے نزدیک یقینی انکار تھا۔ بیکھر میری توقع کے خلاف جناب جوش نے بھی حضرت آفا شام سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ حضرت جوش کے لیے جناب مرغوب احمد کو کوئی نئے آدمی نہیں تھے۔ حضرت جوش کی موٹر کار کو اکثر بار بار پھلنے کی عادت تھی اس کی وجہ سے وہ دنوں مدت تک ایک آدمی سے مشغول رہتے۔

غرض ہم تینوں جناب مرغوب احمد کے ہاں پہنچے۔ وہ اپنے کارخانے کے چانگے کے سامنے کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا: "حضرت قبلہ میں اب آتے ہی ہوں گے"۔ پھر یہ کہا: "یہاں انتظار کرنے کے بجائے کیوں نہ ہم خود اُدھر چلے چس؟" ہم لوگ تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ دُور سے حضرت آفا شام آگئے دکھائی دیے۔ جناب مرغوب احمد صاحب نے کہا: "دیکھیے وہ تشریف لا رہے ہیں۔" انہوں نے آفا صاحب سے ہمارا احوال کر لیا۔ اب ہم سب آفا صاحب کے ساتھ کارخانے کی طرف پٹے۔ وہاں پہنچنے سے پہلے جناب مرغوب احمد صاحب نے آفا صاحب کے کہا: "حضرت آپ کو حیدر آبادی ندی کھلے بہت زمانہ ہو گیا ہوگا، یہاں قریب ہی ایک نیا بٹول کھلا ہے اس میں ندی کا بھی انتظام ہے۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو ندی کھائی جائے۔" آفا صاحب نے کہا: "ہاں ہاں چلے پھر۔"

یہ صحبت دیر تک رہی۔ لنگر میں جناب مرغوب احمد اور جناب جوش کی زیادہ جتہ لیتے رہے۔

..... کبھی کبھی حضرت مولانا مختار احمد بھی ایک آدمی فقرہ فزادیتے تھے۔ میں خاموش تماشائی بن کر

اس انسانی ہستی کی باتیں سننا ہمیں کابر سوں سے ذکر سُن چکا تھا۔ میسر روپکس میں حیدر آباد دکن میں ایک غزل بہت گائی جاتی تھی جس کا مطلع ہے:

یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ صورت کیوں بنی منم کی
تھارے دشمنوں کو کیا پڑی ہے میرے ماتم کی

ادبی شعور پیدا ہونے کے برسوں بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ غزل حضرت آفا شاعر کی تھی۔ میسر روپکس میں حیدر آباد میں حضرت داغ کا بڑا چرچا تھا۔ انھیں انتقال کیے چند ہی سال ہوئے تھے۔ شہر میں اُن کے کئی شاگرد موجود تھے جو اُسٹا دمانے جاتے تھے۔ ایک شاگرد حضرت نادر خان تھے جو حضرت داغ سے قرابت بھی رکھتے تھے ایک مہلب ضیاء الدین ضیا گورگانی تھے جن کی بیوی حضرت داغ کی اہلیہ کی فری حریزہ تھیں۔ اس لحاظ سے وہ گویا حضرت داغ کے داماد تھے۔ غالباً حضرت داغ ہی کے تعلق سے حیدر آباد آئے تھے اور سرکاری ملازم ہو گئے تھے۔ یہ ٹھیکہ شہر دہلی سے تھا۔ "صاحبِ عالم" پکلائے جاتے تھے۔ غزل کے مطلع میں کسی کو خاطر میں نہ لانے لگے۔ (انھوں نے مولیٰ عمر پائی۔ تقسیم ہند سے سال دو سال پہلے مجھے ایک مرتبہ اُن سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا تھا اور چند غزلیں اُن کی زبان سے سُنی تھیں۔ اُس وقت اُن کی عمر اسی پچاس سال کی تھی) ایک طوائف بھی بتید جیات تھیں جو حضرت داغ کی ملازمت میں رہ چکی تھیں۔ اکثر شاگرد داغ اس مقرر خانہ کی بڑی عزت و تعظیم کیا کرتے تھے۔ بعض شاگرد مشاعرے میں ہانے سے پہلے اُن کو اپنی غزل سنانا باعثِ برکت سمجھتے تھے اس لیے انھیں غزل سنائے بغیر مشاعرے میں نہیں جاتے تھے۔ ایک حضرت بارتی تھے جن کا اسی زمانے میں انتقال ہو چکا تھا۔ اُن کے ایک عزیز میر میر محمد ادرکپن کے وقتوں میں سے تھے۔ مجھے عمر میں بڑے تھے۔ ہم لوگوں کو اپنی غزل سنا کر بڑا رعب جاتے تھے۔ بعض واقف کار کہتے تھے کہ — اس کے ہاں حضرت بارتی کا کلام ہے۔ انھیں کی غزلیں ہیں جو یہ اپنے نام سے سُناتا ہے۔ اس کو تو ایک مہر و بھی مزدوں کر مانیں گے۔

فرم: ۱۹۳۲ء میں حضرت آفا شاعر کے سامنے بیٹھ کر اُن کی باتیں سنتے ہوئے روپکس کی ساری باتیں حافظہ میں اُبھرائیں۔ داغ پرستی کا زمانہ گزر چکا تھا۔ ریورسٹی سے ہر سال میسوں گراجوٹ نکل رہے تھے۔ مولانا سید وحید الدین سلیم پانی پتی اردو کے پروفیسر تھے۔ غزل دشمنی اُن کی طبیعت کا جزوِ ایماں تھی۔ اُن کی تئیں اور تیلین سے بہت سے شاگرد غزل اور غزل گوئی کے خلاف ہلکے کالج سے نکلتے تھے جن کے نزدیک داغ ادا میر شاعر ہی نہیں تھے۔ ہاں خوب یاد آیا — ایک مرتبہ حضرت سلیم کے مکان پر ہم چند طالب علم بیٹھے ہوئے۔ مولانا حسبِ طوت، غزل کے نفوتِ تیشیت اور تعجب کے تیر پلو رہے تھے۔ رفتہ رفتہ داغ بھی زیرِ بحث آ گئے۔ میرا ادبی شعور داغ پرستی کی فضا میں بیدار ہوا تھا، مجھ سے رونا دھونا گیا۔ میں نے جو کچھ عرض کیا اُس کا منہم کچھ اس قسم کا تھا کہ کچھ ہی جو داغ کو شاعر ماننا بظاہر غلط ہے۔ اس پر حضرت سلیم بھر گئے۔ کہنے لگے — اچھا داغ کا کوئی ایسا شعر سناؤ جسے تم واقعی شعر سمجھتے ہو؟ حضرت سلیم نے اس تئیت کے ساتھ یہ فقرہ فرمایا تھا کہ میں جو بھی شعر سناؤں گا اُس میں وہ تعجبیک کا کوئی نہ کوئی پہلو نہ مل ہی پس گے۔ کچھ خور کے بعد مجھے داغ مرحوم کا یہ شعر یاد آیا:

ہم مرٹے تو پرستش نام و نشان ہے اب اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب

رسالہ زبان کی وہ جلد کس سن کی تھی ابستہ اتنا یاد ہے کہ اس کے ایک شمارے میں حکیم محمد خاں دہلوی کی وفات کا تذکرہ تھا۔ پرچہ کے مالک نے اپنی والدہ کی حالت کا حال بیان کر کے یہ بتایا تھا کہ حکیم صاحب مرحوم نے کیا عجیب علاج کیا تھا۔ حکیم محمد خاں دہلوی کی وفات ۱۸۹۱ء میں ہوئی اس لیے رسالہ زبان کی وہ جلد بھی اسی سن کی ہوگی۔

حضرت خان دہلوی ۱۸۹۱ء سے پہلے حیدرآباد دکن آچکے تھے اور امید دار ملازمت تھے۔ فردری ۱۸۹۱ء میں مرحوم حضور نظام میر محبوب علی خاں نے اپنی غزلوں کی اصلاح ان کے ذمہ کی۔ تنخواہ ایک ہزار دو سو یا ہوا رنغور ہوئی۔ بعض لوگ بارہ سو اور بعض پندرہ سو بھی بتاتے ہیں۔ میرے قدیم کرم فرما مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے اپنی کتاب ”وکن میں اردو“ میں دو ہزار بتائی ہے۔ غرض اس سال سے حضرت داغ کو ذریعہ معاش سے اطمینان حاصل ہوا۔ داغ کی شہرت نام ہندوستان میں تھی۔ وہ پہلے دربار رام پور سے وابستہ تھے۔ نواب کلب علی خاں مرحوم کی وفات کے بعد رام پور میں رہ سکے۔

شاہ دکن میر محبوب علی خاں کے استاد بن جانے کے بعد حضرت داغ حیدرآباد کے رؤسا اور شرفاء سے بھی روشناس ہوئے اور شرفاء سے بھی حیدرآباد میں ان کے بہت سے شاگرد تھے۔ ڈاک کی سہولتوں کے فائدہ ہو جانے کی وجہ سے سارے ہندوستان سے اصلاح کے لیے غزلیں آنے لگیں۔ حضرت علامہ اقبال نے بھی چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجی تھیں۔

قیاس یہ ہے کہ حضرت آغا شاعر بھی اپنی غزلیں اصلاح کے لیے بذریعہ ڈاک حیدرآباد بھیجنے لگے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسالہ زبان سے آغا صاحب کا تعلق منقطع ہونے کے بعد انھوں نے حیدرآباد آنے کا ارادہ کیا ہو اور استاد سے مشورہ کر کے حیدرآباد کا رخ کیا ہو اور دہلی سے اپنی روانگی کی اطلاع بھی کر دی ہو۔ لیکن دوسرا قیاس یہ ہے کہ آغا صاحب کے کوئی بزرگ جو پہلے سے حیدرآباد میں مقیم تھے اور حضرت داغ سے ربط رکھتے تھے وہی استاد شاگرد کے درمیان متوسل رہے ہوں۔ یہ قیاس اس بنا پر قائم ہوتا ہے کہ آغا صاحب نے ”بزم داغ کے چشم دید نقوش“ کے عنوان سے جو سلسلہ مضامین لکھا ہے اُس میں اپنے خلاف شاگردان داغ کی ایک سازش کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: — مجھ سے یہ ساری کہانی چھاپ صاحب مرحوم نے نقل کی تھی — بہر حال حیدرآباد میں استاد شاگرد کی پہلی ملاقات ایک دلچسپ بیضہ ہے جو یہاں پیش کرتا ہوں۔

حضور نظام میر محبوب علی خاں مرحوم کے زمانے تک حیدرآباد کے امرا قدیم منہجہ دربار کے امرا کا نمونہ تھے۔ ایک نواب خان خاں تھے جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ شہنشاہ اکبر کے مشہور سپہ سالار عبدالرحیم خان خاں کا دلاوہ سے تھے۔ ایک مہاراجہ کشن پرست تھے جن کے خاندان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ راجہ ٹوڈرمل کی نسل سے ہے۔ ایک راجہ شیوراج رائے ریاں تھے جو کابینہ قوم سے تھے اور مشہور تھاکر ان کے جید اعلیٰ، باقی سلطنت اصبہ نظام الملک آصف جاہ اولیٰ کے محاسب اعلیٰ یا جید اصلاح میں وزیر مینامنس تھے اور انھیں کے ساتھ دہلی سے دکن آئے تھے۔ ان کے علاوہ امرا کے پایگاہ اور دوسرے بڑے بڑے جاگیردار بھی تھے جو سلطنت اصبہ کے رکن نہیں تھے۔

مہاراجہ کشن پرست، حضور نظام میر محبوب علی خاں کے ساتھ کیسے تھے۔ ریاست کا ایک قدیم عہدہ ”پیشکاری“ (یعنی پرسنل سیکرٹری) تھا جو مہاراجہ کا مہم دوٹی عہدہ بھی گیا تھا۔ یہ عہدہ اگرچہ نام کا عہدہ رہ گیا تھا اور کوئی فرائض اس سے متعلق نہیں تھے مگر ریاست

سے اس کی تنخواہ برابر جاری تھی۔ حضرت خدام مرحوم نے انہیں جدید طرز کی حکومت میں بھی دینا (کینٹ) میں پہلے پہل تو وزیر اعلیٰ بنایا تھا اور بعد میں "دیوان" میں بھی ملازم بنادیا تھا۔ وہ اس عہد پر مرحوم ملکوں کی وفات تک کراچی رہے۔ موجودہ نظم میں جن کے نام ہیں ان کی اپنی تخت نشینی کے بعد انہیں وزارت ملنے سے ہٹادیا اور سرکار جنگ اقل کے پوتے نواب یوسف علی خان صاحب جنگ ٹاٹ کو دینا شروع بنادیا تھا۔ علم و ہنر کی قدروانی اور شرفاء و نوابوں میں ہمارا جو کثرت پرشاد کے برابر کوئی دوسرا ہیر نہیں تھا۔

جس زمانے میں حضرت آغا شام عید آباد گئے ہیں ہمارا جو کثرت پرشاد جوان تھے، شاعر و شاعری سے بے شغف نہ تھے تھے، شاعران کی خود مصداق کہتے تھے۔ آغا صاحب کے بیان سے تو یہ اطلاع ملتی ہے کہ اکثر چند وصل کی بارہ دہی "میں بزم شاعر" مستعد ہوتی تھی۔ ہمارا جو کثرت پرشاد ویران چند وصل شادمان کے پرغز سے اندان کی جاگیر، اٹاک اور حیدر پشکاری کے وارث تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ مشاعرے انہیں کے ایسا سے ہوتے تھے اور سرکاری مشاعرے بگے جاتے تھے۔

آغا صاحب جب عید آباد پہنچے تو انھوں نے عہدار اشتیاق میں اپنے ایک دوست سید محی مرزا صاحب دہلوی اور دوسرے ان قیام کیا لیکن یا تو ریل ہی میں بیمار ہو گئے تھے یا شہر میں داخل ہوتے ہی مرض نے جھکایا۔ مرض کی اس قسم کا تھا کہ صاحب کیسے ان کا ہسپتال میں داخل ہوا اور وہی ہو گیا۔ چنانچہ عید آباد کے صدر ہسپتال میں جو "دواخانہ افضل" گئی "کہلاتا تھا" داخل ہو گئے۔ کئی روز وزیر علی بنے کے بعد ان کی طبیعت ٹھیک ہوئی اور ڈاکٹر نے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ شاعرانے سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ آج ہی شام کو سرکاری شاعر "جے" صوفیہ پر ایک پیر گئی ہوئی فریالہ کی اور شام کو مشاعرے میں جا پہنچے۔ ہمارا جو کثرت پرشاد صدر شاعر تھے۔ ان کے قریب حضرت داغ تشریف فرما تھے۔ اس پاس اس عہد کے نامور شعراء و شاعری تھے۔ شاعرہ شریعہ نما۔ جب شیخ آغا صاحب کے سامنے آئی تو آغا صاحب نے صغریٰ کی فرمائش کے فرمایا کہ "میرا قاصد یہ ہے کہ میں اپنا چہرہ کلام سنانے سے پہلے تبرکاً اپنے استاد کا کلام سناتا ہوں۔ اس وقت میں اپنے استاد کے دو اشارہ پیش کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر آغا صاحب نے اپنے استاد کا نام بے نیاز دوا شد سنائے۔ اشارہ سن کر شاگرد داغ اور خود حضرت داغ نے اس میں آگے کر کے کہیں شخص ہے جو میرے اشارہ کو اپنے استاد کے سناتا کہ کون سا ہے۔ حضرت داغ نے پوچھا "آپ کے استاد کون ہیں؟" ذرا ان کا نام بتا دیجیے۔ آغا صاحب نے جہد آواز سے کہا "میرے استاد ہیں حضرت فیض الملک نواب مرزا خان داغ دہلوی"۔ ہمارا جو بارہ دہی پچکے سے پوچھا "یہ کون صاحب ہیں؟" استاد داغ نے فرمایا "میں نہیں جانتا" آج پہلی مرتبہ یہ صورت دیکھی ہے۔ پھر استاد داغ نے پوچھا "آپ کو صاحب ہیں؟" ذرا اپنا نام بتائیے۔ آغا صاحب نے کہا "مجھ میں آغا شاعر ہوں"۔ داغ نے کہا "اگر وہ بھی آغا قلم کب آئے؟" مجھ سے کیوں نہیں ہے؟ ذرا یہاں آؤ۔ آغا صاحب قریب گئے۔ استاد نے گلے سے لگایا۔ پھر پوچھا "تم مجھ سے بڑے کیوں نہیں؟" آغا صاحب نے کہا "بڑا کیسے؟" آتے ہی بیمار ہو گیا "ہسپتال میں داخل ہوا۔ اتنے دن ہسپتال میں رہا لیکن آپ نے خبر تک نہ لی۔"

استاد سے مل کر اپنی جگہ جا بیٹے جو غالباً خوشن شرا میں تھے۔ صدر شاعرہ ہمارا جو کثرت پرشاد نے کہا "آغا صاحب ذرا قریب آجائیے۔" آغا صاحب جیسے کہ کچھ آگے آئے۔ ہمارا جو نے کہا "اور آگے آئیے۔" آغا صاحب

ادب کے بڑے کاردار اور کے قریب پہنچ گئے۔ ہمارا جو نے کہا۔ ”ادب کے آئیے۔“ اس سے آگے بڑھنے میں ادب مانع تھا۔ آغا صاحب نے جھلک کر کہا۔ ”ذکیا حضور کی گردنیں آ جیٹوں؟“ آغا صاحب کی اس جھلک پر ہمارا جو زیرب محسوس کر خاموش ہو گئے۔ آغا صاحب نے فرل سنائی اور خوب خوب داد پائی۔ یہ تھی شاگرد کی استاد سے پہلی کلمات! ۱۹۱۶ء میں آغا صاحب نے اپنے رسالہ ”آفتاب“ میں ایک نہایت دلچسپ سلسلہ مضامین شروع کیا تھا۔ جس کا عنوان تھا۔ ”بزمِ داغ کے چشم دید نقوش“۔ اس سلسلہ کا غالباً پہلا مضمون یہی واقعہ تھا جس کو میں پڑھ چکا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں آغا صاحب سے جو ملاقاتیں رہیں ان میں ایک روز میں نے اس واقعہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ آغا صاحب نے تفصیل کے ساتھ سارا قصہ سنایا۔ رسالہ ”آفتاب“ میں جو کچھ چھپا تھا وہ بہت مختصر تھا۔ خود آغا صاحب کی زبان سے اس واقعہ کو سن کر جو مزا آیا وہ مجھے ہوئے مضمون سے کہیں زیادہ تھا۔

افسوس ہے کہ میں ان سے یہ نہ پوچھ سکا کہ وہ پہلی مرتبہ کس سال حیدر آباد تشریف لائے تھے کچھ تو ان کی بزرگی کا رتبہ اندک میری حقیقت ان دونوں نے میسر ہوئی پر ٹہری نگاہی تھی۔ وہ جو کچھ فرماتے اسے سن لینا ہی اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا۔ اپنی طرف سے کوئی سوال کرنے کی بہت نہیں ہوتی تھی۔ صرف حضرت جوش ہی دیے آدمی تھے جو اپنے شروع فریاد فقروں سے ان مرحوم کو مشکوئے پر مجبور کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ جناب جوش کے ہاں (اسی بارغ والی کوٹھی میں) حضرت آغا شاعر تشریف فرما تھے، میں بھی موجود تھا۔ جناب جوش نے نہایت اصرار کے ساتھ کہا۔ ”حضرت آپ میرے یہاں قیام فرمائیں“۔ آغا صاحب نے اپنے عادی مزاجی لہجہ میں جواب دیا۔ ”نہیں جوش، تمہیں بڑی زحمت ہوگی۔ مجھے صبح سویرے ہی وضو کے لیے گرم پانی دینا ہوتا ہے۔“ وہ کچھ اور کتنا پابنتے تھے کہ جناب جوش نے بات کاٹتے ہوئے ڈرامائی لہجہ میں کہا۔ ”کیا حضرت آپ وضو عمارت وغیرہ سب حرکتیں کرتے ہیں؟“ جناب جوش نے یہ فقرہ کچھ اس انداز سے کہا کہ آغا صاحب ہنس پڑے اور اپنے اسی لہجہ میں جواب دیا۔ ”جوش کبھی میں بھی حیران تھا۔“ میں نے کہا یہ نادر اتفاق ہے کہ ”حیران جوش“ اور ”ملا حیران جوش“ دونوں یکجا ہیں۔

(۳)

آغا صاحب پہلی مرتبہ کس سال حیدر آباد وکن گئے؟ کتنی مدت وہاں قیام کیا؟ ان کا ذریعہ معاش وہاں کیا رہا؟ یہ تمام سوالات ایسے تھے جن کا جواب مجھے حیدر آباد میرا کبھی ذریعہ سے حاصل نہیں ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں مجھے حیدر آباد میں آغا صاحب سے ملنے کا موقع ہوا تھا۔ اب ۱۹۶۶ء میں اس کلمات کو تیس سال ہوتے ہیں۔ اتنی مدت کے بعد یہاں کراچی میں چند ہی روز قبل انی سوالات کا جواب ملے۔ آغا صاحب کے فرزند جناب سرخوش کی عنایت سے مجھے رسالہ ”کنول“ کا اداریہ ۱۹۶۲ء والا نمبر دیکھنے کا موقع ملا جس میں آغا صاحب کا ایک مضمون۔ ”فیر کی پہلی پیری“۔ شائع ہوا ہے۔ اس مضمون سے نہ صرف ان سوالوں کا جواب ملتا ہے بلکہ حیدر آباد کے دور کی ایک جھلک بھی نظر آ جاتی ہے جو میری آنکھوں کے سامنے شمع شمع کی طرح جھلک کر ختم ہو گیا۔ آغا صاحب فرماتے ہیں کہ ۱۹۰۸ء میں پہلی مرتبہ حیدر آباد گئے اور غلطہ دارا شفا میں اپنے کنبے دست سید حسن مراد صاحب

دہلی کے محکمہ سیکرٹری کے مکان پر قیام کیا۔ چند ہی روز کے بعد وہ راجہ رائے دیاں بہادر، امانت دنت، آکسف جہاڑی کی بارگاہ میں پہنچا دیے گئے۔ راجہ صاحب کے یہ سب خاندانی خطابات ہیں۔ آغا صاحب نے جس جی کا ذکر فرمایا ہے اس کا نام "شیوراج" تھا۔ ان کے صاحبزادے راجہ شام راج بہادر، تیسیم ہند سے پہلے حکومت حیدرآباد کے وزیر رہ چکے ہیں اور غالباً حیات ہیں۔ یہ خاندان حیدرآباد کے ہر اس عظام میں شمار کیا جاتا ہے۔ آغا صاحب شہسوار بھی تھے۔ فرماتے ہیں:-

”سرگیاں راجہ رائے دیاں بہادر کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں صرف قلمی کام نہیں ہوں، بلکہ اچھا خاصہ شہسوار بھی ہوں، پھر تو راجہ صاحب کے اصطلح سے گزر کر سرفہر راجہ بہادر (کشی پرشاد) کے اصطلح تک رسائی ہوئی۔ نیلی زسٹم، کیوئرس جیسے قیثہ گھوڑے مجھ کو شام میری ساری کے لیے مقرر ہو گئے۔“

اس زمانے میں حیدرآباد کے امرا کو شاعری سے کتنی دلچسپی تھی۔ آغا صاحب کے اس بیان سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے:-

”اسی زمانے میں راجہ رائے دیاں بہادر کو بھی شاعری سے کچھ ایسی دلچسپی ہوئی کہ ایک خاص شاعر بھی قائم ہو گیا جس میں سکوی میرزا دہلی برتر اور مرحوم منشی منتجب الدین تھے۔ سکڑی و نائب یکرڑی ہوئے۔ یہ فقیر بھی ان شاعروں کا جزو و شئک ہو گیا۔ غرض غیب غیب جیتیں جوئیں۔ القصد میں اکثر شاعروں میں رواج روای شاعرہ قرار دیا جانے لگا۔ خدا فریق رحمت کرے، اس وقت حضرت فیض الحسن بہادر مرزا داغ مرحوم بھی زندہ تھے۔ پھر تو مولانا ضیاء، گراچی، ترکی، حسامی، رستو، اپنے اپنے کفنے دلوں سے جیتیں رہیں۔ اللہ، اللہ اس وقت کا حیدرآباد کچھ جہاں آباد ہے کم نہ تھا۔“

میرزا دہلی برتر فاہی لہری حضرت خیر دہوی کے شاگرد تھے اور حضرت فقیر غالب کے شاگرد تھے۔ صورت برتر کی ایک غزل میری طالب علی کے زمانے میں پڑ پڑ گاتا پھرتا تھا۔ یہ غزل سادہ ہندوستانی میں مقبول ہوئی۔ حسانی غزلوں میں قوال اس کو برسوں گاتے رہے۔ گراموفون ریکارڈوں میں بھی بھری گئی تھی۔ حضرت برتر کے ایک شاگرد، حیدرآباد کے ایک سیمپل ڈان کے فزاخاں عبدالکریم دکانی، مختصر بہ، ”تہذیب“ سے میری ملاقات یہاں کراچی میں ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ حضرت برتر کے بہت سے حالات مجھے ”تہذیب“ مرحوم سے معلوم ہوئے جی میں ایک بات یہ تھی کہ حضرت برتر شاعری میں راجہ رائے دیاں کے اُتار تھے۔ حضرت خواجہ شمس الدین (دھون) اور ملک آباد دکن کے مرید جہنہ۔ بیعت کے بعد انھوں نے وہ غزل بھی سنی جو اتنی مقبول نام ہوئی۔ مجھے پوری غزل یاد نہیں تھی۔ ”تہذیب“ مرحوم نے مجھے اس کے پانچ شعر سنائے تھے جو یہاں درج کرتا

جانے کیا ساقی کی آنکھوں نے اشارہ کر دیا
نذرِ ساحلِ آج ہم نے ژہد و تقویٰ کر دیا
دل کو آزارِ محبت کے مزے آنے لگے
اُس کے میں قربان چس نے درو پیدا کر دیا
میکدے میں کل تو تھا میں خشک ساحل کی طبع
آج ساقی نے مجھے قطرے سے دریا کر دیا
کسبِ دالوں سے جو پوچھی میں نے منزلِ یار کی
تنگدے کی سمت چپکے سے اشارہ کر دیا
ہم بُبے سے تھے بُبے برتر خدا کا شکر ہے
اک نگاہِ شمس نے اچھے سے اچھا کر دیا

حضرت نادر علی برتر سالہ ۱۹۱۱ء تک بقیدِ حیات تھے۔ آغا صاحب نے اپنے رسالہٴ آفتاب کے نومبر ۱۹۱۱ء کے پرچے میں اُن کی ایک غزل شائع فرمائی ہے جس کا مطلع ہے :

پھر ہر آئی جنوں فتنہ ساں بڑھ گیا
تا بدامنی پھر مرا پاکِ گریباں بڑھ گیا

منشی منقب الدین تھلی مرحوم کے صاحبزادے تکیں کاظمی میرے قریب کرم فرماتے۔ طالبِ علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ میں ملگرام میں تکیں کاظمی صاحب سے ملنے کے لیے اُن کے مکان پر گیا تو حضرت تھلی کی زیارت بھی نصیب ہوئی تھی۔ اس کے دو تین سال... بعد اُنھوں نے وفات پائی۔ تکیں کاظمی صاحب نے بے شمار مضامین اور دو تین کتابیں لکھیں۔ سالہ ۱۹۱۱ء میں رسالہٴ انکار کراچی کے جوشِ ممبر کے لیے اُنھوں نے ایک مضمون حیدر آباد دکن سے بھیجا تھا افسوس ہے کہ اس رسالہ کی اشاعت سے پہلے تکیں کاظمی صاحب کی وفات کی خبر آئی۔

ضیاءِ منقہ نور الضیاء الدینی، ضیاءِ جنگ اور ملک آباد کے ایک جاگیردار خاندان کے ہاشمیں تھے۔ حیدر آباد میں کئی سال تک منقہ عدالتِ عالیہ (ہائی کورٹ) رہے اور بعد میں ہائی کورٹ کے جج ہو گئے تھے۔ مولانا گرامی کی طرح فارسی ہی میں شعر کہتے تھے اور سامنے جاتے تھے۔ شاعری کے علاوہ شطرنج اور اپنی قانونی بصیرت میں بہت مشغول تھے۔ موجودہ حضور نظام کے دربار میں یہ زمانہ میں بڑا رسوخ اور وقار رکھتے تھے۔ مدارِ اجر کئی پرشاد کے گھر سے دوست تھے۔ قدیم حیدر آبادی شرافت اور روایات کو قائم رکھنے میں اپنی آپ نیلے تھے۔

اس مضمون میں آغا صاحب نے راجہ رائے دیاں بہادر کو کئی جگہ "آغلے نادر" لکھا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً

وہ راجہ صاحب کی سزا میں برسوں عذمت منسلک ہے۔
ایک جگہ سر عبدالقادر مروحی کے حیدر آباد تشریف لے گئے اور آغا صاحب کے محلہ ناسٹی اور عبدالعلیم شرر لکھنؤ سے
منتظران کرنے کا بھی ذکر فرمایا ہے :

اسی اثنا میں علامہ شبلی نعمانی اور مولوی عبدالعلیم شرر لکھنؤ مروحی جو جس اتفاق سے حیدر آباد
کے کسی علمی جلسے میں کام کر رہے تھے، میسٹر محبوب ترین دوست جمعی سر عبدالقادر
مروحی کی وساطت سے ان حضرات کی بھی دیدار و دید ہو گئی۔ مولوی شبلی مروحی تو تجرنا چیز
کے کلام اور طرزِ خواندگی کے اس قدر قادر و شیدا ہوئے کہ بار بار تشریف لے گئے اور سنا
کی عزت بڑھائی۔ وہ چار دفعہ مولوی صاحب نے بچا پنے دولت کو پر طرب فرمایا
اور اس امتداد صراحت سے میرے ناچیز کلام کو پڑھوایا کہ میں پچھلے ہی دیوانہ تھا اور ہے
سے حواس کھو گیا۔

آغا صاحب جب حیدر آباد گئے تھے تو نہایت رقیق و نازک مصنف فاضل آزاد و مجاہد قید حیات تھے۔ جناب سرشار کا غالباً
ہمارا جہ کشی پرشاد نے خود حیدر آباد بگایا تھا اور اپنے ہاں لکھا تھا۔ ان کی برز و صفت کا خاص خیال دکھاتا تھا۔ سرشار کے شمس آباد
اصلاح سے ہمارا جہاد نے دو تین ناول لکھے تھے جو شائع ہو چکے ہیں۔ ہمارا جہ کشی پرشاد کی سرپرستی میں ایک رسالہ "دبیرہ آصفیہ"
شائع ہوا تھا۔ اس کی عبارت ہمارا جہاد نے سرشار کے پڑ کر دی تھی۔ میں نے حیدر آباد کے نقد نگاروں سے یہ سنا تھا کہ آخری زمانے
میں جناب سرشار کا قازن و ادنیٰ غالباً کثرت سے نوشی سے بگڑ گیا تھا۔ اس حالت میں وہ کافور کی پرچیوں پر ناول کے سے دو ایک سکا لے
کھتے اور کسی شاگرد پیشہ کو لے کر کہتے کہ ہمارا جہاد کو مے آؤ۔ وہ حکم کی تعمیل کرتا۔ شروع شروع میں تو ہمارا جہاد نے ان پرچیوں کو
لے کر دیکھا ہوا۔ بعد میں جب سب کی تعمیل ہو گیا کہ ان کا ادنیٰ قازن قائم نہیں ہے تو خود شاگرد پیشہ ان کی ایسی پرچیوں کو ادھر ادھر کسی
ڈال دیتے تھے ہمارا جہاد کے طوطے میں پیش نہیں کرتے تھے۔

۱۹۰۲ء میں جناب سرشار نے وفات پائی۔ ان کی وفات کا دردناک واقعہ آغا صاحب نے اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے جو
ان کے مجلہ "مضامین" شمارستان میں شائع ہوا ہے۔ وہ ایک مشاعرہ کا حال بیان کرتے ہیں جو شہر کے باہر چند نعل کی بارہ دہی
میں منعقد ہوا تھا :

..... جب گامی مروحی پڑ چکے تو بارہ دہی چلے گئے۔ ان کے بعد ساتھی نے دو تین ہاں
پڑھی تھیں جو رام دہی کے منہ لے چکے تھے اور ادیب، پندت رقیق و نازک سرشار دھڑکتے
ہوئے شمع کے سامنے خود آ بیٹھے اور کہا : ————— جگر تمام کے بیٹھو مرن باری
آئی۔

مشاعرے کے غم جو جانے کے بعد کے حالات لکھتے ہیں :

ہیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، پنڈت رتن ناتھ سرشار جو آج مزدورت سے زیادہ پر کیفیت تھے، اودھ آج شہر نہ جاسکے اور اپنے ایک رفیق سفر شاید ٹھنڈی دھار کا پرشاد آتی لکھنوی کے ہمراہ اسی بارہ دہری میں شب باس ہونا پڑا۔ یہ دونوں صاحب چونکہ حضور وزیر صاحب سرمد راجہ بہادر کے مہمان تھے اس لیے یہاں بارہ دہری میں بھی ان کے لیے ایک خاص کمرہ مخصوص تھا۔ دونوں صاحب وہیں اپنے اپنے بستروں پر جا بیٹھے۔ یہ کمرہ بار بار دیکھا جاتا تھا، مگر اس میں کوئی کی گھڑو پنچوں پر آب دار خانہ تھا جس پر پانی کے ٹکے، گولین، مرا حیاں اور گلاس بے سمے تھے اور دوسری طرف ویسے ہی گھڑو پنچیاں رکھی ہوئی تھیں جی پر مدھلی ہوئی فراٹ کی پچتیاں تہ بہ تہ دھڑاؤ پر چھت تک چھنی ہوئی تھیں۔ اب قسمت کی بات اس کا کسی کو دھیان بھی نہیں رہا کہ پانی کی گھڑو پنچیاں کس طرف ہیں اور فراٹ کی پچتیاں کدھر ہیں۔ اتفاق سے اسی رات پنڈت جی کو پیاس کی شدت اور خار کی ترس نے یکایک چوٹا دیا۔ سلق میں کانٹے پڑے تھے۔ آپ دیوانہ وار بستر سے اٹھ کر پانی کی تلاش میں چلے۔ اس شدت اضطراب میں اپنی دانست میں ہی سمجھ کر آب دار خانہ اوپر ہی ہے۔ آہ، آہ، مگدوہ موت کا دھکا تھا، اتنا اس غریب کو ان گھڑو پنچوں کی طرف سے لگی جی پر فراٹ چھنی ہوئی تھی اور وہ اسی گھڑو پنچ میں ٹوٹے سمے، انہیں گھڑو پنچوں پر جا پڑے۔ ستم بہ ہوا کہ پانی کا دباؤ نشان نہ پا کر جو عالم بدحواسی میں اتنے پاؤں مارے تو ان غریب کا پاؤں پھسل گیا اور وہ اندھے ستم اس گھڑو پنچ کے حلقے میں جا گئے۔ ان کے گتے ہی اوپر سے اُدھر رکھی ہوئی فراٹ کی پچتیاں دھڑا دھڑا انہیں پر آ پڑیں جس کے صدمے سے ان کی ہانی نکل گئی۔ آہ، آہ، دوسری صبح کو یہ ہونا کہ خبر مقامی اخباروں میں تھی۔ بس جو پڑھنا تھا سر

پہلا کر رہ جاتا تھا۔

آغا صاحب نے سرشار کی موت پہلیک مرثیہ بھی کہا تھا۔ اس کے متعلق اپنے مضمون "فیر کی پہلی پھیری" میں لکھتے ہیں :
 اسی زمانے میں مشہور و معروف فنانہ گیار پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کا افسوس ناک حادثہ ہو گیا۔ میں نے بھی متاثر ہو کر ایک نظم کہی جو راجہ واسے دایاں بہادر کو بہت پسند آئی۔ سرشار مرحوم ہمارا جہاں کے مہمان تھے اور مجھ پر کرم فرماتے تھے۔ میری نظم ان کا مرثیہ تھی۔ ایک دن راجہ دایاں بہادر نے مجھے اپنے ہم رکاب لیا اور سرمد راجہ بہادر کے حضور میں لے جا کر وہی نظم ہمارا جہاں کو سنوائی۔ اس طرح حضرت شاد باقہ اب تک بھی رسائی ہو گئی۔ بس بدتی چک گئی۔

جندہ ۱۳۱۰ء میں کھوکھڑیہ کی وفات ہوئی اور ان کے سب سے بڑے لڑکے، ایچ ڈی ہتھم جو رخصت کون دیتے تھے تخت نشین ہوئے۔ انگلستان میں ان کا صدر تلخ پوشی سلطانہ کے خلیفہ انتہائی میمنوں میں ہونے والا تھا۔ وہ ڈکرنہ ہندوستان کے واسطے تھے، انھوں نے ہندوستان میں بھی تمام دہلی میں تلخ پوشی منتقل کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ تمام دہلیہ ریاست کو اس دہار میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ ورڈکرنہ کے پیش نظر ایک صحت پرستی کی کہ تمام دہلیہ ریاست کے سامنے انگریزی نوع کی شان و شوکت کا مظاہرہ کر کے انھیں اور تمام ہندوستانیوں کو مرعوب کیا جائے۔ اس سلسلے میں آغا صاحب اپنے اسی مضمون ————— فخر کی پہلی پھیری ————— میں لکھتے ہیں:

غرض میں انھیں رنگ دہیوں میں تھا کہ یکا یک سڑک کا دلی دربار زبان زد خلق ہو گیا۔
..... تمام راجہ ہمارا جہ طلب ہونے بیان ہمکے خود غلہ، شیان،
غلاب میرے بھائی خان، اعلیٰ اللہ متاثر، آصف سادس بھی مدد اپنے تمام خدم و حشم
جاگیرداروں اور اشاف کے دلی جانے پر تیار ہو گئے۔ اعلیٰ حضرت غلہ آشیان کا ایا
پاتے ہی ہزار کھنسی ہمارا جہ سرکش پر شاد بادل نے بھی پا تراب کر لیا۔ انھیں کے ساتھ
ساتھ تمام دوسرے دکن کی بھی خلقی زور آور ہی تھی۔ مروجہ راجہ راسے دایاں بادل
امنت و منت، آصف جابی کا بھی پیش خیر برآمد ہوا۔ ان کی طرف سے دلی کیپ کا انتظام
کرنے کے لیے بروہی ملی احمد صاحب سب سے پہلے دلی جانے کو آمادہ ہو گئے۔ ہمت کی
بات ابھی میسر ہو رہی تھی کہ اپنے اپنے انتظامات میں ہی تھے کہ سب سے پہلے —
قرضہ مال بنام من دیوانہ زونہ — کے موافق، میں بد بخت جو ڈیڑھ سال سے دلی
جانے پر اُدھ کھائے تھا، فوراً ایک بیش قرار رقم لے کر پہلے سے پہلے انتظام کرنے
کو چل پڑا۔

یہ خبر شدہ شدہ غلاب فیض الملک بادل حضرت داغ مروجہ کو بھی پہنچی کہ آغا
شاعر انتظام کے لیے دلی جا رہا ہے۔ آہ! وہ مر گئے ہیں، اور مجھے رہے، انھوں
نے مجھے فوراً بلوایا اور ہر چند ڈرایا، دھمکایا کہ یہ کیا طاقت ہے جی — بھوہ
آغا شاعر اور انتظام، جو لوگ نہیں دہان خدمت پر دہان بھیج رہے ہیں وہ یا تو تھالے
سخت دشمن ہیں یا ان کے حواس بجا نہیں۔ دیکھو آغا شاعر! حیدر آباد نہ
چھوڑو۔

مگر میں کب سناتا تھا۔ میں نے ان کی منتیں بھی کہیں کہ آپ یہ جان لی کیوں لکھتے

ہی؟ حضرت! میں خود ڈیڑھ برس سے وطن جانے کو ترس رہا تھا۔ اب قدرت نے
یہ غیب سے سامان پیدا کر دیا ہے۔ خدا کے لیے آپ اس سچی گاڑی میں روڑا نہ
بٹھائیں۔

آخر وہ ہشتی بھی بچے اتنا بھندو بیکر خاموش ہو گئے اور میں سستہ میں دتی

والی آگیا۔

جہان نیک بچے یاد ہے حضرت آغا صاحب نے یہ فرمایا تھا کہ کیپ نمونے کے لیے انھیں ملہا جو کشتی پر شانہ دس حصار
رہی ہے کہ بھجایا تھا۔ حضرت داغ نے اُس کی مخالفت کی تھی۔ آغا صاحب نے جب اس مخالفت کا لگہ شکوہ کیا تو حضرت داغ نے کہا
بچے یہ یقینی ہے کہ تم پھر حیدر آباد نہیں آؤ گے۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن آغا صاحب بھند ہوئے تو
خاموش ہوئے۔ ٹھیک ہے میرا حافظہ غلطی کر رہا ہو اس لیے میں نے آغا صاحب ہی کا بیان یہاں نقل کر دیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ
آغا صاحب ۱۹۱۵ء کے آخری مہینوں میں حیدر آباد سے گئے ہوں گے۔ لندن میں جشن تاج پوشی ایڈورڈ ہشتم کی اپانک بیماری کی وجہ
سے کئی ماہ قری کرنا پڑا تھا۔ ان کا اپنی ڈی سائٹس کا پریشانی ہوا اور کچا داک کی طالت کے بعد اگست ۱۹۱۶ء کو وہ دہم تاج پوشی کے
قابل بنے۔ ہندوستان میں یہ دربار جنوری ۱۹۱۶ء میں منعقد کیا گیا۔ ظاہر ہے کیپ فیروز کے انتظامات کے لیے لوگوں کو کچا داک پہلے
دلی جانا پڑا ہوگا۔

میرا خیال ہے کہ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۱۷ء تک آغا صاحب مختلف مقامات میں مختلف مشاغل میں مصروف رہے۔ ڈرامہ نویسی کا یہی
دور ہوگا۔ ٹھیک ہے کہ آغا صاحب کاشمیری سے اسی دور میں ملاقات ہوئی ہو۔ انھیں نے آغا شاعر کو ڈرامہ لکھنے کی ترغیب دی ہو
اور انھیں کی کوششوں سے تھیٹروں کے مالکوں تک رسائی اور ڈراموں کی فروخت کے مراحل طے ہوئے ہوں۔ ڈراما نویسی کے
سلسلے میں آغا صاحب نے کلکتہ اور ممبئی کا سفر بھی کیا ہوگا اور ٹھیک ہے کہ مدت ان شہروں میں قیام بھی ہے ہوں۔
۱۹۱۵ء کے گج بنگ، آغا صاحب کا ریاست جھالا داٹے تعلق قائم ہوا ہوگا۔ یہ قیاس میں نے اس بناء پر قائم کیا ہے کہ
میسٹر ڈان رسلو، آفتاب، کا جو شمار ہے وہ نومبر ۱۹۱۶ء کا ہے۔ اس پر جلد ۷ اور نمبر ۱۱ درج ہے، گویا ۱۹۱۶ء کے ختم تک
رسلو، آفتاب، کو جلد ہی چھ ماہ ساٹ برس گزر چکے تھے۔

ریاست جھالا داٹ کے حکمران، رانا سر بھوانی سنگھ، آغا صاحب پر بہت مہربان تھے۔ جھالا داٹ کے دس بارہ سال کے قیام
میں آغا صاحب نے بڑے اہمیت اور فراغت سے زندگی بسر کی۔ وہاں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ۱۹۱۶ء کے گج بنگ
جھالا داٹ سے آغا صاحب کا تعلق منقطع ہو گیا ہوگا۔ اپنے اُس خط میں جو جنوری ۱۹۱۶ء میں لکھا گیا ہے آغا صاحب فرماتے ہیں:

..... میں کیا اور میرا گلام کیا، ایک ٹٹا آجوا چراغ ہوں جواب یقیناً گل ہو

جانے گا۔ کچھ نہ آج ۶۔ ۷ برس سے ۱۶ سو میل کے دھادے کر رہا ہوں اور کہیں

پاؤں نہیں ٹٹتا.....

اسی سے یہ قیصر نکلا ہوا تھا جس کے چھ سات برس پہلے میں ۱۱۳۵ھ کے کبک ریاست جھلا والا سے آغا صاحب کی ترقی
 فرمائی گئی تھی۔ ظاہر ہے اسی وقت سے رسالہ "آفتاب" کی اشاعت بھی بند ہو گئی ہوگی۔ ریاست سے ترقی ترقی کی وجہ غالباً یہاں پہنچائی
 گئی تھی۔ ریاست کی وفات ہو گئی۔ نئے والی ریاست نے آغا صاحب سے تعلق برتا ہوا کہ آغا صاحب وہاں سے چلی کھڑے ہوئے
 ریاست جھلا والا کے قیام کے آخری سال دو سال میں ریاست سے تعلق ختم ہونے کے بعد آغا صاحب مشرہ خرم ریاست
 خیرپور میں گزرا کرتے تھے۔ وہاں سے اٹھیں چار سو روپیہ (مسئلہ) بچے تھے۔ ذی قعدہ ۱۲۵۰ھ (جون ۱۹۳۲ء) کے آخری دو دن
 میں آغا صاحب نائب شہید یار جنگ کی طبی پر حیدر آباد آئے تھے، جمادی الاول ۱۲۵۱ھ (اکتوبر ۱۹۳۲ء) میں شہید صاحب نے
 پھر آغا صاحب کو حیدر آباد بھجوا۔ لعلی ماہ کے قیام کے بعد ۱۲۵۱ھ (دسمبر ۱۹۳۲ء) میں وہی واپس آ گئے۔ اس کے بعد
 پھر کبھی حیدر آباد نہیں آئے۔

آغا صاحب کے ہاتھ والوں میں شاید دونی صدی کو بھی ان کا اصلی نام معلوم نہ ہوگا۔ مجھے بھی یہاں کراچی میں جناب سر فوش
 سے معلوم ہوا کہ نام "غفر علی" ہے جو تاریخی نام ہے اس سے ۱۱۹۰ھ کے احاد نکلتے ہیں اور ۱۲۵۱ھ اس سے مطابقت رکھتا ہے
 سرسٹھ (۱۹۰۱ء) برس کی عمر پر ۱۲۵۱ھ میں آغا صاحب نے رحلت فرمائی۔

ایفردنوبل

ضیاء الدین احمد برنی

ڈنمارک جیسی دھماکہ پیدا کرنے والی چیز کی آمدنی سے نوبل انعامات کی بنیاد ڈالی گئی تھی اور اب بھی جب جب انعامات کا اعلان ہوتا ہے دنیا کے علمی طبقوں میں ایک بہت بڑا دھماکہ پیدا ہو جاتا ہے۔

آج سے ۱۳۱ سال قبل (۱۸۳۲ء میں) ۲۱ اکتوبر کی صبح کو سویڈن کے پاپہ تختہ اشاک ہاؤس (Stockholm) کے ایک امیر گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام ایفردنوبل رکھا گیا۔ یہی وہ بچہ ہے جس نے بڑے ہو کر ڈنمارک اور ایٹلیا کیاد کیا اور اس کے ذریعے جو کروڑوں روپے کمائے اُس کا بہت بڑا حصہ مرتے دم ایسے انعامات کے لیے وقف کر دیا جو سب سے بڑے بین الاقوامی علمی اعزازات کہے جاتے ہیں اور ان کے پائے وائے نہ صرف عالمگیر اور دواہی شہرت حاصل کر لیتے ہیں بلکہ عمر بھر کے لیے مالی مشکلات سے بھی آزاد ہو جاتے ہیں۔

ایفردنوبل چھوٹے سے قد کا اور معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا۔ اس کی صحت کبھی اچھی نہیں رہی۔ وہ بڑا ہنسی اور ہجو کرنے والا انسان تھا۔ والد اور مشہور ہونے کے باوجود اُس کی زندگی بڑی سادہ تھی اس میں غرور اور بڑائی کا احساس نام کو نہ تھا۔ وہ تقریباً اپنا سارا وقت اپنی تجربہ گاہ میں گزارتا اور اس سے جو وقت بچتا اپنی ماں کی خدمت میں صرف کرتا۔ اُس سنے شادی نہیں کی۔ اُس کی ساری محنتوں کا مرکز اُس کی ماں تھی۔

نوبل کا انتقال ۱۰ دسمبر ۱۸۹۶ء کو صبح کے وقت ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ نوبل ایک عجیب و غریب خط میں جلتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ زندہ نہ دفن ہو جائے اور اس لیے اس نے نصیحت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کی لاش جلا دی جائے۔ چنانچہ وصیت پوری کی گئی۔ مرنے سے کچھ پہلے اس نے ایک پٹھے ہوئے کاغذ پر اپنی مشہور زمانہ وصیت لکھی جس میں درج تھا کہ

”نشتے داروں کو بخوڑی سی قسم دینے کے بعد میری ساری دولت (۴۰ ملین پونڈ) ایک انعامی فنڈ کے قیام میں صرف کی جائے جس کا سالانہ منافع برابر کے ۵ انعاموں میں تقسیم کیے ایک انتظامی شخص کو دیا جائے جس نے فزیکل سائنس (طبیعیات) میں نبیات اہم کام کیا کی ہو، دوسرا انعام کیمسٹری (کیمیا)، تیسرا انعام فزیالوجی (علم الادویہ) میں اہم دریافت کرنے والے انعام کو دیا جائے۔ چوتھا انعام اس مصنف کو دیا جائے

جس نے تحقیق و قیمت کی کوئی کتاب لکھی ہو اور پانچواں انعام اس شخص کو دیا جائے جس نے اقوام عالم کے ایسے کسی پیدا کرنے کے سلسلہ میں نمایاں کردار ادا کیا ہو۔ میں تاکید کرتا ہوں کہ یہ انعامات بھلاقی از ذہب و قیمت صرف مستحق لوگوں کو دیے جائیں۔

ایگزڈ نوبل بہت مالدار شخص تھا۔ وہ پندرہ فیکٹریوں اور ۵۲ تیل بردار جہازوں کا مالک تھا۔ ڈائنامیٹ و بھلو کرنے کے علاوہ اس نے ۲۵۵ ارد چیزیں بھی پٹینٹ کرائیں جن میں میزوحین کی آلودہ مسخ و ڈبہ لٹا پارچہ ایک ایک قسم کا رنگ بنایا جی۔ یہ انعامات ۱۹۰۱ سے دیے جاتے ہیں۔

نوبل کے انتقال سے بے کتاب تک تقریباً ڈھائی کروڑ روپیہ انعامات کی شکل میں تقسیم ہو چکا ہے۔ سب سے زیادہ نوبل پائڑ پانے والے اہل جرمنی ہیں۔ اس کے بعد انگلستان کی پھر فرانس کی پھر امریکہ کی بارکی آتی ہے۔ سوڈن ہزاروں کے لوگوں نے بھی یہ انعامات حاصل کیے ہیں۔ برصغیر ہندوستان کے صرف دو آدمی ڈاکٹر راجندر ناتھ ٹیگور (۱۹۱۳) اور سری۔ وی رام (۱۹۳۰) کو انعام دیے۔ دوسرے کسی شخص کو آج تک انعام نہیں دیا گیا حالانکہ نوبل کی وصیت میں یہ چیز خاص طور پر بیع تھی کہ انعامات کی تقسیم میں قومیت و مذہب کا ذکر اسامی لانا نہ رکھا جائے۔ ہندو پاکستان میں باقی اور گاندھی اور دوسرے میں یحیٰی و ابراہیم نے اس قابل تھے کہ انھیں انعامات دیے جلتے مگر یہ سب نظر انداز ہو گئے۔

بر سال اشاک ڈام میں ۱۰ دسمبر کو ایگزڈ نوبل کی برسی کے موقع پر بڑی پر شکوہ تقریب منعقد ہوئی ہے جس میں سوڈن کے بادشاہ بنفس نفیس انعامات تقسیم کرتے ہیں۔ مشہور امریکی محقق پل بک نے اس تقریب کا اعلان بیان کیا ہے۔

۱۰ دسمبر کو اشاک ڈام کے ہوائی اڈے پر پہنچی اور مجھے ایک زبردست استقبال کیٹھی خوش آمدید کہا جس میں تین سوڈنی ارجی سیر کے علاوہ نوبل کیٹھی کے علاوہ سوڈن کے کھڑندار کے ممبر شامل تھے۔ مجھے فوراً گرانڈ ہوٹل پہنچا دیا گیا جہاں انھیں شاہی کمرے میں میسرے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ دوسرے دن (۱۰ دسمبر) صبح کو کھڑندار سے دو اچھی آنے والے حضوں نے شام کی رسومات کے بارے میں ساری تفصیلات بتانے کے بعد یہ درخواست کی کہ بادشاہ کے ہاتھ سے انعام لینے کے بعد میں اپنے پاؤں اپنی کرسی تک واپس آنے کی کوشش کروں کیونکہ اس سے پہلے وہ انعام لینے والوں نے بادشاہ کی طرف چپڑ کر دی تھی جس کا سوڈن کی رعایا نے بہت برا مانا تھا۔ چنانچہ شام کو میں وقت پر اس آراستہ و پیراستہ ہال میں جا پہنچی۔ ٹھیک ۵ بجے ایک سوڈن شاہی ادا ایک سوڈن شاہی نے بجلی بجا کر شاہی آمد کا اعلان کیا۔ بادشاہ کے بیٹے جانے کے بعد نوبل کیٹھی کے ممبر اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ ان کی آمد پر بادشاہ تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ یہی وہ واحد موقع ہے جبکہ بادشاہ اپنی رعایا کے کسی ممبر کی آمد پر کھڑے

ہوتے ہیں۔

میرے باہر کی کڑی پر ایک اور ذیل پر اتر جیتے دلے اطاری ڈاکٹر ایگزیکوٹو فرنی بیٹے ہوئے تھے۔ سید شذالی میں تھری ہوتی تھی کوئی مطلق نہیں تھری۔ اس کے بعد میرا تعلق ہوا اور میں انعام لینے کے لیے بادشاہ کے سامنے پہنچی۔ بادشاہ نے مجھ سے ہاتھ لایا اور ایک سونے کا تمغہ دیا جو پٹے کے بلجس میں دکھاتا تھا جس کے ایک طرف ذیل کی تصویر اور دوسری طرف اس کا نام کندہ تھا ایک نفاذ میں انعام کا وہ علم نامہ تھا جس کو بعد میں چیک کی صددت میں بدل دیا جاتا تھا اس دسم کے بعد پٹے پر دو لٹنے کی مصیبت درپیش تھی۔ ایک تو میں اُدبھی اڑی کے جوتے پہنے ہوئے تھی جبکہ اٹریاں مشرقی میٹ قیست قالمینوں میں وحشی جاتی تھیں۔ دوسرے میرے ذیلی فواک کے پچے کا جوتہ فرش پر ٹکا ہوا تھا۔ میں بہت سنبھل سنبھل کر ایک ایک قدم پچے پٹا رہی تھی میری اس مشکل کو دیکھ کر لوگوں نے ہمدی میں تالیاں بھانی شروع کر دیں۔ وہ تو غلیبت ہوا کہ میں نے قالمین کے ڈیزائی کو ذہن نشین کر لیا تھا ورنہ ممکن تھا کہ میں اپنے برابر والی کڑی پر بیٹھے ہوئے ڈاکٹر کی گود میں جا پڑتی۔ اگلے روز اشاک ہام کے اخبارات نے بڑی بڑی ٹرینوں میں یہ خبر چھاپی، پہلے ایک بڑی تکنت سے پچے کو وٹیں۔

ذیل پر اتر پانے والے کے لیے ہمدی ہے کہ پہلے وہ وٹیلے کسی جوتے میں جو خود ایک سال کے اندر اندر اشاک ہام پہنچ کر ذیل پر اتر حاصل کر لے ورنہ انعام منبہ ہو جاتا ہے اور ذیل فٹ میں جج کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۹ میں جرمنی کے مشورڈاکٹر — احمد دودوہ دودوہ کو کسانانہ معلوم کرنے پر ذیل پر اتر لیا لیکن ٹھلر۔ نعل جرمنی کو ذیل پر اتر لینے سے منع کر لیا تھا اور اس کی جگہ نیشنل ایسٹ پر اتر لیا تھا اس لیے جگہ ختم ہونے کے بعد ۱۹۴۸ میں اس ڈاکٹر نے اپنا انعام طلب کیا۔ اسے رقم تو ملی نہیں، البتہ تمغہ اور سند مل گئی۔

ذیل پر اتر کی رقم اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اب تک کسی شخص نے اس کے لینے سے انکار نہیں کیا سوائے جارج ہزار ڈاکے۔ جب نا کو سوڈن کے سیرنے انعام ملنے کی خوشخبری سنائی تو بے میاں نے زور سے چلا کر کہا کہ "میں اس روپیہ کا کیا کروں گا؟" سیرنے بڑی تانت سے جواب دیا کہ "سیرجہ کج کر تحریری جواب دیجیے گا۔" ایک ہفتہ بعد شاہا فحشہ اٹھو گیا اور انھوں نے انعام کی رقم لے کر اسے ایک ایسی سوسائٹی قائم کرنے میں لگا دیا جو سوڈن اور اٹلیٹڈ کے درمیان ادبی اور ثقافتی تعلقات بڑھانے میں مدد دیتی ہے۔

ذیل پر اتر پانے والوں کی کیا عمر ہونی چاہیے؟ کیا ذیل کا مقصد یہ تھا کہ یہ انعام ان لوگوں کو دیے جائیں جو ایک عمر سے سائنس، طب، ادب اور امن کے بارے میں خیر شہرت کے مالک رہے ہیں یا ان انعامات سے ایسے ذہین اور جدت پسند نوجوانوں کو بھی فائدہ ہائے جو اپنے کارناموں سے دنیا میں ایسے اعلیٰ جگہ حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف

رہتے ہیں ؛ لیکن عموماً انہم پانے والے بہت زیادہ عمر کے ہوتے ہیں ۔ ٹوڈیاریڈ کینگ سب سے زیادہ کم عمر تھا ہے
 نرل پر انڈیا ۔ انہم پانے کے وقت اس کی عمر صرف ۵۴ سال تھی ۔ بقول برنڈو شاہ :
 "نرل پانڈ ایک ایسی پچا فرمی ہے جو تیراکہ کی حفاظت کے لیے اس وقت سمندر
 میں پھینکی جاتی ہے جبکہ وہ تقریباً گھنٹہ پر پہنچ چکا ہے ۔"
 غالباً نرل پر انڈیا بننے والوں کو نرل کی یہ بات یاد ہوگی کہ
 "میں مٹی آدمی کو ایک پیسہ بھی دینا نہیں چاہتا ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس میں جو دھند
 کرنے کی رغبت ہی نہ رہے ۔"
 یہ بے فکری داستان سوڈن کے ایک باشندے کی جو انسانیت کی تاریخ میں ایک سنگ میل ہے ۔

جرمن افسانہ اور اس کا ارتقا

علمی ناظر

بیسویں صدی کی ابتداء ہی سے جرمن قوم میں جو حرکت و ریخت اور تعمیر و تکمیل کا عمل نظر آتا ہے اس کی خارجی صورت تو دو مالگیر جگہیں ہیں لیکن اس کے ساتھ پُرزدی و ادبی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان میں بھی جرمن قوم کی انفرادیت نمایاں نظر آتی ہے۔ وٹو کے تجربہ میں کیا جاسکتا کہ جرمنی کمان نمازلی تک لانے کے لیے تنہا اس کی جغرافیائی حیثیت، سماجی نظام یا بتارک کی سیاسی بصیرت کو دخل ہے یا تنہا ان افکار کا قبضہ ہیں جن میں کائنات کی انتعادت، ہیگل کی تصوریات، شوپنہار کی قنوطیت، نٹشے کی شدت پسند روحانیت یا اس کی قوم کی سماجی مادیات شامل ہے، یا پھر اس کے قومی خصائل ہی تنہا اس کے عوامل مجھے ہیں۔ اسباب کچھ ہی کہیں نہ ہوں یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کچھ قیں گزریں میں جرمنی جن سیاسی، سماجی اور شعوری حوادث سے دوچار ہوا ہے اس کی نظیر کبھی اور ملک میں نہیں ملتی۔ ویں تو گزشتہ جنگ عظیم سے دنیا کے در بہت سے ملک بھی شدت سے متاثر ہوئے لیکن ان ملک میں اتلا کا دور گزر جانے کے بعد حالات معمول پر آ گئے اور کوئی شے دائمی انقلاب کی محرک نہ بن سکی لیکن کوئی کتاب ہے کہ ۱۹۳۳ء میں بشر کے بر سر اقتدار آنے کے بعد جرمن قوم جس انقلاب آفرین دور میں داخل ہوئی تھی آج بھی منقسم برلن اور مغربی و مشرقی محاذ کی شدت کشش کی موجودگی میں وہ دور ختم کر چکا ہے۔ آج کی جرمنی قومی زندگی میں جو سیاسی بے یقینی کا محل پیدا ہو چکا ہے اس کے اثرات مرن میں اقوامی سیاست تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ اس کی صدائے بازگشت زندگی کے ہر شعبہ میں سنی جاسکتی ہے۔ آج کا جرمن ادب اس کی ایک واضح مثال پیش کرتا ہے۔

یہاں ہم اس قوم کے ادب کا مطالعہ کر رہے ہیں کہ جنگ اور مابعد کے اثرات کی ذہنی کیفیت کا ایک سلسلہ دیکھ سکیں اور اس میں خصوصیت کے ساتھ افسانوی ادب ہمارے پیش نظر ہے کہ یہ زندگی کا براہ راست مطالعہ کرتا ہے۔ اس کا نازا اگرچہ جنگ یا اسی کے آس پاس کا نازا ہے لیکن آج کے جرمن افسانوی ادب کا جائزہ لینے سے پیشتر ہم مجموعی حیثیت سے ان تمام مسائل کو زیر بحث لانا ہے جو جدید جرمن افسانہ کی تشکیل، اس کے نشوونما اور اس کے تدریجی ارتقاء کا موجب بنے ہیں۔ ان عوامل کے بغیر آج کے جرمن افسانہ کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اس سلسلہ کے بنیادی حقائق مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ جرمن ادب میں افسانہ کی حیثیت کا قیاس اور اس کا تاریخی ارتقا۔

۲۔ جنگ سے پہلے کا افسانوی ادب۔

۳۔ انقلابی پس منظر۔

۴۔ موجودہ افسانوی ادب کا جائزہ۔

ہر ایک کی طرح دیگر بھی اوقامی زبانوں کی مانند تین بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔
ہر ایک کی طرح



Der Roman

Die Novelle

Die Erzählung or

Die Kurzgeschichte

(ناول)

نویسے (حویل قیسے)

افندہ (مختصر کہانی)

یہاں ناول اور اس کی ٹیکنیک سے قطع نظر صرف 'نویسے' اور 'مختصر کہانی' ہی زیر بحث ہیں۔ آج کا جرمن افسانہ ناول
نویسے کی ایک ذیلی صنف سمجھا جاتا ہے لہذا افسانہ کا جائزہ لینے سے قبل نویسے کا تفصیلی مطالعہ لازم ہے۔

نویسے کی تعریف کا مسئلہ مزاحیہ رجحیت رکھتا ہے۔ اس بارے میں نقادوں کی آراء میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ اب تک
کئی کتابیں اس مخصوص ٹیکنیک کی تشریح و توضیح میں لکھی جا چکی ہیں۔ یہاں اختلافات سے بچتے ہوئے صرف انہی تعریفیں کو زیر بحث لانا
مقصود ہے جن سے نویسے کا مفہوم بہ آسانی سمجھا جاسکے۔

نویسے (Novelle) دراصل اطالوی زبان کے لفظ 'Novella' سے اخذ ہے جس کے معنی جرمن زبان

میں 'Neuigkeit' یا 'خبر' ہوتے ہیں۔ اسبھی یہ لفظ نثر کی اس صنف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس میں کبھی واقعہ
یا شخصیت کا بیان مخصوص اور غیر معمولی انداز میں کیا جائے۔ یہاں اس واقعہ یا شخصیت کا اہم یا غیر اہم ہونا چنداں ضروری نہیں
بلکہ اس کو پیش کرنے کے لیے جو انداز اختیار کیا ہے وہ بالکل اوج کا اور کسی قدر غیر متوقع ہوتا ہے۔ گویا نویسے کی ٹیکنیک
مختصر لیکن جامع تعریف ان الفاظ میں کی جے۔

'Was ist eine Novelle anders als eine sich ereignete und ohne begrenztheit

ترجمہ: نویسے کیا ہے؟ صرف یہی کہ یہ ٹیکنیک آپ جتنی واردات کا بیان

کیا بیان کا مخصوص انداز میں پیش کیا جاتا ہے نویسے کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ جدید جرمن نقاد جانشی کیس نے
اپنی امتحانات کی مشہور کتاب 'ڈیسی اور سینٹ' میں نویسے کی ٹیکنیک پر شکوہ تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے:

"Das Wesen der Novellenform ist kurzgefasst ein Menschenleben durch die
unendliche Kraft einer Schicksalsstunde gedrückt"

1. George von Lukart.

2. 'Die Seele und die Formen'.

زجر : نویلے کی تخلیق دہی ہے جس میں انسانی زندگی قسمت کے کسی انزلی لمحے کے ہاتھوں ناقابل بیان قوت کے ساتھ منضبط ہوجاتے۔

نویلے کی ہیئت میں سب سے اہم شے اس کا انوکھا انداز ہے جس کو "نثری ٹیٹ میں تخلیق اور ہیئت" کے مصنف ٹیلے پیش نے بار بار "غیر معمولی" (ungewöhnlich) اور "انوکھا" (neues) کہا ہے۔ اس کے نزدیک نویلے میں یہ غیر معمولی ہی ٹیٹ کے نقاط نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور بیان کیا جانے والا زندگی کا جز محض اکائی کی حیثیت سے بیان ہوتا ہے جس کی وجہ سے شدت برقرار رہتی ہے۔ یہی شدت اور انوکھا بیان کو انوکھا، غیر معمولی اور غیر متوقع بنا دیتی ہے چنانچہ انگریزی میں نویلے کی ایک ہیئت ہی مختصر تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

Novelle — a description of intense maturity.

زجر : نویلے کا لال شدت کا ایک بھر پور بیان۔

بیان نویلے کا مفہوم اور اس کی طوالت اس کو دیگر مروجہ اصناف سے تمیز نہیں کرتے بلکہ اس کی پیش کش کا عجیب و غریب انداز جس میں شدت اور تاثیر کے عناصر ہر دو اتم پائے جاتے ہیں اس کو مختلف اصناف نثری سے ممتاز بنا دیتا ہے جھوٹا اور آشورم کا مشہور نویلے "باسی گلاب" صرف چند صفحات پر مشتمل ہے اس کے برخلاف لڈوگ ٹیک کی تخلیق "جوان بڑھتی" پورے چار سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہے اور جو نویلے ہی ہے۔

نویلے انا دل یا کہانی سے طوالت اور کینویس کے سائز ہی میں مختلف نہیں ہوتا بلکہ موضوع اور نوع کے اعتبار سے بھی اس کی بائیں جداگانہ حیثیت ہوتی ہے۔ نویلے اور ناول کا ایک بڑا فرق یہ ہے کہ ناول میں پھیلاؤ کی آزادی ہوتی ہے چنانچہ واقعات یکے بعد دیگرے وجود میں آتے رہتے ہیں جس سے شخصیت کے تمام پہلوؤں کی تعمیر ہوتی رہتی ہے اور آخر کار یہی ارتقا ہیرو کا انجام بن جاتا ہے برخلاف اس کے نویلے کا پورا زور صرف کسی ایک پہلو پر رہتا ہے اور باقی پہلو محض ضمنی نوعیت سے بیان کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح افسانہ میں جہاں ایک نقطہ سے دوسرے نقطے تک عموماً براہ راست رسائی ہوتی ہے ضمنی اجزا بڑی اہمیت رکھتے ہیں لیکن نویلے ہمیشہ مرکزی دھڑکی کے نقطہ (Centre of interest) سے وابستہ رہتا ہے۔ وہ اطراف کا ذکر ضرور کرتا ہے لیکن ہمیشہ مرکز کے دشتے سے۔ جوں جوں ایک طویل نویلے "یہودی کی کتاب" اپنے ہیرو فریڈریش میرگل

1. 'Wesen u. Formen der Erzahikunst
2. R. Petsch
3. Theodor Storm
4. 'Spate Rosen'
5. Ludwig Tieck
6. 'Der junge Tischlermeister'
7. Hulschoff
8. 'Die Judenbuche'
9. Friedrich Mergel

کی پوری زندگی اس کی پیدائش سے لے کر موت تک بیان کرتا ہے لیکن پوری کہانی صرف ایک مرکزی فعل (Central Action) کے منہ میں بیان ہوتی ہے جو قصہ میں 'یہودی کا قتل' ہے۔
انگریز نقادوں میں کیچ کے پروفیسر ٹیٹ نے خصوصیت کے ساتھ فریڈ کے صنف پر بڑی تحقیق کی ہے انھوں نے فریڈ کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

A Novelle is a narrative in prose, usually shorter than a novel, dealing with one particular situation, conflict, event or an aspect of a personality. It narrates something 'new' in the sense of something 'striking'.

ترجمہ: فریڈ ایک نثری بیان ہے جس کی طوالت عام طور پر ناول سے کم ہوتی ہے۔ یہ کسی شخصیت کے کبھی مخصوص پہلو، تضاد، واقعہ سے متعلق ہوتا ہے اور ہمیشہ کسی 'نئی' بات کو بیان کرتا ہے جسے 'نیا' اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ وہ کبھی قدر چرنا دینے والی ہوتی ہے۔

ان مختلف تعریفوں کی روشنی میں فریڈ کا مفہوم بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ بین الاقوامی ادب میں یہ ایسی کے اس پاس کی صنف صنف ناموں کے ساتھ رائج ہے جہاں انگریزی کا طویل فقرہ انڈا (Long short story) یا سنڈرائس کی کارائیت (Novella) کم و بیش جرمن فریڈ ہی کے مفہوم کا مترجمہ ہیں۔ پچھلے دو صدیوں میں دنیا کے بہت سے نامور ادیبوں نے اسی صنف کو نگاہ خیال کا ذریعہ بنایا تھا۔ اس سلسلہ میں روسی ادب سے چکن، گرگول، ٹاسٹوئی، ترخیف، ایکوف، فرانسیسی ادب سے سوپیاں، ہسپانوی ادب سے الارکون اور اطالوی ادب سے پیرل دیو کے نام بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔

جرمن ادب میں فریڈ اٹھارویں صدی کے آخر میں آیا اور بہت جلد ادب کی ایک متقبل صنف بن گیا۔ جرمن مزاج کی شدت پسندی اس صنف کی قبولیت کا سب سے بڑا راز تھی چنانچہ اس کو قومی صنف ادب کی حیثیت سے اپنایا گیا۔ کلاسیک دور سے لے کر آج تک جرمن نثر کی سب سے متقبل صنف یہ فریڈ رہا ہے۔ اگر اس دور میں ہم 'جرمن انڈا' کی تاریخ اور اس کے ارتقا کا جائزہ لیں تو ہمیں انڈا کی جگہ 'فریڈ' ہی نظر آتا ہے۔ گئیٹے کے عہد سے لے کر موجودہ دور تک جرمن ادب میں لاتعداد فریڈ لکھے گئے ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں پر محیط ہیں۔ اسی بنا پر سنائیوں کے اعتبار سے ان کو مختلف گروہوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ فریڈ کے خاص منجھے ہیں ۱۔

۲۔ افسانہ جیسا کہ فریڈ ہے۔

۱۔ کلاسیک فریڈ ہے۔

1. E. K. Honner
2. Alarco
3. Pirandello

۵۔ شاعرانہ یا حقیقی نویلے

۲۔ رومانوی نویلے۔

۶۔ نئیاتی نویلے۔

۳۔ بیانیہ نویلے۔

جرمن ادب میں نویلے نویسی کی تاریخ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں گھٹنے کے جرمن آئندہ گرووں کی گفتگو سے شروع ہوتی ہے۔ یہ دور رومانیت پسندی کا تھا جس میں کچھ ہی عرصہ بعد داخلیت کی شدت ہو گئی اور تقریباً پوری بیسویں صدی تک یہی رنگ بچا یا رہا۔ اس انداز نے بالآخر اپنی انتہا پر پہنچ کر ہیئت کے مردہ اصولوں سے انحراف کیا اور کلاسیکسٹ نے مابعد الطبیعی مسائل کو بھی نویلے کی صنف میں داخل کر دیا اس کے ساتھ ہی اس نے تاریخی و شخصی نویلے لکھ کر اس ٹیکنک میں بالکل نئے تجربے کیے۔ خاص رومانوی مضامین کی فضائوں کو ٹیکت، آئینی ڈورف، آرم اور ہوف من نے پیدا کی۔ خاص طور پر ہوف من نے فنی نویلے (Künstlernovelle) لکھ کر اس صنف میں بڑا حسن پیدا کیا۔ حقیقت پسندانہ اور حقیقی تجربوں کی ابتدا گوٹ شٹیف اور آرباخ کے ہاتھوں ہوئی اس دور کے نویلے (Dorf novelle) کہلاتے ہیں۔ اس دور تک جرمن نویلے فنی طور پر انتہائی پختہ اور تخلیقی دولت سے مالا مال ہو چکا تھا اس کی دست بھی بے اندازہ تھی چنانچہ اب عوامی ترجمانی کا کام بھی اسی صنف سے لیا جانے لگا۔ اس عہد نے آئسنورم، کیلر، گوٹ فریڈ، موبیکے، رابے، اولڈوگ اور گرل پارسیسے فنکار پیدا کیے۔ اس دور کے اختتام پر نئیاتی تجربوں کا آغاز ہوا چنانچہ پاول ہیزے اور مارٹن نے نئیاتی مسائل پر کامیاب نویلے لکھے جیسے آگے چل کر مختصر من، ریکے اور ہوف من ایشال کی فنی صلاحیتوں نے معراج کمال پر پہنچا دیا۔ اس درمیان میں ہیئت کی بے قاعدگی جو ایک عرصہ سے چلی آتی تھی وٹیم شیفر اور پاول ارٹسٹ کے ہاتھوں ڈور ہوئی۔

نویلے نویسی کی ابتدا سے لے کر موجودہ عہد تک کی تاریخ ہمیں پر ختم ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادب کی یہ مضمون اور روایتی صنف عہد جدید کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکتی ہے یا نہیں؟ تاریخی شہادت کی روشنی میں اس کا جواب لہی میں ملتا ہے جبکہ بیسویں صدی کے آغاز اور اس کے ابتدائی ایام گزر جانے کے بعد ہمیں نویلے اپنی روایتی عظمت کھوتا نظر آتا ہے۔ اب اس میں وہ شکوہ بآواز نہیں جو قدیم زمانہ سے بطور ورثہ چلا آ رہا تھا اور بیسویں صدی کی ایک چوتھائی گزر جانے کے بعد تو نویلے فنی اعتبار سے بالکل بے جانی معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی مختصر افسانہ کا آغاز ہوتا ہے۔

نویلے کی اس عہد ازنی کے نتیجہ میں نثر کی دیگر اصناف کو پینے کا موقع نہیں مل سکا۔ لیکن مختصر نثر نویسی کے تجربات جاری

مزور رہے چنانچہ

Marchen Parabeln, Anekdoten, Grotesken

- | | | |
|---|-------------|--------------------|
| 1. 'Unterhaltungen deutscher Ausgewanderten | Aurbach | 6. Paul Heyse |
| 2. Kleist | 5. Storm | C. F. Mayer |
| 3. Ludwig Tieck | Keller | Thomas Mann |
| Richendorff | Gottfried | Rilke |
| Arnim | Morike | Hoffmannstahl |
| E. T. A. Hoffmann | Rabe | 7. Wilhelm Schafer |
| 4. Gotthelf | Otto Ludwig | 8. Paul Ernst |
| | Grillparzer | |

دور میں جو کچھ لکھا جا تا رہا وہ بڑی حد تک مختصر انداز سے قریب معلوم ہوتا ہے اس دور میں ان میں کبھی جاننے والی بعض کمائیوں
ترقیاں انداز رکھتی ہیں چنانچہ یہاں مختصر نویسی کے اس دور کا مجموعی حیثیت سے ذکر کیا جا تا ضروری ہے جو اس پر فوٹے
کی سرپرستی میں گزرا۔

جرمن ادب کا مطالعہ کرنے کے لیے اس کو تین بڑے تاریخی ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ گٹے کا دور ۱۷۵۰ تا ۱۸۴۲

۲۔ حقیقت پسندی کا دور ۱۸۴۲ تا ۱۸۸۵

۳۔ نطرت پسندی سے جدید روایت تک ۱۸۸۵ تا موجودہ دور۔

گوٹے کا دور بنیاد پر انداز نوی ادب سے کوئی ربط نہیں رکھتا لیکن اس حد تک کہ جرمن ادب کی ہر صفت کے تذکرے کے
ساتھ ناگزیر ہے کہ اس دور نے جرمن ادب پر دائمی اثرات چھوڑے ہیں۔ اسی زمانہ میں جرمن ادب کا نیا آئینہ ہوا جو تاریخ میں
’طوفان ویرجیان‘ (Sturm und Drang) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا آغاز اگرچہ ہرڈر کی حد سے
جو چکنا چکیاں لکھنے اور شترنے اس کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ اٹاروی صدی کی اس انقلابی تحریک نے جرمن ادب میں ایک
نئی روح پھونک دی۔ اس دور میں ادب کو کلاسیکی بندھنوں سے آزاد کیا گیا، اس میں داخلیت کی جذبات پرستی اور انفرادیت
کے عناصر کو اجاگر کیا اور دوسرے اخلاقی و تمدنی اقدار سے اعلانِ بغاوت کی گئی جس کے باعث جرمن قوم زندگی کی ایک نئی
حرارت محسوس کرنے لگی۔ اسی حرارت کو ’خالص جرمن روح‘ کا نام دیا جاتا ہے چنانچہ آج تک جرمن ادب میں کسی نہ کسی انداز
سے یہی روح کار فرما نظر آتی ہے۔ ان خیروں سے قطع نظر اس تحریک کی بے انتہا شدت ’داخلیت اور انفرادیت کا
پنی حد و دوسے تجاوز ادب میں عام ہے راہ روی‘ غیر آبجی اور کسی متدرجے ترقیبی کا بھی موجب بنا چنانچہ بعد کے حقیقت
پسند دور میں ’طوفان ویرجیان‘ کے اس غروش کے ساتھ ہی اس کی خیریاں اور خامیاں بڑے نمایاں طور پر محسوس کی
جاتی ہیں۔

نثری ادب میں اس دور کی اہم ترین شخصیت جو شیخ یوشنر ہے جس کی واحد کہانی ’لینس‘ (Lenz) جرمن مختصر افسانہ
کی قدیم مثال کہی جاسکتی ہے۔ یہ کہانی ’طوفان ویرجیان‘ کے آخری دہائی میں لکھی گئی ہے جس میں اس تحریک کے جالیاتی اصولوں اور
شاعرانہ حقائق کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بد قسمتی سے یوشنر کے انفرادی خیالات (خصوصاً اس کی فلسفہ میں عینیت اور
ادب میں روایت سے نفرت) اس کو شہرت نہ دے سکی۔ انگریزی ادب میں کیٹس کی طرح یوشنر کو جوان موت نے جرمن
ادب کو کبھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ اس دور کی ایک اور اہم مختصر کہانی ہے ’برجیٹا‘ (Brigitte) ہے

1. Johann Gottfried Herder (1744-1803)

2. George Buchner

جس سے اڈلبرٹ اسٹیفٹر کی فنی مہارت کے ساتھ اس کے شاہدہ فطرت کا احساس ہوتا ہے۔ مومن اشتمال کی کئی مختصر کہانیاں بھی جی میں اس کی فنکاری، شعرا نہ نگر احسانداز کی حدت نمایاں ہے اس دور کے مختصر افسانہ کی عمدہ مثالیں ہیں۔

انیسویں صدی کے آخری ایام میں حقیقت پسندی کا دور بھی ختم ہوا اور اس پر تاثریت کا غلبہ ہونے لگا اسی زمانے میں جرمن ادیب جیہ الا قوامی تاثریت بھی قبول کیے خاص طور سے فلاؤبر، موسویاں، دوستوفسکی، ژا بئیلے، اونیسمو، اسکوڈا لڈ اور ڈی ایچ۔ لارنس کی تحریر میں نے جرمن کھنے والوں کو شدت سے متاثر کیا چنانچہ رومانیت کے اس رجحان کو اپنا لینے کے بعد سماجی برائیوں کا براہِ اظہار کیا جانے لگا۔ مجموعہ اس تشویر کا مقصد (خود فطرت پسندوں کے بقول) 'جیہ الا استیعصال' تھا لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ستائیس کے آس پاس جیہ کی یہ نثر و شاعرت بلاغ و اغراض و استعارات کی حد تک پہنچ گئی۔ انا ڈی ادب میں اس دور کی اہم شخصیت آر تھر شٹنلر ہے جسے خاص آسٹریائی فطرتیت کا نمونہ کہا جاتا ہے اس کا فنی ترقی یافتہ ہونے کے ساتھ زندگی کی توانائی سے بھرپور ہے۔ محبت کے مسائل کو اس نے رومانیت کے انداز کے مقابلہ میں عقل و شعور کی میزان پر جانچنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ باجمالیاتی حقائق بھی بیان کرتا ہے اس کی فنی کلادہ ذہانت موسویاں سے کم نہیں تاہم اظہار کی بے باکی اور مختصر رنگملی اشاریت کہیں کہیں اخلاقی حدود سے متجاوز ہو جاتی ہے جہاں وہ (Adultery) کو بھی محض ایک بے ضرر کھیل "کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسی تحریک کے دوسرے بڑے علمبردار گیارٹ ہاؤپٹس کی یہاں خیالات میں تنوع کے ساتھ زندگی سے ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی تخلیقات مختلف مائع عناصر کا مرکب ہیں جیہ میں زندگی کے مسائل کی تشریح کے ساتھ ان کا حل ڈھونڈنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ فنی اعتبار سے بھی اس کا انداز بڑا پختہ اور بھرپور ہے۔ ہاؤپٹس کی سب سے بڑی خوبی اس کی سہجی بی بی ہے جیہ وہ ہے کہ فطرتیت کے دور سے اگر اس شخصیت کو نکال دیا جائے تو یہ دور بالکل بے رنگ نظر آتا ہے۔

جیویں صدی کے آغاز کا زمانہ یورپ میں عام فنیاتی تحریک کا زمانہ ہے۔ اس دور میں فرانز کا فنیاتی تخیل، پراڈسٹ اور جوس کا تجزیاتی اسلوب بر روی فنیاتی فکر کے ذہنی پر مسلط تھا۔ دوسری طرف فرانسیسی ادیبی اہل قلم موضوع ہیئت اور اسلوب میں نت نئے تجربے کر رہے تھے اس سلسلہ میں فلاؤبر کا انداز خصوصیت کے ساتھ جرمن لکھنے والوں کو متاثر کر رہا تھا۔ انہی محاکات نے جرمن ادب میں انیسویں صدی کی شخصیت کو جنم دیا جو آج بھی نہ صرف جرمن بلکہ بین الاقوامی ادب میں پانے کی شخصیت سمجھی جاتی ہے۔ یہ شخصیت تھومس ہے جس نے پرانی قدروں کا زوال اور نئی قدروں کا عروج خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور آج بھی وہ ان دونوں کے درمیان ثابت قدم سے کھڑا نظر آتا ہے اس دور کے تھومس کی افسانوی سرمایہ اگرچہ قلیل ہے لیکن اس میں بھی فنی کارائزہ صلیونوں کا خیر مسوہی اظہار پایا جاتا ہے۔ "ہتری اور ابتدائی آلام" میں اس نے خیالات و جذبات کو دانشورانہ خطوط پر پیش کرنے کے کامیاب تجربے کیے ہیں۔ بعد کی کہانیاں

1. Adelbert Stifter
2. Gabriele d'Annunzio
3. Arthur Schnitzler
4. Gehari Hauptmann
5. Thomas Mann
6. 'Disorder & Early Sorrows'

ساتھ بڑا مسلح بھی ہے لہذا زندگی کی بے قاعدگیوں

بے اس کے یہاں محاسبہ کا سب سے بڑا معیار نسیات ہے جس کی

بے محفظہ اور اس کی سلامتی کا خواہاں ہونے کی حیثیت سے وہ عوامی قدروں

کی ایک اہم قسم ہے۔ دوسرے دور میں اس کو انہی خیالات کے جرم میں معنوب کیا گیا۔ نازی قلمب کے زمانہ میں اس نے

جس کو یوٹو کے لیے شہر بنایا اور امریکہ کی شہریت قبول کر لی۔ برتن یونیورسٹی کے اعزازی کریچر یوٹو کی فرسٹ سے پہلا نام خارج

کیے جانے پر اس نے یونیورسٹی کے ڈیپ سے مرست میں اپنے نظریات کی فاضلانہ توجہات دی ہیں انسانی ادب کے علاوہ فطرت

کے دوسرے شعبوں پر بھی محرمس کی شخصیت چھائی نظر آتی ہے۔ اس کا اثر و نفوذ آج کے جرمی ادب میں بھی سراپت کیے

جس کے معلوم ہوتا ہے۔

۱۹۱۴ء میں جرمنی کی پہلی سیاسی موت واقع ہوئی جس سے ادب شدت کے ساتھ متاثر ہوا۔ جنگ کے خاتمہ پر فاتح اقوام

اپنی تمدنی زندگی کا از سر نو تعمیر میں مصروف ہو گئیں لیکن جرمنی اس سے عوام رہا شکست اور پھر مصلح 'دوڑوں سے جرمنی پسندانہ کا نشانہ

ہو گیا اور مدت تک اس کو اپنے حریفوں کا دست نظر رہا پڑا اس طرح قومی زندگی میں شکست خود کو اور دلائل زندگی کا فضا پیدا ہو گئی۔

عوام پر برا اقتدار جینے کے خلاف عام بیزاری کا اظہار کرنے کے لیے بھی رجحان تاریخ میں "منکویت" (NIHILISM) کے نام سے موسوم

ہے جس میں ایشنگلر نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "ذوال مغرب" (untergang des Abendlandes) لکھ کر یورپ

تبدیل کے اہم اندام کا اعلان کیا۔

اس ممکن "انفرادی اور بچاؤ کی کے احوال نے فنکاروں کو کسی ذہنی پناہ گاہ کی تلاش کے لیے مجبور کیا۔ یہی پناہ گاہ ادب میں

اظهاریت کی تحریک تھی۔ یہ لفظ اگرچہ سال ۱۹۱۴ء کے ٹک جھگ ہی جرمنی ادب میں مختلف ہو چکا تھا تاہم اس وقت تک اس کو محض

تأثریت کے لحاظ نظر یہ کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ اظہاریت پسندوں نے نیو لیس عہد کے روایتیت پسندوں کی فنکار

روش اور ان کی رائج کردہ اخلاقی و فلسفیانہ قدروں کو بغیر بدل ڈالا۔ انھوں نے حقیقت پسندوں کے اس نظریہ کا بھی بطلان

کیا کہ "محض معلومات صداقت کو پیش کرنا کافی ہے" ایک طویل عرصہ تک یہی اظہاریت کی تحریک جرمنی ادب پر چھائی رہی جس کا سلسلہ

کم و بیش دائرہ جمہوریہ کے آغاز تک جاری رہا۔ یہاں ہونچکر اس تحریک نے ایک ایسا موڑ دیا جو آگے چل کر خود ایک ہشمار پڑ

تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔

یہ اور ایتیت کی تحریک تھی۔ جرمنی ادب اس نئی تحریک سے جس میں ایک متاثر ہوا اس کا اندازہ آج کی تحقیقات سے

بھی بڑی کیا جاسکتا ہے۔ اسی ضمنی میں جرمنی ادب میں ایک ایسی شخصیت کا نام لیا جاتا ہے جس نے نہ صرف جرمنی بلکہ بیرونی

صدی کے فطرت پر بھی گہرے نقوش چھوڑے ہیں آج کے جرمنی افسانے میں بابا بھی اسی کی صدائے بازگشت سنی جاتی ہے۔ یہ

1. Oswald Spengler (1880-1886)

2. Weimar Republik

شخصیت فرانس کا ایک بڑا حصہ ہے جو جرمنی و بے مادیات کا سب سے بڑا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ کافکا کا فن اور اس کی تخلیقات کلیتہً اسی قریب سے وابستہ ہیں جن کا مطالعہ کرنے کے لیے اس تحریک کا پس منظر پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

بیسویں صدی کے ادب کی یہ انقلابی تحریک فرانس سے شروع ہوئی اور بہت جلد یورپ امریکہ کے ممالک تک پہنچ گئی۔ ادب کے ساتھ آرٹ کے دیگر شعبوں پر بھی اس سے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ ہمسایہ ملک ہونے کی حیثیت سے جرمنی نے ان اثرات کو شدت سے قبول کیا۔

بیسویں صدی کے فرانسیسی ادب پر برگاتوں کے وجوہات مختلف تھے مگر انڈالاچین نے مصوری میں تاثیریت اور بعد میں پائرس کے فن 'مکجیت' (Cubism) کی صورتیں اختیار کیں۔ اسی زمانہ میں فرماڈ کی نفسیاتی تحلیل نے لاشعور کی پراسرار باتوں سے آگاہی دے کر یورپی ذہنوں میں انقلاب برپا کر دیا چنانچہ فرانسیسی شاعری میں اپولی نیر کی شخصیت میں یہی دو عناصر نمایاں نظر آتے ہیں اسی شخص نے سب سے پہلے 'مادیات' کا لفظ بھی استعمال کیا جو آنے والے دور میں ایک عظیم ادبی تحریک کا مہم چال اپولی نیر نے خارجی صداقتوں سے ہٹ کر مادی حقیقتوں کو اپنا موضوع بنایا اس کے ساتھ ہی اس نے ہنیت کے راز و اسراروں سے انحراف کا آغاز کیا جس نے پہلے 'مادیات' (Dadaism) اور بعد میں 'مادیات' (Surrealism) کی صورتیں اختیار کیں۔

'مادیات' کا آغاز ۱۹۱۳ء میں سویٹزرلینڈ میں تریسٹن تارا اور اس کے معاصرین نے کیا۔ یہ لوگ اپولی نیر کے متبع میں خاص شاعری کے قائل تھے جس میں خارجیت ایک بے معنی لفظ تھا۔ اس شاعری کا مقصد (خود اس نظریے کے بانیوں کے بیان کے مطابق) محض تحت الشعور سے آنے والے پنیات کی ترسیل تھا، جس کے لیے اوزان بحر اور ردیف و قافیہ کی پابندی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس تحریک نے اپنے وقت کے تمام اخلاقی و ذہنی تعلقات کو بالائے طاق رکھ کر آرٹ میں بڑے راہ روی کو با اثر قرار دے لیا۔

مادیات کے اس منہی مرجان اور اس کی بے اعتدالیوں کے باعث اس کے بہت سے حامی اس سے الگ ہو گئے جنہوں نے ایک نئے محکمہ فکر کی بنیاد ڈالی۔ یہی محکمہ فکر مادیات کہلاتا ہے جس کا بانی آندریس بریٹون تھا۔ اس تحریک کے ماننے والوں کا کہنا تھا کہ عالم معسرات کے علاوہ ایک اور عالم بھی پیدا ہو چکا ہے جو اس ظاہری اور حسی عالم سے بالکل مختلف ہے۔ اس عالم تک سائنس حاصل کرنے کا واحد ذریعہ لاشعور ہے جس کو استعمال کرنے کے لیے انسانی کو عقل و منطق سے کنارہ کش ہو جانا ضروری ہے چنانچہ مادیات میں خارجی اور معروضی حقیقت کوئی معنی نہیں رکھتی اس کی جگہ لاشعور کی داخلی حقیقت سب پر مقدم ہوتی ہے۔ اور انسانی فطرت حقیقت کو خارجی اشیاء میں تلاش نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے وہ لاشعور کی مدد سے خود اپنے وجود کی گہرائیوں میں اتر جاتا

1. Guillaume Apollinaire
2. Tristan Tzara
3. Andre Breton

س کے ترقی یافتہ طبقے کی بہترین مثالیں ہیں۔ وہ ایک عظیم فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا صحیح بھی ہے۔ ان کے فن کارانہ رویے اور بے اعتدالیوں سے چشم پوشی نہیں کرتا بلکہ ان کی اصلاح چاہتا ہے اس کے یہاں محاسبہ کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ جس کی صداقتوں سے وہ کبھی روگردانی نہیں کرتا۔ نوب انسان کے تحفظ اور اس کی سلامتی کا خواہن ہو سکے۔ طبیعت سے وہ ماحول کی حدود کا پورا پورا احترام کرتا ہے۔ آنے والے دور میں اس کو انہی خیالات کے مجرم میں منظور کیا گیا۔ ان کی طرف سے وہ ماحول کی حدود کو وطن کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا اور امریکہ کی شہریت قبول کر لی۔ بون یونیورسٹی کے اعزازی گریجویٹ کی حیثیت سے وہ کیم نام خارجی کیے جا رہے ہیں اس نے یونیورسٹی کے ڈین سے مراسمت میں اپنے نظریات کی فاضلانہ تعجیبات کو ان کی طرف سے ایک علاوہ بخش کے دوسرے شعبوں پر بھی محسوس کی شخصیت چھائی نظر آتی ہے۔ اس کا اثر و نفوذ آج کے دور میں ایک نئی ہیئت میں بھی سراپت کیے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔

۱۹۱۲ء میں جرمنی کی پہلی سیاسی موت واقع ہوئی جس سے ادب و فن کی زندگی میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ جرمنی کے فنانس اور ادب کی زندگی کی از سر نو تعمیر میں معروف ہو گئیں لیکن جرمنی اس سے محروم رہا۔ حکومت و سرکار نے جرمنی سے جرمنی پیمانہ کا اعلان ہو گیا اور مدت تک اس کو اپنے حریفوں کا دست نجر بننا پڑا اس طرح قومی زندگی میں حکومت و سرکار کی عدم داندگی کی نشانی پیدا ہو گئی۔ حرام برسر اقتدار طبقہ کے خلاف عام بیزاری کا اظہار کرنے کے لیے جرمنی میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ (۱۹۱۸ء) کے نام سے یہ ہے جس میں آپسٹنگر نے اپنی مشہور آفاقی کتاب "Zwischen Krieg und Revolution" (۱۹۱۸ء) لکھی۔ (۱۹۱۸ء) کے نام سے یہ ہے جس میں آپسٹنگر نے اپنی مشہور آفاقی کتاب "Zwischen Krieg und Revolution" (۱۹۱۸ء) لکھی۔ (۱۹۱۸ء) کے نام سے یہ ہے جس میں آپسٹنگر نے اپنی مشہور آفاقی کتاب "Zwischen Krieg und Revolution" (۱۹۱۸ء) لکھی۔

اس نمونہ، افسردگی اور بچاؤ کے ماحول نے فنکاروں کو کسی ذہنی پناہ گاہ کی تلاش کے لیے مجبور کیا۔ یہی پناہ گاہ ادب میں اظہاریت کی تحریک تھی۔ یہ لفظ اگرچہ ۱۹۱۱ء کے لگ بھگ ہی جرمن ادب میں متعارف ہو چکا تھا تاہم اس وقت تک اس کو محض ناثریت کے مخالف نظریہ کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ اظہاریت پسندوں نے نپولین بوناپارٹ کے رومانیت پسندوں کی لٹریچر روش اور ان کی رائج کردہ اخلاقی و فلسفیانہ قدروں کو یکسر بدل ڈالا۔ انھوں نے حقیقت پسندوں کے اس نظریہ کا بھی بڑا کیا کہ محض معلومات صداقت کو پیش کرنا کافی ہے؛ ایک طویل عرصہ تک یہی اظہاریت کی تحریک جرمن ادب پر چھائی رہی جس کی وجہ سے کم و بیش دباؤ جمہوریہ کے آغاز تک جاری رہا۔ یہاں پہونچکر اس تحریک نے ایک ایسا موڑ لیا جو آگے چل کر خود ایک بنیاد تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔

یہ اور ایتھ کی تحریک تھی۔ جرمن ادب اس نئی تحریک سے جس حد تک متاثر ہوا اس کا اندازہ آج کی تحقیقات سے بھی بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ اسی ضمن میں جرمن ادب میں ایک ایسی شخصیت کا نام لیا جاتا ہے جس نے نہ صرف جرمن بلکہ ساری صدی کے فکشن پر بھی گہرے نقوش چھوڑے ہیں آج کے جرمن افسانے میں جا بجا ایسی کی صدائے بازگشت سنی جاتی ہے۔

ہیت فرانس کا قلم ہے جو جرمنی میں اوجھل کاسٹ پر غمازہ بھجواتا ہے۔ کافکا کا فن اور اس کی تخلیقات کلیتہً اسی
یہ سے وابستہ ہیں جن کا مطالعہ کرنے کے لیے اس تحریک کا پس منظر پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

بیسویں صدی کے ادب کی یہ انقلابی تحریک فروض سے شروع ہوئی اور بہت جلد یورپ امریکہ کے ممالک تک
پہنچ گئی۔ ادب کے ساتھ آرٹ کے دیگر شعبوں پر بھی اس سے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ ہمسایہ ملک ہونے کی حیثیت
سے جرمنی نے ان اثرات کو شدت سے قبول کیا۔

بیسویں صدی کے فرانسیسی ادب پر برکات کے وجہ سے فرانسیسی فلسفے نے گہرا اثر ڈالا جس نے مصوری میں تاثیریت اور بعد
اس کے فن 'مکعبیت' (Cubism) کی صورتیں اختیار کیں۔ اسی زمانہ میں فروڈ کی نفسیاتی تحلیل نے لاشعور کی کھدائی
کے آگاہی دے کر یورپی ذہنوں میں انقلاب برپا کر دیا چنانچہ فرانسیسی شاعری میں اپولی نیر کی شخصیت میں ہی دو عناصر
مکعبیت نظر آتے ہیں اسی شخص نے سب سے پہلے 'مادائیت' کا لفظ بھی استعمال کیا جو آنے والے دور میں ایک عظیم ادبی تحریک کا
مہم بنا۔ اپولی نیر نے خارجی صداقتوں سے ہٹ کر ادبی حقیقتوں کو اپنا موضوع بنایا اس کے ساتھ ہی اس نے ہیت کے
تجربہ اصولوں سے انحراف کا آغاز کیا جس نے پہلے 'مادیت' (Dadaism) اور بعد میں 'مادائیت' (Surrealism) کی
صورتیں اختیار کیں۔

مادائیت کا آغاز ۱۹۱۴ء میں سویٹزرلینڈ میں تریسٹن تارا اور اس کے معاصرین نے کیا۔ یہ لوگ اپولی نیر کے متبع میں
خاص شاعری کے قائل تھے جن میں خارجیت ایک بے معنی لفظ تھا۔ اس شاعری کا مقصد (خود اس نظریے کے بانیوں کے بیان
میں) محض تخت لاشعور سے آنے والے پیغامات کی ترسیل تھا جس کے لیے اوزان بحر اور ردیف و قافیہ کی پابندی کوئی
معنی نہیں رکھتی۔ مکتوبات ہی عرصہ میں اس تحریک نے اپنے وقت کے تمام اخلاقی و ذہنی تحفظات کو بالائے طاق رکھ کر آرٹ میں
پہلے قدم ڈال دیا۔

مادائیت کے اس منفی رجحان اور اس کی بے اعتدالیوں کے باعث اس کے بہت سے حامی اس سے الگ ہو گئے جنہوں نے
مکعبیت کے انداز کی بنیاد ڈالی۔ یہی مکتبہ فکریہ مادائیت کہلاتا ہے جس کا بانی اندر سے بریتوں تھا۔ اس تحریک کے ماننے والوں کا کہنا تھا کہ
عالم کے لیے علاوہ ایک اور عالم بھی اپنا وجود رکھتا ہے جو اس ظاہری اور حسی عالم سے بالکل مختلف ہے۔ اس عالم تک سائنسی
تجربہ و ذریعہ لاشعور ہے جس کو استعمال کرنے کے لیے انسان کو عقل و منطق سے کنارہ کش ہو جانا ضروری ہے چنانچہ
مادائی اور معروضی حقیقت کوئی معنی نہیں رکھتی اس کی جگہ لاشعور کی داخلی حقیقت سب پر مقدم ہوتی ہے۔ مادائی
عالم و خارجی اشیاء میں تلاش نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے وہ لاشعور کی مدد سے خود اپنے وجود کی گہرائیوں میں اُتاتا

جسے محل عقل و ادراک کے تابع نہیں چنانچہ اندر سے برہمن نے اس عمل کو 'خالص نفسیاتی خود حرکتیت' (Psychic) کہا ہے۔ حقیقت کی اس لا شعوری تلاش میں 'ادی انسانیت' کا ادراک سے خود بخود اشتراک ہوتا ہے جس کی کوئی منطقی ترمیم نہیں کی جاسکتی۔ ایڈلڈ کا زیر نے اپنی شاخوں 'اندریت' میں اس رشتہ کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی ہے کہ یہ ہر قسم کی عقلی و منطقی ترجیحات سے بالاتر ہے: 'اندریت پسندوں کی دلیل ہمیشہ یہی کہ موضوع اور موضوع کے تضاد کی موجودگی میں انسان اپنی حقیقت کو نہیں پاسکتا کہ خالص موضوع غریب نظریہ خالی غلبے حقیقت صورت ہے'۔ اس کے لیے انسان کو باطنی دجہان سے کام لینا چاہیے جو لا شعور کی اتحاد گرائیوں میں وجود اور حقیقت کے سرور ملکیت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اندریت میں لا شعور کو 'مطلق حقیقت' (Reality) کے ساتھ ملانے کی حیثیت دی جاتی ہے۔

ادراکی فنکاروں نے اندر کے لیے براہ راست (Symptom) کا طریقہ اختیار کیا ہے جس میں ہیئت اور موضوع کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ رمزیت کا ہر ہر لفظ کسی نہ کسی ذہنی کشش کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جس سے لا شعور میں دہنی برائی یا دوسرے کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ رمزیت کے کسی لفظ کا مفہوم خارجی حقیقتوں کو سامنے رکھ کر نہیں نکالا جاسکتا کیونکہ یہ تو محض کسی ذہنی کیفیت کی جانب ایک اشارہ کی حیثیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات رمزیت محض الفاظ کا ایک چھپا ہوا معلوم ہوتی ہے۔ طارے لکھے 'نغم تو ایک ستر ہے جس کا حل پڑھنے والوں کو نکالنا چاہیے'۔

جرمنی میں دائرہ کی موسیقی رمزیت کی فصل کے لیے بہت سازگار ثابت ہوئی اور فن کاروں نے جا بجا اس سے استفادہ بھی کیا... اس موسیقی کی ضرورت نے یادوں کا ایک طغیان پیدا کرتی ہے جس کے ذریعہ انسانی لا شعور کی پراسرار اور اتحاد گرائیوں میں اُتر جاتا ہے۔ اس پراسرار دھندلے میں بھٹکنے سے انسانی شعور خود بخود منتشر و زات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ رمزیت کا یہی انداز ادراکی فنکاروں میں قبولیت کا باعث بنا۔

کہا جاتا ہے کہ اندریت کی تحریک محض وادایت کے رد عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئی جس کا غور پانگنی بڑا محرک نہیں تھا۔ تاریخ کی روشنی میں اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ جین الا قوامی طور پر ادراکیت کا رجحان اس وقت سے بہت پہلے ہی سے محسوس کیا جا رہا تھا جس کے بنیادی عوامل میں فرواد کی لا شعور کی بصیرت، ہیگل کے تصوراتی نظریات اور مارکس کے سیاسی افکار شامل تھے جن کا زمانہ وادایت سے پہلے کا ہے۔ خصوصاً فرواد کا پیش کردہ نظریہ لا شعور، انا، فوق انا اور اصل حقیقت کا نظریہ اس تحریک کا سب سے بڑا محرک کہا جاسکتا ہے جس کے ذریعہ انسان نے پہلی مرتبہ فوق الفطرت عناصر سے ہٹکارہ پاکر لا شعور کے ذریعے خود اپنے دھم کی حقیقت اور زندگی کے کام کا اصل محرک بننے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ کہاں تک

1. Edschmid Kasimer
2. 'Über den Expressionismus in der Literatur & die neue Dichtung
3. Richard Wagner (1813-1883)
4. Freud: 'Unbewusstes, ich, überich & Princip der Wirklichkeit

یاب نما اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے البتہ آناؤڈلڈ سے کہا جاسکتا ہے کہ اس تصور سے انسان نے ایک ایسی حقیقت مزدور پالی جو سرت ماورائے حقیقت خود اس کی اپنی آگاہی تھی

ایسی حقیقت کی تلاش بود لیر، طرے اور رین کو کی گری و مزیت میں پوشیدہ ہے اور اسی منزل تک پہنچنے کے لیے پوکو پر اسرار کے فضا کے جگہوں سے گزرتا ہے۔ کافکا کا دنیا کا ایک سبب تک کا بوس ہے۔

جرمن ادب میں نظم میں میرنگ اور نثر میں کافکا اورایت کے اولین طبردار کے جاتے ہیں۔ کافکا کی اہمیت کا سبب اس کا زمردی افاز، اس کے تخلیق کے ساقی ادا اس کا عجیب غریب احساس ہے۔ اس کا فن ثبوتیت اور سائنس کے دور میں بھی پراسرار عناصر اہمیت کو سرتا ہے۔ ماورائی فنکار جرنے کی حیثیت اس کے یہاں بھی نیت کی عام بے قاعدگیوں پائی جاتی ہیں جہاں وہ خارجیت کے روضوں سے آزاد ہو کر محض و شعور کی وحدانی گزائیوں میں غوطہ زنی کرتا ہے اور اس دنیا کے عجیب غریب اور منتشر تلازمات کی جانب مارتی و ملا تھی میں اشارے دیتا ہے۔ وجود اور حقیقت کا انکشاف اس کے فن میں کسی قدر خوف کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ "تغیر" انسانی وجود کا مجمل ہو کر ایک ہولناک حشراتی مخلوق میں تبدیل ہو جانا اسی خوف کی علامت ہے جہاں زندگی پر خارجی قوتوں کی یورشیں سے بے بس کیے دیتی ہیں۔ تمدن کی پیچیدہ ساخت اور اس کے سن مانے اصول و قواعد میں جکڑ جانے کے بعد انسان کرب محسوس کرنے لگتا ہے یہاں کافکا اپنی سچی گرفت میں ان پر اسرار طاقتوں کو بھی محسوس کرتا ہے جو غیر مرئی طور پر انسان کا گلا گھونٹ رہی ہیں۔ یہی احساس سزا کی گنجی میں شدت سے محسوس کیا جاسکتا ہے جو جرم و سزا کی ایک پراسرار لیکن اتھالی ہولناک داستان ہے۔ اسٹیفن ہینڈل نے کیا خوب کہا ہے کہ اس منزل پر کافکا آنے والے دور کا پیغمبر نظر آتا ہے کہ "بے جرم سزا کا جو میکانی انداز کافکا کے تخیل نے ۱۹۲۰ء کے گگ جنگ سس کر لیا تھا صرف میں سال کے اندر ہی اندر آؤ شوٹس اور دیگر تیس نازی قتل گاہوں میں اس کی عملی تشکیل بھی دیکھی گئی۔ اسی طرح شہر ڈائمر ۰۰ خواب ۰ اور بعد کے مقرر نثری مجموعہ (Die Erzählungen) کی ایک ایک کہانی اس کے عظیم فن کی نمائندگی کرتا ہے۔ کافکا کا احساس قاری کی تخیل کی ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتا ہے جہاں کرب ہوتے ہوئے بھی اس کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اس جگہ میں وہ جا بجا داعی کی مدد دیتا ہے لیکن اس داعی پر حقیقت کا دھوکہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی اس اجنبی احساس میں حقیقت بھی داعی معلوم دے لگتی ہیں۔ اس کی تخیلات جھڑبھڑاتے انسان کا خواب ہیں جو خواب ہونے کے باوجود بیدار حقیقتیں نظر آتی ہیں۔

کافکا کے فن پر اس کی دائم طبعی شخصیت، باپ سے اس کے ذہنی تضادم (father complex) اور "ایرانی معاشرے" میں اس کی یہودی نسلیت نے گراؤ ڈالا ہے۔ یہی تمام عناصر اس کو زندگی سے خوف دلانے کا بھی محرک ہوئے ہیں جو درجے کے بعض مخلوق میں اس پر شخصیت سے انحراف کا الزام بھی عاید کیا جاتا ہے لیکن کافکا کا فن ایک ایسی دنیا کی نمائندگی کرتا

1. Mernik
2. Franz Kafka
3. 'Die Verwandlung'
4. 'In der Straf Colonie'
5. 'Auschwitz' the concentration camp.
6. 'Der Landarzt'
7. 'Der Traum'

ہے جو شخصیت کی دار و گیر ہے۔ ایک نقاد نے اس غلیظ فنکار کی شخصیت اور اس کے فن کو "نمبر نمبر" سے تعبیر کیا ہے۔ ایسا نمبر جو اپنے اندر ناقابل تیکاس وسعت اور بے پناہ محنت کر لیے ہوئے نمبر ہو جہاں اس کی بے پایاں وسعت اور گرائیڈنگ کا راز تو اسی وقت دیکھے جاسکتے ہیں جب یہ مکمل جائے۔

لافلکا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ ۱۹۲۳ء کے اس سال کا راز جدید جرمن افسانہ کی تشکیل کا راز ہے جسے ہم خاص طور پر (Ankdot) کی ترقی یافتہ شکل سمجھیں گے۔ جیسا کہ مصنف کے ابتدائی حصے میں بیان کیا گیا ہے کہ جرمنی میں فیلے کچھ اس طرح روچا لیں چکے کہ عام طور پر (Ankdot) کی جگہ غلطی سے فیلے کا نام لے دیا جاتا ہے حالانکہ ٹیکس کے قبائے دونوں میں بڑا فرق ہے جس کی وضاحت پہلے ہی پیش کی جا چکی ہے۔

اس ضمن میں افسانہ کا نام آتے ہی اسے فہم میں لانا پیچیدہ اور پامال یا تو کے مثالی افسانوں کا خاکہ ابھر رہا ہے جس میں بقول پروفیسر دوست تار "ایک لفظی شرط ہے اعداد و حساب کی مناسبت و نمونوں کی ترتیب جس کا اثر کثرت میں افسانہ کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ بیان دیگر پہلوؤں سے لے کر گریڈ کیا جاتا ہے برعکس اس کے جس میں افسانہ میں گویا مصنف کے محتاج کسی جگہ کو کافی مان کر اس کو مکمل حیثیت سے بیان کرنے کے تجربے پائے جاتے ہیں جس سے افسانہ (Ankdot) کا لگن ہٹنے لگتا ہے۔ ایسے قطعے عام طور پر مختصر افسانے کے متبادل میں زیادہ طویل ہوتے ہیں۔ لیکن اس صورت کا ہر جرمن افسانہ پر اطلاق ضرور کیا نہیں۔ آج کے جرمن افسانے عام طور پر دو تار کی بنیاد پر ہی لکھے جاتے ہیں جو مختصر افسانہ کا میں الا قومی سیما ہے۔

جدید جرمن افسانہ کی تشکیل کا راز ہر قسم سے جرمنی کی تاریخ کا انتہائی ہی جانی راز ہے جسے پتا اور اُبتا ہوا۔ (Ankdot) نمونہ ۱ - راز بھی کا جاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب جرمنی میں ماسخی حالات انتہائی اتر چکے تھے سارے ملک میں اقتصادی بحران، سیاسی عدم استحکام اور مذہبوں کا دور و وعدہ تھا۔ قومیت کا دیوانہ وار پروپیگنڈا کیا جا رہا تھا اور ہٹلر کی پارٹی ہر ممکن طریق سے پارلیمنٹ (Reichstag) میں اکثریت حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ بالآخر یہ افوازی کا دور ختم ہوا اور جرمنی میں نسل پرست و فاشیست کاظم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس ملک کا وہ انقلابی دور شروع ہوتا ہے جس کے سنگین نتائج آج بھی جرمن دنیا بھر تک رہی ہے۔ اس انقلاب نے فنگلے کے غور کو سرے سے بدل ڈالا جس کا براہ راست اثر ادب پر بھی ہوا۔ اس دور کے بیشتر فنکار اسی ہنگام سے متعلق رہے ہیں اور ان کی زیادہ تر تخلیقات میں ہی انقلاب مرآت کیے گئے ہیں لہذا ان مصنفین اور ان کی تخلیقات کو سمجھنے کے لیے اس انقلاب کا پس منظر اور اس کے اثرات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ جرمن ادب پر اس کے اثرات واقعی نوعیت رکھتے ہیں۔

جرمنی کی تاریخ کا یہ عجیب و غریب دور ۱۹۱۸ء میں نیشنل سوشلسٹ تحریک کے کامیابی سے شروع ہوا اور مسلسل بارہ برس تک انتہائی ڈرامائی انداز میں جاری رہ کر ۱۹۳۳ء میں برلن میں ہٹلر کی خودکشی پر ختم ہو گیا لیکن اس کے بعد اس اثرات جرمن زندگی پر آج اور آئندہ بھی محسوس کیے جاتے ہیں۔ جنگ کے خاتمہ پر جرمنی کی سیاسی حیثیت یکسر بدل گئی۔ اس کو بشمول آسٹریا پارلیمنٹری جمہوریت میں بانٹ دیا گیا۔ اس وقت ملک کی اقتصادی حالت مکمل طور پر تباہ ہو چکی تھی۔ جنگ کے بعد کے تین سال تک یہی اقتصادی بحران جاری رہا جس کا خاتمہ ۱۹۳۳ء کی کرنسی اصلاحات پر ہوا اور ملک کی معیشت رفتہ رفتہ پھر اپنی اصلی حالت پر واپس آنے لگی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد امریکی، برطانوی اور فرانسیسی منطقہ طاکر دفاعی جمہوریہ جرمنی (Bundes Republik Deutschland) کی تشکیل کی گئی اور روسی علاقہ میں جولاگانہ صدر پر ڈیوکر شکس ریپبلک (Deutsche Demokratische Republik) کی حکومت قائم ہوئی ۱۹۵۵ء میں اتحادی قوتوں نے باضابطہ طور پر جرمنی سے اپنے سیاسی و فوجی دستبرداری کا اعلان کیا جس کے ساتھ ہی آسٹریا اور سوئٹزر لینڈ کو ان کی روایتی سیاسی حیرانہ باری حاصل ہو گئی۔ جرمنی کا سب سے بڑا شہر اور دار الحکومت برلن اتحادیوں اور روس کے درمیان سیاسی اکھاڑے ثابت ہوا۔ یہ شہر اطراف سے دوسری منطقہ سے گھرا ہونے کے باوجود زبردست جنگی اہمیت رکھتا تھا لہذا دونوں فریقین میں سے کوئی بھی اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوا۔ اس طرح برلن کی تقسیم عمل میں آئی۔ مشرقی برلن روسی علاقہ تسلیم کیا گیا اور مغربی برلن میں امریکی، برطانیہ اور فرانس تینوں طاقتوں کے لیے فوجی منطقے قائم ہو گئے۔ ابتدا میں برلن کی تقسیم محض خادراتاروں کے ذریعہ عمل میں آئی لیکن بعد میں سیاسی جمہوریتوں کے باعث تختہ دیوار تعمیر کر دی گئی۔ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دیوار دو علاقوں کے درمیان خط فاصل ہے یا خط تار کہ جنگ جبکہ آج بھی اس کے ہر دو طرف موجودہ سیاسی بلاکوں کا زبردست جنگی محاذ قائم ہے۔

جنگ شروع ہوتے ہی ادب میں بھی غیر مطمئنہ انداز پیدا ہو گیا۔ جذباتیت کی شدت نے ادب کی اعلیٰ کلاسیکی قدروں کو کمتر اور غیر مضید بنا دیا۔ اس بے چارے دور کا ادب کس حد تک ادبی کہا جاسکتا ہے اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے البتہ اتنا ضرور کہا جاتا ہے کہ اس میں دشمن سے اندھی نفرت کے مقابلے میں سچی حب الوطنی کے عناصر کا بھی فقدان ہے۔ ہل یونیورسٹی کے پروفیسر واٹر ہاؤس نے اس جنگی ادبی سرمایہ کی قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے ریاضی کا ایک کلیہ دریافت کیا ہے:

$$Quality of literature \propto \frac{1}{moral \text{ confusion}}$$

ان کا مطلب ہے کہ اس دور کے ادبی اوصاف اپنے اخلاقی محاسبے سے نسبت دکتے ہیں۔ یعنی اخلاقی محاسبہ جتنا سخت کیا جائے ادب کی قیمت اتنی ہی کمتر دکھائی دے گی۔ اس معیار پر ادب کے اس دور کو بدترین دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ دوسرے اس صدمہ کے انتہا پسند نہ نظریات اور خطرناک سیاسی رجحانات نے عام ادب کی ترقی اور اس کے کساد کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ جرمن ادب کی تاریخ میں نازی عہد سے زیادہ شگین اور مستفید دور آج تک نہیں گزرا۔ اس عہد میں زندگی کے دیگر شعبہ مانند ادب پر بھی کڑی پابندیاں عاید کر دی گئیں۔ ہر اس ادبی تخلیق کو "نا پسندیدہ" قرار دیا گیا جس میں خالص آریائی روح نہیں

جاتی تھی اور ان کی محنت کو قدر نہیں کیا جس کا نتیجہ اس جوہر سے خالی تھا۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اس دور کے لکھنے والوں کی بنیاد
 تھی جو میں سے اکثر یہودی تھے جبکہ یہودی ہی نہ نازی جس کا قابل مافیہ جرم تھا۔ چنانچہ تمام یہودی ادیب جو تھیں مستوجب یکہ گئے ان کے
 علاوہ تمام ادیب بھی جو غیر یہودی ہونے کے باوجود نیشنل سوشلزم پر یقینی نہ رکھتے تھے نازی عتاب کا نشانہ بن گئے۔ ان میں سے
 بیشتر کو ملک بدر کر دیا گیا اور وہ ادیب جنہوں نے جرمنی کے حدود میں رہتے ہوئے نازیت کے خلاف آواز اٹھائی زندگی کے بدترین حالات
 میں گزار دیے گئے۔ مئی ۱۹۴۵ء میں نازی حکام نے باضابطہ طور پر ایسی تمام تصانیف خدراختیار کر دیں جو ان کے نزدیک "قومی غناؤ"
 کے معنائی تھیں اور آئندہ کے لیے ایسی تصانیف کو جرم قرار دے دیا۔

نازی آمریت کے نزدیک صرف وہی ادیب پسندیدہ تھے جو "آریائی فکر" کے رہنے والے تھے یا پھر خاک و خون کے دور
 کیجئے نعرے مسکرتوں کو جنگ کے جہنم میں دھکیل سکیں تاکہ: Sieg, Heil! Sieg, Heil! (فتح ترجبا، فتح ترجبا) کے کھٹکٹا
 مردوں کی عملی تحلیل کی جاسکے۔ اس قسم کے ادیبوں کو اس دور میں بھی تصنیف کی مکمل آزادی رہی انہیں خوش نصیبوں میں کوئی چیز
 بہت "بیک اور گرم و طویل" کے نام سے پکارتے ہیں۔ البتہ بدقسمتوں کی فہرست کا شمار مشکل ہے جنہیں "خاکوش" رہنے سے بے فکر موت تک
 کی سزاؤں دی گئیں اس سلسلہ میں مشہور ناول نویس جانس برنہ کے بولٹاک موت جرت ناکہ واقعہ ہے جسے ۱۹۳۲ء میں آڈیٹر ٹرس کے نازی
 میپ میں محض سپرینٹ کے مسکے پر اٹھارہ خیال کے جرم میں مح تصانیف زندہ بچا دیا گیا۔ یہاں تمام متاثرہ ادیبوں کا ذکر نہ کر سکیں
 میں صرف ان نازی ادیب متعلقہ وہ شخصیتیں پیش نظر ہیں جن کا ذکر مضمون میں شامل ہے یہ وہ ادیب تھے جنہیں بہر حال جرمنی کے
 رد میں رہنے کا اجازت حاصل رہی لیکن ان کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

کازیمیر ارنسٹ یسنگر، بریگنر نیو، ہاؤس سم اور الائنہ یگسکر۔ خاموش رہنے کی سزا دی گئی اور ناچنگ نامی تصنیف تائید
 سے روک دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ الائنہ سے جنگ کے دوران فیکٹری میں جبریہ محنت بھی کر دائی گئی اور اس کی بڑی لڑکی کو آڈیٹر ٹرس کے کیپ
 بچھڑا گیا۔ الائنہ یسنگر کے بہت سے اعزاز و لینڈ کے جنگی کمپوں میں قتل کر دیے گئے۔ اسی طرح ڈوٹ کاگم بد شہرت کو ہٹلر کی طرف
 خلاف باخیز خیالات رکھنے کے جرم میں دو مرتبہ قید کی سزا بھگتی پڑی۔ تیسری مرتبہ اسی جرم کے ارتکاب میں اس کو موت کی سزا بھی سنائی
 گئی جو بعد میں جبراً رومی کاڈ پر بھیجے کی ضرورت میں تبدیل کر دی گئی۔

جبری ترک وطن کی سزا پانے والے ادیبوں میں سے کچھ نے پہلے قریب جوار کے یورپی ممالک مثلاً آسٹریا، سوئٹزرلینڈ، اٹلی

1. Kolbenheyer

Jost

Blank

Grimm

2. George Hermann

3. Kasimir

Ernst Junger

Bergengruen

Hausmann

Elisabeth Langgasser

4. Schreih Verbot

5. Joe Aichinger

6. Wolfgang Borchert

یافرض میں پناہ ڈھونڈیں لیکن کئی مسئلہ کے بعد یہ لوگ براہِ علم چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور ان میں تھومس من، بیرٹولٹ بریٹٹ، اسٹیفن ہرا، از نوڈس وایگ، اسٹیفن ہڈرس، فرائس ویرفل، جورج کائزر، کارل زوکر نیر اور ارنسٹ گلیسر جیسے ادیبوں کے نام شامل ہیں۔ ان ادیبوں نے جلاوطنی کے گھمبیر میں جو کچھ کھادو تاریخ میں 'پناہ گزیں ادب' (Exil Literature) کہلاتا ہے۔ پناہ گزیں ادب میں اس دور کے ہنگامی اثرات کے ساتھ ان مالک کا مقامی رنگ بھی شامل ہو گیا اس کے علاوہ ایک طویل عرصہ تک ملکی اور پناہ گزیں ادیبوں کے درمیان کوئی ادبی رابطہ ہونے کی وجہ سے اس میں ملکی ماحول سے ہم آہنگی باقی نہ رہ سکی۔ جنگ کے بعد جب ان پناہ گزیں کو جرمنی واپس آنے کا موقع ملا تو انہیں خود بھی مقامی ماحول بالکل اجنبی محسوس ہونے لگا جس کا اثر ان کی تخلیقات پر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

اس پس منظر سے اس پر ماحول فضا کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے جو جرمن ادب پر سراسیمگی، دہشت اور بے یقینی کا باعث بنی۔ جنگ کے بعد بلکہ آج بھی جرمن تخلیقات پر جنگ کا یہی دہشت ناک کاؤں مسلط نظر آتا ہے۔ موجودہ دور کے تقریباً تمام بڑے لکھنے والے اسی پُر آشوب عہد کی صحنہ باز گشت میں قدم رکھنے والے ہیں۔ کتاب (Das Dritte Reich) میں اس بار عہد کو قیسری حکومت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ وہ قرونِ وسطیٰ کے جرمنی کو، پہلی حکومت اور ہمارے جرمنی کو دوسری حکومت کہنے کے بعد نیشنل سوشلزم کی عہداری کو قیسری حکومت کہتا ہے۔ آج جرمن زبان میں جس کے لیے یہی لفظ قیسری حکومت، طنزیہ طرہ پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے مضمون کا یہ حصہ بڑی حد تک قیسری حکومت ہی سے متعلق ہے۔

یہ افانوی دور جنگ سے پیش کے عہد سے شروع ہو کر موجودہ عہد تک پھیلا ہوا ہے جس میں بے شمار ادبی شخصیتیں شامل ہیں ان تمام کا تذکرہ مضمون کو کتب بنا دینے کے مترادف ہو گا لہذا صرف ان شخصیتوں اور ان کی تخلیقات کے مختصر بیان پر اکتفا کی گئی ہے جو کسی نہ کسی اقلیت سے افانوی عہد کی ممتاز شخصیتیں ہیں اور جدید جرمنی افسانہ کی تشکیل میں ان کے تجربات کا نمایاں حصہ ہے۔ ان لوگوں کا محض افسانہ نگار ہونا چند ان مزدوری نہیں جب کہ بہت سے ادیبوں کے ساتھ یہی معاملہ درپیش ہے۔ یہ لوگ بحیثیتِ فنکار شاعر، ناول نویس یا ڈرامہ نگار ادب میں جانے جاتے ہیں لیکن ان کی افانوی تخلیقات (خواہ وہ کتنی ہی محدود کیوں نہ ہوں) جرمن افسانہ کی تاریخ میں غیر معمولی اضافہ ہیں۔

یہاں جرمنی سے مراد صرف جرمنی ہی کے اہلِ قلم نہیں بلکہ اس کا دائرہ ان تمام ملکاتِ مک مکسین ہے جہاں جرمن ادبی زبان کی حیثیت سے استعمال کی جاتی ہے ان میں وسطی اور مشرقی یورپ کے بہت سے ملکوں کے نام آتے ہیں جہاں اور زبانوں کے

1. Thomas Mann
Bertolt Brecht,
Stefan Zweig
Arnold Zweig
Stefan Andres
Franz Werfel

George Kaiser
Karl Zuckmeyer
Ernst Glaser
2. Moller van den Bruck

لاندہ اور ہندوستان کی حیثیت سے جرمن ہی مستقل ہے۔ اس سلسلہ کی سب سے بڑی مثال کاغذ ہے جس نے نیک (ezee) ہنس کے وجود تمام تصانیف جرمن میں پھیلنے کا ایک نیا انداز پیش کر دیا اور ڈکٹر جو بھی کتاب لکھتا ہے سو ستر لکھ دیا۔ ادیب تو جرمن کو اور بھلے حیثیت ہی سے استعمال کرتے ہیں کہ یہ ان کی قریباً ناہی ہے۔

جیسا کہ اب تک بیان کیا جا چکا ہے جنگ سے قبل کے جرمن ادب پر اندازیت ہی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ فیصل ازم کے یہ جہان ناس فزیک کے شیعہ الدین تو ہی احسانات کو شدید تر بنا دیا چنانچہ پیر ڈکٹر بریش کے یہاں ہی اجتماعی احساس تھا۔ خود کیساتھ ظاہر ہوا۔ ڈاکٹر جھوٹا، کے آواز میں اس نے بحیثیت ڈاکٹر نگار بڑے جرات مندانہ جرات کیسے اس کے ہاں پیمانہ کی کا احساس غالب تھا جس کی وجہ سے جرمن میں مٹی اور جا بجا طنز کے پلوں سے نفرت کا انداز تھا ہے۔ کلینڈر کی کلینڈر میں اگرچہ اس کا اسلوب بہت سادہ ہے لیکن اس سادگی میں بھی انقلابی رجحان کی جھلک ہے جس کا یہی مگری انداز آگے چل کر شمس کی مسک سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ بریش کی تخلیق، بڑھی ہوئی عزت، موجودہ جرمن افانہ کی ایک نائنہ مثال کہی جاسکتی ہے۔

جرمن جیسے سو ستر لکھ کا باشندہ ہے لیکن اس کا انداز خاص جرمن نمونہ کا ہے افانہ کے علاوہ اس کو ناول نگار اور شاعر کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ لکھنے میں ادب کا نرمل پر آرزو حاصل کرنے کے بعد اس کی شہرت میں اقوامی حلقوں تک پہنچ چکی ہے۔ جیسے کا اسلوب متعصبیت سے بھرپور چھٹنے کے ساتھ ہی بڑا پراسرار اور اجنبی محسوس ہوتا ہے اس کے یہاں وقت کا کوئی خاص یقین نہیں۔ وہ جبریت کا قائل ہے اور زندگی کے ناقابل حل مسائل کو انسان کا مقتدر جاننا ہے اپنے فنی کے بارے میں اس نے ایک جگہ خود ہی لکھا ہے، میں جانتا ہوں میں کوئی ادیب نہیں، ہم آج کے کھنے والے آرٹ کوئی کے لیے استعمال کر رہے ہیں جس کی

سم سے کوئی ہمتی نہیں۔

جیسے سیمت کے ایک قدیم مسلک سٹ ازم (Stam) کا پیرو ہے جس کی وجہ سے اس کی شخصیت میں روحانیت کا عنصر نمایاں رہتا ہے۔ اسی فرقہ کی ایک خاتون کینیزنگ آثار وں صدی میں گونٹے کے خیالات پر بھی اثر انداز ہوئی تھی۔ جیسی مبلغ کی حیثیت سے اس کو جرانی میں ہندوستان جانے کا بھی اتفاق ہوا جہاں سے اس نے قدیم ہندو دیانت اور بدھ فلسفہ کا گہرا اثر قبول کیا جسے اس کی تخلیق سدھارتا میں واضح طور پر دکھایا جاسکتا ہے اس کی بیشتر تخلیقات میں مشرق و مغرب پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں ابتدائی انسانی مجرور اس طرف کا انداز مکتبہ قزوینی ہے لیکن بعد کی نیومات میں اس کی مزید شخصیت کے تمام عناصر یکے جلتے ہیں۔ اس انداز میں وہ بہت کچھ قدیم جرمن ایشیائی راز داسر سے ہم آہنگ ہے۔

1. Aurthur Koestler
2. Berdt Bercht
3. Weimar Republik
4. Kallendergeschichten
5. Die Unwürdige Greisen

6. Hermann Heese
7. Frau Ketenberg
8. 'Siddharta'
9. 'Die weisse'
10. Wassermann

جنگ کے بسکے، سازگار فضا میں کھنے والوں میں ایسے اشترائوس، ویم شیفر، ویشرت، فرائس، ویرفل، جورج ہم، اور گوٹ فریڈلپسے کے ادیب بکے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں فطری حقیقت نگاری میں سماجی شعور بھی نمایاں ہے۔

ایک اشترائوس جنوب مغربی خطے سے تعلق رکھتا ہے۔ ادب میں اس کا سرمایہ اپنے ہمعوروں کے مقابلہ میں بہت کم ہے لیکن اس نے بدلتی ہوئی قدروں کو نئے زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اس کے مقابلہ میں شیفر کا ادبی سرمایہ بہت زیادہ ہے۔ اسلوب میں وہ ملگرچہ قدیم اساتذہ فن کلاسیک، سیکر اور سیبل کا متبع کرتا ہے لیکن اس کا طنز، انماز ان سے بالکل مختلف ہے۔ "قصے"، "گلر بند کی کمانی"، اور "ہر طور کی کامت گاہ" اس کے جدید اور ترقی یافتہ فن کی عمدہ مثالیں ہیں جن میں خارجیت نمایاں ہے۔ ویشرت کے یہاں حقائق کا تلخ اظہار ہے۔ وہ انسانیت کا ہندو اور اس کی ظلم کا خواہاں ہے چنانچہ امرزہ عنانم کے خلاف اس کا لہجہ ہمیشہ سخت رہا ہے۔ قیسری حکومت کی عداوت اس کے نزدیک وقت کے عدم توازن کی بدترین مثال ہے۔ ویشرت کا محبوب "سفید بیل" شروع سے آخر تک سیاسی شعور کا آئینہ دار ہے۔

ویرفل کے فن میں سچائی اور حقیقت نمایاں ہے۔ خفائی شاعر ہونے کی حیثیت سے نثر میں بھی اس کا لہجہ بہت شیریں اور دل آویز معلوم ہوتا ہے۔ جذبات کی صحیح صحیح ترجمانی کے علاوہ شعوری مسائل کی بھی بہتات نظر آتی ہے۔ نازیت کا دھڑ بھنے کے بعد وہ ترک وطن پر مجبور ہوا۔ چنانچہ پناہ گزری ادب میں بھی ویرفل کا بڑا حصہ ہے۔

اس عہد کے چند نامور شعرا مثلاً جورج ہم، ارنسٹ اشٹڈر اور ڈراکل وغیرہ نے بھی خال خال مختصر نثری تجربے کیے ہیں جو فنی اعتبار سے اکتاہم نہیں جتنا ان کا کلام دقیق سمجھا جاتا ہے۔ ہم اخباریت پسند شاعر ہے نثر میں بھی اس کا انداز معتدلاً خوبیاں دکھاتے ہیں مثلاً وہ کے گرائی بعض اوقات الہام تک پہنچ جاتی ہے۔ گوٹ فریڈلپس ہمعوروں میں سب اگے سے ملکہ منکویت (Nihilism) کے دور میں کسی قدر چومکادینے والی آواز ہے اس کے یہاں دہش اور آرٹ دونوں میں نظم و ضبط پایا جاتا ہے اس کی شخصیت میں کسی حد تک روحانی غصہ کا پرتو بھی ہے، ایک زمانہ تک اس نے نازیت کی طرف ذاری بھی کی لیکن اس کی تحریروں میں پُر دہشتگانی رنگ نہیں آ سکا البتہ نثر کی گرائی اور فن کی سطح کم ہو گئی۔

رابرٹ والا رکو سنز (Hans Reiser) نے پرمیجر مینی کے چوٹی کے کھنے والوں میں شمار کیا ہوتا ہے۔ ناول نویس ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے بہت سی مختصر نیز طویل کہانیاں لکھی ہیں جو اسلوب کی جدت کے ساتھ زبان میں ان کی مہارت کا نمونہ ہیں۔ زبان میں وہ ہمیشہ اپنی مخصوص جہتوں سے کام لیتا ہے جو ترجمانی کے لیے دشواریوں کا سبب بنتی ہیں۔

1. Emil Strauss
2. Wilhelm Shater
3. Wiechert
4. Franz Werfel
5. George Heym
6. Gottfried Benn

7. "Anakdoten"
8. "Halsbandgeschichte"
9. "Holdertins Eukelr"
10. "Der Weisse Buffel"
11. Ernst Stadler
12. George Trakl
13. Robert Waber

نثر شخص سوانح کے اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جو ہر دور و زمانہ کے ہر ذہنی کاغذ کے نگار کے لیے ایک تحریر ہے۔
یہ سوانح و شخصیات حقیقی سے منظر مکانی و زمانی، ایک منظر فطرت شناسی کا نام ہے۔ حقیقت سے اس نے تمام پس منظر کے دور کا
خوبی مشاہدہ کیا تھا اور وہ اس کے ہر نام سے بھی واقف تھا جسکی حالت کا نشانہ پھر اس کی حقیقت سے باہر نکلا ہی احساس نے اس کے
نہیں یہ سوانحیت کے عنصر کو نایاں کر دیا یہیں یا سوانحیت اس کی موت کا بھی باعث بنی۔ میرے نگاہوں کے بعد سوانحیت نے بازاری میں مصالیح
نو کوئی کرلی۔ موجودہ نثر نگاروں کی اس کیفیت کا تذکرہ کرتے ہوئے دیکھا جاتا ہے۔

جنگ کی ہولناکیاں، کاروں نے ایک حریفہ بری قوم پر جنگ کے میں منور ہو کر دنیا کو اپنا اندر لیں جنگ دینا اور اس کے فخریہ کاغذ
کی بجائے ہشت نگ اسب کا طرز ذہن پر چھائی جس کے سایہ میں غلامیہ، شہک، پیاسی، ہنگامہ، قتل و غارتگری، آہ و بکا، کار و فرار
سب کچھ دکھائی دینے لگا۔ دوسری جانب انسانی زندگی نے نثر کا انداز بھی بدل ڈالا اسباب بیت کے ساتھ اسب پر بھی غصہ تو جھوٹے
ٹھکی۔ اس کی تمام ان سبب اور ترقی یافتہ سمجست پڑ گئی تھی کہ یہاں تک ہے۔ اس کا انداز تو ان ادا حقیقت انفری ہے جس میں ذاتی
مشاہدات نے اتنا دلخیز پیدا کی ہے۔ جو اس نے حالات کے غلبہ کی تائید سے وہ اپنے طور پر باخبر نظر آتا ہے۔

دانش گھر میں یا مختلف شعبہ سے متعلق ہے۔ لنگا کا تذکرہ کہ فاسٹ گر کی کہ اس کا انتخاب کتاب ہے اس کے برعکس ہر کتاب
کے بیان انتخاب کی ایک سمت نظر میں آتی وہ زندگی کے دور و بہ مختلف ہو چکا ہے اور ہر شے کی ایک تفسیر کے عالم میں دیکھا ہے اس کے ساتھ
فدا آئیگی کہ جسے جس کے لیے ہر شے ہوتی ہے اس کے باوجود بھی کار کا لب ہے۔ تفسیری حکومت کے حکام نے اس کے لیے کہ کچھ شدت سے
تلاش کی ہے۔ اس میں اصل وہی بیٹل کے یہاں لگتا ہے اس کا انداز سرائی لانی ہے جس کا بیشتر حلقہ تفسیری حکومت بھی ہے
مستقل ہے۔

کائنات کا انداز کسی قدر مشکل ہے وہ اس کی حرکت فوری و درمیانی بھی زندگی کے خوش آئند پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ طنز کے
علیت عربوں سے اس نے ہر جان زندگی کو نظر ثور کیا کہ اس کا احساس دلا ہے۔ ابتدا میں وہ محض فیلے نگار کی حیثیت سے
سنا تھا تاہم ایک جیسے گفتگو کا نیز نے اس کی فخر انسان کے فوسٹ میں شامل کر دیا۔

اس اصول کی ایک منفرد آواز ملے تو پڑی پانچا ہے جس کے یہاں حالات کا بڑا واضح مربوط اور حقیقت پسندانہ تجربہ تھا ہے اس
کی حقیقت باشبہ اپنے وقت کے انسان کو پڑا یہیں بھی کہ دیکھ کر اسے دوسرے مسائل کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کی زبان پر حیرت انگیز
حاصل ہے جس سے انداز میں شرفی، محبت، فخر اور مستحلات کی خوبیاں پیدا کرتا ہے۔ ہندوئی کائنات میں ٹھیک اور اکل۔ میں گرا

1. Stefan Zweig
2. Roderich Kassinov
3. Ernst Glaeser
4. Hermann Kesten
5. Anna Segher
6. Willi Bredel
7. Karl Zuckmayer
8. Alfred Polgar

'Gestern u. Heute'
'Ich bin Zeuge'
'Nehmt auf meine...

سینہ سیاہ، امدہ چھوٹے کپڑے میں، منگھری طرفت اللہ، شفق میں کھاتے، مجھ کو مختصر شکر کے بتیوں پر مجبور ہیں۔ جوڑت ہو نہ کرنے
 زمانہ تخیلات کو اپنے دماغ کے کلاسیک سے تعبیر کیجے۔

اسٹرا کے کیتھولک حلقے سے ادیت کے خلاف دارا آواز اٹھاتی تھی، بعد میں ایک آواز میل آگس بھی ہے۔ وہ روحانی قدر
 کا طبردار ہے اور عموماً تمام کادشوں کو مذہب کے تابع کر دینا چاہتا ہے، اسی سے ملتا جلتا رنگ آرنلڈ سرائیک کا ہے جو انسانیت کی
 رتی کے لیے کچھ ہمدردی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ ————— فردی کھاتا ہے۔

ہنگوی سے آرنلڈ کو شکر کی شخصیت، غیر معمولی صلاحیتوں کی نظر ہے اس کے بیشتر تخیلات میں سیاسی عنصر غالب ہے۔ اس میں کھانا کچی
 سے لے کر جنگ عظیم کے میں اقوامی جڑوں نے کھسک کر سیاسی بصیرت دکھائی ہے۔ گزشتہ سالوں میں خود ہنگوی کے انقلاب سے اس کی
 تحریریں نمایاں طور پر متاثر ہوئی ہیں۔ ایسے ہی تجربات کا دامن شورا نے انھیں ملایا، دیر ویرنگ کے یہاں ملتا ہے البتہ اُس کے یہاں فرانسیسی
 انداز کی تقلید موجودہ جرمن روایات کے بعد نظر آتی ہے۔

ارنلڈ شکر اس دور کی اہم ترین شخصیتوں میں شامل ہے۔ اس کی شخصیت ادب کے مختلف شعبوں پر حاوی ہے۔ اس دور
 کی سیاسی و فنیاتی الجھنوں کو اس نے اپنا موضوع قرار دیا ہے۔ کہیں کہیں احوال کا مینق مشاہدہ اس کو قوت ملی بھی بنا دیتا ہے اور یکایک
 ملکیت کے صلے باز گشت ممکن دینے لگتی ہے۔ برزی کا احساس اُس کے یہاں بھی ہے لیکن فسطائی فلسفہ کے ساتھ نہیں۔ شکر کی
 تخیلات پر اداریت کا اثر بھی نمایاں ہے خصوصاً جدید اشاریت میں اس کو حیرت انگیز قدرت حاصل ہے۔

جنگ کے کچھ سال پیشتر یا اس کے دوران ادب پر سیاست جس امانت سے اثر انداز ہوئی اس کے نتیجے میں اتنا پسند گروہ نے
 ادب کو بھی سیاسی تحریک بنا دیا ان لوگوں نے اپنا مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نیشنل سوشلزم کو مختلف صورتوں کے ساتھ سونا
 پر سلا کرنے کی جدوجہد کی اور ہر اسلاف طریقہ سے قومی جذبات کو مشتعل کیا۔ کوئین بیر، جیک، گریم، سٹیل وغیرہ اس گروہ سے تعلق
 تھے۔ ان کے نظریات کا محرک خود جرمنی کا اپنا ماضی تھا جس کی تاریخ میں پسماندگی امدید چارگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں
 نے ان حضرات کو اچھے طرح محسوس کر لیا تھا جو مستقبل میں اس قوم کا مقدر بننے والے تھے چنانچہ فسطائی فلسفہ کے بہرہ جاپنے آئیٹل
 کو حاصل کرنے کی آخری کوشش کرتا، غواہ اس کا انجام ہلاکت ہی کیوں نہ ہو، ان کھڈ ہنوں پر بھی مسلط تھا۔ اس اتنا درجہ کی جذباتیت
 ادب کو غالباً پروپیگنڈا بنادیا۔ جنگ کا مجبور، کمر میں آگ، اسی رنگ کی ایک عمدہ مثال ہے۔

1. 'Anderseits'
'Begegnung im Zwi Licht.'
2. Joseph Hofmiller
3. Mell Max
4. Arnold Zweig
5. Aurther Keestler
6. Von der Viring

7. Ernst Junger
8. Kolbenbeyer
Blunck
Grimm
Zellich
9. 'Feuer im Nebel.'

زندگی کے حقائق کو غشیانہ بصیرت سے پرکھنے کا انداز گوشتے کے حمل سے جرمی ادب میں سامی ہے۔ جس کا دوسرا کے پہلی بصیرت انسانی انداز میں پائی جاتی ہے۔ وہ بظاہر تھکے کی پُرانی قدموں کا پابند ہے لیکن حقائق کو ہمیشہ نئے نادیدوں سے پیش کرتا ہے حقیقت اشاریت کے پرے میں کہنا اس کی سب سے بڑی فکر ہے جس میں ہا بکا کا واقعہ ملتا ہے۔ اس کے برعکس جرمی کو ڈیس کے بیان غشیانہ باعث کی کو اہمیت نہیں وہ روزمرہ کے مسائل ہی کو اپنا موضوع قرار دیتا ہے۔ جس فراہمات کی تخلیقات زبان و بیان کی خوبید سے مزین رہتی ہیں وہ خیالات کی ترہانی کے لیے ہمیشہ دلچسپ پیرایہ ڈھونڈتا ہے۔ جس فریڈ ہاؤس کا انداز ایک جگہ ہم نے سافر کی طرح قہری و مختلف دنیاؤں کی سیر کرتا ہے، بنیادی حیثیت سے وہ روایت پسند ہے اور قدیم المانی زندگی کو دلکش انداز سے پیش کرتا ہے۔

دیکھ لے میں کے یہاں حسن بھی مار داروں کی ترہانی ہے اسی طرح زیریں جرمی کے مقبول انسانہ نگار ارنسٹ پیٹر کے یہاں بھی نجی سائل کی بہتات دکھائی دیتی ہے۔ کارل ہنس اشتروپل نے جدید فقر انسان کی نرالی یافتہ ٹیکٹ استعمال کی ہے جس میں مشاہدے کی شدت نے ساتھ تخیل کی سطح بھی بلند ہے۔ شوٹ فریڈریش نے زندگی کے اہم مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ قدیم رومانیت کا ٹھکانہ ہے اور ان کو ذہنی نا آسودگی کا سبب بناتا ہے۔ اس کا موضوع جدید روایت ہے جس میں اس کے خیال کے مطابق تخیل حقیقت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

آسٹریا سے قنولی انداز کی ایک آواز بنا کر شواگر لی ہے جس کے اسلوب پر دو ستر فکری کا فن اثر انداز ہوا ہے۔ اس اصطلاحی مد میں ایٹار ڈیل کا تشقی آیز لہر واقعی تشقی کا موجب ہوتا ہے۔ فن کی انتہائی پختگی کے ساتھ وہ زندگی کے شدید اثر پر اور انہ شغفت کے ساتھ تسلی دیتی ہے۔ سب کچھ جو جانے کے باوجود اس کو یقین ہے کہ کھلی ہوئی رگوں میں سکون پا جائیں گی اور اس دن دنیا کے سارے دکھ درد مٹ جائیں گے۔ خود اسی کے الفاظ میں۔

”ایک دن ایسا ضرور آنے والا ہے جب ماؤں کے آنسو اتنی مقدار میں بہت جو جائیں گے کہ جگ کا غضب ناک شعلہ خود بخود بجھ جائے گا۔“

تسل کا ایک بڑا ذریعہ مذہب بھی ہے چنانچہ میرٹ کے یہاں خالص روحانی فضا ہے جس میں روایتی اور دیو مالائی حکایتیں بھی کچھ تک تصدی میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح ہینس اندریس کی تخلیقات میں خود اس کی کلیسا کی تربیت کا رنگ نمایاں ہے۔ اسپیس کی خانہ جنگی اور گزشتہ جنگ عظیم کے تجربات نے اس کے فنی کو بھی شدت سے متاثر کیا ہے۔ اس کی تخلیقات میں جوش و ولولہ کا بھی عنصر غالب ہے۔ زبان کی صحت اور تخیل کی جدت کے لحاظ سے اس کو آج کے جرمی انسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

1. Hans Carossa
2. Hermann Cladus
3. Hans Frank
4. Manfred Hausmann
5. Wilhelm Lehmann
6. Ernst Peter

7. Karl Hans Strohl
8. Bischoff Friedrich
9. Heinrich Waggrel
10. Ina Biedel
11. Gertuda von Lefort
12. Stefan Anders

سنجیدہ مزاج کے مضمون کو ارنسٹ پنزولڈ نے بڑی محنت سے بنایا ہے اس کا انداز بہت کچھ جرمن جیسے سے متاثر ہے۔ طنز کے ساتھ نقاسات اور جرح بیان کی خوبیاں بڑے بوج کے ميان ملتی ہیں وہ حقیقت پسند تحریک کا نمائندہ ہے اور عام انسانی کمزوریوں پر کڑی تنقید کرتا ہے۔ مقصدیت سے بھرپور تجربات و لطف کا نمک بولنے کیے ہیں۔ ابرشٹ گوز کی تحریر پر تلخ ستافن سے یہ نظر آتی ہیں۔ وہ قسری حکومت کی بد اعمالیوں پر سنا کانہ انداز میں تبصرہ کرتا ہے اس کے ساتھ ہی آئے وقت دور سے پُر امید بھی ہے لیکن واپس اور ہرگز نہیں نے ساری خطاؤں کا سزاوارد و مسروں ہی کو گزانا ہے۔ اس دور میں ان کی یہ نوعیت بڑی حد تک سیاسی حالات کا تقاضا بھی جاسکتی ہے۔ والٹر کے یہاں سراپائی کا احساس بھی غالب ہے لیکن نہیں کی تحریروں میں تنہا کے ساتھ مذمت بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک ہنگاموں سے زیادہ اہم ان کے اندر پوشیدہ عوامل ہیں جن کو وہ بڑی سنجیدگی سے پرکھتا ہے اس لحاظ سے اس کا اسلوب ادبوں سے کچھ مختلف ہے۔

روڈ ولف بورشارڈ کو ایک عرصہ تک فریے نویس اور مضمون نگار کی حیثیت سے ہی جانا جاتا تھا لیکن بعد کے افسانوی مجموعے اس کو صنفِ اول کے افسانہ نگاروں میں شامل کر دیا۔ زندگی کے تمام اور جانے بوجھے مسائل پر فہم اٹھاتے ہوئے وہ زبان کے اعجاز سے عجیب و غریب تاثرات پیدا کرتا ہے۔

پچھلے نصف صدی سے جرمن ادب میں جرمنی کی کثیر اور مختلف النوع تصانیف کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس نے جرمن افسانہ کو کبھی نئی ٹیکنیک سے روشناس کیا ہے اس کا منہ بنکر بہت وسیع نظر آتا ہے جس میں نفسیات و روایات کے مضامین ہمہ جہت سے قابل ذکر ہیں۔ کیتھولک عقیدہ کی پابندی سے وہ عام انسانی قدروں کو سب پر ترجیح دیتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کو نازی عمارت میں تصنیف و تالیف کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ برگنڈین کے ابتدائی مجموعہ "دیوال میں موت" کا رنگ عموماً افسانہ ہے لیکن بعد کے مجموعہ "اسخری شہسوار" اور "آخری شہسوار" اس کے فن کی بہترین مثالیں ہیں مختلف مضمونوں کی مخالفت کے باوجود اس کے آج کے صنفِ اول کے ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

جنگ کے بعد جرمن افسانہ کو نئی ٹیکنیک سے پیش کرنے میں پرانے فن کاروں کے ساتھ نئی نسل نے بھی سرگرمی سے حصہ لیا ہے جس کی وجہ سے پچھلے پندرہ برس میں جرمن افسانہ نے حیرت انگیز ترقی کی۔ اور آج وہ براہِ اعتبار سے بین الاقوامی سطح پر بلند آتا ہے۔ اس دور کو جرمن افسانے کی نشاۃ ثانیہ بھی کہا جاتا ہے۔ ویڈسن کا خیال ہے کہ صحیح معنوں میں "خالص جرمن افسانہ" کا دور بین زمانہ ہے۔ اس دور کے میٹر فنکاروں کی تخلیقات جرمن ادب کے مطابق ریڈیو کے ذریعہ سامعین تک پہنچیں اور بعد میں

1. Ernst Penzoldt
2. Britting George
3. Wolfgang Muller
4. Abrecht Goes
5. Walter Jens
6. Hermann Lenz

7. Rudolf Borchardt
8. Bergengruen
9. 'Der Tod von Reval'
10. 'Der letzte Rittmeister'
11. 'Die letzte Rittmeisterin'
12. Prof. W. Waidson

مستقل تصانیف کی صورت میں آئیں۔

گر ڈاکٹر کا نہر جگہ کے بعد کی فضائی جگہ کی یہ مشہور ہے۔ اس نے جنگ سے واپس جو زلزلے فوجوں کو زندگی پر نشانہ انداز میں قلم اٹھایا ہے جس کی تہ میں ایک ضخیم ہنگامہ پیدا نظر آتا ہے۔ انکس ہوبر کا انداز بڑی حد تک درجہ اولیٰ کا ہے۔ ان کے متباد میں روتاز میں زیادہ کامیاب ہوئے۔

جس ایرش زساک چنانچہ طور پر ڈرائنگ ہے۔ انسانی ادب میں اس کا سرمایہ جنگ کے بعد کا ہے۔ وہ آج کے مہم کو درپیش مسائل پر گہری بصیرت رکھتا ہے۔ ادبیت سے متعلق نہ سمجھنے کے باوجود اس کی باریک بینی اور خصوصیات شہادت کہیں کہیں اپنی انداز اختیار کرتی ہے۔ "کیا" "موت سے انشور" "اندھا" "بیرسل" اس کی دانشورانہ بصیرت کی عمدہ مثالیں ہیں۔

بڑے شاعر کی قریبوں کو دیکھ کر اس ہنگامہ کی یاد آ رہی ہے جب جرمنی خاک خوں اور کھنڈرات کا گہرا گہرا ہنگامہ جنگ کا خوفناک آئینہ اس کی تخلیقات پر بھی چھایا نظر آتا ہے۔ اسی ہنگامہ سے اس کو وطن سے دور کر دیا۔ جنگ کے بعد اس کو زور برگ کی حالت میں بھی پیش ہوا پڑا جہاں اس نے نازی جنگی مجرم کے مراسم کے فرائض انجام دیے۔ اس کی قریبوں میں انہی حالات کا اثر غالب ہے۔

ازجیہ بیکسہ جنگ سے قبل خدائی شاعر اور ناول نویس کی شہرت کھینچتی تھی۔ نازی حملہ کی "جبری خاموشی" کے بعد شہر سے اس نے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ اس مرتبہ اس کی قوت کا مرکز خصوصیت کے ساتھ فقر انسانی رہا۔ چنانچہ اٹھارہ کینوں کے مجموعہ "ڈوڈ" ہے اس کو انسانہ محاوروں میں بھی صوبہ اول کی فن کارہ تسلیم کر لیا گیا۔ یہ تمام کہانیاں جنگ کے دوران یا اس کے فوراً بعد کی لکھی ہوئی ہیں۔ ازجیہ کی تصانیف بڑی پرمعنا اور اشکاتی انداز کی ہوتی ہیں جن میں جا بجا خود کلامی کی تکنیک استعمال کی جاتی ہے اس کے یہاں خارجی عمل کے متباد میں نفسیاتی تحصیل پر زور ہوتا ہے وہ جرمنی کے تروستہ طبقہ کی بہترین ترجمانی کرتی ہے اس کے فن پر بھی جنگ اور بصیرتی جزیر پر نازی آمریت کے اثرات نمایاں ہیں۔

ہرٹس کانگ حقیقت کو کھینچنے سے اور امانت ہے۔ زندگی کے عملی و نظری پہلوؤں پر اس کی گرفت بہت مضبوط ہے وہ اس کی استقامت کا قائل ہے۔ نیشیل آٹنوں کے تند و تیز لہریں اس نے اس اذہمی عقیدے کے خلاف اعلانیہ بغاوت کی جو قومی شعور کو ہلکے کر رہی تھی۔ وہ تہذیب کی مہمانی ساخت سے بیزار ہے اور تباہ شہروں کے مہ پر کھڑا ہو کر خواب کی پناہ گاہیں خوش کرتا ہے اس رمزیت میں جا بجا کافکا کا اثر و نفوذ درایت کیے نظر آتا ہے۔ اس کا فن حال کی ساری ناامیدیاں اور مایوسیوں کا آئینہ دار ہونے کے باوجود ایک خوش آئند مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

1. Gerd Gaiser
2. Heinz Hober
3. Hans Erich Nossack
4. 'Nekyia'
5. 'Interview mit dem Tode'

6. Wolfgang Hildesheimer
7. Elisabeth Langgasser
8. 'Der Torso'
9. Hermann Kassaak
10. 'Der Webstuhl'

کوٹ کوڈنبرگ نے رنگ کا دامن کھنکھنے والا ہے جس نے معجزات کی ساری حد بن دیاں توڑ کر کلمات و تراجم کی فوقیت کو منوانے کی کوشش کی ہے۔ وہ زندگی کی یکسانیت اور بے کیفی سے اگنا کر تخیل و مبالغہ کی دنیا میں جا رہا ہے۔ معقولیت کے خورد خوار و مضبوطی ضابطہ پر اس نے فسوس کے عربے استعمال کیے ہیں ایک عجیب و غریب انداز میں کہیں کہیں حرف فن کے روایتی انداز کا بھی پرتو نظر آنے لگتا ہے۔ آج کے برس اس انداز نگاروں میں کوڈنبرگ صنفِ اول کا افکار شمار ہوتا ہے۔ اب تک اس کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو میں ”نیلا خواب“، ”سورج گتھی کے پھول“، ”زندگی کی ترلے“ اور ”لا بونیو“ خاص شہرت رکھتے ہیں۔

فطرت سے کیے بیان اخلاقی و مابعد الطبیعیاتی افکار کا پورا پورا احترام ہے۔ وہ فرد اور جماعت کے ہمیشہ رشتہ پر فلسفیانہ مباحث سے گریز کرتا ہے لیکن فرد کو معاشرے میں اس کے صحیح مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ معاشرے کی روتہ پر قدموں سے مکمل بغاوت نہیں کرتا لیکن اس کے کز و پہلوؤں پر طنز کے بحر پر سحر کرتا ہے۔ ”بے راہ رو“، ”جینز میں پاپ“ اور ”خود اپنا کھانا“ اپنے طنزیہ انداز، سادگی اور واقعیت کی بنا پر جدید جرمن افکاروں کے عمدہ مجموعے خیال کیے جاتے ہیں۔

فائزرش بل کو جو وہ برس اس انداز نگاروں میں چوٹی کا افکار سمجھا جاتا ہے۔ جنگ کے باقیات کا اثر اس پر بھی نمایاں ہے لیکن وہ ان مسائل پر مابعد الطبیعیاتی بصیرت رکھتا ہے۔ روزمرہ کی برس زندگی پر بھی اس کا مشاہدہ بہت عمیق ہے۔ روحانیت پر کامل اعتقاد اس کے نزدیک سب محاسب کا داما ہے۔ حقیقت کو موثر بنانے کے لیے ہل جاتا تخیل کا انداز اختیار کر لیتا ہے۔ نہ صرف کرکس کے لیے ”ابتدا فیماں کی روٹی“، ”پل پر“، ”یا“، ”چاقو پھینکنے والا“ اس ضمن میں اس کی بہترین محققہ کمائیاں کی جاسکتی ہیں۔

دولت گانگ بورشیرت کی شہرت کا سبب اس کی محرکہ آواز ڈانٹائی تخیلیتی ”دو فاندے کے باہر“ ہے لیکن بعد کے مشکل عبور نے اُس کو شاعر، افکار نگار اور پورٹرائٹ نویس کی حیثیت سے بھی منوایا۔ بورشیرت کی افشاری تخلیقات اگرچہ مروجہ پلا کی پابند نہیں ہیں لیکن ان کا دلچسپ اور موثر انداز بیان قاری کو متاثر کرتا ہے۔ اکثر مرقعوں پر وہ محض وقتی اور لمحائی تاثرات کو بھی فنکاری کے ساتھ کینز میں پر پھیلا دیتا ہے اس کی تخلیقات اپنے وقت کے ہنگاموں کی جیتی جاگتی داستانیں ہیں جن میں زندگی کی خواہش بھی تمام اس سے صاف بھی۔ ان شدائد کے خلاف بورشیرت کی آواز ایک مانمانہ لیکن شدید احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے نثر میں وہ غنیمت برس و انتشار پر واز جمنع پر شرسے متاثر ہوتا ہے لیکن ہیئت کی جدید تخیل میں اس کے تجربے، مفراوی و وقیت رکھتے ہیں جس کی مثالیں ”اسی مکمل کو“ اور ”سب گل“ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

1. 'Kunt Kuenberg'
2. 'Der blaue Traum'
3. 'Die Sonnenblumen'
4. 'Wein auf Lebenszeit'
5. 'La Botella'
6. 'Holzs Rasse'
7. 'Irtfahrer'
8. 'Schlangen in Genf'

9. 'Belohne dich Selbst'
10. 'Heinrich Brhl'
11. 'Nicht nur zur Weinachzeit'
12. 'Das biot-d. Erhen Jahre'
13. 'Über die Brücke'
14. 'Der Man mit dem Messer'
15. 'Wolfgang Borchert'
16. 'Draussen vor der Tur.'
17. 'An diesem Dienstag'

اڑے آتش بگڑی کے جلتے اناٹ میں سب سے زیادہ شہرت یافتہ فنکار ہے۔ اس کا اسلوب بروہما ناز ہے، اصل مختلف نظر آتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ روایتی افادہ کی تشکیل میں اڑے کا جبر بہت نمایاں ہے۔ اس کی تخلیقات میں وصال، جذبات و محسوسات ایک آفاق گیر انداز میں پیش ہوتے ہیں۔ اورایت میں وہ براہ راست لائق اسلوب کا متبع کرتے ہیں۔ چنانچہ اُس کے یہاں بھی حقائق، اساطیر، ظالم اور اسرار و رموز کی مجہول بھیلیں قاری کے لیے خواب کی تیشوں کا کام کرتی ہیں۔ اُن میں ہم کہنا کی دشمنی احساسات ختم ہو جاتے ہیں اور پڑھنے والا تصور امت کی دنیا کا کوئی حقیقی دنیا سمجھنے لگتا ہے۔ اڑے کا ابتدائی افادہ ہی مجبوراً بندھا انسان کے نام سے مشہور میں شائع ہوا تھا جس کا بک یورپ کی تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے حال ہی میں فیئر لاک نے اس کی نثری تخلیقات کا ایک اور مجموعہ ”مقدمہ“ کے نام سے شائع کیا ہے جس میں اورایت کی جدید ٹیکہ استعمال کی گئی ہے۔

اڑے کے بیان پر جدید جرمن افادہ کا جائزہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں ابتداء سے لے کر موجودہ عمدہ ٹیکہ کا نام اور فنکارانہ ہیں۔ ان کے لکھنے والوں کے علاوہ بھی نئی نسل کے ادب سے قلم کار ہیں جن کی تخلیقات جرمن اخبارات و رسائل میں چھپتی رہتی ہیں۔ دورِ حاضر میں یہ لوگ بھی جرمن افادہ کی ترقی میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ ان کی تخلیقات کا عمدہ آج کی جرمن زندگی ہے جو قابلِ حل مسائل سے دوچار ہے۔ اس ضمن میں جنگ کے باقیات، جرمنی پر یورپ و امریکہ کی فینار، مختلف معاشرہ کا اقتصاد، سیاست و نظریاتی کشمکش، پرلین کا بحران، ایٹمی خطرات اور سب سے بڑھ کر آنے والی جنگ کا خوف موجودہ لکھنے والوں پر اثر انداز ہے۔ ان فن کاروں میں ٹیڈ رینش، الفریڈ، ہانٹ شوارزباخ، ہینڈر ڈاؤس، ہربرٹ آرکن رائش، ویلی فریڈ، ہوگو ہارٹنگ، مائیکل ڈونہوفن، ویلی ڈرامپ، فرانس نابل، گیمارٹ پرل، ٹوزے رفسر، ارنسٹ شابل، اور ڈاؤس شوافر جیسے قلم کار شامل ہیں۔

۱۹۹۷ء میں گوتے نے ادب کی عالمی قدروں کے بارے میں لکھا۔

ادب کی دنیا ایک دم دکھتی ہے جیسے کبھی ختم نہیں کیا جاسکتا۔ آرٹ کی اس دنیا سے اس جیسی اور دوسری نئی دنیا میں پیدا ہوتی رہیں گی۔ اس دنیا میں ادب کی زندگی سانس لیتی ہے جو ہمیشہ سے بڑھی، جوان اور

1. Ilse Aichinger
 2. Der Gefesselte
 3. Zu keiner Stunde
 4. Andreasch Alfred
 5. Beheim Schwarzbach
- Bender Haus
Herbert Euentreich
Willi Fehre

Hugo Hartung
Memrad Inglin
Willi Kramp
Franz Nahl
Gebart Fohl
Lause Rinser
Ernst Schnabl
Hous Schumacher

پڑ رہا ہے۔ مرنے والے حادثے اس کی اس اذلی حیثیت کو نہیں بدلا سکیں گے اور اس دنیا میں بسنے والے فن کی سادگی سے یوں بے فیضیاب ہوتے رہیں گے جی کا کام آدمی اس میں بھی نہیں کر سکتا۔
 مون چار سال گزشتے تھے کہ صحت کے تیز ترنے کا رو لینے ٹیگیل کے دل میں خدشات پیدا کر دیے۔ ۱۸۸۰ء میں اس نے انے والے خطرات سے متاثر ہو کر کیم ٹیگیل کے نام ایک خط میں لکھا۔

”میرے دوست، مسلسل دوہرائے جا۔ یہ زندگی کس قدر فخر ہے لیکن پھر بھی کتنی محنت! بالکل آرٹ کی دنیا کا مانند۔ نقاد گھتے رہیں گے، تلافی نہیں رہی تھکتے رہیں گے، نظام بدل جائیں گے اور جب یہ دنیا کا فخر کے ایک تیر پڑے گا تو جی کی زیادہ کم آرٹ کا یہ سارا مال و متاع اس بھیا تک شہ کے آخری پیک ثابت ہوگا، اور پھر اندیرا چھا جائے گا۔“

نہیں کہا جاسکتا آج کہ جرمس دنیا کیا محسوس کر رہی ہے؟ آیا وہ گڑھے کی اس یقین دہانی سے مطمئن ہے یا ٹیگیل کے خطرات

۸، برس کے بعد
ادارہ نقوش

مکاتیب نمبر

کی صورت میں

خطوط کا دوسرا غیر مطبوعہ اور نالیاب سرمایہ

اردو ادب

کے حوالے کرنے کا اہتمام کر رہا ہے

—

اگر آپ بھی اس سلسلے میں ہماری کچھ مدد کر سکتے ہوں
تو اس سے اولین نہ فرمائیں تاکہ ادب کا مکاتیب باب
ابدیت کی حدوں کو چھوے

مجلس ترقی اردو لاہور

کے

کلاسیک اور تحقیقی مطبوعات

(تفصیل فرست منت طلب فرمائیے)

۳/۰۰	ہبار دانش	از مرزا جانی پیش	۱۰/۰۰	کتوبات سرسید	سرسید احمد خاں
۴/۰۰	بیٹا پیسی	از منظر علی خاں دلا	۴/۰۰	موضع حسنہ	از ڈپٹی نذیر احمد
۴/۵۰	ہبارستان ناز	از عظیم جمیل الدین رنج	۲/۵۰	سوانح سوانا دوم	از شبلی نعمانی
۵/۵۰	حک العزیز خطا	از عبد العظیم شرر	۶/۰۰	تقصص ہند	از مولانا محمد حسین آزاد
۲/۴۵	واسطت امانت		۸/۰۰	آتش مصل	از شیر علی افسوس
۶۳/۰۰	مقالات سرسید احمد خاں	پرودہ جلدی	۹/۰۰	یادگار طاقت	از خواجہ اعجاز حسین حالی
۳/۵۰	قوت الکاہنی	از حیدر بخش حیدری	۵/۰۰	امداد جہان آوا	از مرزا سواکھنوی
۲/۲۵	سکنتلا	از لاکھ علی جوان	۴/۵۰	فساد و جہل	از ڈپٹی نذیر احمد دہلوی
۸/۰۰	مراۓ نہیں دتیر	از شبلی نعمانی	۲/۰۰	زردی بریں	از عبد العظیم شرر
۴/۰۰	نشر	از سجاد حسین انجم	۲/۵۰	مربع میں جنونی	از مرزا سواکھنوی
۵/۰۰	باغ اردو	از میر شیر علی افسوس	۶/۰۰	نورین	از محمد بخش جوڑ
۱۴/۰۰	کلیات بوجن	(ادو جلدی)	۵/۰۰	سروش سنی	از سمن دہلوی
۴/۴۵	توبہ المنصور	از ڈپٹی نذیر احمد	۴/۵۰	خود افروز	از فتح حسین الدین احمد
۸/۰۰	ذوق - سوانح اور انتقاد	از ڈاکٹر تنویر احمد طوی	۱/۵۰	جوسر اخلاق	از مجیر کادکر
۵/۵۰	مومن - حالات زندگی	از قاضی رام پوری	۳/۰۰	جاس احکامات ہندی	
۶/۵۰	ڈراما نگاری کا فن	از ڈاکٹر محمد اسلم قریشی	۳/۰۰	خلاق ہندی	از میر ہادی علی حسینی
۶/۰۰	مرزا محمد ہادی مرزا دوسرا	از ڈاکٹر سمیع بیگم انصاری	۴/۵۰	گل مغرت	از حیدر بخش حیدری
۹/۰۰	اصول انتقاد ادبیات	از سید عابد علی عابد	۹/۰۰	مجاہد تقصص	از شاہ عالم ثانی
۱۳/۰۰	مباحث	از ڈاکٹر سید محمد عمر	۴/۵۰	مناسب داغ	از داغ دہلوی
ذیر طبع	میرا سے عبدالحق تک	از ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ	۳/۵۰	دیوان درد	از خواجہ میر درد
ذیر طبع	مقالات حافظ محمد شیرانی		۲/۵۰	رسانہ گل کرست	(قائد زبان اردو) از گل کرست

مولے ایجنٹ

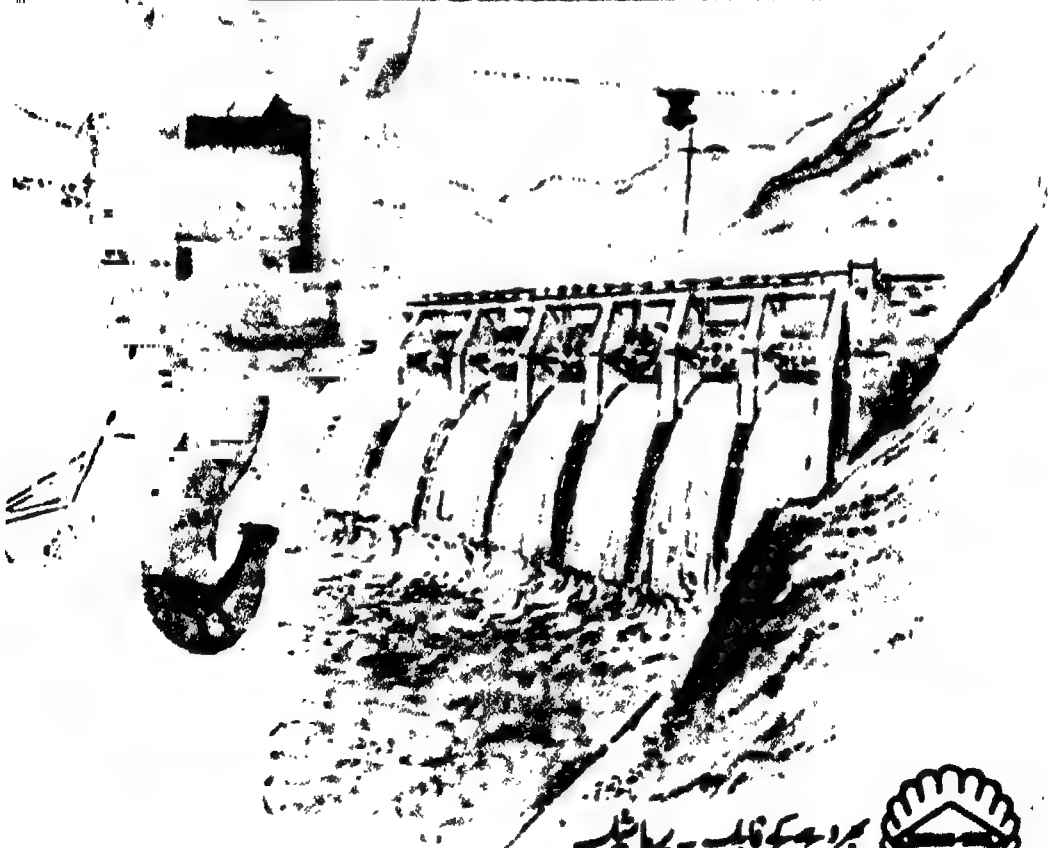
مکتبہ ادب جدید

۱۵ پیسہ گراؤنڈ - میکوڈ روڈ - لاہور

ترقی میں دوش بدوش



قیل کیا ہے! روضہ بدوش کمال۔ روضہ بدوش کمال ترقی دوش بدوش کا منہ نہیں
 لانا کہ عظیم قوت میں جھلک کر نے اور زعفران تک روضہ بدوش پہنچانے کے لئے
 بند تھیمہ کے ہاتھ نہیں۔ ہر ملک ہندوستان کی بہت ترقی کا مظہر ہے اور
 دھرم میں لانے کے لئے ہر مائیل کے قیل سے چلے والی ہیسوں مائیل رات
 دن مصروف رہی۔ اصحاب وادارہ کے ہر مائیل ہند کی تھیمہ شروع ہو گئی ہے
 اس عظیم ہند کی تھیمہ کے لئے بھی ہر مائیل ہی قیل لے جا رہی ہے
 ہر مائیل کو محبت اور ہر تھیمہ کے ہر ترقی دوش بدوش کے ان عظیم
 منصوبوں میں پاکستانی عوام کے دوش بدوش شمس ہے۔



مردم کے قابل۔ ہر مائیل



ریب اور دیدہ زیب پارچہ جات

خوش رنگ
اور
خوش وضع



ٹیکسٹائل میلز لمیٹڈ

اسٹریٹ آف آباد (مستان)

کالونی سیمینٹ ٹراپ

۳۴، بی ایڈورڈ روڈ صدر الہندہ

۳۸، دی مال - لاہور۔

اکڈمی لائبریری سیریز

۱/۵۰ مالی اور نیا تنقیدی شعور، معتقد احمد انصاری

تیسرا سیٹ

- ۱/۵۰ دیوان خواجہ میر درد، مرتبہ عبدالباری آسی
۱/۴۵ مقدمہ شعروشاعری، معتقد الطاف حسین حالی
نیرنگ خیال (مطالعہ)، محمد حسین آزاد
۱/۴۵ تیسرا سیٹ، مرتبہ محمد رفیع بیگ
یادگار غالب (سوانح و شرح)، مولانا حالی
۲/۴۵ (جلد اول)، مقدمہ سید ابوالحسن کاشانی
یادگار غالب (جلد دوم)، مولانا حالی (ذاتی نظم و شکرہ غالب)
۲/۲۵ زلوراء (انسانے)، غنشی پریم چند
۲/۴۰ موازنہ انیس و دو تیر، علامہ شبلی نعمانی (تنقیدی لکچر) - ۳/-
ایک نگار ایک محبوبہ، ترجمہ محمد عامر
۱/۲۵ (دیوین اور اس کی محبوبہ کے خطوط)
۲/- چھوٹی موٹی (افسانے)، عصمت چغتائی
۲/- قصص ہند (تاریخ)، محمد حسین آزاد
۲/- عہود ہندی (انشاء)، مرزا غالب
۸/۵۰ کلیات انکس، مرتبہ محمد سید وقت اور عظیم
چوتھا - چار حصوں کا سیٹ
۱/۵۰ ارکی انکس، پرو فیور اور ڈ آر پی مین
۱/۵۰ (ایک سیاسی جائزہ)، ترجمہ ڈاکٹر محمد عبدالقدیر وغیرہ
۵/- مختصر تاریخ ادب اُردو، ڈاکٹر انجم حسین
۱/۵۰ ترکی و درویش، آغا حشر کاشمیری
۲/۲۵ مددس مالی (صدی ایڈیشن)، مولانا حالی
۱/۶۰ ٹنوی سحرابیانی، میر حسن دہلوی
شرعی بیوی (ناول)، حکیم بیگ چغتائی
کولتار (ناول)، حکیم بیگ چغتائی
اقتصادی ترقی کے جبر و ڈی کالڈر وڈ
۲/۵۰ تجرہ بانی ساپنے، ترجمہ پرو فیور صوفی گلزار احمد

پنسل سیٹ

- ۱/۲۵ شہزادی گلزار نسیم، ویسٹنگ ہاؤس، سندھ سید وقت اور عظیم
۲/۵۰ فساد مستطاب (ناول)، ڈی بی نذیر احمد مع فرہنگ
۱/۲۵ انقلاب مشائیں مرید، مع سوانح مختصر و نکات فرہنگ
۰/۴۵ انقلاب و نکات جدید، مع تذکرہ و تنقید بابائے اُردو
۱/۲۵ انقلاب و نکات شہزادی، مع تذکرہ و تصویف علامہ رفیع خاں
۲/- دلی کا ایک یادگار مشاعرہ، فرحت اللہ بیگ
نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی
۱/۲۵ کہانی زبان، فرحت اللہ بیگ
۲/۵۰ آزادی و تہذیب، مترجمہ ڈاکٹر عبادت بریلوی
۱/۲۵ اورنگ زیب عالمگیر ایک نظم، علامہ فضل
۲/۲۵ الطور کبیر، حضرت شاہ ولی اللہ
۱/۲۵ احمق الدین، غنشی سہاد حسین ایڈیشن اور عظیم
۱/۲۵ خطبات اقبال، مرتبہ رفیع فرحت ہافو
دوسرا سیٹ
۲/- شاہد حسن (ناول)، کاظمی سرشار حسین
توبہ انصاری (ناول)، ڈی بی نذیر احمد
۲/- تبصرہ مولانا عبداللہ عبداللہ آبادی
۱/۲۵ ضدی (ناول)، معتقد عصمت چغتائی
۱/۴۰ چرمیں (افسانے)، معتقد عصمت چغتائی
۲/- بارش و ببار، معتقد میرامن دہلوی
۲/- مقدمہ و تذکرہ سید ابوالحسن کاشانی
۱/۵۰ شریعت زادہ (ناول)، مرزا محمد ہادی و ڈاکٹر محمد سعید لائی
۱/۲۵ مریم بھلائی (ناول)، معتقد سید باقر بیگ ترجمہ ڈی محمد آبادی
۱/۲۵ دیوان غالب (مطابق طابع ایڈیشن)
۱/۲۵ امرا و جان ادا (ناول)، مرزا محمد ہادی رستوا
۳/- تنقید و تبصرہ ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی
۲/۵۰ اختیاری بیگم (ناول)، مرزا محمد ہادی رستوا
۲/۵۰ بوڑھا اور مسند (ناول)، معتقد انیسٹ بیگم
۲/- (ذیل انعام یافتہ)، ترجمہ تعارف ابن سلیم

اردو اکڈمی سندھ

بہادر شاہ مارکیٹ، کراچی

اردو مرکز
گفت روڈ، لاہور

برقِ جہندہ

جوشِ ملیح آبادی

چرخِ ہمک شورِ لہنِ ترائی ہے
شوخ، بے باک، چلبلی، مضطر
انکھڑیوں میں غزلِ سدا کا جل
انکھڑیوں میں نہیں یہ عیند کا بھاؤ
یوں جوانی کی زد پہ بالک پین
کم سنی و شباب کا سنگم
موجِ ٹلنے، بدن کو ڈھال ہے
شونیوں سے ہیں خال و خدر روشن
”جو گیا“ کی ٹھک تکلم میں
چال میں گھومتا ہے یوں کو لا
روئے تاباں پہ دو لے ایسے
یوں اُبلتا ہے جسم سے کندن
زیر پوشاک شعلہٴ دل جو
زلف کی چھاؤں میں طرب گاڑیں

ہائے کیا مددِ صبری جوانی ہے
نقد میں طوفاں، انیتوں میں بھنور
گرمیِ تن سے کھولتی بمیکل،
جوئے صبا میں چل رہی ہے ناؤ
جوں ہوا میں حسدِ یر کا دامن
رُخ پر اک جھٹپٹے کا ہے عالم
سایہٴ شاخِ گل نے پالا ہے
موتیوں پر دمک رہی ہے کرن
بھیرویں کی رکھب تبسم میں
جیسے جھولے دھنا سری جھولا
قصرِ مر مر پہ چاندنی جیت
موجِ زہر ہے تمام پیراہن
جیسے پتوں میں پر فشاں جگنو
تارِ زہر کی بنی ہوئی بانہیں

الاماں! تابِ رخ میں لاکھوں طور

وَقْنَا رَبَّنَا هَذَا ابْنُ النُّورِ

الہم

جوش ملیح آبادی

الہم، چنل، شوخ، ودانی
بات ہلال، لہجہ کستانی
اپنے سے خود معینہ پاتانی
لٹ میں لڑاں پیت کہانی
جیسے کھلتی بال کمانی
آگاہ، چیت چور جوانی
اد ہو ہو، کھنکھور جوانی

گاہ سراپ و گاہے جیوں
گاہے لیسلی، گاہے جنوں
دن کو آگاہ "شب کو" اوں ہوں
وقت ایسا، رشک قاروں
وقت پیاں، مہتم ثانی
آگاہ، چیت چور جوانی
اد ہو ہو، کھنکھور جوانی

تن میں محبت ارم جہم ساون
 من میں چستی پروا سن سن
 پھٹکتا پھٹکتا، پھٹتا جو بن
 گاہے پھٹیں، گاہے ان بن
 پل میں شوم، اور پل میں دانی
 آلا، چت چور جوانی
 او ہو ہو، گھٹ گھور جوانی

دور رہو تو یار خنداں
 پاس جو آؤ تیغ عسریاں
 خلوت کھرد جلوت ایساں
 پاؤں پڑو تو شاداں مسدعاں
 ہاتھ بڑھے تو آنا کانی
 آلا، چت چور جوانی
 او ہو ہو، گھٹ گھور جوانی

دیکھا مجھ کو ندیا نارے
 پتو ڈھلکا، مچلے دھارے
 پلکیں جھپکیں، ٹوٹے تارے
 آنکھ جھکالی، ڈرکے مارے
 بھولی ساری آنی بانی
 آلا، چت چور جوانی
 او ہو ہو، گھٹ گھور جوانی

ایک لٹک میں سو جگورے
 نیناں جیسے پھول کٹورے
 کتے ہیں یہ پاپی ڈورے
 جمال نہ چھوٹا سیاں مورے

نہیں تو ہوں گی اور دوانی
 آہا اچت چور جوانی
 اد ہو ہو، گھنگھور جوانی

بائیں مپا، دہنے سیلا
 جوتی لونڈی، گیسند اچیل
 رنگوں کا وہ مکھ پر سیلا
 سندر بن میں جیسے سیلا

سیلا، جیسے بھور سہانی
 آہا، اچت چور جوانی
 اد ہو ہو، گھنگھور جوانی

اہلی گھس، افسر، اچیل
 بھشتی پھلیں، چھتا کا جیل
 گھور بھنور کی تن میں جیل
 گھٹ میں آندھی، لٹ میں بادل

مکے بر میں رات کی رانی
 آہا، اچت چور جوانی
 اد ہو ہو، گھنگھور جوانی

تال کے بریں، بھل جھل زبور
سے میں، ترچھی موج کوڑ
سر کے سر پر آڑا بھومر
پہی ہے دھنک کا دہن کے اوپر

بول گلابی، تائیں دھانی
آلا، چیت چور جوانی
اد ہو ہو، گھنٹ گھور جوانی

آبی آنچس، سرخ شلوکا
نیتل بکرس، مکھڑا لوکا
رنگ سنو، انگ بھوکا
بال کھلے تو جھل کوکا

بات جو کی تو برسا پانی
آلا، چیت چور جوانی
اد ہو ہو، گھنٹ گھور جوانی



فراق گورکھ پوری

فرزانگی بڑھی تو سرا سر خوشی گھٹی
 میری خطاؤں پر بھی نہیں لطف میں کمی
 حق تیری چشم ناز میں یا میرے دل میں حق
 اس بزم ناز میں جو سنی حق نہ ان شنی
 ۔۔۔ اور حسن وہ میری زباں پر رُک رُک
 شاعری کہ رہی ہے یہ ہونٹوں کی بکھری
 غم جو ہے وہ ضبطِ تبسم نہ ہو کہیں
 اکروہ کی حسن کے حد تک کہ ہونٹ پر
 اسے طالب بقائے محبت یہ جان لے
 یہ تو نہیں کہ عشق پہ دائم ہے عتاب
 ساقی ترے اشار دیا ارغواںِ نیشا
 یہ سحر کا۔ یاں تری آنکھوں کو دھند ہیں
 بیاباں بھی مستِ نظر انہیوں کی ہیں
 ہم دیکھتے ہی رہ گئے اندازِ چشم ناز
 میری فساد کی نو مشائے تو میں کہوں
 بحرِ شاعری کو پھوڑ کے حق کی صومِ دھام
 میں نے سکویا جن کو دیکھا جو غور سے
 اسے روشنی طبع تو برہن بلا شہی
 یعنی تمہاری اب وہ محبت نہیں رہی
 وہ نئے کہ جامِ جی میں رہی اور چمک گئی
 عشقِ زباں دراز نے وہ ان کہی کہی
 ہونٹوں پہ تیرے موی تبسم حق حق
 سو خوش بیانیوں کا جواب ایک خامشی
 ہونٹوں کی اوٹ میں وہ کرن سی دہلی دہلی
 اک مسکراہٹ اور یہ آنکھیں جبری بھری
 ہر چیز آتی جانی ہے ہر شے ہے رفتنی
 تو مہربانِ شہ در ہو لیکن کبھی کبھی
 لیکن ہو بھی کچھ رگ پیمانہ دے گئی
 موی کے بھونے ہیں نہ جادوئے سامری
 ۔ اٹھیے میں اب کہ لذتِ خواب سحر گئی
 ۔ دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
 یوں تو تری نگاہ ہے پینٹ امِ زندگی
 دنیا کو یاد آئے سکے ان کے نام بھی
 وہ درد تھا کہ روحِ محبت تڑپ گئی

آتی حق شاعری سے گلے ملنے روحِ مصر
 کہ کرتے فراق کو سوپا گز گئی



سید عابد علی عابد

بے سبب آپ کا وہ برسرِ احساں ہونا	ناگماں عقدہ و شوار کا آساں ہونا
دوستوں دولت کو نین کہاں ملتی ہے؟	در بدر خاک بسرِ چاک گریباں ہونا
دلہجی میں تری جانب سے کمی کوئی نہ ملتی	میری قسمت میں ہے در ماندہ و حیراں ہونا
قفسِ باغ میں وہ شورِ شیش آہنگِ طیور	وہ مرا فصلِ بہاراں میں غزلِ خواں ہونا
ناصر! تجھ کو بہاؤ دشمنی اہلِ نیاز	زیب دیتا تھا درِ ناز کا درباں ہونا
ہمدرد! وقت یہ کہتا ہے کہ اب لازم ہے	روبروِ قتل گہ کو چہ جاناں ہونا
اے حیا! انجمنِ ناز میں مینا کوئی آؤ	لبِ لعلیں کی جگہ چشمِ سخن داں ہونا
غمِ دنیا مجھے رکھتا ہے پریشاں خاطر	کاش دیکھوں ترے گیسو کا پریشاں ہونا
مرے جانے کی تمنا میں جسے جاتے ہیں	چارہ گراؤ دیوید اور دکا درماں ہونا

کیا ناشابہ کہ شہروں کو جلا دے عابد

آتشِ لالہ کا صحرا میں منہ دناں ہونا

صدائے بے صدا

احمد ندیم قاسمی

انہارِ مہسا کی اجازت کا شکریہ
لیکن مری زبان تو واپس دلائیے
الفاظ سے صدا کی صفت کس نے چھین لی
اس رہزنی کا کھوج تو پہلے لگائیے

جب مل گیا مجھے مری آواز کا سراغ
جہاں رہیں گے کنج لحد میں بھی میرے لب
یوں بولنے کو بول تو دوں آج بھی، مگر
تاروں کے توٹنے سے نہ ٹوٹا سکوتِ شب



احمد ندیم قاسمی

آج کی شب تم نہ آپائے، مگر اچھا ہوا
 چاندنی روٹی ہوئی ہے، چاند ہے ٹوٹا ہوا
 شام کا جادو تھا یا شدت تمہاری یاد کی
 وقت کیا، مجھ کو تو دریا بھی لگا ٹھہرا ہوا
 جان و تن جلتے ہیں لیکن ایک کیفیت کے ساتھ
 حسن اک شعلہ تو ہوتا ہے، مگر گھسلا ہوا
 ہجر کا احساس تنہائی ہے بے قید و معام
 مجھ کو تو صبحِ مہین بھی دامنِ صحر ہوا
 جذبہ تخلیق نے ماتم کی ملت ہی نہ دی
 ہر نئے منظر سے اک منظر نیا پیدا ہوا
 وقت کی اپنی طبیعت، عشق کا اپنا مزاج
 زندگی پر چھا گیا ہے ایک پل گزرا ہوا
 آدمی اک تھا، مگر اس کے ہزاروں روپ تھے
 وہ کبھی بندہ، کبھی آفت، کبھی مولا ہوا
 کیا سوائے موت، کچھ بھی قدرت میں نہیں؟
 یہ تماشا تو ہے صدیوں سے مرادیکھا ہوا

دشمن

قتیل شفائی

میں اور وہ جب ملتے ہیں تنہائی میں
بند کواڑوں پر لہرانے والے کچے پردوں کے سوا
کوئی اور نہیں ہوتا

میرے ہاتھوں کے پیچھے
اور اس کے دل کی دھڑکن میں
کدام سا چھنے لگتا ہے
میں سوچتا ہوں
سب کچھ کہہ دوں
وہ جانتی ہے
سب کچھ سن لے
برابر ہو

کچھ کہنے سننے سے پہلے
اُن انہماک سا شخص کوئی
معلوم نہیں کس رستے سے
ان بند کواڑوں کے اندر آ جاتا ہے
تب میرے ہونٹوں کے پیچھے
اور اس کے دل کی دھڑکن میں
کدام چھاتی باتوں کا

اک دفن سا بن جاتا ہے
تھراتے لب سل جاتے ہیں
کافی دھڑکن تک جاتی ہے
اس بارنگ

جی چاہتا ہے
اک سازش کر لیں ہم دونوں
جب بند کواڑوں کے اندر
مجبور پرانی عادت سے
وہ شخص اگر پھر آجائے
اس شخص کی روشن آنکھوں کو
ہم دانیس کرد سلاخوں سے
اس شخص کے سنتے کانوں میں

بمچکا ہوا ایسہ بھریں
پھر لکھ لے بند کواڑوں کو
اور فوج کے برتھل پردوں کو
میں بے کھٹکے
سب کچھ کہہ دوں
وہ بن سنے
سب کچھ سن لے



قتیل شفاٹ

نیند کے گہرے سمنہ میں جہاں غرقاب تھا ایک میں ساحل پہ تھا سو ماہی بے آب تھا
 کیا بتاؤں دوستو! ان کے خیال آنے کا حال جھللاتی جھیل میں لرزاں کوئی مہتاب تھا
 بہہ گئے آنکھوں سے جب آنسو تو یا د آیا مجھے اک جہان آرزو آباد، زیر آب تھا
 اب بھی ہے میرے گریبان میں کئی باتوں کی کون کتنا ہے خلوص دوستانِ نایاب تھا
 دور مجھ سے جو کہیں کچھ اس لیے بھی منزلیں بمسفر میرا غلام، ریشم و کنجواب تھا
 برہر محفل سبھی کو مل گیا اعزازِ جام ایک دیوانہ ترا بیگانہ آداب تھا
 دل منور ہو گیا اک جلوہ نورِ شید سے ورنہ میں اب تک فلانے کو کب شب تاب تھا
 سوپنا رہتا ہوں آنکھیں بند کر کے رات دن میں نے دیکھا جو کھلی آنکھوں کو کیا خواب تھا

میر کی شتی کے لیے آغوشِ پیلائے قتل

یا نہ کی ذاتِ حق یا حلقہ گردِ آب تھا

ایکٹرس کا کنٹریکٹ

مجید امجد

مرا وجود، میری زندگی کا بھیہ ہے، دیکھ
یہ ایک ہونٹ کے شعلے پہ بڑبڑل سے فحاش
یہ ایک جسم کے کسند ان ہیں کہ گدی سے گداز
یہ ایک روح بھنے بازوؤں میں کھیلتی لہر

ذرا قریب تو آ، دیکھ تیرے سامنے ہیں
یہ سرخ ریں بھرے لب جن کی اک جھلک کیلئے
بھی قبیلوں کے ان جوشنوں میں دھڑکے جتے
جو تو کہے تو یہی ہونٹ سرخ ریں بھرے ہونٹ
ترے لمبے شکوئے بھلا بھی سکتے ہیں

قریب آ یہ بدن، میری زندگی کا تلام
تری نگاہ کی چٹکاریوں کا پیاسا ہے
جو تو کہے تو یہی نرم، اسدیا، آپکل
یہی نقاب، یہی چٹکیوں میں اٹکی ہوئی
یہی اداس، میری انگلیوں سے سکھی ہوئی
یہ آبشارِ دھندلوں سے گر بھی سکتی ہے
بس ایک شرط! یہ گوہرِ ستودہ و ستاویز
ذرا کوئی یہ ذیقہ رقم کرے تو سہی
اکائیوں کے ادھر جتنے دائرے ہوں گے
ادھر بھی اُتے ہی عکس ان پر نہ شعلوں کے



میکش اکبر آبادی

جنگ میں بھی اک صلح کا پہلو صلح میں بھی اک جنگ کی آن
ان گھاتوں کے نام ہیں کیا کیا ان باتوں کو کیا کہتے ہیں

بات ہرانی جیسے باؤں، آنکو جھپکتی جیسے بحسب
جسم ملتا جیسے گلشن پال پستی جیسے لہریں

جسم پہ یوں پوشاک بھی ہے جیسے شبنم پھولوں پر
رنگ سنہری گل گالوں پر جیسے ماتک کندن میں

اُس کی زلفیں جیسے ناگن بل کھانے بجلی لہرائے
اور نہ جانے کیسی ہیں وہ چھوکر کس نے دیکھی ہیں

اُس کی آنکھیں؟ اُس کی آنکھیں! کیسی ہیں کیا تبادلاً
خیر نیچے مجھ کو سوچنے دیجئے اُس کی آنکھیں! اُس کی آنکھیں



شاد عارفی

قدم نہیں کے بھاؤ کہ روشنی کم ہے اگر یہ بھول نہ جاؤ کہ روشنی کم ہے
 کھردن کو آگ لگاؤ کہ روشنی کم ہے یہیں سے بات بناؤ کہ روشنی کم ہے
 جواب یہ کہ کوئی رہنمائے قوم میں آپ اگر کسی کو بہتاؤ کہ روشنی کم ہے
 سحر کو شام بھننا جو بس کی بات نہیں یہی سوال اٹھاؤ کہ روشنی کم ہے
 شریکِ بزمِ سیاست میں کچھ بٹے چرسے ذرا قریب تو آؤ کہ روشنی کم ہے
 صدائے گاؤ کہ آنکھیں عجیب نعمت ہیں انھیں یقین دلاؤ کہ روشنی کم ہے
 جھپٹ پڑیں نہ کہیں دن میں مٹھلیں لے کر سو ہم کو نہ ٹھکناؤ کہ روشنی کم ہے
 روا نہیں کہ کسی ڈوبتے ستارے کو چراغِ راہ بنناؤ کہ روشنی کم ہے
 ذرا پہنچ کے تو دیکھو سوا در منزل تک تم اس خبر پہ نہ جاؤ کہ روشنی کم ہے

یہ شاعرانِ خط ہیں "کیس گئے اک دن شاد"

ہیں چراغِ دکھاؤ کہ روشنی کم ہے



صوفی تبسم

جن پہ ہیں تیری نظر کے سائے
 اُن بہاروں پہ خزاں کیوں آئے
 دُور ہیں اہل و مل کے مسکن
 دل کی آواز کہاں تک جانے
 تیری یادوں کی کراہی دیواریں
 کون اس شہر سے باہر جانے
 آج ہر بات سے جی گھبرا یا
 آج ہر بات پہ وہ یاد آئے
 کل تھی جس بات سے دل کو تسکین
 آج اس بات سے جی گھبرا ائے
 دل غمگیں میں ایسہوں کا ہجوم
 ڈوبتی شام نے بے سائے
 کھو کے دنیا کو تجھے پایا ہے
 تجھ کو کھو دے تو کوئی کیا پائے
 ایسے تیور نہ بدلتا اسے دوست
 دیکھ کر تجھ کو نظم پہنچانے
 کوئی شیریں ہے ترے حلقہ کی کسک
 وہ پہ آئے تو تبسم بن جائے



احسان دانش

مٹی کس کو خبر اوج پہ قسمت نہ رہے گی راتوں کو خوشی دن کو مسرت نہ رہے گی
 یہ علم کہاں تمام سے پند ابر جنوں کو آنکھیں بھی اٹھانے کی جسارت نہ رہے گی
 پابند وفا عشق بھی ملت ہے مشکل اس دین میں یہ شرط جلاوت نہ رہے گی
 شکوہ تو محبت کے بھر دے پہ کیا صحت یہ کس کو خبر مٹی کو محبت نہ رہے گی
 تقدیر مٹی یہ عرض تمنا کا نتیجہ معروض تمنا کی اجازت نہ رہے گی
 بار غمِ دنیا تو میسر ہی کسے ہے بار غمِ ہستی کی بھی ہمت نہ رہے گی
 آجاؤ کہ آثارِ زمانہ سے ہے طہا ہر اب بھی جو ہے طے میں سہولت نہ رہے گی
 یہ دن تھانیا لات و تصور سے بھی باہر ہم سے تمہیں طے کی بھی فرصت نہ رہے گی
 چل دو گے نہیں پھوڑ کے تنہا مجھے اک دن تم سے بھی کبھی خط و کتابت نہ رہے گی
 درپیش میں کچھ میرے جنوں کو وہ مراحل اب تم کو نہیں پھر مجھے فرصت نہ رہے گی
 راتوں کی کہیں گے وہ نکلیں گے تارے صبحوں کی جیس پر یہ صباحت نہ رہے گی

دانش یہ زمانے کے روتے سے بچے ہر

باقی کوئی اب قدرِ شرافت نہ رہے گی

ذاتیات

خلیل الرحمن اعظمی

جو مجھ پہ جیتی ہے
 اس کی تفصیل میں کسی سے نہ کہہ سکوں گا
 جو دکھ اٹھائے ہیں
 جن گناہوں کا جو مجھ سینے میں لے کے پھرتا ہوں
 اُن کو کہنے کا مجھ میں یا را نہیں ہے
 میں دوسروں کی لکھی ہوئی کتابوں میں
 داستان اپنی ڈھونڈتا ہوں
 جہاں جہاں سرگزشت میری ہے
 ایسی سطروں کو میں مٹاتا ہوں
 ردِ ثنائی سے کاٹ دیتا ہوں
 مجھ کو لگتا ہے لوگ ان کو اگر پڑھیں گے
 تو راہ چلتے ہیں لوگ کہ مجھ سے جانے کیا پوچھنے لگیں گے



ناصر کاظم

کہاں گئے وہ مخمور جو میر محفل تھے
 ہمارا کیا ہے بھلا ہم کہاں کے کامل تھے
 بھلا ہوا کہ ہمیں یوں بھی کوئی کام نہ تھا
 جو ہاتھ ٹوٹ گئے ٹوٹنے کے قابل تھے
 حرام ہے جو مسد امی کو منہ لگایا ہو
 یہ اور بات کہ ہم بھی شریک محفل تھے
 اب ان سے آنکھ لانے کو جی ترستا ہے
 کبھی جو لوگ مرے رنگوں میں شامل تھے
 شادروں کو ترے ڈوبنا ہی تھی منظور
 قدم قدم پر دگر نہ مہزار ساحل تھے



فضا ابن فیضی

ہم تو خیر ہیں جیون بری خوار توئے معتب ہوئے
 تیرے گیسو کی موجوں سے خوشبو خوشبو راہ گزر
 حسن و عشق کی یہ تعریفیں اپنی بچہ سے باہر ہیں
 مرے زیادہ مصحوبی بھی دجہ سزا بن جاتی ہے
 مصلحت آیام نہ تھی یہ مجھ کی حالات کی تھی
 یک طرح کی شہرت ٹھیری عشق میں یہ سوانی بھی
 سب آتا ہے مجھ کو اس کی خبر سے آتا ہے
 یہ بھی ہے اک رسد زمانہ کیسی دار و کیسی حیات
 اُن نہ جانے عشق میں کیسے دکھ کا رونا روتے ہیں
 بجز کچھ ہو، مگر مجھ کے پیسے یہ تیرے تو نہ ملتے
 نے زندگی و فن کی جو بھی مائے مائے پھرتے ہیں
 ان سے پوچھے کوئی آخر کیوں اتنے محبوب ہوئے
 تیرے قارض کے افسانے پھولوں سے منسوب ہوئے
 ہم خود اپنے طالب ٹھیرے خود اپنے مطلوب ہوئے
 کانٹوں سے دامن کو پکایا، پھولوں کے معتب ہوئے
 ہم باغوں میں پتھر لے کر شیشے سے مرعوب ہوئے
 جس کی تم نے بات پوچھی اس کے چہرے خوب ہوئے
 گویا بستے پھول چین کے سب اس کے معتب ہوئے
 طوفاں کا سُرخ پھیرنے والے تھکوں سے مغلوب ہوئے
 وہ غم کتنے شیریں نکلے جو تجھ سے منسوب ہوئے
 کتنے نازک غنچے اپنی شاخوں پر مصلوب ہوئے
 ہر فن کار کہاں بن بیٹھے کیوں نہ کوئی مزدب ہوئے

تیری راہِ قدر سے بہت پرانا اب مثل ہے فضا

تو نے جو اسلوب نکالے وہ سب کے اسلوب ہوئے



جہیل ملک

نریہ زمیں ملا . نہ تہہ آسماں ملا
 ہم جس پہ مر مٹے ہیں وہ پیکر کساں ملا
 تم ڈھونڈھنے پٹے ہو گئے چاند رات میں
 بچاؤ کو بھی منزل شب کا نشاں ملا
 ہر اک سے پوچھتا ہوں سب رگن رشوق
 نیا تم کو راستے میں کوئی ہم زباں ملا
 جب زندگی پہ طنز ہوئی شاہم زندگی
 وہ مہرباں ملا بھی ہمیں تو کساں ملا
 پھر اُس کے بعد دل پہ جو کوری گزرتی
 اک شخص زندگی میں ہمیں ناگساں ملا
 ہم آئینہ بھی جس کے مقابل نہ ملے تھے
 وہ جب ملا تو ہم سے بہت بدگماں ملا
 مرنے کا مسلہ ہو کر بیٹے کی قید ہو
 جو غم ملا جہیل منہم جاوداں ملا



شاعر لکھنوی

پیار کی خوشبو پھیل گئی تو ہوتی ہے رسوائی بھی
 محفل سے گھبرانے والے ٹکے گئی تنہائی بھی
 جن آنکھوں کو خشک سمجھ کر تم نے نظر انداز کیا
 اُن آنکھوں میں ڈوب گئی ہے دریا کی گہرائی بھی
 آئی تھی کیا کیا اربابوں کے دل نہ ملے دیوانے سے
 خالی در پر دستک دے کر لوٹ گئی تنہائی بھی
 عشق کی راہ میں چلنے والے اپنے کو تنہا نہ سمجھ
 شہرت بن کر ساتھ چلے گی صدیوں کی رسوائی بھی
 کس گل کو سینے سے لگانیں کس گل کا دیدار کریں
 راہ بیمار اس تکے تکے خون ہوئی مینائی بھی
 زخمِ قاتلنا حسنِ بیاں پر اُن سے مگر کچھ کہہ دے
 اپنی طلب کی آگ میں جل کر خاک ہوئی گویائی بھی



شاعر لکھنوی

اک اک پی اک ایک برس ہے دوٹھ کے اُن کے جانے سے
 ہم لمحوں کو ناپ رہے ہیں صدیوں کے پیمانے سے
 اچھے اچھے لکھتے لکھتے، لگانے بیکانے سے
 پاس لکھتے وہ سوئی رہتے ہیں کیا پوچھیں دیوانے سے

دش پر پسینہ، تیز نفس، نادم سا احساسِ وفا
 ہم پر کیا کچھ بیت ثنی ہے ایک تے مٹ جانے سے
 دل ہے جیسے کھویا کھویا انگلیں جیسے خواب میں ہیں
 توتنی، دوری بڑھ جاتی ہے اُس کے قریب آ جانے سے
 کارِ جنوں پر رسوائی کی تہمت رکھنا سہل نہیں
 جرات ہو تو آنکھ ہار بات کر دو دیوانے سے
 دل میں جو حق اک بوند ہو کی اشکوں میں تبدیل ہوئی
 آج حقیقت بھیں بدل کر گزرتی ہے افسانے سے
 بھول ہی نہ دیدہ ہیں شاعرِ عظیموں کی بھی آنکھیں
 کھلنے پر ایسا اوس چڑی ہے موسمِ گل کے آنے سے



مظہر امام

اپنے رستے ہوئے زخموں کی قبا لایا ہوں

زندگی! میری طرف دیکھ، اکہ میں "آیا ہوں

تشنگی مد سے سواتو نہ متی مے خواروں کی

جانے کیوں جام اٹھاتے ہوئے تھرایا ہوں

کام آئی ہے وہی زلف، جو میری نہ ہوئی

وقت کی دھوپ میں جس وقت میں کھلایا ہوں

غیریت پر پھنسنے والے ہیں بہت سنجیدہ

جرم اتنا ہے کہ اک شوخ کا ہمسایہ ہوں

صبح ہو جائے تو اس پھول کو دیکھوں کہ جسے

میں شبتان بہا، اس سے اٹھالایا ہوں

عصر نو! مجھ کو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے

ایک مٹی ہوئی تمذیب کا سہ ماہی ہوں

نکستِ سودہ

شاذتِ نکست

لس کی آنکھ سے مسہ پوریں مسکارتی ہے
گردشِ خوں ہے کہ شریاؤں میں جھنکار سی ہے

آنکھیں جھکتی ہیں برائے اوجِ حجابِ دوشیں
شب کے پارے پھٹے کابل کی چمک دم دم ہے
سننِ زیرِ لبِ دقوسِ بستمِ مولہوم
اقتیادِ اتنی کہ کنگن کی کھٹک دم دم ہے
پیمپنی چھوٹ سی پھنسی ہوئی کھونٹت کرتے
تیز سے شعلہ بُننے، دل کی کسک دم دم ہے
کل کرتی جوتی انڈالی کی مرابِ دنیسم
شانِ ہر عضو کے فخن کی چمک دم دم ہے

کون نہ گاہے دمِ سب سے سرِ بائیں نماز
نہی پڑتی دبا سب شکنِ آلودہ لیے
موجِ انفاس میں اک نکستِ سودہ لیے

فارغ بخاری

بازگشت

سالہا سال پکارا ہے تجھے
زندگی نے کئی گوشوں سے
میری آواز کا جادو لیکن
تیری بے رحم سماعت پہ بھی مل نہ سکا
اور میں سنتا رہا
اپنی ہی غمزدہ آواز کی گونج

ہمہ اوست

سحر سے لہر اٹھی
شوخ، شیشیل، چنپل
لہر اٹھی — تڑپلی، آڑی
اڑکے بنی — سلمے نلاب پر بادل

ناخلف

بجائیک کہ غمزدہ گروں سے نہیں کر دیکھا
اپنی ہم جنسوں سے جب آنکھ ملی
شرم سے ہو گئی پانی پانی

پٹر کاخوں پی کے شاخیں
پھیلتی بڑھتی ہیں
چھوٹی پھلتی ہیں
رفعتوں کے بار کو چھپاتی ہیں
بار بار بگڑ گیا
سارے تہاں کو فیش یا ب
کیوں اپنے چہلے میں بے نیاز

نفرت

فارغ بخاری

یہ مسجد یہ مندر یہ دیروہ دم
 ہمیشہ ہمیشہ دنیاں رہے جن کی ہمتوں کے خم
 یہ اندھی محبت کی قربان گاہیں
 ہمیں زندگی کی حرارت نکلتی ہوئی سرد راہیں
 کھلی لہو وایاں کی یہ منڈیاں
 وفاء و محبت کا نیلام اختیار رہا ہے جہاں
 اور ان میں یہ پھیلی ہوئی دُور تک

ایک کالی شرک
 غلوں آوازوں کو بھٹکا رہی ہے
 اُفق تا اُفق پھیلتی جا رہی ہے
 حرم کے جواں نور کی بے پناہی
 سے بھی چھٹ نہ پانی یہ ظالم سیاہی
 ہزاروں طرصار ابھرتے مرنے کا خون ناحق
 بھی لایا نہ سیل تباہی
 ہمیشہ اسی طور قائم رہا
 اس کا سرمایہ کچھ بھی

اور اب تو ازل سے اب تک
 یہ کالی شرک
 دلوں کے بیابان میں پھیلی ہوئی دُور تک
 بھیا تک لہو کا سمندر بنی ہے

گناہوں کی ندی

شاد امرتسری

آہو سی رنگ تیکھے خال و خط
جسم کے اندر کہیں پوشیدہ روح بے سکون
روح سے پیتی جوتی آلودگی
آہو سی رنگ اب تک یاد ہے

سنگ اسود کی چٹانوں کے قریں
بیشہر و عالس کی ڈھلوانوں کے غم کے وسط میں
مہنیں لمبھیتوں کی لہلہاتی جڑے بار
تیز اور بدست آنکھوں میں گنہ کی پاشنی
جیسے کوئی دیو داسی خواہشوں کی راہ میں
دیوتاؤں کے عہن کو تیاگ کر
منہ روں کے پروہتوں سے بھاگ کر
اک منٹش کے جسم کی پابست کر سکتی رہے
اور گناہوں کی ندی بہتی رہے

آہو سی رنگ اب تک یاد ہے



شکب جلالی

جلتے تھمے اٹوں میں پھیلا ہوتا کاش میں پیروں کا سایا ہوتا
 توجہ اس راہ سے گذرا ہوتا تیرا ہوس بھی کالا ہوتا
 میں مٹا ہوں نہ پوچھوں نہ چراغ ہمیشہ میں کونی کیا ہوتا
 زخم ہاں تو نہ دیکھے گا کونی میں نے کچھ بھیس ہی بلا ہوتا
 کیوں سینے میں چھپاتا دیا ٹر بھے پار اترنا ہوتا
 بن میں بھی ساتھ گئے ہیں سنا میں کسی جا تو کیسا ہوتا
 مجھ سے شفا ہے سینہ کس کا چاند اس نعل میں اترا ہوتا
 اور بھی ٹوٹ کے آتی تری یاد میں جو کچھ دن تجھے بھولا ہوتا
 راکھ کر دیتے جس کا شعلے یہ دھواں دل میں نہ پھیلا ہوتا
 لکھ تو آتا ہی باتوں کا جواب یہ کنواں اور جو کسہا ہوتا
 نہ کچھ تا جہ نغسا میں نغمہ سینہ نے میں تو چپتا ہوتا

مٹی مقدہ میں خزاں ہی تو شیرت

میں کسی دشت میں مہکا ہوتا

پاداش

شکیب جلالی

کبھی اس بیک روز ندی کے کنارے گئے ہی نہیں ہو
 تمہیں کیا خبر ہے
 وہاں ان گنت کھروے پتھروں کو
 بھل پانیوں نے
 مٹا دیا۔ سیلے، مٹھریاں، گار
 امٹ چلی کو لانیوں کو، داسونپ دی سے

وہ پتھر نہیں تھا
 جسے تم نے بے ڈول، اُن کھڑ بھگ کر
 پرانی چٹانوں سے ترا کے توڑا
 اب اس کے سلگتے تراشے
 اُڑ پاؤں میں چبھ گئے ہیں
 تو کیوں جھپٹتے ہو؟!



شفقت کاظمی

شکوہ تو کوئی تیرے جہاں سے نہ تھا مجھے
یہ اور بات ہے کہ نہ واس آسکا مجھے

اس طرح میں کسی کی جفا سے ہوں مطمئن
جیسے نہ ہو کسی کی شکایت رواج مجھے

قسمت سے وہ نگاہ بھی تیرے بدل گئی
لے دے کے جس نگاہ کا تھا آسرا مجھے

منزل پہ آگیا ہوں مگر کچھ نہ پوچھیے
کن سخت مرطوں سے گزرنا پڑا مجھے

آباد کس دیار میں ہیں اب خیر نہیں
یار ابنِ رفتہ دے نہ گئے کچھ پتا مجھے

شفقت پھر اُس دیار کی جانب چلا ہوں میں
آئی تھی جس کی خاک سے ہوئے وفا مجھے



بشیر بدر

مکتبِ دلؔ دکانوں پر پکے گی زمانے کی نطنہ تجھ پر پڑے گی
بتاؤ کون ہے جو روک لے گا محبت جب ہمیں آواز دے گی
ہمارے پاؤں تنک جائیں گے لیکن گلی تیری سا چلتی رہے گی
جگاتا ہے مجھے یہ وہم شب بھر یہ دنیا اب نہ سو کر اٹھ سکے گی
ذرا تھکے ہوئے پانی میں دیکھو کوئی تصویر ہے جو بول دے گی
شبِ تاریک کے کاغذ سے سلامت ستاروں کی یونی ڈولی اُٹھے گی
بیشِ بلا کھ مہر و ماہ لیکن یہ مٹی، مٹی میں آئندہ ملے گی
یہی ہے دل کی بستی کا طریقہ ابھی سوئی، ابھی پھر جاگ اُٹھے گی
کہیں جاؤں، زمیں کہ آسماں ہو یہ تنہائی مرا پیچھا کرے گی

نہ بانے دل پہ کس کی بد دعا ہے

یہ بستی ہر برس اُجڑا کرے گی



رفعت سلطان

بھارتی ہے سُرخ گلاب کی طرح
 ہمیں بھی ہے کسی شے پر اداسے عشق، معر
 اُسی نے کی ہے عطار و شنی زمانے کو
 طلوع صبح کی مانند یہ کیفیت ہے
 نہ پانچ بجے سے کہیں کیوں منہ زمانہ میں
 ہزار بار سہ شام وقت غابت میں
 نہ بے دلی سے مجھے اس طرح مخاطب کر
 ہوائے وہ سے ہنہ و شل برکب خزاں
 کہیں سے آئے دو آواز بیت بابا کہ دن
 خلوص پہلی وطن کو یہ بس بوا کہ مجھے
 وہ جس کا اسم نہانی بھی ہم نہ پوچھ سکے
 ملک اٹھتا ہے چمن جس کے پیر جن کی طرح
 ہمیں پسند نہیں موت کو کجمن کی طرح
 وہ اک نظر کہ ہے تاروں کے بانگین کی طرح
 کہ لازوال ہے وہ جن میرے فن کی طرح
 اُجھٹا جوں تری زلف پر شکن کی طرح
 وہ یاد آنے میں ہے ساختہ وطن کی طرح
 کہ میرا دل بھی ہے نازک تر سے بدن کی طرح
 و چہ وجہ کبھی شناب کا چمن کی طرح
 غم شش ہے کسی ویران انجمن کی طرح
 وطن بھی اب نظر آتا نہیں وطن کی طرح
 چاہا کیا ہے کہیں بوسے یا سن کی طرح

اُسے نہ چاند کہوں میں تو کیا کہوں رفعت

اُنزینا ہے مے دل میں جو کرن کی طرح

وقت کا دھارا

صدیق کلیم

روشنی تیز کرو
درو کی سنے تیز کرو
کس کے ہاتھوں میں ہے تقدیر کا ساز؟

آؤ گاؤ کوئی نغمہ
کراہ اٹھا۔ کا وقت آیا ہے
جل اٹھے ساز کے تار
پھر کوئی رقص کرو
صبح جب خواب سے اُٹھو تو ہنسی رخ پہ نمایاں ہو جائے

صبح جب دھوپ کی چھاؤں میں چلو
کبھی اس جس سے پسٹی ہوئی زنجیر
کبھی افکار کی بوجھل حرکت
آپ ہی آپ سبک ہو جائے

صبح کی پہلی کرن دولت ہے
کس لیے وقت کی مقدار کو کم کہتے ہو؟
وقت کو دھین کی لہروں میں بہہ جانے دو
آج پھر وقت کی تمیز کو مٹ جانے دو

شہر میں اجنبی

صدیق حکیم

ترا سو اگت نہیں کریں گے
جو سارے اجاب مل گئے نہیں
وہ دل ٹلی سی۔ وہ تکتے سے
جو وجہ سے میں سرخ لہریں نہیں لے سکے
تجھے وہ لیکن بٹھا تو لیں گے
ترا سو اگت نہیں کریں گے

جو ذوق ہو ان میں ہم میں کہہ دیں !
وہ خود سے باہر ہیں جب سے شمالی دوا ہوں میں بھی
لو کی رنگت ملک کا سماں بنی ہوئی ہے
سفید پاندی میں لہروں میں ٹھل ہی ہے
بہا کا یہ سماں ہے گویا !
یہ ساری چیزیں ہیں ان کا تھمنے — تراں ہر ماہیں !!
یہ تیرے منہ میں زبان اترتے لفظ ہیں قلم سے
تجھے وہ لیکن بٹھا تو لیں گے
ترا سو اگت نہیں کریں گے

یہ کیسی باتیں سننا رہا ہے ؟
یہ بیتے دن کے سرور میں ہیں
یہ چمکتے دن کا مزاج پر رکھیں
کہ تجھ کو جانیں کہ خود کو جانیں
یہ سا کیا ہے : اسے اور کھ ! جو آج شب بھی بجا رہا ہے
الٹ الٹ ہے سبھی کی دنیا
یہ دازوں کی طرح ہے ان کا بس ایک مرکز
جہاں سے چل کر
سمندر وں کی طرح بڑھی ہیں۔ ہیبت صورت

ترا جہاں بھی ہے ایک نفل
فقد ہوئے تری رنگوں کا
تجھے وہ لیکن بٹھا تو لیں گے
ترا سو اگت نہیں کریں گے



دولت قرار آئے نکست نگار آئے
آنا ہے تو یوں اب کے موسم بہار آئے
زندگی کے صحرائیں گونجتا تھا سناٹا
کیسی کیسی منزل مٹی ہم جہاں پکار آئے
پھول کھلتے جاتے ہیں کانٹے پھتے جاتے ہیں
کیا خبر کے اب کے وقت سازگار آئے
میں نے کے بعد دھرتی کی کیا بھڑاس نکلی ہے
کاش میری بستی میں ابر بار بار آئے
کارواں میں گلیں بھی ہیں گرد بھی ہے کنکری
دیکھیے کہ منزل سے کون کا منہ کار آئے
بارش کے ہوا خواہوا جنگلوں میں آ بیٹھو
شاید اس طرف سے ہی دولت بہار آئے
کھڑکیاں کھلی رکھیے شب کو جاتے رہیے
جانے کب ہواؤں سے لے لطف یا آئے
آندھیلوں سے دولہے ساری رات بچتے ہیں
کوئی چارو ساز آئے کوئی غم ساز آئے
یہ بے بات اور اختر کوئی بھی نہ کچھ ہوئے
ورنہ ان کی محفل سے سب ہی شرمسار آئے



افوار انجم

جہان بھر سے زیون میسر تیز کوہ کیجے
 میں دل ۵ یا نہ ہوں دل سے مزا دل کیجے
 یہ کیا یقین کہ مجھ لے کا ہر اشارہ دو
 ہوں کا فرض نکلا ہوں سے کیوں ادا کیجے
 نصیب میں جو کبھی صبح ۱۵ جسا لا ہوا
 تو مل ہی جائے گا ہر رات کیا دعا کیجے
 غلوں کو بھی یہاں صحت نہیں ملے نوب
 بھلا یہی ہے سہی سے نہ جو بھلا کیجے
 وہ ہوس پہ ہے ہر لحظہ اک نئی دھنک
 جو خود سے پھٹتے نہ پھرے تو اور کیا کیجے
 یہ جی میں ہے کہ ترا جنت تراش کر پہروں
 تو ہے حضور کھڑے عرض دعا کیجے
 تمہارے حال سے جو بے خبر نہیں انجم
 پر اب بتاؤ کہ کیا رنج کے سوا کیا کیجے

شاعر ابہام سے

اغصا صدق

اے شاعر ابہام یہ ہے طرزِ ادا کیا
ہر بات جب اسرار کے پردوں میں چھپی ہو
تبلیغِ حقائق کا ذریعہ سے نکلو
تدبیر کے ڈانٹے جو غموشی سے ملے سیرا
یہ جنبشِ لب بھی تو عجب جنبشِ لب ہے
مرد و مخاطب کو کئی بات انوکھی
جب بولیا کتنا بھی نہ کہنے کے برابر
جب نطقِ غموشی کی طرح مہربان ہو
یہ شعر ہے یا لغز، سخن ہے کہ مٹا
الفائدہ میں جو تاج ہے معانی کا ذخیرہ
مانا کہ اشارات میں جی لطف سخن ہے
جب شعر کا مطلب ہے شائع شدہ میں
کیا شمع کو جو بن نہ سہ کر مٹی مفصل
لب پر کبھی نہیں تو دلوں میں بھی آتیاں ہیں
غائب کی طرح خوش ہے کہ کبھی نہ کوئی ہے

لاٹے کا تراشہ، تاثر کی فضا کیا
مائل ہو لہو ہوم سی مدت کے سوا کیا
ہو خونِ حقائق تو تکلم کی ادا کیا
اظہار سے انسان جو پھر عمدہ برا کیا
معلوم کسی کو نہ ہوا تو نے کہا کیا
حیران مخاطب کہ مگر اس نے کہا کیا
کہتے کہ اس انداز میں کہنے کا مزا کیا
پھر نطق کو سمجھے کوئی انعام خدا کیا
سمجھیں نہ آئے قاری و سامع کی خطا کیا
معنی نہ رہے ان میں تو پھر ان میں رہا کیا
جب مد سے بڑھے جز تو پھر لطف ادا کیا
ارشاد ہو ارشاد سے مفصل کو ملا کیا
جو راہ نہ دکھلائے وہ نقشِ کف پا کیا
سینے میں رہے کھٹ کے تو وہ آہ رسا کیا
منظور ہوئی تجھ کو سماعت پہ جفا کیا

مقصود سخن یہ ہے کہ دل تک جو رسائی

پہنچے نہ دلوں تک وہ صدا کیا وہ نوا کیا



ضمیر اظہر

کوئی پارہ گرجو متا دل و جہاں ہو نہ کرتے
بھی درد بھول جاتے کبھی ماؤ ہو نہ کرتے

گریبانِ پاک ہی ہے ہم وحشیوں کا درماں
ہمیں گرجریہ ہوتی گریباں رفو نہ کرتے

غمِ زندگی سے بڑھ کر غمِ آرزو نے مارا
غمِ آرزو نہ ہوتا تو غمِ نمونہ کرتے

تری بے رخی سے اکثر یہ خیال دل میں گذرا
تری آرزو نہ ہوتی، تری آرزو نہ کرتے

ہمیں یار بنتے بھی کے کوئی یار تھا نہ اپنا
رہ و رسم ہم سے کیسے بھلا پھر عدد نہ کرتے

کھلا کاوشِ طلب سے ہی راز ہم پہ ظہر
کوئی جستجو نہ ہوتی، کوئی جستجو نہ کرتے



کسریٰ منہاس

خاک ہونا ویسے ہستی ہے کس بختی پر اپنی پستی ہے
 کاوش عشق دل کی ہستی ہے جان دے کر ملے تو سستی ہے
 میری ہستی بھی کوئی ہستی ہے زندگی موت کو ترستی ہے
 کوئی سمجھا نہ آج تک یہ راز ہر نفس اک فریب ہستی ہے
 پھر بھی سائل پہ جا کے دم میں گے گو تلام میں بحر ہستی ہے
 یاد آتا ہے کوئی مستِ شباب جب گھٹا جھوم ر برستی ہے
 ہوش آیا تو ہم بھی دیکھیں گے ان کی آنکھوں میں کتنی مستی ہے
 کو چہ عشق میں یہ راز کھلا زندگی کیا ہے؟ غم پرستی ہے
 حسن مغرور عشق مجنون ساز اک بلندی ہے ایک پستی ہے
 شعر کہتا ہے ہر کس و نا کس ہائے یہ جنبش کتنی سستی ہے

جس کو کہتے ہیں زندگی کسریٰ !

رنج و غم کی وہ ایک بستی ہے



رضازیدی

پسکا ہے کائنات کا ہر نقش رنگ و بو
 تم کس قدر حسین ہو تم کتنے خوب رو
 باد صحنہ پاسدار مٹی صفا طر نہ کچھ ملا
 سو ابے اس دیار میں پابست کی آبرو
 اس پیر حسین کی شعا میں تھیں الاماں !
 ہم اس کو دیکھ بھی نہ سکے اس کے رو برو
 گو ہم بھی یقین کی حدوں تک نہ باسکے
 لیکن تمام عرصہ رہی تیری جستجو !
 حسن ایک معجزہ ہے ، مگر دیر پائیں
 اور اک عشق میں ہے بڑی قسمت نو
 یہ دشت جنوں ہے کہ تہذیب عشق ہے
 انہی بدھ کو لطفہ آیا ہے تو ہی تو
 میں کس طرح بدل کے چلوں باد و صفت
 تم مقصد حیات ہو تم جان آرزو
 دیکھی ہے ہم نے چہ نہ کتاب میں رضا
 اپنے تجلیات کی تصویر ہو بہو

حُسن گریزاں

شاعر ندیم

کہنا بھی جو چاہوں تو نہ کہہ پاؤں کہ کیا ہے
 بزمِ کامِ حیا لختوں سے آنکھوں کو چھپانا
 اس ڈر سے کزدینا ڈھلکتا ہوا آنچل
 جیٹی ہو اگر سامنے اُٹھنے میں تکلف
 دو کام بھی چلتی ہے تو بہکی سی روش سے
 ٹوٹے ہوئے لفظوں میں لبوں پر ہے شکایت
 اقرار میں پوشیدہ ہیں انکار کے انداز
 میرے لیے ہنگامے ہیں اُس دل میں بھی روشن
 وابستہ خوشی سے مری ہے اُس کی خوشی بھی
 اُٹھنے جو ٹکوں میں تو ہیں رکنے کے تقاضے
 وہ حُسن گریزاں کہ بہت ہوش رہا ہے
 کچھ شوخی سی ہے شوخی ادا سی کچھ ادا ہے
 ابھرے نہ کہیں راز جو سینے میں چھپا ہے
 اُٹھ جانے اگر بیٹھنا پھر حسد سا ہے
 شاید مری نظروں ہی سے وہ لغزش پا ہے
 لفظوں کا مری اس کو بھی احساس رہا ہے
 انکار میں استہار کا پہلو بھی چھپا ہے
 وہ لاکھ چھپاٹے مجھے اس کا بھی پتا ہے
 میں روٹھ گیا ہوں تو اُسے لکھ بھی نہوا ہے
 زحمت پر اُن آنکھوں نے مایہ چا کیا ہے

وہ میری نگاہوں سے کہیں پر وہ نہ کرے

ڈرتا ہوں یہ کہتے ہوئے تو میری خدا ہے



شمیم حنفی

ہم ہیں پریت نگر کے ہاں ہم سے ہم وفا نکل
 ہم کو گمان تھا پانڈ کے پایے میں ہوگی صبا نے غم
 دنیا والو اوپر دیکھو عشق تک پہنچے ہم
 قسبیں دوری کا عالم قہم کس جہ پریشان تھے
 اسے دل روپ نگر کی غیروں میں کیا سنا ہے
 رات نے اپنے بال میٹھے سوچنے نے انفرادی لی
 دونوں عالم تجھ پر قرباں بنے۔ وہ آبد بے
 ہم نے وفائے رات الا پہے کوئی شے سے مش ہوا
 اسے غم مانا لے غم جاناں تجھ سے بچ کے کہاں جانے
 اب اسے جنتیں لب پر چرخ افش ساری دنیا
 ایک بار سے دم سے یار و دنیا سی دنیا نکل
 پہلی جو پہلے تو اپنے منہ سے مجھے جو رو بھا نکل
 ایک کرن سوزِ الفت کی اپنی راہ نکل
 جس کو ہم دیوار بکھتے تھے وہ تیری جیسا نکل
 کل جو بستی صحن چمن تھی آج اسے دیرانہ نکل
 نخی نخی غیروں کا دل غم کو صبا نکل
 دل نے اس کو یاد کیا ہی تھا کہ وہ پگھل آ نکل
 اپنی صدا بھی اس بستی میں آوازِ صحرانہ نکل
 دنیا بھی اپنی انظروں میں تیری ایک اداس نکل
 ہونٹوں تک جو بات آئی جانے کیا سے کیا نکل

کار پانڈ کا مے کوفت ٹٹت ہی حسن کی میک

دو بھولی بھالی سی لڑکی بھی دل کی دریا نکل



ظہیر صدیقی

شورش دہر ہے ہے ارض و سما کی قیمت
نخندہ گل سے ہے جس طرح صبا کی قیمت
وہ تو ہم ہی تھے کہ جس نے اسے برتر سمجھا
ورنہ کیا ہوتی خدا جانے خدا کی قیمت
اس کے رگ رگ میں مچلتے ہیں ہزاروں شعلے
ورنہ پھر کیا ہے اس اک برگِ حنا کی قیمت
خون باقی ہے ابھی قلب و جگر میں میرے
دے تو سکتا ہوں تیرے ناز و ادا کی قیمت
دل کا ہر قطرہ خون وقف تیری مٹکان کو
میں ہوں مشتاقِ جفا، دوں ہا جفا کی قیمت
چاہ داما نی و رسوائی و نشہ کا من !
اور یہاں جا بیسے اپنی وفا کی قیمت
دشکِ فرزانہ یہ ہیں حال پیشاں ہوں میں
دے سکا کوئی مرنی چاکِ قبا کی قیمت
اے ظہیر! آج طلب میری ہوئی متعل ہیں
ہاں ہی آج مری آؤ رسا کی قیمت



حزین لدھیانوی

وقت ایسا اے حزیں کبھی ہم پر پڑا نہ تھا
 سب آشنا تھے، پھر بھی کوئی آشنا نہ تھا
 بارِ الم سے اپنے ہی زانو پر جھک گیا
 جو سر کبھی کسی کے بھی آگے جھکا نہ تھا
 وہ جس کو حادثات کی صرصر بھبا گئی
 دیر و حرم کی شمع تھی دل کا دیا نہ تھا
 ہم ہی نے جاگ جاگ کے کائناتِ حیات
 ہر شخص کے نصیب میں یہ رت بگا نہ تھا
 جینے کو جی لیے مگر اس بے کسی کے ساتھ
 جیسے بھرے جہاں میں ہمارا خدا نہ تھا
 میں کشنِ حیات میں نغمہ سدا رہا
 گو بھلیوں کی زد میں مرا آشیانہ تھا
 رسوائیوں کی آگ میں جلتے نہ کس طرح
 دن کو بھی تیرے درد کا سورج چھپا نہ تھا
 گونجنے کی اب صدائے شکستِ قفسِ ضرر
 قفسِ قفس، قفس کا فقط آب و دانہ تھا
 میری نگاہ اُٹھی تو پاتاں تک گئی
 ہر ذرہ اسے حزیں بھے آئینہ خانہ تھا



شارق میرٹھی

ان کو جب دیکھا ہوا اپنا یہ حال
 جیسے دل سے مٹ گیا ہر اک ملاں
 تبصرے کرتی رہی دنیا مگر
 کس نے جانا کون سمجھا دل کا حال
 پھر بھی دنیا ہے غراب آرزو
 جانتی ہے آرزوؤں کا نام
 ہر نظر اس کی اُٹتی کہنتی ہوئی
 دیکھنے والے ذرا خود کو نبھال
 یوں کہیں ہر ایک کو ملتا ہے یہ
 مل گیا جس کو ملا اس کا ملاں
 آہ شارق حال اس دل کا پوچھ
 ماوراے حال ہے اب اس کا حال

سوئمبر

شاہد شیداؑ

اس کے ماتھے میں دکھتا ہوا سورج ایسے
تیری بھولی ہوئی صورت کا پتہ دیتا ہے
جیسے عاشق کو۔ جدائی میں دمکتا ہوا چاند
اپنے محبوب کی تصویر دکھا دیتا ہے !

ہم کئے تھے جو کہیں۔ آج وہ غم پھر گھیلے
میں کئی سرد دنیا کو حرارت، پھر سے !
اور سئے زیست کی تلخی میں گھر می بھر کیلئے
گھل گئی شہد سے ہونٹوں کی ملاوت، پھر !

یوں مرا ذہن ترسے جسم کی موجوں میں بھرا
جیسے طوفان کی زد میں ہو سمندر۔ کوئی !
اور گردِ اوپ حوادث کے چانکے آنے کر
میری خوش بختی نے جیتا جو سوئمبر کوئی

جب مجھے کوئی ہواں جسم نظر آتا ہے
میری ہر سانس تری یاد میں حل جاتی ہے
لہو بھر کے لیے، ایک جاتی ہے بغضِ بچراں
لہو بھر کے لیے، تو پاس چل آتی ہے !

اور پھر۔ فنی عارض کے شہادتے، گھر
میرے جذبات ہیں یوں آگ لگا دیتے ہیں
جیسے اخبار کی جلتی ہوئی سرخ فہرست کے حوالے
آتشِ وقت کے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں

آج پھر ایک میدان کے لبِ خنداں نے
مونا لیزا کے تبسم کو بھی شہر مایا ہے
سرخِ خواہش پہ دکھا کب مجھے پھر اس کی کبیب
پندرہ روز اور اب مجھے جیسے پتہ کیست



نجیب اسلم

اِدھر کچھ اُجالے اُدھر چند سائے
 کوئی سوچتا ہے کہاں بیٹھ جائے
 وہ انسان ہے یا کہ رستے کا پھتہ
 جسے جو بھی گزیرے وہ ٹھوکر لگائے
 جنہیں خون وں دے کے سینچا تھا میں نے
 وہی پھول میری نظر تک نہ آئے
 غمِ زیت کی تند آندھی میں کوئی
 کہاں تک چراغِ تمنا جلائے
 ہر شام کس موڑ پر آگیا ہوں !
 جہاں سب نظر آ رہے ہیں پر اسے
 وہ دل پر پھر دستکیں دے رہی ہے
 کوئی یادِ دامن میں آنسو چھپانے
 ہر منزلِ آرزو تیسرے کی ہے
 کسی سے کہو، دل کی شمع جلائے
 مجھے مرنے والے سے مٹا دینے والے
 تجھے بھی اڑ کوئی دل سے مٹانے
 نجیب اس مسافر کی حالت نہ پوچھو
 جسے چاندنی بھی نہ رستہ دکھائے



مظفر حسنہ

چو کہ میں "مختلہ خاصا" میں نہ نہیں
 اس لیے پہچان کر بھی اُس نے پہچانا نہیں
 آدمی "اُونچی اڑائیں" لے رہا ہے آج کل
 آدمیت ماننے کا کوئی پیمانہ نہیں
 مسکرا کر جب شکوفوں نے کہی "خوش آمدید"
 ہاتھ پھولوں نے پٹائے "اس طرٹ آتا نہیں"
 بدظنی پھیلا رہا ہے میرے اس کے دل کا چور
 میں بھی دیوانہ نہیں ہوں وہ بھی دیوانہ نہیں
 بزم میں پردانہ ہائے راہدار کی شرطیں
 شمع اس غم میں سلگتی ہے کہ پردانہ نہیں
 مجھ کو یہ اصرار "پھولوں کی جھلک" دکھلائیے
 آپ کو یہ ضد کہ "گلشن" ہے یہ دیراز نہیں
 اے مظفر! طنزیہ غزلوں کے دشمن ہیں بہت
 اور میرا ریشمیں غزلوں سے یارا نہ نہیں!

ند باد جہازی کا سفر آخرت

(صوقی تمثیل)

ابوسعید قریشی

خاوں کا نذر اور بند کا شور آہستہ آہستہ ابھریں
اور پھر عجب میں چلے جائیں

د: کیا نغمہ ہے؟

کیسے سانسے ہیں؟

یہ سینے؟

(ہوا کا شور)

یہ بادبانوں سے اڑتے بادل

دریدہ دامن

سور کا شور اور ساحل سے ٹکراتی لہریں

میری رگوں میں

ہو کی ہسریں

جو ہر سینہ زمان کی مانند

کو بجتی ہیں

یہ چٹانوں پہ جیسے کشتی

جو ہم موجِ بلا کے آگے

کر جھکاتے

سکونِ ساحل کی آرزو میں سفینہ کوئی - نگارِ سینہ

صدائے گریہ پہ ڈوٹا ہو

(طوفان اور پیچ و پچا)

یہ کیا ہنگام لاؤ ہو ہے؟
طوفان تم جاتے اور پھر چند ساعت کی مکمل
خاموشی کے بعد

سری نگاہوں میں دھند کے یہ دبیز پردے
کبھی اُجالے کبھی اندھیرے کی چٹینوں پر چل رہے ہیں
یہ پچھلے یسے پہ سر مٹی سا مہیب گنبد

افقِ سمت و سوسے عاری

نشانِ منزل کہیں نہ ساحل

نہ روئند وشن نہ جلوہ شب

نگاہِ شمس و قمر کہیں پر -

نہ رقص نہ ہرہ!

عجیب صحرائے بے کراں ہے

رمِ غزالاں کہیں نہ ٹھہل

مرد کس لالہ کہیں نہ شبنم

سراب ہے نہ مباد و صرصر

رباطِ راہِ مشکاں نہ صوتِ نفیر و شہنا

عجیب دریاں چیتاں ہے

فسوں زدہ

گٹھ

میں جاں
نویہ باد و آہ سے نے نہیں فوائے پیام طوفان
میری آواز بگڑ کر دریا
قمان غول بیولی برپا
صدائے سور و جرم ہشر آشیان

یہ کیا ہے؟
میرے سینے پر شور و شیون
یہ کیا ہیں؟

احمد خان اپنی دھڑلہ بھری آواز سے کہتا ہے
یہ زمین ان کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے
ناخدا! : نہ اسے آدم و داؤد و یونس و یعقوب
ترے اشارے سے گلزار مار ابرہیم
نہ اسے موسیٰ و ہارون
نہ اسے نیل بنی راہزار اسرائیل
ترے ارادے سے صحرائیں چمنہ نازم
نہ اسے بزرگ و قدس و رب انجیل
نہ اسے رحمت کوئین
نہ اسے احمد مرسل

ترانہ نفس تن مردہ میں زندگی کا لہو
ترے اشارے سے شق القمر شہادت حق
ترے کرم سے پیچھے کئی کدے لگے
ترے کرم سے تو کیشتی جیفر بھی آج
پہلے سے حلقہ گرداب سے نکل جانے

طوفان

سنبل باح : میرے اللہ

یہ نوج جنوں خیز و فلک بوس وزین دوز

یہ دیدہ گرداب
نزل ہے کہ انجام کا آغاز
(طوفان تم جلتے)
یہ ساحل صد پارہ و کفت زرا
یہ خواب ہے یا خواب کی تعبیر

صدف!

کنارا!

تھائیگی و دشت و جبل
عودیں تاک و غمار ہوائے تو بہ شکن
جہر و ہر و گل

روح غدا و صبح شباب
دکوں میں دوڑتے پھرتے لہو کی شادابی
فسانہ شب رفتہ
فسون زہر گداز

اور سے قوی آواز میں ہے

خیز اور فائز رتب مرناک انداز

پیش زائے کشود کا نہ مرناک انداز

سنبل باح : ایک آواز کی لہر جانے کیا کیا غم ناک
یہ آتی ہے

دلِ غم گشتہ کے دکھوں ارماں

مے ویرینہ و معشوق جواں

طلب و درخاں

نغمہ ناہیدہ گل

یہ زلف محبوب

ہوس و شربت نایاب

لذتِ لب لب ماہو شان
عقدہ بندِ لب
گرخی آغوشِ تباں
ساقِ یمن کا فوں
رنگِ جنوں
ماز و نیاز
نغمہ و سازِ صدائے صدف گوہر تاب

یہ کیا حاصل ہے
میں کہاں ہوں
مرا سفینہ
ابھی یہاں تھا
ابھی نہیں ہے
مے سفر کا یہی تھا حاصل
سوال ہی کر مری نگاہوں میں زندگی پھر ابھر رہی ہے
نئے جوڑے
نئے نشیمن
نئی نئی امتحان کی راہیں

(لہریں ابھر کر دوڑ سوتی جاتی ہیں)
سند باد : اے مردِ پرکون ہے تو
پیرِ قسما پا : ملکِ التجار

میرا نام
مگر میری کہانی
اک قصہ طوٹا ہی ہے
الف لیلہ کی طرح
بات سے بات نکل آئے

ہوں
شعور کی لہریں
بھڑک کر بجھ جائیں
مگر قصہ میرا ختم نہ ہو
امتحان ایک سے ایک
حسرت و شوق سفر کے عنوان
بھر زخار
سینے

طوفان
شہرِ بغداد کی گلیوں میں سنانے کے لیے
شہزادی کے شہبشاں کے طلسم
مگر ... میری نقابست
میری آواز
علق میں کاٹا جاتی جاتی ہے
مجھ کو اس چٹھے پہلے چل میرے دوست
میرے پاؤں
سنگریزوں کی چھینٹ میرے زخمی پاؤں
مجھ میں اب چلنے کی طاقت بھی نہیں
آہ !

ایسے نہیں
جس طرح
شہرِ بغداد کے حمال
اپنے گاندھے پہ اٹھائے ہیں کوئی بوجھ
اٹھا
سند باد : شہرِ بغداد کے حمال
تو انہیں جانتا ہے

میرے قصوں کے وہ دسیا ہیں

شریک بخش

وہ مجھے بانٹتے ہیں

پیرِ قسما پیا، ایک نعل ہی کیا تو بھی مجھے جانتا ہے

تو کون ہے

میں کون

کیا ہے یہ کمانی

یہ کمر ہے

عقدہ ہے

صلوات ہے

احساس ہے یا سایہ احساس

یہ کہ وہ ٹٹا ہوں کی سزا ہے

کوستم

نا کام مقناؤں کا

احساس زیاں کا

تو کون ہے

میں کون ہوں

اس چمچے کے آئینے میں پہچان

ان کی پیچ پر پیرِ قسما پا کے قلعے

سندِ باح : اُن پر عظمت

میرا ہی عکس نظر آتا ہے

میری ہی مسخ شدہ صورت ہے

میرے کندھوں سے اُتر

میرے سینے پر تیرے پاؤں کی چھنی

مری شہر پر تیرا لہجہ

نفسِ میرا نفس - میرا نفس (دہناتا ہے)

پیرِ قسما پیا : (خند) میں کون ہوں

تو کون ہے

لے جاں گیا اب (فقد)

سندِ باح : (انجنت برے) شیطان ! (بڑے کا فقد)

پیرِ قسما پیا : شیطان کہ فرشتہ ہوں کہ انساں

میں تجھ سے ہوں

تو مجھ سے ہے

نادان

فوریستی کا نہیں کوئی بجز مرگِ طوط

سندِ باح : بادہ تاک مگر

ذلتِ زیست

ستمِ رانی احساس کا ہے یہ بھی علاج

اگنِ ایک اذیت ہے مگر

مگر

زہر ہی زہر کا تریاق ہوا کرتا ہے

بے خودی بادہ انگور میں ڈھل جانے کی

میرے عظمت کو آج

سایہ تاک نکل جانے کا

(پتیا ہے - جنتا ہے)

پیرِ قسما پیا : اے - تو یہ کیا پتیا ہے

سندِ باح : یہ بھی ایک راز ہے

مرتبہ و محفوظ

پیرِ قسما پیا : بتا

سندِ باح : آہ

مگر میرا لہجہ

میری شہرگ پر تیرا لہجہ ہے

ہوں کیے

پیر قسم پا: لے

چھوڑ دیا

اب بول

تو یہ کیا چیتا ہے

سند بلال: نسخہ عمر جواں

آب بقا

مرگ پیری کا علاج

نسخہ محمد شباب

پیر قسم پا: مرگ پیری کا علاج

نسخہ محمد شباب

راحت و ہمیشہ دوم

سند بلال: خضر و ایکس کا سربت و محفوظا طلسم

پیر قسم پا: آویہ آتش تیاں

میری رگ رگ میں جوانی کی اُٹٹ

باد باں بن کے مجھے

کسی انجانے جزیرے میں لیے جاتی ہے

سند بلال: ہے صاعقہ و شعلہ و سیاب کا عالم

یہ ڈھمکی جذبات سے نہ راسے ہونے جسم

ہے کاشی کا مندر کہ یہ بھنا کا کنارہ

ہے شام سزا دہ پ کہ یہ صبح بنارس

یہ بعت بغداد ہے یا دختر بابل

رقاصہ افلاک کی بازیب سے اڑتے ہوئے جگنو

ادھن کی موسیقی جس میں ذیل کی غن تھیں ہو جائے

نسوانی آوازیں

غزل

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا مورچ شراب

رونی شہر غزالوں ہے قریب آجاؤ

میری بانوں میں امیدوں کے نول کھیلے ہیں

دعوتِ مویج ہماراں ہے قریب آجاؤ

آرزو صاعقہ ساماں ہے قریب آجاؤ

جنت پہلوئے جاناں ہے قریب آجاؤ

قریب آجاؤ

قریب — اور قریب

(موسیقی ڈوب کر پس منظر میں چلی جاتی ہے)

سند بلال: مگر پاس آکر بھی تم دور کیوں ہو

تمہارے تنفس کی آواز

اک سر و شعلہ ہے

حدت سے عاری

جلائے نہیں ہیں شرارے تمہارے لبوں کو

تھیں پاس پا کر بھی آغوش خالی ہے میری

تمہارے بدن کی نمازت کہاں کھو گئی ہے

بناؤ

بناؤ

تمہاری گھٹاؤں سی زلفوں میں آسودگی کیوں

تمہاری نگاہوں میں یہ فاصلے

دور سے دور ترکیوں چلے جا رہے ہیں

کنارے پر طالع کو چھوڑ کر جیسے کشتی — وہاں

عورت: نہیں تو

تمہیں چھوڑ کر میں کہاں جا رہی ہوں

میں ہوں

جہیں تھی
شخص کی سرکشیت کی طرح
ہوئے محل کی طرح
سند باح : ان کی جیسے کوئی
ادھوری کمان
مگر کون ہو تم؟
عورت : تیرا خواب

تصویر
تخیل، جھوٹا ہوا کا
کرشمہ، تصور کی تخلیق
تیری قتا کا
نوازش کی جادوگری کا بیوی
(میری، طوفان)

سند باح : جانے اب کو نسا سال مری تقدیر میں ہے
کونسا تیرا ہی ملے تقدیر میں ہے
جانے کس کسٹہ کسٹہ پہ لے جانے لے
مگر کو یہ صحت بلا
سفر کرب میرا ختم بھی ہو گا کبھی
داؤن

آواز : یہ محل کیسا ہے
کیسا نسبت

بلبل سا درون صحرا
نہ در نہ در بان

۱ : نہیں نہیں

یہ نہیں ہے گنبد
تو پھر یہ کیا ہے

کسی کے کپ میں کی طرح
میان دشت جتا
وفا کا نشان روش
۱ : نہیں نہیں

یہ کسی جفا بھر جہاں گویہ کی خانقہ ہے

۲ : نہ محل ہے یہ

نہ خانقہ ہے

نہ مقبرہ ہے

۳ : تو پھر یہ کیا ہے

۴ : سب کے اتار

یہ خزانہ ہے

شہر بلقیس اور سیماں کا

ایک سوائے جس کو صدیوں سے ڈھانپ رکھا تھا

جستجوں ہزاروں تیار جس کی نذر اجل ہوئے ہیں

۵ : ہمارے قسمت چمک اٹھی ہے

تو آج اب اس کو مل کے ڈھانپیں (ہما بھی)

سند باح : مٹھ جاؤ

جس کو دینے بگھتے ہو تم

وہ دینے نہیں ہے

یہ پتھر نہیں ہے

یہ چونا نہیں ہے

نہیں ہے کوئی سنگ اور شست کی کوئی تعمیر

کہ جس پر گماں ہو عمارت کا تم کو

۶ : مگر کچھ تو ہے یا فقط دابر ہے

تمہارے فسانوں کی مانند (تمہارے)

سند باح: یہ رُخ میں بھائی

کہ حوا میں دُخ نام

اک طائر دیو پیکر بھی ہوتا ہے

مجھے یوں نظر آتا ہے کہ

یہ بیضہ رُخ ہے

اس کو نہ پھیر دو

مبادا کوئی ابتلا ہم پہ نازل ہو اس سے

۱: بٹاؤ میاں ایسے تھتے

ہزاروں سنے ہیں

حکایت تمہارے سفر کی تو صد داستان ہے

مگر اس کو حال ہی مان سکتا ہے

ہم نام تیرا (تقدیر)

سند باح: مگر جلد بازی کا انجام اچھا نہ ہوگا۔

۲: بٹاؤ میاں

ہم تو آج اس دینے کو حاصل کریں گے

رہے تم

سو تم

اس کے سامنے میں سستاؤ

آہیں بھرو (تھتے)

اور اگر

کوئی خطرہ ہو

(تھتے۔ بیضہ رُخ کو تو دینے کی کوشش۔ ہاں ہی)

۳: یہ

بہ اندھیرا سا کیوں چھا گیا ہے

یہ بادل سے کیا ہیں

(رُخ کے پردوں کا شور)

سند باح: یہ رُخ میں بھائی

بچاؤ جانیں

وگرنہ آج ایک ایک ہم سے

اجل رسیدہ ہے

چند لمحوں کا زمانہ ہے

(بھگدڑ۔ خوفزدہ۔ ہجوم۔ پرندوں کی چہنیں

۔ پرندوں کی سرسراہٹ جیسے آندھی)

مقدور میں میرے خرابی لکھی ہے

مجھے چھوڑ کر چل دیے میرے ساتھی

گناہوں کا ان کے نتیجہ

بھی کو بھگتنا پڑے گا

عجب قاعدہ ہے

عجب کھیل ہے یہ سزا و جزا کا

مگر یہ پرندے

چٹانیں یے اپنے پنجوں میں

کشتی کی جانب

کہاں جا رہے ہیں

(دو۔ سچے بکار اور سمندر میں چٹانیں گرنے کی آواز)

سفینہ ٹوٹ گیا

اور سب میرے ساتھی!

قضا و قدر کے راز آدمی کو کیا معلوم

رہائی کا اس دشت بے در سے امکان کیا ہے

نہیں کچھ نہیں سو بھتا

مجھے سایہ موت میں زندگی دینے والے

وسیلہ رہائی کا میری

سمائے تیرے

اللہ کوئی نہیں ہے
مگر یہ صنوبر سا کیا ہے

ستون سا

یہی تو نہیں ہے
نکلنے کا اس دشت بے در سے زینہ
خون کے پیروں پہ چڑھتے ہیں غار جیسے
اسی طور

میں بھی

چمٹ باؤں کا پانے لٹ سے
بنے گا میں میاں شہ پر
راہی کا اس دشت بے در سے۔۔۔

آؤں مسرت پروانہ پہ دم دینا ب

آج وہ طاقت پر وار میں رہے مجھے

گوئے ہر کان کی طاعت مجھ کو نظر آتا ہے یہ کتہ دارض

اس کے سب کو وہ

دشت و جبل

بحر پر شور نہیں جن سے سینوں کو مغر

کسی سائل کی تجسس کی طاعت

خط تقدیر کی مانند نظر آتے ہیں

کائنات کو اس کے بھی سچا ہوں

برف کے ٹکڑوں کے مانند مجھ جانیں کے

سوچتا ہوں کہ غلوں سے غلوں سے پرے

کتنی دنیا میں ابھی آدم کی نکاحوں سے

تصویر سے نماں

نیلوں گنبد افلاک میں پوشیدہ ہیں

کتنے پیکر ابھی اس پردہ تصویر میں یاد دہ ہیں
سوچتا ہوں کہ مدد مہر کی روشنی تبدیل

کوئی منبع انوار کی شرمندہ ہے

کھکشاں کون سے افلاک کی ہے راگزار

کون ہے اس کے ارادے سے ہیں قافار

یہ ستاروں کے مدار

مگر جس شمس و قمر کون سی پرکار ہے

جیرتی کس کے ہیں یہ یل و نہار

سوجھتا ہوں

کہ نہاں خاں ادراک کی بے راہ روی

شوق بے حد کا جنوں

زیست اور زیست کی در یوزہ گری

فکر فردا و غم و دوش و ستم رانی اموز

سوچتا ہوں کہ میرے عشق کا انجام یہی ہونی

بھوسے سے پہلے میرے اندیشہ جیاک سے پتہ ہونی

میرنی تخلیق سے

تخریب سے پہلے کیا تھا

اس کے آثار

مہر بنی لغزش پا سے پہلے

آدم و حوا کی تشہیر سے سوانی سے پہلے

شجر ممنوعہ تھا کیا سوچتا ہوں

کیا کوئی باز تھا۔۔۔ سربستہ و محفوظ

جس کو داکر نے کی پادشہ میں آج

عیش ام و زہرا مجھ پر مسام

یہ می سوجھ کر

مجھ سے کتنی ہے کہ ہے

مری افتادہ باں گامی ایام گزار
اک وہی راز کو سر بستہ بھی ہے عام بھی ہے
وائے بے مری ایام و ستم رانی تیر مری
کس خوابے میں مجھے نے کئی تعدیر مری
پیکر خاک تھا میں

کرۂ خاک ہوا مجھ کو نصیب
مری پرواز مگر ٹوٹ رہی ہے شاید
قعر و ریامیں اُترتی ہوئی کشتی کی طرح
دل مرادوب رہا ہے برآں
جانے وہ کون سے افلاک تھے روزن تھے
درتچھے تھے مرے پیشِ نظر
کون سے خواب کی سوغات تھے
وہ لوگوں نے بخشہ

اے وائے

بغبارِ آب تو ہے تاحیرِ نظر

پھر وہی دشت و جبل

غیر ہے ہر

نہ

سر چٹا ہوں شہرِ غیر کی پرواز کا انجام اپنی ہونا تھا

چہ وہی میں ہوں

وہی گردشِ آہم بھی ہے

چہ وہی دانہ وہی دام بھی ہے

مہ کب مجھے اک حادثی آؤم میں لے آیا سے

یسی وادی کہ نہیں ہیں گہر گہا و نیال

جس کے غاروں میں تھا مارِ سیاح

جس کے سایوں میں پڑے موتے ہیں

شعورِ مکن

اڑوے

نیشِ عقرب سے سوا جس کی چٹانوں کی چھین

ایسی وادی کہ جسے

سحر و افسوں و طلسمات کی وادی کیسے

دیو آسائیں کھڑے جس کے پہاڑ

حادثے کے فسانوں کی فضا ہو جیسے

اک طلسمات کا عالم ہے مرے پیشِ نظر

ان گنت لعل و گہر - نیلم و یا قوت کئی

چاند کا جن پہ گماں ہو وہ زمرہ کے شجر

وہ جو ہر کہ اندھیروں میں ابالا ہو جائے

رقصِ حادس کا ہر سمت گماں ہوتا ہے

ایک اک لعل بدخشان و مین

دُورِ ناسفہ و نایاب - کئی

مضطرب ہیں کہ انھیں زینتِ دستارِ کروں

اس نہاں نہانہ کو ہمارے کے امراء

مگر مثلِ کسار

واہمہ بن کے مری - او میں شامل ہیں

نہیں بن تے نہ

سوچتا ہوں

یہ جواہر نہیں انکار تے ہیں

ان طلسمات کی دنیا کے شرار سے ہیں منہیں

کسی مارنے فسون گئے مٹا رکھا ہے

ان کے پھوٹے ہی کئی مارِ سیاح

اڑوے خوابیدہ کئی

جاگ اُٹھیں گے جلا دیں گے مجھے

یہ سدا کی سدا سے گیل جائیں گے یہ بل و گھر
 وہ مگر کیا ہے گھر وہ دہی غار کے پاس
 پھر مری گات میں ٹھیکہ ہے وہی بار میں
 مری برائی کا سماں جو بنا
 آئی پھر دشمن دیر نہ مرا
 ہیکل باندھتے تھے دیکھ رہا ہے اس طور
 جیسے کتا ہو

شیطان : مقتدر کے دھنی

دیکھ میں تجھ کو کہاں لایا ہوں یہ میرے جتنے نیت
 مجھ کو بھی یاد ہے وہ باغ جناں
 جس کے سایوں کا شمار
 آج بھی تجھ کو لیے پھر تا ہے یوں خاک بسر
 بحر و بر جس کے لیے
 ایک کیے ہیں تو نے
 تجھ کو تو یاد ہی ہو گا لیکن
 باغ بہشت میں بھی یہ بل و گھر
 تو نے دیکھے تھے کبھی
 سچ تو یہ ہے کہ وہاں او یہی کیا رکھا تھا
 بس شب و روز شناختی وسیع و درود
 ایسی کیسا فی اوقات کہ بی بل جانے
 کوئی جگہ نہ شو بیش
 نہ چھاپنے جہاں گزراں
 در و بھراں نہ کہیں راحت وصل
 کہیں طوفان نہ کنارہ امیر ساحل
 آرزو کوئی نہ نہ اہش نہ خیال
 تیری حالت پہ اگر رحم نہ آتا مجھ کو

نسل انسان کا نشان بھی نہیں پر ہوتا
 ایک قوا کے سوا
 تیرا ہم جنس بھی داں کوئی نہ تھا
 تھا بھی کوئی؟
 وہی بے عزم ملا نکہ
 وہی بے جاں حوریں
 ان سے بھتی بھی تو کیسے بھتی
 خیر — اس ذکر کو اب جانے دو
 آئی ان ساکنی و بے کیف فضاؤں کی جگہ
 ایک دنیا ہے تری تجربہ گاہ
 آج تیرا تری تابع تقدیر نہیں
 کسی مشاق صنف کی طرح
 خود ترا لاکھ ہے غلاق ترا
 ایک بنی سل میں ہزاروں پیکر
 منتظر ہیں تری صفائی کے
 میں تو کیا
 میں تو خادوم ہوں ترا
 روز ازل کا مذاج
 خود خداوند بھی قائل ہے ترا
 تری بجا و کافن کا بی کا مذاج ہے وہ
 تو اگر خود کو خدا بھی کہہ دے
 پھر بھی زیبا ہے تجھے
 اور یہ بل و گھر
 یہ ترابخت رہا ہے کہ تجھے
 آج وہ دولت نایاب ملی ہے کہ
 سلاطین زمین

ہوں تہے دے کے غلام
 اور حسیناں جہاں
 فردیتی و تلو پھرہ تائیس و سلمیٰ اک ایک
 خدمت خاص کی ہوں تیری رفیق
 سند بلال : کدہ جسی فروغی و قتادہ مصر
 نازشیں شہر سکندر — تائیس
 اور وہ رگولہ بابل — سلمیٰ
 ابلیس : عشرت شمع شبتاں خیال
 لذت شہر قتلانے وصال
 ایک سے ایک حسین
 ان جواہر کے تصدیق تیرے مقدور میں ہے
 ہیں تصرف میں ترے
 رعب شبی
 باہ و بطلال
 عظمت و شہرت جاوید
 کنیزیں ہیں ٹری
 بے خطر لختہ بڑھا
 بیچ اندیشہ فردا ہے
 عیش فکر زیاں
 حقیقت ہے تو بس ایک — یہی تاعبت نرود
 سند بلال : مگر یہ کیا ہے —
 یہ کون گدرا ہے اس گل سے
 یکس کے پاؤں کا خون رس رس کے منگیزوں
 پہ جم گیا ہے
 مرا گریباں چپ — ہے
 مے ہوں پہ ہو کی بونہیں
 مری بیباں آرزوؤں پہ جس رہی ہیں

پیاس بن کر مرے گلے میں
 بزا خواہش ملک رہی ہے
 مرے دگ و پے میں پچاس بن کر سرک رہی ہے
 میرے پیسنے پہ بوجھ کیسا ہے
 یہ کیا کر گس ہے
 جس کا سایہ
 سیہ تعفن کا اک بگولا سا
 میرے لاشے کو لے کے نعل و گہر کی وادی سے
 جانے کس سمت جا رہا ہے
 (ذہول اور دوگون کا شر جیسے ہانکا — ہریں)
 نہ جانے کس سمت جا رہا ہے مرا سفینہ
 کوئی بتاؤ
 مے پیسنے کے ناخداؤ
 مگر یہ کیا ہے
 تمہارے چہروں پہ خوف کیوں ہے
 تمہارے ہونٹوں پہ کپکپی بن کے بات کوئی
 صدا کو جیسے ترس رہی ہو
 تمہارے ہونٹوں پہ پیریاں بن کے جم رہی ہیں
 تمہاری آہیں
 تمہارے سانسوں میں سوکھے تپوں کی سرسراہٹ ہے
 مرد ساہوں کی سنسنی سی
 تمہاری آنکھوں سے جماعتی ہے
 بتاؤ
 بولو
 یہ بات کیا ہے
 محب محما ہے

یہ ہے ہاتھ کی تھک چکی جاتیں گے یہ مل و کر
 وہ عکس کیا ہے جس کے وہ وہی خار کے پاس
 پھر مری گات میں شاید ہے وہی بار میں
 مری سوائی کا ساں جو بنا
 آئی پھر دشمن دیرینہ ما
 محکم باندست مجھے دیکھ رہا ہے اس طور
 جیسے کہتا ہو

شیطان : متذکر کے وطن

دیکھ میں تمہ کو کہاں لایا ہوں۔ میرے جنت رفت
 مجھ کو بھی یاد ہے وہ باغ جناں
 جس کے سایوں کا شمار
 آج بھی تمہ کو لیے پھرتا ہے یوں خاک ہر
 بحر و بر جس کے لیے
 ایک لیے ہیں تو نے
 تجھ کو تو یاد ہی ہو گا لیکن
 بدست میں بھی یہ مسل و ٹبر
 تو نے دیکھے تھے کبھی
 کسی تو یہ سب کہ وہاں او یہی کیا کیا تھا
 بس تب وہ دشنام دانی و سیح و دور و
 اسی کیسانی اوقات کو بل بوتے
 کوئی دکھ نہ نہ شہر بش
 نہ ٹھکانے جہاں گزراں
 در و بھراں نہ کس راحت وصل
 کہیں جہاں نہ کنارہ امید حاصل
 آرزو کوئی نہ رہا پس نہ خیال
 تیری حالت پر اگر ہم نہ آتا مجھ کو

فصل انسان کا نشان بھی کیس پر ہوتا
 ایک حوا کے سوا
 تیار ہم جنس بھی ہاں کوئی نہ تھا
 تھا بھی کوئی؟
 وہی بے عزم خانک
 وہی بے جاں حوریں
 ان سے بھتی بھی تو کیسے بھتی

خیر — اس ذکر کو اب باندھ دو

آئی ان ساکن و بے کیف نضاؤں کی جگہ
 ایک دنیا ہے تری تجربہ گاہ
 آج تدبیر تری تابع تقدیر نہیں
 مٹی مشاق صنم گزری طرح
 خود ترا لہت ہے غلاق ترا
 ایک ہنسل میں ہزاروں پیکر
 منتظر ہیں تری صنم کی
 میں تو کیا
 میں تو خادم ہوں ترا
 روز ازل کا مداح
 خود خداوند بھی قائل ہے ترا
 تری لہجہ و کافن لاری کا مداح ہے وہ
 تو اگر خود کو خدا بھی کہہ دے
 پھر بھی زیبا ہے تجھے
 اور یہ مسل و کر
 یہ ترابخت رسا ہے کہ تجھے
 آج وہ دولت نایاب ملی ہے کہ
 سلاطین زمین

ہوں تو سے دوسکے غلام
اور حسیناں جہاں
خودیتی و کلو پطرہ تائیس و سوسی اک ایک
عدت خاص کی ہوں تیری رفیق
سند بلال : کلمہ حق فروغی و قتالہ مصر
نازشیں شہر سکندر — تائیس
اور وہ رنگولہ بال — سلمے

ابلیس : عشرت شمع شبتاں خیال
ذات شہر قتلے وصال
ایک سے ایک حسین
ان جواہر کے قصد تیرے مقدور میں ہے
ہیں تصرف میں ترے
عجب شہی
باہ و بلال
عظمت و شہرت جاوید
نیز میں تری
بے خطر ہاتھ بڑھا
بہی اندیشہ فردا ہے
عشرت نگار زیاں

حقیقت ہے تو میں ایک — یہی ساحت لہروز
سند بلال : مگر یہ کیا ہے ۔
یہ لون گدرا ہے اس گل سے
کس کے پاؤں کا خون رس رس کے سنگریزوں
پر جم گیا ہے

مزارین چپ رہا ہے
مے ہوں پہ سو کی بونہیں
مری ہیانہ آرزوؤں پہ نہیں رہی ہیں

پایس بن کر مرے گلے میں
ہزار خواہش سنگ رہی ہے
مرے دل و پے میں پھانس بن کر سرک رہی ہے
میرے سینے پہ بوجھ کیسا ہے
یہ کیا اگر گس ہے
جس کا سایہ
سیہ تعفن کا اک بکواسا
میرے لاشے کو لے کے نعل و گمر کی وادی سے
جانے کس سمت جا رہا ہے
(دھول اور توں کا شر بیٹے لنگا - ہریں)
نہ جانے کس سمت جا رہا ہے مرا سفینہ

کوئی بتاؤ
مے سینے کے ناخداؤ
مگر یہ کیا ہے

تمہارے چہروں پہ خوف کیوں ہے
تمہارے ہونٹوں پہ کپکپی بن کے بات کوئی
صدا کو جیسے ترس رہی ہو
تمہارے ہونٹوں پہ پیرٹاں بن کے جم رہی ہیں
تمہاری آہیں
تمہارے سانسوں میں سرکے تپوں کی سہرا ہٹ ہے
مرد ساہوں کی سنسنی سی
تمہاری آنکھوں سے جمائتی ہے
بتاؤ
بولو

یہ بات کیا ہے
محب محبا ہے

خیزنا کہ بھول جاؤ
 جس کو ہر سانس سوچ دیا ہے جو پٹ کر کسی نہائی
 کسے خبر ہے وہ صبح حتیٰ بھی
 اگر میں ہے تال بستی
 تو پھر یہ غم کیوں
 مری کینیڈی کہاں ہیں — جاؤ
 انیس بلاؤ

بلاؤ نائین و مشتری کو
 بھاری نعل میں یا دامنی و نگر فردا کا ذکر کیا
 اٹھاؤ بربط

داسیفہ رواں دواں ہے
 نہ علی کوئی حتیٰ نہ کوئی ہوئی
 جو سانس جاتی ہے پھر نہ آئے گی
 واؤ بش طب مناؤ
 (انس — داؤ کھین کا سو)

دو دیکھا ہے!
 اتنی کی جانب وہ سوتے مغرب!
 میان دریا سیاہ جنگل

سراب ہے یا کوئی جزیرہ ہے جس کی تم کو خبر نہیں
 حتیٰ مرے پیچھے کے ناندو

ناخدا! یہی دو ساحل ہے جس کا سایہ
 ہمارے پیروں پر غائب کرنا ہے
 اسی کے قصے ہمارے ہونوں پہ نغمہ تھے
 اسی کی وحشت سے ٹوٹے پتوں کی سرسبز بستی
 ہمارے ماسوں میں

بس رہی تھی

تھا۔ ہی زندہ دلی کو کیا ہو گیا ہے — دو
 اسے کوئی بات بھی ہو آفر
 ہوا موافق ہے
 ناؤ سالم ہے
 دن کا سورج ہے
 شب کو تارے

تو چہ یہ اجڑتے ہونے سے چوس
 یہ خوف و وحشت
 اگر مہمان نہیں تو کیا ہے
 کوئی فہم ہے کہ میں نے آنا
 تمہاری نعل و نعلوں کو کیا بتا دیا
 دریا نہیں تو تمہاری باؤں سے تم کو دیوانہ کر دیتے
 مجھے تو سب مرے ہائیڈو

مجھے بھی یہی دوں سے سانس پڑتا ہے یہ دو
 مرنا نصیب ہے ان کا حاصل
 جو جوں نہ ہوتا تو یہ نہ ہوتا
 ان سب یادوں کا تاج

طرک کمان تک میں پوچھتا ہوں
 جہاں وہ ہیں بن آؤں گھر آج
 یہ سلامت وہاں وہاں ہے
 جہاں تیرے جہاں ہمیشہ
 ہزاروں

میرا جو وہ پناہ ہے
 تو چہ کہن تک

یہی وہ جگہ ہے جس کے سایوں میں وہ کشتی ہے
کہ اس سے بچ کے کوئی نہ اب تک نکل سکا ہے
یہی ذخیرہ ہے جس کی شاخوں میں ابی آدم کے
اب وجد

حروج انساں پہ نہیں رہے ہیں
(بند روں کے غوغائے کی آوازیں - حورتوں کی
چیمیں — دہشت زدہ لوگوں کا شور)

سند بلال : اُن نہ آیا یہ وحش
مری تہذیب و تمدن کے یہ آئینہ صنعت - پھر نہ
اُن یہ جزا دیر سے
جانے کشتی کو مری نے کے کہاں جانیں گے
مراسمان سفر
میری تائیس و سولی
میرے آگاہ حرب
میرے قہر
میرے سو
سب کے سب
اب جسے جزا دیجے جاتے ہیں
اسے داسے

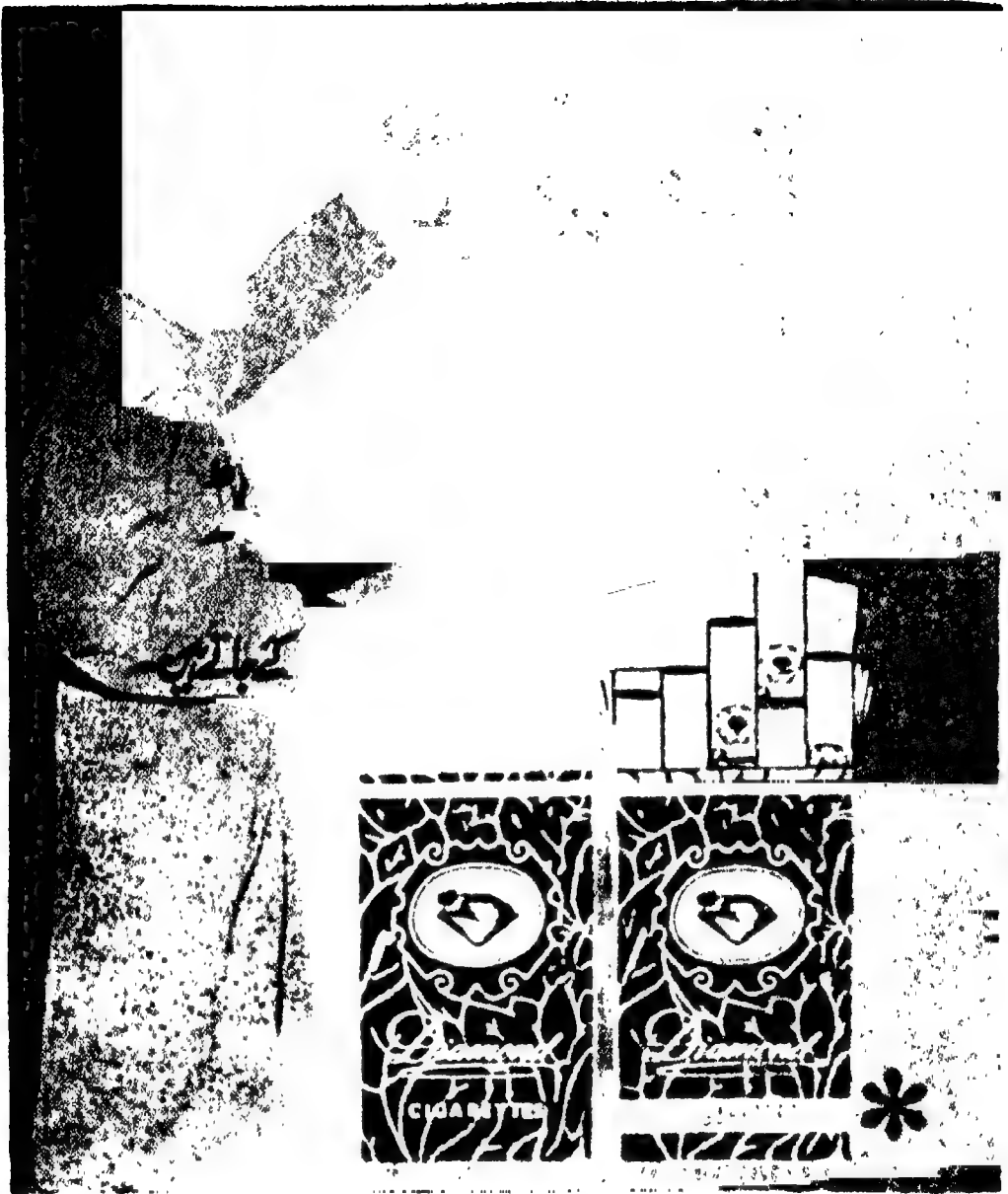
(رجوع و پکار - مدوں کا شور)

سند بلال : آج پھر ہم سفر دل میں مرے
غل امراتی بدلتا ہند
کسی انجانے جزیے کی خبر دیتا ہے
آج پھر مری ہوا
پر وہ محلِ بلی سے اُڑا لاتی ہے
خند و سحر و سخن

گوشہ چشم آہوا
مجھ کو اب میرا جنوں
جانے کس قلعہ میں بے جاوہ پہ لے جائے گا؟
ہر سبک رو پہ مجھے خضر و الیاس کا گدرا ہے کہاں
مجھ کو ہر راہ سے منزل کی ہوا آتی ہے
میں نے فرعون کو موسیٰ سمجھا
میری کوتاہ نگاہی کے سبب
یہ جیسا لیے آیا ہے نظر
مجھ کو ہر شعبہ و گھر
میں نے ہر بات کو خدا مانا ہے
ہر عظم خانے کے ناقوس کی آئینہ صدا
پانے کو بں کیسے
حلقہ زنجیر بنی
نقش ہر پا پہ مرا ذوقِ سجود
قصدِ زمیت کا عنوان بنا
بہ قدمِ دوری منزل کی خبر لایا - مگر
آبِ حیات کے بہانے پر بار
تو خطرات میں ہر نہ مجھے پہچان گیا
جاوہ پر پانی مری پھر بھی لکھ کر نہ ہونی
تقدیمِ آشامہ مرا شوقِ سنہ
آج پھر مجھ کو بلال ہے کہ آؤ !
پھر کسی نانا دنا دیدہ سے آواز جس
پہ کوئی منزل موعود جاتی ہے مجھے
مجھ کو ہر مریج پہ عمل کا کہاں ہوتا ہے
نارندابن کے اظہار آتی ہے ہر مریج سب
خود عصیاں کے سوا - سہ پتیا ہوں

ہندو اعمال مرا
 کچھ بھی نہیں
 ہے یہی وقت سفر — دامن صد چاک مرا
 او یہ تھوڑے خصال کی مانند زالی ناؤ
 بادیاں جس کے ہیں
 پتوار

نہ مستول کوئی
 بانے کس ساحل گم نشہ پہ لے جائے گی
 کون بانے مری منزل ہے کہاں !
 دھرم ہر موی میں ہے حلقہ صد کام نہنک
 دکھیں کیا گزرتے ہیں قعر سے پہ لہر ہمنے تک



گر تم کو کو ایک خوشگوار آپ وہو کے انتخاب کا اختیار ہو تو یقیناً وہ منسل سگریٹ کے بہترین ماحول کو منتخب کرنا۔ اصل اسی طرح مجھے تمہارے
 کو خوب منسل کی کڑی احتیاط اور عمرانی میں اہلکار ہوا ہے۔ اسی طرح آپ بھی ڈامنڈ سگریٹ سے اور زیادہ فرحت و تسکین
 حاصل کریں گے۔ منسل کا وہ جواب سگریٹ ڈامنڈ آپ مکمل نیر کسٹڈیشنڈ پائٹ میں تنہا رکھا ہوا ہے۔
 * ڈامنڈ سگریٹ کے پیکٹ پر لکھا ہوا ہے کہ نیر کسٹڈیشنڈ پائٹ میں تنہا رکھا ہوا ہے۔

لا جواب سگریٹ

منسل کو بہتر سبب سے

ڈامنڈ



صبر کا نعام

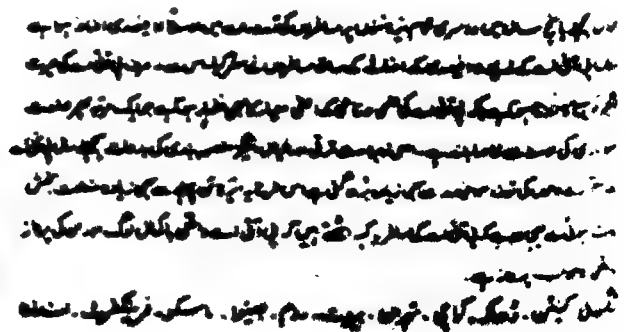
درپے صبری کا انجمام

ایک صاحب نے اپنا انصافی بونڈ بیٹے بھائے جیٹا ڈھ ادریہ صاحب اے فریلائے آفغان کی بات گاس پر لیک
 قرضہ اندازی میں ختام گل آیا: آپ گھر صبر کی خوشی کا کیا پرچھا۔
 کاغذ کا فاسا ایک پندہ کس قدر قیمتی ہو سکتا ہے۔ یہ ہے انصافی بونڈ کا کرشمہ۔ دس روپے کے انصافی بونڈ کمپنیاں
 میں ہار بار ۵۰ ہزار روپے کی مالیت کے ۱۳۹ انصافات تقسیم کئے جاتے ہیں۔ پہلا انعام ۲۰۰۰ روپے۔
 قرضہ اندازی میں شامل ہونے کے لئے اس سے کم از کم ایک ماہ پہلے انصافی بونڈ خریدیں۔ انصافی بونڈ لاؤنسٹ
 بھنا ایسی جاسکتا ہے اور بھنائے ہوئے بونڈ دہا ہا فروخت کر دیئے جاتے ہیں تاکہ ان پر بھی انعام پانے کا موقع مل
 رہے۔ آپ اس سے کیوں ناغہ نہ اٹھائیں

دس روپے والے انعامی بونڈ بنکوں اور ڈاک خانوں سے خریدیں
 ملک کے لئے بھائیے
 بننے کے لئے بھائیے



ہاکم الملک
لاہور پرواز



قلیدروایات اور جلیدوضع کی ایکندار

ڈلیو۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی۔ کی
گھریلو مصنوعات
حسریہ

ڈلیو۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی۔ کی گھریلو مصنوعات شائع ہوتے ہیں
کھلونے۔ آرائشی پارچے جات۔ نمایاں بدو سریز پینٹنگ
چیزیں اپنے گھر کی رون کو دو آواز دیتی ہیں۔ مصنوعات
اندرون اور بیرون گلی میں پسند کی جاتی ہیں۔
آپ بھی اپنے گھر کی آرائش کے لیے ان مصنوعات کا
انتخاب کیجئے۔



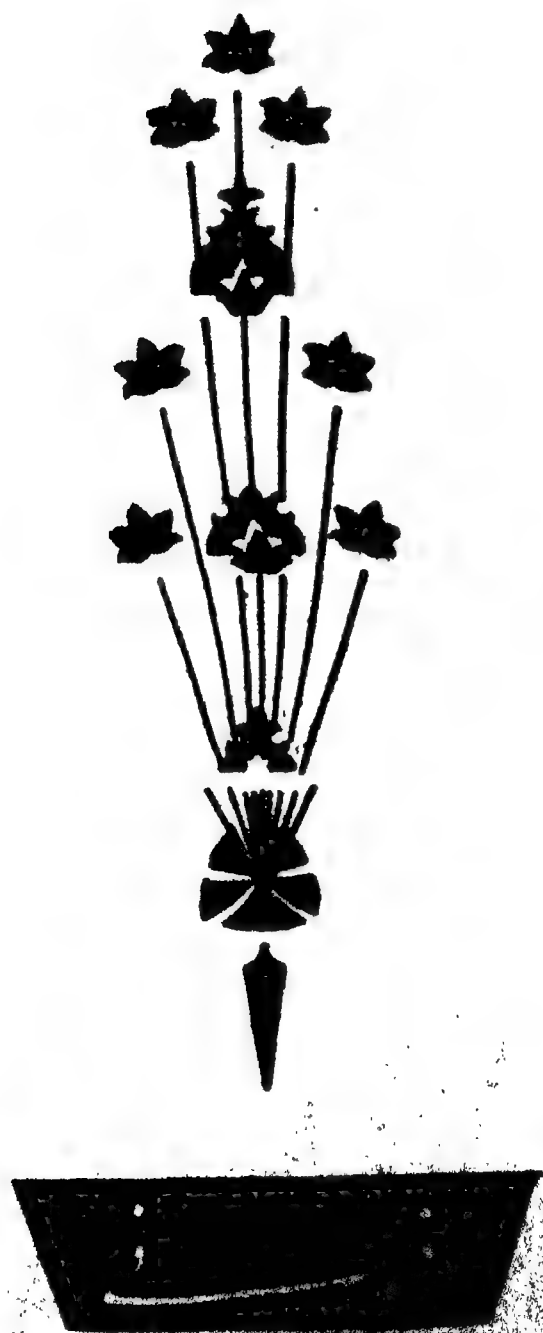
مغربی پاکستان
منبعی تحریکی کامیابی

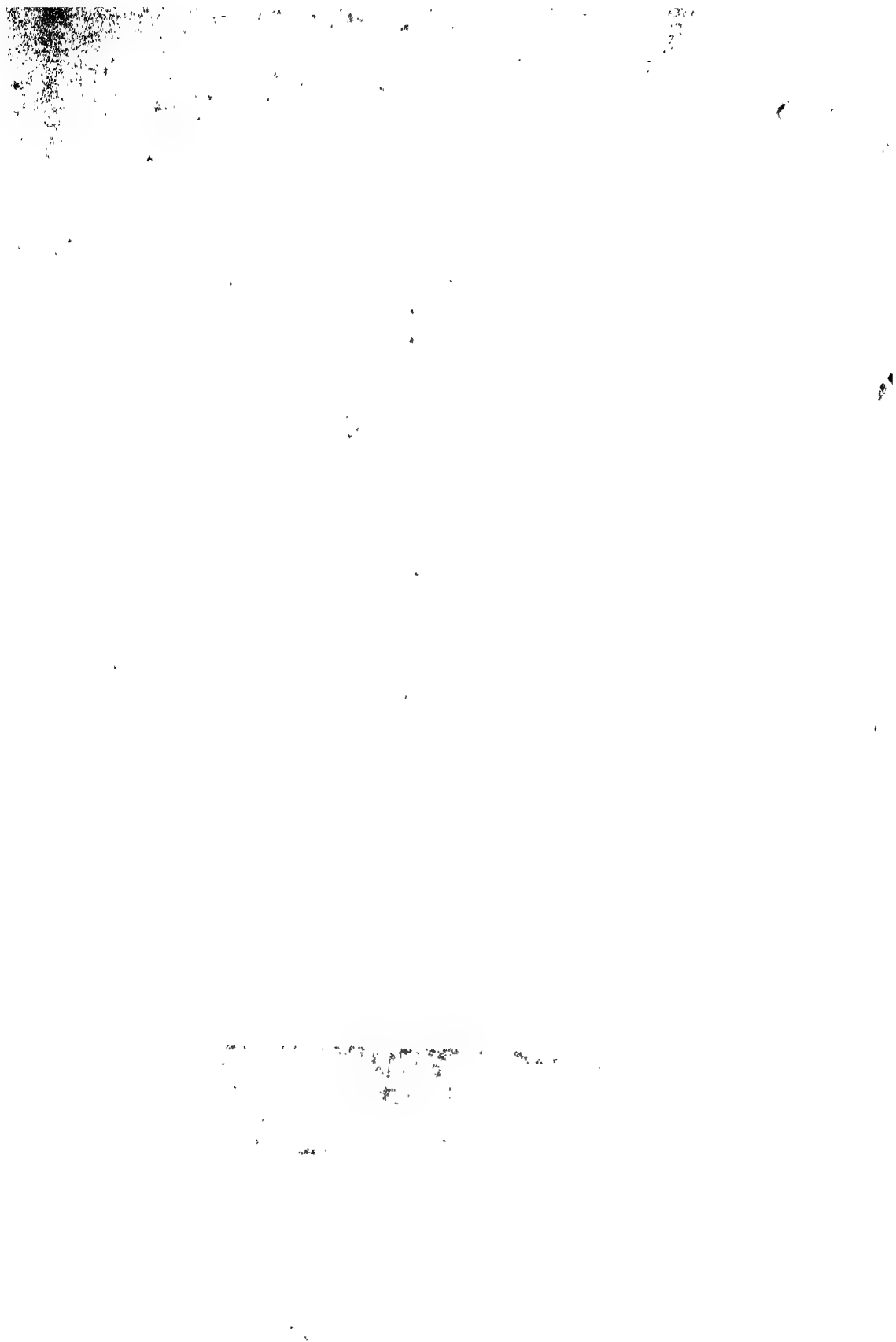
مسکند

پاکستانی

گھریلو مصنوعات

برٹری سٹریٹ اور پکری روڈ۔ کراچی۔ دی مال لاہور۔ دی مال راولپنڈی۔ دی مال لاہور۔ دی مال پشاور۔
دی مال پشاور۔ ملک پلوڑی حیدر آباد۔ بنسٹان لاہور۔





پیاس

کھنچن چندر

نواب بٹا تریا اور زنگان لاڈ لگا تھا۔ زریزہ کو اس سے پسند تھا کہ وہ زریزہ کے ہاتھوں سے پٹ کر اور رو دھو کر صبر کر رہا تھا۔ اسے نوکروں کی طرح بدیہ بستر اندر کر رخصت نہیں ہو جاتا تھا۔

اس کے گندمی رنگ چہرے پر چمک کے داغ تھے اور وہ بہت دُجو تھا اور بہت کھاتا تھا اور کچھ میں نہیں آتا تھا کہ جو وہ مانتا ہے وہ کہاں جاتا ہے۔ اس کی آواز میں ایک جلی سی تلاہٹ تھی۔ جب وہ کھڑا ہوتا تھا تو کبھی سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی پر ایسا کسی دروازے سے گھ کریم دروازے میں یوں کھڑا ہوتا تھا کہ پاؤں فرش پر گھسٹ رہے ہیں سر بائیں طرف کو دکھا ہوا ہے اور دائیں طرف کو نکلا ہوا ہے ایک ہاتھ دلتے پر ہے تو دوسرے سے چٹکھا رہے ہیں۔ نواب کو عورتوں کی طرح ہاتھ دلا رہا تھا کہ اسے تروق تھا۔ انہی کی طرح وہ فقروں کو چھانکے یا پٹا کر کے بارش کی طرح کھینچنے سے بولتا تھا۔ مگر باہر کے کام میں بہت ہوشیار تھا۔ اس نے اپنی تمام محنت خیر اداؤں اور غروں کے باوجود قابل برداشت تھا۔ کھانا اور چینی دن سے نواب تھا اور نواب کو کچھ میں کام کرنا پڑا تھا۔ وہ سرفروں کے کام کے لیے رکھا گیا تھا۔ زریزہ زکیوں کے کالی میں پڑھانے جاتی تھی اس میں اپنے دُجو جاتا تھا اس لیے اگر نواب کھانا دیکھنے کو کوئی چلے اور اس سے شکل ملے یہ تھا کہ باورچی کون ڈھونڈے اور کب؟ یہاں کسی کو فرصت ہی میر حتمی۔

نواب کو جب تین دن کچھ میں جین گھارنا پڑے اور کسی کی چٹنی میں رختے مصالحے مقرر مریا کرنا پڑا تو اس کی ساری تلاہٹ اور سائیت ختم ہو گئی۔ مردوں کی طرح بڑے کرخت اور جھنجھلا نے جوئے لہو میں بولی پڑا۔ صاحب ہم سے نہیں ہوتا ہم کو ایک دن کی چٹنی اور ہم آپ کے لیے ایک باورچی ڈھونڈ کے مانے گا۔

کوئی باورچی جے ٹھہری نظر میں؟ زریزہ نے اس کی جھنجھلاہٹ پڑھوائے پوچھا۔

کچھ سے ابرا کہ نواب کو جو ٹھنڈی ٹھنڈی جھا کے جھوٹے ٹکے تو اس کے مزاج کی سائیت پھر اُجھلنے لگی۔ اس پر اسے کوئی بالوں کی ٹھکراہٹ جولی تو اور بھی پھیل گئے۔ آپ نے ایک کدہ حاد پر اُچکایا دوسرا پیچ کیا؟ بائیں کوٹے کو اندر کی طرف ٹھکرایا اور دے کو دھاما باہر نکالا اور اپنے دونوں ہاتھ بڑی آواز سے ہتے ہوئے بے۔

اب ہائیں گے کیسے نہ کیسے آپ کیلے باورچی؟ نواب نے اپنے دیئے گھاتے ہوئے باورچی کے منہ کو آپ پر اسرہ لیا۔ ان کی طرح ہارے سامنے کچھ اس طرح پیش کیا کہ جی ہل کے باب ہو گیا۔ جی چا پاسے کو دوں دو بجائ پڑا اور اس کی ساری آواز تلاہٹ نکال دی۔ مقررہ وقت باورچی کی تھی اور باورچی ڈھونڈنے کی فرصت مجھے تھی نہ زریزہ کو۔ اس لیے نواب کو ایک دن کی ٹھنڈی دینا پڑی۔

ایک دن کے بعد اتوار تھا میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھوڑی سی نیلی روشنی میں اپنا سر غودی مے مے دہار رہا تھا۔ کبھی

اس بے فربہ چہاں — جانے کے لیے تیار ہو گیا ہم بھی اندر سے بہت خوش تھے کیونکہ فربہ اب تو تقریباً صفت کی کھاتا تھا۔ وہ کام تر اشتیاق نے سنبھال لیا تھا۔ ذریعہ نے بھی ملے کر لیا تھا کہ فربہ کے جانے کے بعد دوپہر کے کام کے لیے کسی کو نہ رکھے کی اشتیاق کی موجودگی میں کسی دوسرے کو رکھنا درست نہ تھی۔

ذریعہ بولی: دیکھ فربہ کی شادی جو رہی ہے اب تو بھی شادی کرے اشتیاق میں تیری بیوی کو رکھ لوں گی مجھے ایک ملازم کی ضرورت ہے۔

شادی کے نام پر میں نے دیکھا کہ اشتیاق کچھ پڑسا گیا ہے۔ اس کی بھنویں تھکی گئیں۔ تنگ آتے پر بالوں کی میٹھی ڈولنے سے بھینچاؤ کے چھوٹے سے ہونٹ چڑکنے لگے مگر وہ کچھ وہ نہیں۔ سر جھکا کر کھانے کے کمرہ سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد فربہ نے یہ سہ پر ایک عجیب سی سکواہٹ آئی کھانے کی میز کے قریب آکر بڑی راز داری سے بولا۔

”اے صاحب۔ یہ کیا شادی کرے گا اس کی بیوی تو شادی کے دوسرے دن ہی اسے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔“

”کیوں؟ ذریعہ نے پوچھا۔“

”معلوم نہیں مجھ صاحب۔ فربہ بولا۔ ”کہہ جاتا تو ہے نہیں۔“

چند منٹ کے بعد جب ہم لوگ کانا کھا کے کھنچے میں ہاتھ دھوئے کے بیٹے آئے تو دیکھا کہ اشتیاق کچن میں بیٹھ رہی اور راکھ کا زیر پائے سامنے رکھے خاموش گھور رہا ہے اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی اسلوم جذبہ سے عجیب کرناڑی چمک رہی ہیں مجھے پہلی بار اشتیاق میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

آٹھ دس روز کے بعد فربہ نے علی گڑھ واپس جانے کا پروگرام بنالیا۔ اس کے جانے پر اشتیاق بیٹھے بیٹھے بہت رو دیا اس کی انیس سو گھنٹیں اور ہفتوں کے کونے بے حرج چڑکتے تھے مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے فربہ کے لیے سفوی ناشتہ تیار کیا اور صرف اٹھا لیٹنے کا سفر تھا مگر قہر کے پرانے اور سرخ مچھوٹا ہوا اور کھانا بھرنا اور بیسی روٹی اور کھنکھائی آداب کر لی۔ وہ اس کی جھوک سے واقف تھا۔ خود اپنے خرچ سے اس نے فربہ کا ناشتہ تیار کیا تھا اس نے ہم شطرت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ فربہ سے بے سکوڑے کر آیا اس کا سامان سکوڑیں رکھا اور اسے پرانی دلی کے سٹیشن پر لایا۔ یہی سوار راکے واپس آیا۔

اگلے دن اس نے مضطرب اور بے چین چہرہ تاراج کیا جیسے اس کو کھانسی یا زہر یا دوسری بیماری کے ویرانے میں کہہ رہا ہو۔ اگلے دن اس کا کام گر گیا تھا۔ قریب اس کے جذبہ کی طرف تھی تھا اور قہر آتا تھا جیسے کسی نے اس کی ماری میاؤں پر پانی چھڑا دیا ہو۔ چلتا تھا سے ڈال اور بے دخلی اور بے پرواہی پر جھگڑا ایسی کی راکھ لگی ہوئی۔ وہ اپنی ٹہنی پر کسی نہ کسی صبر کر کے کھانا زہر کیا اور یہ سون مارا زہر سادہ یونسی پتھر یا تو اشتیاق کو جواب دینا پڑے گا۔

مگر وہ دن کے بعد اشتیاق سنبھل گیا۔ کہیں سے وہ ایک بلی کا بچہ اٹھایا اور اب وہ بلی کا بچہ اشتیاق کی توجہ و مرکز بن گیا۔ وہ کام کرنے کے بعد وہ اپنا سارا وقت جس سے پہلے وہ فربہ کو دیتا تھا اب اس کے بچہ پر صرف کرنے لگا۔ اپنی خواہ کالافا منہ بلی کے لیے دو دو اور گوشت پر غر پر کرنے لگا اور یوں دیکھا جانے تو بلی کا بچہ فربہ سے کچھ کم نہیں کھاتا تھا۔ اس نے مشورہ

ہی۔ جی۔ جی۔ ٹاکسٹ: اشتیاق دودھ ازادہ سے ملک کر فخریں ٹھکا کر پاؤں سے فرش کو کڑیہنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

اباگل بازار کے سے معلوم ہوتے ہیں؟ زریزہ تعریف کرتے بھنے ہوئی۔

”یہی تو ابان کی خوبی ہے۔ میں نے کہا۔ سید سے بازار سے لانے گئے ہیں۔“

”جی نہیں۔ اشتیاق نے زور سے احتجاج کیا۔

اس کے احتجاج کی شدت دیکھ کر زریزہ کاشٹ اور بڑھ گیا۔ بولی۔ ”تو آج رات کو میرے سامنے رس ٹھکے بناؤ۔ میں خود دیکھوں

جی بہت اچھا۔“

اشتیاق نے رس ٹھکوں کے سسے میں چند چیزوں کی فہرست پیش کی جو منظور کر ڈی گئی۔ دوپہر میں بہت دیر تک اشتیاق بازار

نات سر شام زریزہ نے ابا کے چھوٹے کی تاشی سلی کر کہیں دور رس ٹھکے بازار سے نہ آئے ہوں۔ رات کے کھانے کے بعد

رات کے بڑے استام سے رس ٹھکے بنانے کا کاروبار کچھ میں پھیل دیا۔ زریزہ نے ٹھکر کو اندر سے بند کر کے تالا لٹا دیا تھا اور ہر بندہ

رات کے بعد کچھ میں جا کر بیٹھتی تھی۔ کوئی دھبے کے قریب جب فینڈ کا فہرہ بند ہونے لگا تو رس ٹھکے تیار ہو گئے۔ اشتیاق ایک

اس میں رس ٹھکے کر آئے۔ کھانڈ کے متعلق شیرے میں فیاض کی گریوں سے بھی دو تھانی کم کے ہم کی سفید سفید گولیاں تیار رہی

نہیں چچی!

”یہ رس ٹھکے ہیں۔ بکری کی سٹھنی کے برابر؟“

”ابھی پھرنے میں، دیکھیے جیسے بکری کا سب۔ یہ رس ٹھکے ابھی پھرنے میں گھبراتے پھر شیر اپنی ٹے سب کو پھیل کر پورا

دو سو بائیس گئے۔“

اشتیاق نے کہا:

زریزہ کو یقین آیا نہ مجھے غریب کا فہرہ بند یہ تھا اس لیے ہم سونے صبح ٹھکے تو اشتیاق پر پورے ہجرت کی بڑی ٹولانی کے سفید

و کھانے کوٹ۔ کس طرح بیتیں نہ آتا تھا کہ رات کو کوئین کی گولیوں کے برابر ہم داسے رس ٹھکے میوٹ کر اس قدر بڑے ہو گئے

نات رات بھر کو نہ جانے ہا اور کوئین پر کی کرے اشتیاق نہ زریزہ کے بازار سے رس ٹھکے غریب لانے ہوں گے اور رات کی

نات رات بھر کو نہ جانے ہا اور کوئین پر کی کرے اشتیاق نہ زریزہ کے بازار سے رس ٹھکے غریب لانے ہوں گے اور رات کی

نات رات بھر کو نہ جانے ہا اور کوئین پر کی کرے اشتیاق نہ زریزہ کے بازار سے رس ٹھکے غریب لانے ہوں گے اور رات کی

نات رات بھر کو نہ جانے ہا اور کوئین پر کی کرے اشتیاق نہ زریزہ کے بازار سے رس ٹھکے غریب لانے ہوں گے اور رات کی

نات رات بھر کو نہ جانے ہا اور کوئین پر کی کرے اشتیاق نہ زریزہ کے بازار سے رس ٹھکے غریب لانے ہوں گے اور رات کی

نات رات بھر کو نہ جانے ہا اور کوئین پر کی کرے اشتیاق نہ زریزہ کے بازار سے رس ٹھکے غریب لانے ہوں گے اور رات کی

نات رات بھر کو نہ جانے ہا اور کوئین پر کی کرے اشتیاق نہ زریزہ کے بازار سے رس ٹھکے غریب لانے ہوں گے اور رات کی

لاگو نہ ہوئی پانچ پر پڑ کر صوبہ کا درویش بھی اُس کی باتوں میں پھنسا پھیل کر بیٹھا۔ صحت کا کل سپردگی کے براغلامی بھی
شری تلافی دادا کی کشت و خون، انسانی شوق اور جب اشتیاق اُسے کھانا پاتا تو وہ پھر اکر جائے ملنے اور اشتیاق ایک عجیب مست اور
مست سے اُس کی صورت دیکھ لگا۔ اشتیاق نے اس کا نام نکلتا، کھانا پیرا، کھیت میں اُسے صحت کو کرکھار آتا۔

ایک دن میری غیر فوری میں اشتیاق نے زریں کے بیڑہ پر روم پر اٹھ کر
سرواں کے ادا پہلے تھے، اس لیے زریں نے تم بونے کے باوجود اپنے فائز میں ہوس ایک سویرا رہی تھی۔
کوہ ہے، زریں نے پوچھا۔

میں ہوں اشتیاق۔

ادنا ہاؤ زریں بولی۔

کاغذ پیل سے ہونے اشتیاق مجھے مجھے اتنا ہی صوبہ انداز میں دروازہ سے لگ کر کھرا ہو گیا پھر اُس نے پچھلے سے کاغذ
اد پیل سے لے کر حادیا اور دھلیے۔

زریں نے قیاس کیا۔ اب ہے، ابھی نہیں جہ میں دیکھ لوں گی۔

حساب نہیں ہے۔

پھر کیا ہے؟

آپ مجھے تو اشتیاق اور بار کاغذ اور پیل آگے لے کر حساب سے زریں نے کاغذ اور پیل تمام کر دیا سختی سے پوچھا۔

آخرت دیا ہے۔

ایک غلام کے تہی ہو کر ہے۔

زریں چند لمحوں کے لیے جھنجھکی، دھن پر اس کے دل میں ہنسی پھٹنے لگی، ہنسوا کر بولی۔

تم خود نہیں کھ سکتے؟

جی نہیں۔ میں نہ کھ سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں۔

تو شکر کہ کھنے کو زریں نے غور دیکھا۔

جی ہاں، کھ سکتا ہوں آپ مجھے میں پڑھتا ہوں۔

لیجئے، زریں نے زبیر کو کرنا۔

اشتیاق نے اپنی انھیں بند کر میں اور ایک عجیب ایت کے عالم میں رہا۔

تھانی میرا مہر ہے، گھنٹہ پڑا نام ہے جو ہر سو ہو

جہم تے میں جو پڑا تو ذرا ہی ہے مجھے۔ جو ہر سو ہو۔

مگر اس کی جو کیا ہے؟ زریں نے پوچھا۔

• ہر اشتیاق نے موت سے انھیں کھل کر پوچھا۔ ہر حال غزل تو غزل ہے۔
• گم اس کا وزن؟ ذرینہ نے پھر توجہ دوائی۔

• بڑا مدنی غزل ہے حکیم صاحب۔ آپ مجھے تو اشتیاق نے کال دلی سے کیا۔
• بڑا مشکل ہے ذرینہ نے اپنی ہنسی روکی۔ ہولی۔ آگے پیچے۔

• اشتیاق نے پھر انھیں بند کریں اور گھرے راتے میں جا کر بوسے
• تیری جسدانی میں جتنے ہم مست فکار جو ہو سو ہو۔
• کتا ہے تنہائی اب گلشن میں کون آیا جو ہو سو ہو۔

• ذرینہ نے پوچھا۔ کتا ہے تنہائی؟ مگر تنہائی تو مرث ہے!

• مگر تنہائی تو ہر شخص ہے اور میں مرث نہیں ہوں اشتیاق نے کہا۔

• اس کے چہرے پر کچھ ایسی مسکراہٹ تھی جیسے وہ کنا پاتا ہو۔ اسی حکیم صاحب۔ یہ شعر شاعری ہے آپ کیا جانیں؟
• اور یہ مست فکار۔ کمال کی ترکیب ہے تنہائی صاحب۔ ذرینہ نے پھر پوچھا۔

• ہلکے مراد آباد میں ایسا ہی ہوتے ہیں؟ اشتیاق نے جواب دیا۔

• ذرینہ نے اکدم کا فزینل بیڈ روم کی کھڑکی سے باہر بھیک دیے۔ لڑکی کر بولی۔ اشتیاق اگر آج کے بعد تو نے کبھی بے

• سادگی شہر سنا یا تو کھڑے کھڑے گھر سے اب ہر حال دونوں کی۔ اشتیاق نے کھیا کر سر جھکایا۔ پھر سر جھکنے لگے۔ بے حد محراب اور
• تھکے دکائی دے رہے تھے۔ ذرینہ کو اس پر دم لگیا نرم ہو میں مسکرا کر کہنے لگی۔

• میسر خیال میں اگر آپ شعر و شاعری چھوڑ کر ادب نگاری کی طرف توجہ کریں تو بہتر ہوگا۔

• دراز سر اٹھا کر بوسے۔ ایک نول بھی تیار کر رہا ہوں۔

• کیا ہے اس نول کا؟ ذرینہ نے پوچھا۔

• وقت اینڈ ٹک۔ اشتیاق انگریزی میں بوسے۔

• اشتیاق کی انگریزی ایسی تھی جیسے پڑانے نے ناٹے میں ملے، یاد چوں کی جہاں کی تھی جو انگریزوں کے پاس کام کرتے تھے یا آج کے

• بے زوروں کی جوتیوں پر جو نئے کے باوجود لیکن کل دھندوں میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ انگریزی بڑی مختصر اور جامع ہوتی ہے اور بالعموم

• اس کی قیاس نہیں ہوتی مگر پانچ منہ ہاں کرنے میں اس انگریز کے کس بہتر ہوتی ہے جسے آئی کل کے طالب علم میٹرک میں

• جاتے ہیں۔

• ایک دن جب اشتیاق میرے سر کے گچی سے غارغ ہو چکا تو میں نے اُس سے کہا۔ تم اتنے ڈھیر سارے دھندے جانتے

• نہیں اگر تم کسی ایک دھندے کو چر کر جیٹے جانتے تو غالباً بہت سی جانتے۔

• صاحب! میرا کسی کام میں زیادہ دیر تک جھنجھکیا نہیں تھا۔ اشتیاق ایک پھولے سے توبہ سے اپنے ہاتھ صاف کرتے

لگا رہی ہوئی پانچ پر میٹر کھوپ لاڑو دیتی تھی اُس کی ہانوں میں پورے پیل کر میٹ ہاتھ۔ حسرت کا کل ہر دلی کے ہر خانہ میں کبھی
شریر تھا خدا سے ایک ست، عمرانی سنی اور جب اشتیاق اُسے کڑا پاتا تو وہ پھر اکر جاتے تھے اور اشتیاق ایک لب مسرت اور
مسرت سے اُس کی حسرت نکلتا۔ اشتیاق نے اس کا نام گلشن کا تھا مگر پایہ کی کویت میں اُسے حسرت تو کہہ کر کھاتا تھا۔

ایک دن میری فرما رہی میں اشتیاق نے ذرینہ کے بیڑے میں پر دستک دی۔

سردیوں کے دن بپٹے تھے، اس لیے ذرینہ سے تمام ہونے کے بارہو اپنے نائٹ لکھیں ہر ایک سویر بجا رہی تھی۔
"کون ہے؟" ذرینہ نے پوچھا۔

"میں ہوں اشتیاق۔"

"آہ راجاؤ! ذرینہ بولی۔

کاغذ پیل سے ہونے اشتیاق تجھے تجھے انتہائی خوب انداز میں دروازہ سے لگ کر کڑا ہو گیا پھر اُس نے پچھلے سے کاغذ
اور پیل سے لڑھا دیا اور وہ لپکے

ذرینہ بولی: کیا اس کا حساب ہے، ابھی نہیں جہ میں دیکھ لوں گی؟

"حساب نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟"

"آپ مجھے تو، اشتیاق بارہ کاغذ اور پیل آگے لڑھا رہے تھے ذرینہ نے کاغذ اور پیل تمام کر دیا سختی سے پوچھا۔

"آخر بے کیا ہے؟"

"ایک خانہ کے تین سو ہونے ہیں۔"

ذرینہ چند لمحوں کے لیے جو تھی، دھنکی پھر اُس کے دل میں ہنسی چھٹنے لگی، مسکرا کر بولی۔

"تم غور نہیں کر سکتے؟"

"جی نہیں۔ میں دیکھ سکتا ہوں، ذرینہ سنا ہوں۔"

"مگر شہر کہہ سکتے جو: ذرینہ نے غور کیا۔

"جی ہاں! اصل کہ سنا ہوں آپ مجھے میں وقتاً بوقتاً۔"

"مجھے: ذرینہ نے زچہ ہو کر کہا۔

اشتیاق نے اپنی انھیں بند کر دی اور ایک لب کویت کے عالم میں وہ۔

تہائی یہ کام ہے، مگر شہر برا نام ہے جو ہو سو جو۔

ہم ہر تے ہیں تو پر تو ڈرتی ہے مجھے، وہ ہو سو جو۔

"مگر اس کی جو کیا ہے؟" ذرینہ نے پوچھا۔

• برون اشتیاق نے حیرت سے انھیں کھول کر پوچھا۔ ہر حال غزل تو غزل ہے۔
• مگر اس کا انداز؟ ذرینہ نے پھر توجہ دلائی۔

• بڑی مدنی غزل ہے عجم صاحب۔ آپ لکھتے تو اشتیاق نے کمال دلچسپی سے کہا۔
• بڑی مشکل ہے ذرینہ نے اپنی ہنسی روک کر۔ ہلی۔ اگلے پیچے۔

• اشتیاق نے پھر انھیں بند کر دیں اور گھرے راتے ہی جا کر بوسے
• تیرا جسدانی میں مجھے ہم سست نگار جو جو سو جو۔
• کتا ہے تنہائی اب گلشن میں کون آیا جو جو سو جو۔

• ذرینہ نے پوچھا۔ کتا ہے تنہائی! مگر تنہائی تو مرثیہ ہے!

• مگر تنہائی تو میرزا خلیص ہے اور میں مرثیہ نہیں برون اشتیاق نے کہا۔

• اس کے چہرے پر کچھ ایسی مسکراہٹ تھی جیسے وہ کتا چاہتا ہو۔ اسی عجم صاحب۔ یہ شعر و شاعری ہے آپ کیا بائیں؟
• اور یہ مرثیہ نگار۔ کہاں کی ترکیب ہے تنہائی صاحب۔ ذرینہ نے پھر پوچھا۔

• پہلے مراد آباد میں ایسا ہی ہوتے ہیں! اشتیاق نے جواب دیا۔

• ذرینہ نے کلام کا فہرست پیلڈ روم کی کھڑکی سے باہر پھینک دیے۔ گلی کر ہلی۔ اشتیاق اگر آج کے بعد تو نے کبھی بے
• بانی شعر سنایا تو کھڑے کھڑے گھر سے ابتر نکال دوں گی! اشتیاق نے کھیا کر سر جھکایا، پھر سر جھکنے لگے۔ بے حد محو اور
• حسد سے دکائی دے رہے تھے۔ ذرینہ کو اس پر دم بھیا نرم بھرم میں سکنا کر کہنے لگی۔

• میچر خیال میں اگر آپ شعر و شاعری چھوڑ کر ادبی نگاری کی طرف توجہ کریں تو بہتر ہوگا۔

• ذرا سزا کاٹ کر رہے۔ ایک نعل بھی تیار کر رہا ہوں۔

• کیا تمہیں اس کا دل لا؟ ذرینہ نے پوچھا۔

• وائے اینڈ ٹھک۔ اشتیاق انگریزی میں بوسے۔

• اشتیاق کی انگریزی ایسی تھی جیسے پڑانے نائے میں تھو، اور پیوں کی ہوا کرتی تھی جو انگریزوں کے پاس کام کرتے تھے یا آج کے
• ان مزدوروں کی جو انھیں لڑھ بونے کے باوجود لیکن لکھل دھندوں میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ انگریزی بڑی مختصر اور جامع ہوتی ہے اور بالعموم
• قصہ کی قضا نہیں ہوتی مگر پانچ سو سوا کر کے اس انگریزی سے کہیں بہتر ہوتی ہے جسے آج کل کے طالب علم میٹرک تک
• پڑھتے ہیں۔

• ایک دن جب اشتیاق میرے سر کے کسی سے فارغ ہو چکا تو میں نے اس سے کہا۔ تم اتنے ڈھیر سارے دھندے جانتے

• نہیں اگر تم کسی ایک دھندے کو چن کر جیت جاتے تو فائدہ بہت جلدی کرتے۔

• صاحب! میرا کسی کام میں زیادہ دیر تک کچھ نہیں لگتا۔ اشتیاق ایک پھولے سے توبہ سے اپنے ہاتھ صاف کرتے

برسنہ اور : غلامیاد ایک مصلحت پر دوسرے میں پڑا کیا اس طرح زندگی کے میں ہیں برس کا دوسرے ہیں۔ اسی کا ایک ہی کو کر
جانے کی :

• تو تم کسی ایک دھندے میں جا کر کیا نہیں لگاتے۔ میں نے تو کہا :
• بچ نہیں لگتا۔ اشتیاق سرخسار کسی اقبالِ عزم کی طرح شرمندہ ہو کے لگا۔
• میری سینہ ہر وقت خالی تھا سا رہتا ہے۔
• میاؤں :

دو ہزار پندرہ تشرین و نیم اور دوسرے اٹھارے ہزار پندرہ آسمانوں سے امتیاز کا طرف دیکھے گی۔ امتیاز نے اسے گرد میں اٹھایا اور اس کے جہوں پر وحیرے وحیرے باتے پھیرتے رہے۔ گنگا شہر کی جہاں سے دو دھڑے اڑاں۔

اشتیاق پر کبھی کبھی ذہنی فحش کے لیے دوسے پڑتے، جبکہ وہ گفتگوں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا کچھ میں غائب ہوتا تھا۔ جانے کہاں رہتا ہے۔ خود ہی ٹھکرا رہا خود ہی گھورتا ہے خود ہی کھٹکتا ہے، کبھی کبھی منہ میں بڑبڑانے لگتا ہے۔ کب لڑائی ہے اس پر وہ کون سا کرب ہے جو اسے اندر ہی اندر کھلنے لگتا ہے۔ کون ہلنے لگتا ہوتا ہے نہیں۔ کبھی کبھی نہ بھی کرتا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ جب دل کی گفتگو اور سینے کا سننا یہاں سے گزرنے لگتا ہے تو کوئی نہ مزدور کرتا ہے۔ کیونکہ جیسے میں ایک دو دن بیٹھتا ہوں جب اشتیاق کوئی کام نہیں کر سکتا۔ سارا دن تقریباً نیم فحش کی حالت میں اپنی چابپائی پر پڑا رہتا ہے اور اس کا سینہ دھڑکتا رہتا ہے اور دو دن کے بعد جب وہ ہوش میں آتا ہے تو ہرگز کہہ کر نہ دے گا کہ مجھے کبھی بدلتا ہے نہ اس نے کوئی نہ کیا ہے اور ہم بھی اس سے پہلے جتے ہیں کہ اپنا کام بہت اچھا کرتا ہے۔ ابر کھینچا، انٹ ہے اپنے کام کا وہ فکڑا، ان کے مانگ کی ایک میل تو ڈھیل ہوتی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں

اس لیے کچھ ایسا جو بات ہے کہ اس سے کامیاب بادشاہیں بنائے اور وہ نے کیا کچھ عجیب کٹش - میں ہیں شر :
پانی کا طرح تیار تھا اور اس کے اندر میگوں کے لکڑے لگائے گئے تھے جو مین کی طرف تیز بہتے۔
یہ حیدر آبادی شیخی : زمین پر چا کر پڑھتی ہے۔

• جی نہیں یہ ہوتا ادا ہے :- امتیاق کہتا ہے :- باطل تو ڈش ہے کلا کے دیکھو۔ کچے پکے، باطل یا سڑے :-
• اظاکے سے جا بھی ابھی میں سے روز تیرہ سر پرستاروں کا :- میں گنا کر کتا ہوں کہہ کر کچے قبض ڈش کو کچا
کر ہی قتل ہونے لگی تھی۔

اُس وقت قریشیان اُٹھ اٹھا کہ یہ لکڑی جس اُس نے خریدنے سے کہا: ”صاحب بھی تمہیں انصاف کرتے ہیں پتھے بھر پاس کر دیتے ہیں کھانے کو۔“

اشیاءِ رتہِ قدیمت محمد پنا ہے۔ ایک ذخیرہ مخصوص معائنہ کی جہت تھی۔ اشیاء سے رونقِ قدیم پانے کا (۱)

جی۔ جب دسترخوان بچا تو بخود دوسری چیزوں کے ایک نہایت بڑے ڈالہ اور سڑک بھٹی ڈش سامنے آئی۔

یہ مرقی قہر ہے۔ ذرینہ نے حیرت سے پوچھا۔

جی نہیں۔ اشتیاق لڑا ہوا ہے۔ یہ پیٹا ہے۔

پیٹ کیا؟ قہیں تو مرقی قہر تیار کرنے کو کہا تھا، کما تھا کہ نہیں؟ ذرینہ خابو کے بولی۔

جی۔ مرقی قہر بھلا گیا۔ اس لیے میں نے نئے ڈش تیار کر دی۔ اشتیاق کی یہ عادت اب میں معلوم ہو چکی ہے کہ جب کوئی

سارے بڑا ہوتا ہے وہ لڑاؤ سے کوئی نیا نام لے کر دسترخوان پر پیش کر دیتے ہیں اور ڈش کے جھٹنے کا یون تیار کر کے کرتے ہیں جیسے کسی

بہن کا لڑاؤ بخود بخود بکھڑا ہونے اور اس کے بگاڑنے میں اٹھ لگنے کا قہر نہ ہو۔

بکیا کہیں۔ چند ایسے معاذوں کی دعوت تھی جی کے سامنے میں بے تکلف نہ ہو سکتا تھا ورنہ آج میرا ارادہ اشتیاق سے

بے تکلف ہونے کا تھا۔ مگر معاذوں کا ہونا اور دوسرے سامنے ہونے سے اس لیے خاموش رہ جانا پڑا۔

دو پہرے کھانے کے بعد ہم اپنے معاذوں کے کرشماتی ٹوکینے چلے گئے اور چلتے چلتے ذرینہ نے اشتیاق کو رات کے

منے کے متعلق حایات سے دی۔ مینیٹر دیکھ کر جب ہم شام کو واپس آئے تو دیکھا کہ گھر کے باہر فائر بجلیڈ کھڑا ہے۔ بہت

سے دل جمع ہیں اور کچھ کی گنجی اور محبت اور کھڑکیوں سے دھوئیں کے ابل اٹھ رہے ہیں۔

اگل، اگل، میرا گھر بھاؤ۔ سینٹ فارڈ زور زور سے چیخ رہا تھا۔

اشتیاق کہاں ہے؟ تو میں نے پوچھا۔

کیا معلوم؟ سینٹ فارڈ اپنے سر کے بال لپکتے ہوئے بولا۔ ایک گھنٹہ سے چیخ رہا ہوں دروازہ ہی نہیں کھلتا انا

میں میں شاید نشہ کے بے ہوش پڑا ہے۔

میں نے اور ذرینہ نے۔ دونوں نے پتہ چلا کہ اشتیاق سے دروازہ کھلایا۔

اشتیاق بے حد حیرت زدہ کچھ سے نکلے اور دھواں دیکھ کر کپٹے اور کچھ کی دونوں ٹھیسوں پر پانی ڈال کر بھلے گئے۔ دونوں

بہنوں کے سامنے جل چکے تھے۔ مگر خدا ہلنے اچھا میں اس نے کونسا سا لڑکا تھا کہ دھوئیں کے گھرے سیاہ بادل اب تک اچھیلیوں

سے اٹھ رہے تھے۔

اگل، اگل۔ سینٹ فارڈ دھڑکتے چیخ رہا تھا۔

کہہ کر بھاؤ؟ اشتیاق حیرت سے پوچھے۔

ذرینہ بولی۔ یہ بے چارے ایک گھنٹہ سے چیخ رہے ہیں دروازہ پیٹ رہے ہیں اور قہیں کچھ پتہ ہی نہیں۔ سنار

بلیک ٹمک گیا اور تم کچھ کا دروازہ بند کیے غافل بیٹھے ہو۔

اشتیاق سب دکان کو متوجہ دیکھ کر کچھ چوئے۔ شرمندہ ہو کر سر جھکانے لگے۔ ایک اچھلی اچھلی کھڑکی پر دھڑک رہا ہے۔

بحث ہل رہی تھی۔

کیسے بھٹا؟ دیکھا کہ بڑھنے کا۔ تم تو یہاں پہلے بیٹے تھے۔

کہ شہر میں مقدر تھا۔

کیا متحرک؟

ابا کی مٹا کا متحرک قلم میرے ابا چاند جانی حلیف کے دیوانہ وکیل استغاثہ اور وکیل مٹا کی میں بھٹا ہوا تھا؟

بھٹے کے وکیل استغاثہ اور وکیل مٹا کی؟ زمین کے ٹھٹھ کا پابا چڑھنے لگا۔ میں خود دونوں طرف سے وکیل ہوں، خودی

کنت ہوں خودی مٹی، خودی کا مدعا علیہ خودی بھٹا تھا، خودی جواب دیتا تھا، اشتیاق نے بتایا۔

مگر کہاں بھٹا چل رہی تھی؟ زمین نے دانت پس کر پوچھا۔

میں: اشتیاق نے اپنی کھوپڑی پر اٹھل رکا کر کہا اور سر جھکا دیا۔

زمین کا دل اشتیاق سے بھٹے کا۔ میرا بھی! محمد! ابا چھوٹے کے بھٹا جو اس کی نہیں اب چھوٹا بھٹا ہونے لگیں۔

اشتیاق سے زیادہ اُس کی بی بی گمشدہ نے بچے ہاڑ کر دیا۔ میں دراصل اشتیاق کی دوج سے اُس سے بے افتائی تو رہتا تھا میرا اشتیاق

نہیں جانتا تھا کہ اُس کے سوا کوئی دوسرا اُس کی بی بی پر تو قرب۔ مگر غائب گمشدہ کی بات پسند نہ تھی وہ بچے بھی اپنے تئوں کی کفرت

میں تالی کہنے پر مٹھتی۔ وہ ایک بار وہ میرے کمرے میں غصہ ہوئی آئی مگر میرے شیش کہہ کر بھاگا دیا۔ پھر میری غیر حاضر میں

ایک بار وہ میرے بستر پر چڑھ کے سو گئیں۔ دراصل سوئی۔ پھر میرے کانا باز کر رہی تھیں۔ وقت بھی بی گشتی لے رہا تھا جو چپ

دفتر سے آنے لگا تھا۔ تب یہ تھا کہ دیکھو ہم تو قلم سے بستر پر چڑھ کے سوئیں گے اور اگر تم بے برداشت کہنے کو تو دوسری بار قلم

پہنچے پر چڑھ کے سوئیں گے۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ بچے اپنے قریب رہنے پر مٹھتی ہیں اس وقت میں نے

جو انہیں بستر پر سونے بھٹے دیکھا تو خستہ میں ان کی انہیں روم سے پکڑا اور بستر سے نیچے پھینک دیا۔ بے حد خفا ہو کر فریادیں ادا کرتا

کہ کہ وہ باہر چلی گئیں گس کا ہر گشتی نے یوں دیا کہ دوسرے دن دفتر سے آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میسٹر کر وہیں سبیل کی ریشمی رونی

کے دونوں نیچے اٹھنے پٹے میں اور گشتی انہیں بچے اور اگر فریاد رہی ہے اور سبیل کہ ہم میں اڑا رہی ہے۔

میری آنکھوں میں غم اُتر آیا۔ چھٹا مارنے کے لیے آنے جو بڑھا تو گشتی چھٹک لگا کر دروازے سے باہر۔ اور بی بی چلنے

فل: میاؤں! میاؤں! مگر آج میں نے بھی قسم کھالی تھی۔ آج میں اس حادثہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے محل کا دروازہ نہ

کر دیا اور اراٹک روم سے بیڈ روم اور ڈائننگ روم کے کمرے کے کمرے سے باہر روم بھٹا گشتی کے پیچھے پہلے کہ ہنر میں

اُسے پکڑ لیا اور دونوں ہاتھوں سے دبا کر اُسے گھر سے باہر چھوڑا۔ اشتیاق سا ہوا میرے پیچھے گئے اُسے گھر سے بھٹے کو

دیکھ کر مڑنے سے کچھ ہل نہیں رہا تھا۔ صرف اُس کے ہونٹوں کے کپکپ رہے تھے۔

بڑی سڑک پر اگر میں ایک کسے میں کھرا بڑا گیس سڑک پر کھڑا کڑے اور کڑے تھے اور اس پر غل گنت دھن دھن لگا

گھن گتے بھٹے گڑے تھے۔ میں نے ایک ٹرک کو قریب سے بھٹے دیکھ کر ایک گشتی کو دوسرے بھٹا اور قاتلانہ ہوا

گڑے بھٹے ٹرک کے نیچے پھینک دیا۔ اشتیاق کے گے سے ایک گشتی ہوئی چلی گئی۔

”اگر سڑک پر سے گزریا پھرنے لگا، یہاں محسوس ہوا جیسے گشتی سڑک پر میں کرکھی گئی ہے۔“ پھر بیکار وہ چومک کر کھڑی ہو گئی۔
 ”ابھی کی سرعت سے چومک لگا کر سڑک پر آ کر تھی، مگر مخالفت سمجھ گئی۔“ دو لک بار اُس نے پٹ کر ہاری طرف دیکھا مگر
 ”مگر بارے گھر کی طرف آنے کی بجائے وہ مخالفت سمجھ ہی وہ ڈھکی چلی گئی اور پھر کبھی ہمارے گھر نہیں آئی۔“
 تین دن تک اشتیاق نے انتظار کیا مگر گشتی کیس نظر نہیں آئی۔ چوتھے دن اُس نے سامان باز دیا اور ہوا۔ صاحب میرا حنا
 کر دیے میں جانا چاہتا ہوں۔“

”کیوں۔“ حسیں بولی کیا تعجب ہے۔“ ندینہ نے پوچھا۔
 ”اشتیاق نے مجھ سے آنکھیں پڑا کے زہینہ سے کہا۔“ بیگم صاحب جس طرح صاحب نے میری بات کے ساتھ سلوک کیا ہے وہ
 میں برداشت نہیں کر سکتا۔“
 ”اور وہ جو تمہاری بات نے جیسے پامیس روپے کے دو تھی تھے چار ڈالے ہیں اس کا ہر باز کھلے گا؟“ میں نے فحش سے
 منہ آواز میں کہا۔
 ”زہینہ ٹھنڈے کر سبھانے کے خیال سے بولی۔“ اسے ایک بات کی وجہ سے ٹکی لٹائی تو کڑی پھوڑا ہے۔ میں تجھے ایسی ایسی دس
 بیان دہ دوں گی۔“

”نہیں۔ وہ تو میری گشتی تھی۔“ اشتیاق کی آواز کڑور ہو کر رز نے ٹکی جیسے وہ ابھی روٹے گا۔
 ”اُسے گشتی تھی کہ رُخصتی کرکریں جو ہم چاہے نہ کیا۔“ میں نے بھی اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔“ سیکڑوں
 بند کر تھی ہیں اس علاقہ میں۔“

اشتیاق نے پھر نظریں پڑا کر مجھ سے رُخ کر زہینہ کی طرف دیکھا۔ وہ !
 ”مجھے صاحب سے بڑا ڈر ملتا ہے اب تو۔“
 ”کیوں؟ زہینہ نے پوچھا۔“

”جب صاحب نے گشتی کرنا کر سڑک پر پھینک دیا تو مجھے اچھا لگا۔“ اگلے اپنے آپ کی طرف نظر آیا۔
 ”اپنے پپ کا طرح؟ کیا کچھ جو؟“ زہینہ فحش سے بولی۔

اشتیاق نے ایک دو طرفہ وقت کیا پھر گھیر لہو میں کہنے لگا۔ ”اسی طرح جیسے اپنے ایک دلہنہ کی حالت میں مجھے کرے
 تو اگر ہر سڑک پر پھینک دیا تھا۔ اس وقت میری عمر صرف چار سال کی تھی میں یقیناً رہا تھا مگر سڑک پر جہاں میں مگر اس پر ایک بٹا سا
 ہوا تھا اور میں اُس گٹھے سے باہر نہیں نکل سکا اور سات کا وقت تھا اور دو ایک ٹرک پے سے پرے گزرتے پھر شاید میں
 سے ہوش ہو گیا میری من دو ہڑتاد کر چنے لگی۔“ بیکار جیسے اب کو ہوش آیا اور وہ جھانکا جھانکا آیا اور سڑک کے گٹھے سے مجھے اٹھا
 لے اپنے سینے سے لٹکے گھر لے گیا اور وہ میرا منہ چومتا تھا اور زہینہ زہینہ سے روتا تھا اور کبھی میری اس گٹھے اُس نے چھین کر اپنے
 سے لٹائی تھی اور کبھی میرا آپ بے میری اس سے لٹکے اپنی چاتی سے لٹا تھا۔ مگر میں اس کا وہ چو کبھی نہیں سہل سکتا تھا

مجھے اس کو دیکھ کر بہت رحم آیا اس وقت ذرینہ سے نظری چکر ٹپا اور دل دھڑک دیا تھا جیسے پاروں طرف سے دیواریں اس پر
لگ چکی ہوں۔ اس کے ہر نکلے ناکھیں کئی ساتہ ذرا۔

میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ پھیرتے ہوئے اس سے پوچھا۔
”شعر و شاعری باری ہے؟“

”اس نے انکار میں سر دیا۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”اب تو ایک فلمی کافی گھر رہا ہوں۔“ اشتیاق نے ہنس کر اسے اعلان کیا اب اپنی گھڑبٹ پر تہہ پوچھا تھا۔

”پیرا رکھ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اشتیاق! اپنا نام بے کر ہے۔“ ڈبل دہل ہے اشتیاق کا اس شعر میں۔

”اور دلی رکھ ہے؟“ ذرینہ نے پوچھا۔

”شاید دیپ کا رہنا ہائے!“ اشتیاق سر پر سر پہ کر رہے۔ ”وہیں کار دل بہت مفلج ہے۔“

ذرینہ نے ہنس کر دیکھے اپنے سڑ میں دوپٹہ ٹھونس دیا۔

”اور پیر دلی؟“ میں نے پوچھا۔

”فلم اڈا سڑی میں تو کوئی ہے نہیں۔“ اشتیاق سنجیدہ ہو کر کہے۔ ”باہر دیکھ رہا ہوں۔“

”فلم اڈا سڑی میں کوئی نہیں ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”جیسے اسکا انگریزی فقرہ میں نے ذکر کر پوچھا۔“

”Not even one percent of the five percent of the twenty
five percent of the hundred percent.“

”ذرا۔“ اشتیاق نے سر جھکا کر۔

”تو اس فلم کے گانے گانے گا؟“ تم نے تو شاعری ترک کر دی ہے۔“

”ہاں۔“ اشتیاق اپنے اقماعے ایک انٹو کو اڈا سڑا انٹو سے کریتے ہوئے کہے۔ ”شاعری تو چھوڑ دی ہے مگر اس فلم کے

گانے تو میں پھر گوں گا۔ ایک سگرا اکبے۔۔۔۔۔“

”کیا؟“

”لاہور میں پچیس کے انٹو سے لڑتے لڑتے چھوٹا ہوں سے ذرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہے۔“ صاحب!۔“

یہ کہہ کر خزانے عظیم صاحب نے ہم کو بہت ڈرا دیا تھا کہ اس کا ذہن بہت ڈرا ہو گیا ہے اس لیے ہم نے خزانے کو چھوڑ دیا مگر خزانہ

میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا ذہن چھوٹا ہو گیا ہے۔ کیا صاحب کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جوتے ہیں اور پیناچ میں بیڑنگ بہت ہے۔ اس

بہنے تک ٹکڑے ٹکڑے ٹکڑے۔ اس طرح چھوٹے ٹکڑے ڈالے۔

تو سنہ : میں نے بے چین ہو کر کیا۔

اشتیاق نے کھلاڑ کے گلاسٹ کیا۔

اوسم ! اوسم !

میں نے کیا۔

اؤ کا جنم۔

اوسم۔

تیرے لیے۔

ذریعہ کی بڑی حالت تھی، مرنے میں دوپڑا ٹھونکتے ہوئے اس کا پروال ہوتا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی ہنسی روکی۔

مگر اؤ کا جنم کہیں اشتیاق : روکنے کے باوجود میری ہنسی میرے سال سے ابھر چکی پڑتی تھی۔

اؤ کا جنم اس لیے صاحب : اشتیاق نے گری سمیڈگی سے کہہ اشتیاق کو لینے غم کے سرور کو رات میں نیند نہیں آتی ہے، میری رات میں ہیر دوش کے فراق میں رات بھر جاگتا ہے اور اؤ تو بھی رات کو جاگتا ہے اس لیے بات کر کیے۔

اے اؤ کے پتے : ذریعہ نے دوپڑا مرنے سے نکال کر یکایک چھ کر کہا : بھاگ جا یہاں سے ورنہ اپنی چلی آواز کرتے

..... کی اتنے اردوں کی کہ.....

ذریعہ چل آتے تھے۔

اشتیاق بھاگ کھڑا ہوا۔

اشتیاق کا کاروبار ایرانی ہوٹل دوسے کے ہاں خوب ٹھیک گیا پچھلے دو دن سر سے بناتا تھا پھر اس نے ایرانی ہوٹل کے مالک کے

قرب پر ٹاک سے شاہی ٹوٹے پہننے کی ترغیب دی۔

بہت سستے میں بے بائے کا سینہ ٹھکے اور ہوٹل روٹی کا کٹا ٹھکڑا ہے، میں پھینکتا ہے، ہم اس کام میں ملے گا۔

بے بائے کا غریب ہے اور تھوڑی سی مالٹی : اشتیاق نے اسے کہا لیا اور ٹھکانے پاس تین تین ریفر بکڑے۔ ایک ریفر بکڑے میں شاہی

فرنگ لے گا۔ لاکھ کوٹھڑا ٹھنڈا اسرو () کرے گا۔ ایرانی ان گیا کہہ کہ غریب بہت کم تھا اس مشائی کا۔

بے بائے اشتیاق نے جو شاہی ٹھکڑا بنایا تو وہ دوتنے فی ٹوٹے کے حساب سے اسیٹوں اٹھ بک گیا۔ ایسے عمدہ ڈش جس سے

بے بائے بہت اور مشائی کی مشائی بھی معلوم ہو ایرانی ہوٹل میں بیٹھے والوں نے آہی کہ کہے کہ کمالی تھی۔ اب تو یہ حالت ہو گئی کہ اشتیاق

اوسم : دو شاہی ٹوٹے تیار کرنے پڑے اور بھری کر بھتے دیکھ کر ایرانی ہوٹل کے مالک نے اشتیاق کو اپنے کچھ کا بیڈ ٹھک مترو

نہیں۔ کام تو اشتیاق بہت اچھا لگتا تھا۔

پھر؟
ایرانی برٹل کے ملک نے کچھ کھنے کے لیے تڑکھا پھر جلدی سے بند کر دیا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ "اُس کا بھیا
بڑا ہے ہم اس کو شرور میں پھردیا تھا وہ پھر بھی اُس سے خیر کر دیا اور پر سے پانچ سو کپ پائے اور دو سو سلاخیں لاپل ہو گیا۔
پانچ سو کپ پائے اور دو سو سلاخیں؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "اشتیاق تو اتنا پیڑ کھیں نہ تھا وہ تو بہت ہی کم خوراک کھاتا

ہم ہانتا ہے اس لیے تو ہم بولتے ہیں۔" ایرانی برٹل کا ملک تھا ہم کے بولا۔ "وہ خود پانچ سو کپ پائے پتا تو ہم اس
دست نہیں لگا تھا مگر خود نہیں پتا تھا اور دوسرے کے بے کار اور شکے و شائبہ لوگ کہو اور آج باجو کی بڑی ٹخوں میں نوکری بنانے کے واسطے
انے وہ اُن کو بھوکے پیٹ کی طرح پتا تھا۔ جب ہم سن کر اتنا تو بولتا تھا، میسکے حساب میں کھڑا۔ اب پانچ سو کپ پائے اور دو
سو سلاخیں لاپل ہو گیا۔ اس کو کس کے حساب میں لگے گا؟ اس لیے ہم نے اُس کو نکال دیا۔

نہت اچھا کیا۔" میں نے ایرانی سے کہا اور پیسے کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک ڈیڑہ کیونڈر کی دو!"

جب منتر پھر دے اُس کا ایرانی نے میرے پیسے کھتے ہوئے کہا: "دو ہیہ کی ہے۔"

مساہی نہ کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اُسے دو پیسے اور دیے اور کیونڈر کی ڈیڑے کر اُس سے پوچھا۔ "تو آج کل اشتیاق

کون پر ہے؟

جیل میں ہے۔

جیل میں؟ میں حیرت سے ایرانی کی طرف دیکھنے لگا: "تم نے اُس جے پائے کو جیل بھرا دیا؟"

ہم نے کون بچھڑایا ہے صاحب۔ وہ تو اپنی کف سے ٹیلے ہے۔ شرب کی سلاخ کے دھنڈے میں؟

اچھا۔ یہ دھنڈا بھی اُس نے شروع کر دیا تھا۔

وہ تو یہ دھنڈا نہیں کرتا صاحب۔ مگر ہمارا دوستو اپنے کمالی ایم میں یہ دھنڈا کرتا تھا اور ادھر ادھر کی بڑی ٹخوں میں:

زبان پر پختا تھا۔ ایرانی بولا: "پھر ایک رات پولیس نے اُس کے جھوٹا پر چھاپا اور پھر باٹی پلا گیا تو اشتیاق بولا کہ منتہی آ

سے میں نے یہ چھ بوتلی شرب کا ادھر کے رکھا تھا اس واسطے اشتیاق کو تین مہینے کی سزا ہو گئی ہے۔"

اُس نے ایسا کہیں بولا؟

وہ بولا۔ ہاں کیلے ہو کیونکہ آدمی ہے تین مہینے کی سزا چلنے لگا ہے۔ مگر جب سزا کی گھر والی اپنے بچے سنا کر

بہرپوشہ میں آنے کی تو جھوٹا کمالی دیکھ کر رونے لگی؟

ایرانی برٹل کا ملک اپنے سر پر انگلی رکھ کر بولا: "بھیا پھر جے اس کا۔"

ذریعہ کو خیال آیا کہ میں سے راہ ہوتے ہیں اشتیاق ہمارے گمراہے گا۔ لیکن جب تین آدمے اوپر کچھ دیں گے اور اشتیاق
 دنیا کو لے کر اپنی کاسی ہوئی اور سی بجے بھی ہوئی۔ پھر میں نے سوچا کہ اشتیاق اگر ہمارے گمراہے کر نہیں لے گا تو کھنک ہے اور ہر
 ایرانی ہوئی کے اپنے درد دکھائی دے گا۔ پر اُدھر بھی نہیں۔ سنتا اور چ سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ اس کے ہاں بھی نہیں آیا لیکن ہم دونوں
 نے سوچا کھنک ہے اشتیاق شرم کے اسے یہ علامت بھی ہو گئی ہو یا بیٹھے کہیں باہر چل گیا۔ جب دوا دھانی ماہ اور گزرتے نا
 اشتیاق نہ آیا تو ہمارا یہ خیال پکا ہو گیا۔

پھر ایک روز - ہم نے یکایک اُسے ایک دعوت میں دیکھا۔ سردار ذرا دوا دھانی کے ہاں ہماری دعوت تھی مگر کچھ میری
 نصرت منظم میری بیوی کی خاص سہیل تھی۔ ہم تو کھانے کے ٹرے کے دھتکے کاتے ہی کہہ گئے کہ یہ کس کا شایہ ہے۔ پتہ تو نہ پتہ
 ہی میں نے ذریعہ کی طرف اور ذریعہ نے میری طرف چونک کر دیکھا مگر ہم دونوں چپے بے۔ کھانے کے بعد جب دعوت کی
 قرعہ پڑنے لگیں تو کھنک سے خزاں خزاں اشتیاق بڑا ہونے لگا۔ کالی پتوں کے اوپر وال و شرٹ اور وال ٹیش شرٹ کے اوپر
 مجھ سے رنگ کا ایک میوہ اسی طرح ہونے اور سر جھکا کر دلش بجاہتے ہوئے شاموں کے انداز میں داد بٹورنے لگے۔
 دس منے نہ ذریعہ نے اس وقت بغیر پہچاننا مناسب سمجھا۔ اشتیاق نے بھی اس وقت ہلکا رویہ کہ کر مکمل اجنبیت
 اختیار کی۔

بعد میں نصرت نے ذریعہ کو ملک لے جانے کا بتایا۔ بہت اچھا لگ کر گیا ہے۔ اشتیاق احمد خاں نام ہے اس کا اپنی
 طرف کتب خانہ خیل کا پشتہ بہت اچھی بول قیادت ہے حالانکہ ہمیں ہی سے اور مرد ابے پھر کا انور غضب کا پتا ہے۔ کچھ میں بڑی
 بہت سے کام قیادت۔ جگہ یہ اب ہے جیسے کچھ کا فرج احسانی سر روپے کم ہو گیا ہے۔ پردے ڈھائی سو روپے۔ سننے ہوا میں
 اس کو صرف شردتی ہوں حالانکہ سو بھی دونوں تو سنا ہے گا۔
 ذریعہ انجان ہی کر بولی۔ "آؤ اچھا تو شرمین معلوم ہو گئے۔"

"اسے شرمین ایسا شرمین: نصرت اشتیاق کی تعریف کرتے ہوئے ہوئیں۔" یہ بے چارے تو جان چڑھ گئے اور ہر
 سبک چھڑنے کو تو دل دیا ہے۔ کوفی کھانوں اس کی کیا خدمت کرے گی جیسی وہ بڑا کی کرتا ہے۔ ابھی چاروں کی
 بات ہے جو سوڑا رنگ لگتا ہے۔ میں نے کہا وہ دونوں کی میں ناں رہی تھی کیونکہ گھر میں دو کھلونے کونڈوں کے پھلے سے پڑے ہیں۔
 پڑنے ہو گئے ہیں ذرا تو کیا ہوا: نصرت ذریعہ کا لہو پکڑ کر خوشی سے ہوئی۔ یہ مہاشیاق دس روپے کی سوڑا رنگ کے پھلے
 لے آیا تو میں نے فخر سے جھٹکا کہ "میں تو اس کو نہ کہے نہیں دونوں کی تہ سوا ہوا۔" دیکھے حکم صاحب۔ میں تو پتہ پر نہ کہہ سکتا ہوں تو
 کہیے: اس پر وہ فخر سے لگا کر بے۔ تو تم سے کس نے کا کا فخر کے لیے سوڑا رنگ کر۔ تو اشتیاق پتے تو ان کی گئی تھی کہ سمجھا۔
 جس سے سزا خوار ہوا۔ صاحب میں تو کا کا نہیں ناں لگتا۔ وہ جو کہیں گے میں مزے کر لوں گا۔

اس نے دیکھے مضرب دہو میں اس سے بات کی کہ ان کا سارا غصہ اُتر گیا۔ شکراتے ہوئے ایک طرف کر سرک گئے ہیں

جی کیا وہی بھی چپ ہو کر مرنے سے پیدای کاٹنے لگی۔

دورینہ غاموشی سے ٹھکرا سوا کہ نصرت کی باتیں سن کر ہی مگر اس نے ایک دفعہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اشتیاق کو ہانتی ہے۔ نہ اس کے یہ سلاہیں اشتیاق نے ملک بدر بھی بتایا کہ وہ ہم لوگوں کو پھلے سے جانتا ہے۔ ہم نے سوچا ہے چارہ جہاں لگے ہے لگا ہے اس کی خامیاں بتانے سے کیا فائدہ؟ اور یہاں دُور اور غل صاحب کے ان رد کہ اشتیاق بہت ٹھیک ہو چکا تھا مال اکتے پر نہیں لگتے تھے، ذہنی طور پر بہت زیادہ رہتا تھا، کپڑے صاف ستھرے پہنتا تھا۔ شہر و شامی ترک کر دی تھی۔ وہ بھرا تو کچھ میں رہتا یا غل صاحب کے بچوں کی دیکھ بھال کرتا۔ مگر ان کی دیکھ بھال کے لیے دو آدھائی ایک سٹے مقرر تھیں مگر بچے میں قدر اشتیاق سے انہیں ہونے لگے تھے اتنے گھر کے کسی دوسرے ملازم سے نہ تھے۔ میں نے بعد دورینہ سے شکوہ کا سننا سنا یا۔ چلو۔ یہ اشتیاق نازل تو ہوا۔

ایک صبح دُور کی گھنٹی بجی تو کئی تین بجے کا وقت تھا میں نے گھر کا کہہ دیا کہ دُور آؤ اور غل کا ڈرائیور صاحبہ کو آنا۔

”صنوبر بدی پیسے۔ ٹیکم صاحب نے ملائی بھیجی ہے۔“

”کیا بات ہے عام؟“ میں نے پوچھا۔

”اشتیاق نے زہر کھلیا ہے۔“

”نہے۔ میرے مرنے سے نکلا۔“

”ان صاحب۔ اشتیاق نے زہر کھلیا ہے اور غل صاحب پر ان میں ہیں مگر پر ٹیکم صاحب کے دو بھائی ہیں مگر ان کی کچھ میں نہیں آتا کہ کیا مہمان۔ ڈاکٹر مقصود کو بھیج دیا تھا ٹیکم صاحب نے مگر وہ بولے یہ پوچھیں کیسے ہے۔ میں نہیں آ سکتا۔ اور اشتیاق مر رہا ہے۔“

دورینہ میرے پیچھے کھڑی تھوڑا سا کاپ رہی تھی۔ رزتے ہوئے ہمیں بولی۔ ”تم جلد ہی سے پہلے جاؤ بے پار ہی نصرت صحت پریشان ہو گی۔“

غل صاحب کے ڈرائیوگ دم کے میں مرکز میں فرش پر سوئے پاؤں تک ڈھکی ہوئی ایک لاش رکھی تھی اور نصرت اور ان کے ماں بہن اور گھر کے دوسرے ملازم حیرت سے منہ کھم کھڑے اُسے دیکھ رہے تھے۔

”کیا مر گیا؟“ میرے مرنے سے بے انتہا نکلا۔

”میں ابھی تو زندہ ہے۔“ ایک آیا آہستہ سے کھٹے تھلنے لگی۔

میں نے چادر ہٹا کر نہیں دیکھی مگر کچھ دیر میں زعفرے کے گھر کھڑا ہٹ تھی اور زمین ٹوٹ رہی تھی۔ نسبت ایک بھری شال اور کچھ اور اشیاء سے بے خرابی چلی گئی تھی۔ گھروں سے چادریں طرف دیکھ رہی تھی۔

”کب اس نے زہر کھلیا؟“ میں نے نصرت سے پوچھا۔

نصرت کہہ نہیں سکی۔ ”جیسے اس نے میرا سوال سنا تک نہ ہو۔“

نصرت کا چہرہ اجالی رہا: کوئی دہائی کے قریب میں نے اپنے بستر کے قریب کسی کی آنکھ کھلی۔ کوئی آہستہ آہستہ اٹھ اٹھا۔
 جھنڈو ڈر جا رہا تھا۔ جب ہوا تو معلوم ہوا اشتیاق ہے۔ وہ اور چھ لٹا۔ عرصہ گزرتا تھا میرے کمرے میں پھر پھر آتا۔ کمرے سے کمرے کا رات
 لگے پچیسے میں نے ذہن کا لپٹ ہے۔

میں نے پوچھا: کون سا ذہن؟

ہو۔ ایک لڑکا۔

بھڑکیا؟

بھڑکیا؟ اس کی زبان ذہن سے مرنے پر کچھ تھی۔ انداز میں گفت تھی۔ وہ کیا پاتا تھا ایک نوٹھی بھی اس کے منہ سے
 تھا تاہم بھڑکیا۔ پھر وہ یہ تھا۔ پانی سے ٹکرتے کہنے گا۔ میں نے مزید بات کا شہید کچھ کر ڈرا کا۔ اسے ٹھکانے کا ڈھانچہ
 میں ڈرا ڈھانچہ ہسپتال سے باہر کے۔

مگر پوچھیں: نصرت کا بچہ کون ہے۔

پوچھیں کہ وہ بھی اس کا کوئی ہے: میں نے کہا: نزدیک کا ہسپتال کون ہے:

تھا ادنیٰ:

یہاں سے کتنے دور ہو گا؟

کوئی پار میں:

بھڑکیا:

میں دقت پا رہا تھا میں نے فی کراشتیاق کو پہلے منزل سے پہلے انداز میں دقت کچھ بھی کچھ ہادی ہادی تھی۔ شرک کے کھسکے کا
 روٹھنے کے لئے پانی میں پھینکے۔ ہمنے ہونے سے پہلے کھسکے تھے۔ اپنی زبردور دزدگی پر مدد ہے ہوں۔ بھینچے ہوئے شرک پر کہیں کبیر
 روٹھنے کے پچھے پچھے سے نظر آتے پھر اندھیرا نہیں نکلتا۔ آہستہ آہستہ ایک کڑھائی کی جھلک ہوئی۔ ایک شرک پر کھلے ہوئے لڑکھڑکھ کر پچھے کھی بیٹے
 ایک صحت بھی صحت ناکہات کی ادھ میں اپنے کمرے کی طرف بھاگ رہا ہے۔

پھر مینے وہ ڈھانچا:

اسے فارم بھرو:

لی فارم بھرو:

کی فارم بھرو:

ذند کی تم بھی تو کر:

اشتیاق کا سر مجھ سے رنگ کے نیل کا تو کے گزروں پر نکلا ہے۔ اس کی آنکھیں کسی کمرے کے کڑھے میں جا کر ہیں اور اُٹھ رہا ہے:

ازن گھون گھون کا ہوا ہے۔

پختہ رو پر ایڈوانس دو۔

یہ سیدو۔

دھل۔ مریخی کو کمرہ میں لے جاؤ اوپر۔ بٹ سے۔ میں ابھی ڈاکٹر کو شادی کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔

بہتے کوئی ٹرک گڑتا ہے۔

گھون گھون۔

اشتیاق کا سینہ جوتا ہے

جھن جھن۔

آئیل کلاک کا بھڑا بستر پہنے پاؤں میں لگی ہوئی رڈ کی چرخوں کے ذریعہ بٹ کی جانب حرکت کرنے لگتا ہے۔ بٹ اوپر کی

خان پر جا کے ٹک جاتی ہے۔ بستر پر اسے میں سے گڑا ہے کہ خبر سنا کے اندہ جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور دو وزیں اندر آئیں۔

سات نمبر کا پروگرام دیا جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور دو وزیں آتی ہیں اور ہم باہر بیچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔

بلکہ یہ وہی ہے آواز وزیں خاموشی سے غم رہی ہیں۔ ادنیٰ خیز کی غزوگی سے جیزار ٹل رہے ہیں۔ کہیں کوئی مہلے تلے کر لیتا

سے کوئی دیر سے دیر سے سکتا ہے۔

اشتیاق نے زہر کیوں کیا؟ میں پوچھتا ہوں

نہیں کیا ہو گا۔ نفرت کا پھوٹی بجائی اندازہ لگا کے کتاب ہے۔

میں نے بولے ہوئے کمر کا سدا چہ اشتیاق کے سپرد کر دیا تھا۔ ہر وقت چار پاسور وہی اشتیاق کی حبیب میں رہتے تھے

میں نے اشتیاق سے محبت دینے کو کہا تھا۔ آج اُس نے زہر کھالیا۔ میرا خیال ہے کہ . . .

مختار خیال تھا ہے۔ نوت کا دورا بجائی ہو۔ اشتیاق میں دس ہائیاں ہوں مردہ چور نہیں ہے۔ آج تک اُس نے ایک دیئے

دور۔ ی نہیں کی میرے خیال میں کچھ جتنے حرم زاد اُسے اُسے اطلاع ملی تھی کہ اس کے آباؤ اجداد کا فیصلہ اُس کے خلاف ہوا

سے محروم ہو گیا اس کا اُسے بہت جاب ہے۔

ابھی نہیں۔ آج معاملہ اپنی گھٹی گھٹوں پر اتار پھیر کر ہو۔ اشتیاق کو مکان دوکان روپے سے کبھی قیمت نہیں۔ یہ جسٹس

نہا کا پتہ ہے۔ کش کش

کش کش میرے کان کھڑے ہیں۔ کش کش چہ میرے ذہن میں ایک آبی نوٹ لکھی

ایک نئی یاد آ رہی ہے صاحب نے ٹی بی نہ موت لڑا یہ ٹی بی ٹی سروس ورس کی ہے۔ جال جال کر کام کرتی ہے۔ اس کا نام کش ہے

صاحب میرے سنا ہے کہ اشتیاق کی پہلی بیوی کا نام بھی کش تھا۔

اسے میں چومک گیا۔

میں نے دیر تک دم لیا مگر کچھ نہ ہوا۔ اسے اس وقت کے اندر نہ لکھ سکے۔ میں اندر گئی لکھیاں ہیں ایک جیسے ہیں۔
اند تم کان کن سے کوڑا کھڑو کے ڈالتے رہے ہو۔ اگر کھڑو سے نہ بھر مانے چنے تو ہنسے اس نے نئے زب کا اس میں چھکا پیر
ایک تو کوڑم سے اندر کا اس میں نکال دیا۔ پھر یکلون کپ پانے کلم تھے اس میں آٹا ملی دیا۔ اندر ڈلی روٹیاں کاش کاش کا اس کے
پھینکتے رہے ہو۔ تم میری رات پیٹ باتے رہے اور خود ہر گز نہ کر دوسروں کے لیے مگر دھونڈتے رہے اور اپنے ہاتھوں کو دیکھ کر میں دوسرا
کے ہاتھ سے جنت کتے رہے مگر تم گلشن کو کبھی ٹھلڈ نہ گئے۔ اور کبھی رات یہ ظاہر نہ ہو سکا۔ گلشن گلشن تم کانٹے چنے رہے اور بے قرار اور غصہ
ہو کر ایک پیٹے سے دوسرے پیٹے کا پتہ میں لگتے رہے۔ تاکہ کسی حرام تم اس لاکر میر کو بچے صرف ایک عورت کا وقت میر سکتا ہے۔۔۔۔۔
چلے !

نوس اندر آگئی۔

میں نے ایک بار کے لیے اشتیاق کے خاموش تھے ہونے یا وہ بہ نیت میرے کو دیکھ لیں کہ پیچھے نہ کھڑکی کو کھول سے پن
قوس ہر اسے لڑا کر ڈالے اور کانچ کے خندوں پہنچتے ہوئے چلے گئے۔۔۔۔۔ میں کرا سے ابر کل آیا۔



نسیم منزل

شوکت تھانوی

— شکر میں خود ہی بڑا ہوا ہے —

سکر (خود ہی بڑا تلے جھنڈا) واہ ہی واہ۔ ٹوڑے ہو گئے شکر میں تم بھی اسی ڈیوڑھی پر۔ اپنی بت تو پوری کر دکلائی۔ جب نے کئی کرنے آئے تھے تو یہی کا تھا کہ اب جنازہ ہی آئے گا اس گھر سے اپنا۔ تو اب جنازہ اگلے میں کسری کیا رہ گئی ہے۔ اس عریض موت سری پر منڈھتی رہتا ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ مگر اتنے ہی دنوں میں کیا کچھ نہیں دیکھا تم نے شکر میں؟
نہ ہرنا دیکھا اس گھر پر۔ گود کے کھائے جہاں دیکھے۔ پھر جواڑوں کے کزوت دیکھے۔ دونوں لامحوں سے دولت اڑانی گئی بڑے صاحبزادے نے پیسے کو ہاتھ کا میل کھا۔ اسے بھی تاروں کا خزانہ ہو تو وہ بھی غریب ہو جائے۔ آخر یہ جال ہو گیا کہ مکان کرنے پر اٹھ رہا ہے۔ کرایہ پر نہ آئے گا تو کب جائے گا۔ اب بڑے بھائی کہتے ہیں۔ چوڑی لو۔ سال بھر کا کرایہ پیشی دے چھٹے بھائی کہتے ہیں کہ یہ ڈیکھتی ہے مگر کوئی پوچھے شکر میں تم کون۔ تین میں نہ تیرہ میں نہ سستی کی گھر میں —

نسیم (آواز آتی ہے) شکر۔ شکر بابا۔

شکر (بہذا دانستے) حاضر سکار۔ آ رہا ہوں۔ (پھر بڑا ہوتا ہوا جاتا ہے) شکر کو بیٹھے نہ دینا وہ مگڑی۔ ڈار یہ ہے تاکہ کہیں اس بڑے کی کر سیدھی نہ ہو جائے اگر اس کی تھکن دور ہو گئی تو ایک روٹی نہ کھلے یہ پیٹا اندھیرے منڈا کھو اور پھر آدمی آدمی رات تک آبلے لوٹے جا رہے لوٹے۔۔۔۔۔ (بہذا دانستے) بگے جو اتنا میاں،

نسیم (ای ہاں۔ کلیم میاں سے کیے کہ ذرا میسر کرے میں آئیں۔

نسیم: بہت اچھا (جاتا ہے) کوئی پوچھے یہی آواز کلیم میاں کو بھی دے سکتے تھے جو شکر کو دی گئی ہے۔ مگر کلیم میاں کو آواز دیں ان کے دشمن بچ اٹھ کو بڈنے کے لیے شکر کو روک دے تو اس سے کام کیوں نہیں۔ دو وقت کی رانی اور بس روپے میں مفت میں تھوڑی دیے جاتے ہیں۔ ان داسوں کو کہنے پر یہی پیچر اسی پلے تو باز نہ جاتا ہے کہ وہ کسی چارہ ہے پتار ہے اوپچے پچتے گھس کر رہا ہے۔ پھر تو کبھی ایسا جو کہ کہ جنازہ ہی جائے گا اس گھر سے۔

چھوٹ میاں

گھر میں کیا بات ہے شکر بابا۔

شکر : میان نے کہا، کا نہیں دیا ہے کہ آپ اُن کے کمرے میں آجائیں۔ آجائیں نہیں مشریف لے آئیں۔
 حکیم : اچھا، بیٹھ کر آپ اس محفل کی تکلیف دفرایا کریں۔ شاید آپ بھول جاتے ہیں کہ آپ نے مجھے کھانا کھلایا ہے۔
 بہتر ہے میں جا رہا ہوں۔

شکر : وہ بعد میں بھول جاؤں گا، ان کو دوں کھانا تو میری رہنمائی ہے اگر کہیں یہ دھمکول گئے ہوں۔ بابا لڑکھایا ہے،
 ذکر کی کہ کہیں چھوڑا ہی جاتا ہے۔ شکر : دو تو پتھر پو تو دیتا۔ اس شکاری بھکیا باتیں ہیں شکر : میان : سنا لے
 ہو۔ دیتا تو کھانا ہے، ذکر میں ذکر ہی جاتا ہے، سوئے ہے۔ وقت آیا تو تم لے لو جو حق چھوڑا ہو۔ اب
 اگر ہم جل نہ گئی ہو تو شاید حق نصیب ہو جائے نہیں تو پھر سے بھرو اور جب تم گئے تو پھر دلاؤ گے شکر : تنہا
 میں لکھو، تم پر بھی جو۔ تم، وہی تھوڑی ہو کہ کمرے چل جو۔
 مجھے بھڑا تھا جانی جان آپ نے۔

حکیم : ابھی وہ آیا ہے جہاں صاحب سے جو کچھ دیکھنے آئے تھے،
 حکیم : اُن کو مکان پسند ہے کرایہ اگر ملے گئے کو تیار ہیں۔ وہی بھی شریف محرم ہوتے ہیں۔
 حکیم : صاحب : ان کی طرف سے کہنے کو کیا ہیں پاشا ہے۔ ہم کو کسی اُن سے رشتہ داری ہو رہے ہیں کہ آپ اُن کا صاحب
 شکر : میں نے سوال کیا ہے کہ وہ سال بعد کا چھٹی کرایہ اور کرایہ کے بعد وہ دو ڈھائی ہزار دینے پر آمادہ ہیں
 یا نہیں۔

حکیم : یہ بات میں نے اُن سے نہیں پوچھی۔
 حکیم : یہ آپ نے پوچھا ہی کیا، صرف اُن کے خاندانی حالات، جواب نہیں ہے آپ کا بھی حکم بیان، پوچھنے اور ملنے
 کی باتیں ہیں وہی آپ پھر لے گئے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ باتیں آپ نے کیوں نہیں پوچھیں؟
 حکیم : اس سے کہیں ان باتوں کو جائز نہیں سمجھتا۔

حکیم : کیا صاحب، کہاں کرتے ہیں خدا آپ بھی۔ بھائی میسرہ آپ کو موسم نہیں ہے کہ مکان کی اتنی قیمت ہے اور کرایہ دار
 کی اتنی کثرت کہ ہم جو مکان بھی اُن کے سامنے رکھیں وہ ہمارے جوڑ کر اس کو شکر کریں گے۔ ذرا غور تو کیجئے کہ ہمارے
 غنا یہ کیا کہتے کہ ہم ان کو رہنے کے لیے مکان لیا کر رہے ہیں جس کا وہ خواب بھی نہ دیکھ سکتے۔ اب آپ یہ چتے
 ہیں کہ ہم صرف ایک بیٹے کا کرایہ لے کر مکان اُن کے واسطے کر دیں۔

حکیم : ہوا تو یہی چاہیے اور جائز حریۃ ہے۔ مگر آپ ضرورت مندوں کی ضرورت کو دیکھتے ہیں اُن کا غنا پوروس
 چاہتے ہیں۔ میں اس کو خدا سمجھتا ہوں۔ پلڑے کا بازار میں ہم سے کچھ نہیں ہے۔

حکیم : ابھی یہ کہہ رہی تھی۔ میسرہ بھائی صرف یہی حریۃ ہے کہ ہم مکان کی ضرورت بھی کراہتے ہیں۔ اور اپنا کچھ
 بھی ادا کر سکتے ہیں۔ اسے بھی ڈھائی ہزار، سہی ڈیڑھ ہزار بھی ملے گا کہ پھر تو کیا چاہیے۔

میر: ہر حال میں قواسم کی اختلاف ہے۔ میں اس کو اصول زیادتی بھر جرات زیادتی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک تو ڈیڑھ سو روپیہ ہمارا جو کہ یہ مقرر کیا گیا ہے وہی بہت زیادہ ہے اس زیادتی کے بعد یہ زیادتیوں کو آپ فرما رہے ہیں اصولاً قانون کی حیثیت سے بھی جائز نہیں۔

شیر: موقع سے فائدہ نہ اٹھا کر ایک وقت ہے۔ اس وقت سب ہی یہ کہہ رہے ہیں۔ ہمارے پڑوسی میر صاحب کی ہیں اپنے دو مکانات چوڑی پرائیڈا کر تیسرا مکانات ہزار ہے ہیں یا نہیں۔ جب سب ہی چوڑی سے رہے ہیں تو آپ کو کیا پس و پیش ہے۔

میر: پس وہ پیش صرف یہی ہے کہ یہ جرم ہے اور جرم صحیح ایسا کر میری حیثیت اس کو قبول نہیں کرتی۔

شیر: بہتر ہے۔ آپ یہ قہر فہم پر چھوڑیے۔ میں یہ مکانات بھی اٹھائے دیتا ہوں کہ یہ پر اور چٹکی جی تہی رستم بھی لیے دیتا ہوں کہ بغیر کسی انتظار کے فرما دیجئے اس کی مرمت بھی شروع ہو جائے اور اس کا ٹھیکہ بھی بدل جائے۔

میر: میری رائے یہ ہے کہ اس مسئلے میں آپ اباجان سے مشورہ کریں۔ اگلے یقین ہے کہ وہ خود اس طریقے کو پسند فرمائیں گے۔
شیر: اچھ وہی اباجان۔ صاحب ہزارم تہ آپ کے کبابے کہ اباجان کو آپ ہر معاملے میں نہ لایا کریں اباجان کو بھڑا بنے دیکھئے اپنے گوشہ حایت میں۔ وہ کیا ہائیں کہ ہوا کا رخ کیا ہٹا نہیں کیا مسودہ کو دینا ان کے زمانے سے کس قدر محنت ہو چکی ہے۔ اس دنیا سے شباب ہمارا کام ہے اباجان نہیں۔

میر: جب میرے اور آپ کے درمیان اتنا واضح اصولی اختلاف موجود ہے تو فیصلہ اباجان ہی کر سکتے ہیں۔

شیر: پھوڑو بھی پٹے وہاں سے اصول اور اختلاف سے کہ بھائیوں بھائیوں میں نہیں اختلاف ہوتے ہیں۔ جب ہزاروں روپے کے ٹوٹ ہاتھ میں پھوڑا نہیں لے سب اختلاف ختم ہو جائے گا۔

میر: آپ غلط کہہ رہے ہیں بھائی بھائیوں کی اس سے دیگر گڑی ڈاکہ ڈال کر مل سکتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ دیر گزرتی تو مل کر سکتی ہے اور جرم ہی کرنا ہے۔ نوٹوں کی گزروں کے لیے نہ رہا ہے تو یہ ریف جرم ہی کیوں کیا جائے گا کہ بڑا ہاتھ مارنے میں کیا مضائقہ ہے۔

شیر: آپ کے خیال میں اپنے مکانات کو چوڑی پرائیڈا اور اپنے مکانات کا پیش کریا دینا گویا ذمیت اور نقل قسم سے جرائم کی صف میں آتا ہے۔ کمال ہے صاحب بھائی میرے روپے کی ہم سب کو شدید مزدورت ہے وہ۔ دھل جائیں گے۔ پتہ پھوٹا میں اس ایک ترتیب کے وجہ سے مکانات کرایہ پرائیڈا خانے کے خیال سے تسخیر ہو گیا ورنہ ڈیڑھ سو روپیہ ہمارا بھی بھلا کٹا رہتا ہے۔

میر: ساتوں کی ایک بات یہ ہے بھائی بھائی کہ اگر آپ کو یہ مکانات چوڑی پرائیڈا ہے یا اس کا سال دو سال کا کرایہ چٹکی دینا ہے تو میں نہایت ادب کے ساتھ صفائی پائنتیوں میں نہ چوں گا۔

شیر: بہتر ہے نہ پڑیے آپ یہی میں اور اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ اباجان ہی کو اس مسئلے میں فیصلہ کرنا چاہیے تو بددعہ میری

میں ہی تیار ہوں وہ دن میں نہیں پہنچتا تھا کہ باہاں کو خود لڑا یہ زحمت دی جانے۔ طرہ سبب یہ ہے کہ ہم باہر میں ہی رہا
تفہن نہیں ہے۔

حکیم: اگر اتفاق اس طرح نہیں ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں ہمہ سزائیں نہیں کر سکتے تو بہت مبارک ہے یہ اتفاق۔
حکیم: غیر میں آپ سے یہ عجیبہ پند و نصائح سنتا ہوں پاتھناپ ہے شک باہاں سے کہہ دیں کہ میں چل کر آیا وصول کرنے کی
آئید میں ہوں اور آپ کو یہ روپیہ بھی پاتا ہوں بھر آپ یہ زحمت کیوں فرمائیں میں خود بات کیے لیتا ہوں (جاتا
ہے)۔

شکوہ: (بڑبڑاتا ہے) کچھ نہیں رہا ہے اب لے کر یہ ایک کھنڈر رہ گیا ہے اب اس پر دلتا لیکن جلد ہی ہے۔ بڑے
عاجزہ سے اس سے کچھ تو کھل کر ٹوٹ لیں جو ان کے اور چھوٹے میاں کے میں میں ہر قسم کی دنیا کو سمیٹ لیں
مگر میں کہہ نہیں سکتا ہے تو یہ ہے مگر شکوہ میں پچھو تو دونوں ہی کا جواب نہیں پر تم کہہ شکوہ میں۔ تیرے میں ذیہ
میں دستی کی گرو میں۔ تم یہ باتیں سوچتے ہی کیوں خود ہی شکر لاندی کے کا پی پی پی پی پی پی پی پی پی پی پی پی پی پی پی
آئی تو تم نے کیا خود تیرے یہ تو بچا یا بھر کر روٹی اور چوٹی کا ساگ ہے۔

حکیم: (دور سے آواز دیتا ہے) شکوہ، شکوہ!!

شکوہ: حاضر ہوا ہوں

حکیم: (آواز دے کر) پھرنے میں کو بھیج دو باہاں یاد دلاتے ہیں۔

شکوہ: (جدا آواز سے) بہت اچھا! پھر بڑبڑاتا ہے یاد دلاتے ہیں صاحب یہ کہہ دیتے ہیں چھوٹے میاں کی کئی سہی ہیں کہ ان کا یاد
فرمایا جائے۔ آدمیوں کی طرح یہ ہیں ملتا جلتا، باہاں جوتے ہیں اس زبان کو شکوہ ہی سمجھتا ہے کہ لی یا تو کہنے تو خود یاد کرتا
رہ جانے ان باتوں کا صاحب اسے میں نے کہا پھر نے میں خود یاد دلاتے ہیں آپ کو۔

حکیم: (کہہ کر باہاں میں اس کی طرف ہار اٹھا۔

شکوہ: (پھر بڑبڑاتا ہے) اب طے کر ہی لے باہاں کہ کر ہی ٹیک کتا ہے۔ میں ہوا ان کی جگہ تو اس جگہ کے کیونچ اپنا رتبہ کا
مقبوضہ دیتا اور خود ایک میز کر کرتا اللہ اللہ یہ کان کا انسان ہے کہ بڑا بیٹا تو آؤٹنے گل پھرتے اور چھٹا رہ جاتے
فرزہ دیکھتا۔ پر تم سے کیا شکوہ میں تم میں تیرے میں دستی کی گرو میں (اور دوسرے پر دستک)

گوی مسافر شریف نے نے۔ جیتے رہے حکیم بیاں۔ جیتے جانے اپنے بھائی جان کے برابر لے لے حکیم میں سے صوم جہا ہے
کونپ کماں وہ رکھنے کے سطح میں اب کچھ میں دپیش کر رہے ہیں۔

حکیم: ابی نہیں تو یہ تیرے ہی تیرے ہی میں دپیش کس طرح کر سکتا ہوں۔ جتنے جالی جان کی اسی دے سے حق نہیں ہوں کہ
کایہ کے ہوا کہ کیا مارے ایک مستحق رقم پڑا کے طور پر بھلی جانے اللہ کیا یہ بھی کم سے کم ایک مل کا پیچہ وصول
کیا جائے۔

روزی سا چڑھائی؟ یہ خیال آپ کو کیسے آیا شیم میں۔ میسر تو قصور میں بھی نہ تھا کہ اس صنت تک آپ کا ذہن رسا پہنچ سکا ہے۔

شیم: اباجان میں خود چڑھائی اور چٹکی کرایہ کی تائید میں نہیں ہوں مگر خیال صرف یہی تھا کہ اس طرح ہم مکان کی فور امرت کر سکتے ہیں۔ اور کرایہ دار سے جو کرایہ وصول کر رہے ہیں مکان اس کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ اگر آپ چوڑی کی تائید میں نہیں ہیں۔ تو ایک سال کا کرایہ ہی چٹکی لے جانے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

روزی: آپ کے نزدیک یہ بھلے خود ایک قسم کی چوڑی نہیں ہے؟

شیم: اباجان آج کل عرصہ ہی ہوا ہے۔ اور مکان کے متعلق اس سے ذرا باریک نہیں ہوتے بلکہ ان کو خوشی ہو رہی ہے کہ نہ صرف مکان بن گیا بلکہ اس استحکام کے ساتھ طے کر اب گزرا سال بھر تک ان کو ملک مکان بے دخل نہیں کر سکتا۔

روزی: ان کو جس قسم کی سرت ہو سکتی ہے اس کا اندازہ آپ ان کی جگہ پر ہوں جب ہی کر سکتے ہیں۔ میری کہہ میں تو یہ بات آئی نہیں کہ تقریباً دو ہزار روپیہ عیشت آپ کو ملے کہ کوئی خوش ہو سکتا ہے۔

شیم: اباجان یہ پیش کش خود حکیم صاحب کی طرف سے ہوئی ہے کہ ہم سال بھر کا چٹکی کرایہ لے کر مکان ان کی مرضی کے مطابق بنادیں۔

روزی: سا یہ غلط ہے میں مکان کرایہ پر ملے رہا ہوں اپنی مرضی کرانے پر نہیں ملے۔ ابجوں۔ اس مکان کی مرمت میری مرضی کے مطابق ہوئی آپ یہ جانتے ہیں کہ سال بھر کا چٹکی کرایہ لے کر ہم سال بھر کے لیے کرایہ دار کی مرضی کے غلام بن جائیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ جو شخص عیشت تنی بڑی رقم لے گا اس کے مطالبات کس قدر سخت ہوں گے۔ دھندل کی رقم پر تو آپ ریجھ گئے مگر یہ اندازہ نہ کیا کہ اس کے بعد کرایہ دار کی دھانڈوں کی قلیل سال بھر کا کتنا شدید اور مسلسل غلاب ہوگا کہ کئی غصاؤں میں خیر کا اہتمام کر دیجیے۔ آج باورچی خانے میں پکھا لگا دیجیے۔ اس کرے کارنگ فر دہی ہو۔ اور اس کو کسے کا شانی۔

شیم: اباجان ان میں سے کوئی صاحبہ ان کی طرف سے نہیں ہے وہ تو صرف معمولی مرمت اور قلعی چاہتے ہیں۔

روزی: سا، جہاں میں جاتا ہوں ابھی کوئی صاحبہ اس لیے نہیں ہے کہ ان کو صرف مکان کی ضرورت ہے مگر جب مکان جاسے لائقان کو بعد جنت نئی آسائشوں اور آرائشوں کی ضرورت بھی ہوئی اس کے بعد وہ جس سے ہم اتنی بڑی رقم عیشت لیں اس کے لیے اہتمام کرنا بھی ہمارا فرض ہو جاتا ہے۔ پھر آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ سال بھر کا کرایہ تو آپ عیشت لے کر خرچ کر دیں گے اس کے بعد کیا ہوگا۔ سال بھر کے مزدوری مرمت کماں سے ہوئی۔ ہم کو یقیناً یہی محسوس ہوگا کہ ہم نے ادعا مکان کچھ کرایہ پر اٹھا دیا اب خود اپنی گھر سے اس کی دیکھ بھال پر روپیہ صرف کر رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے یہاں ضرورت کے لیے روپیہ پس انداز کرنے کا نہ طریقہ ہے نہ سلیقہ لہذا میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کہ آپ سال بھر کا کرایہ چٹکی وصول کر کے اپنے مصائب میں اور بھی انداز کر لیں۔

شیم : میں آپ کا حرف۔

حکیم : میرے دانے یہ سچ کہ حکیم صاحب یا جو کرایہ دار بھی آتا ہے اس سے ہم یہ سچ کہ میں ایک بھر میں ایک چھینے لاکریہ اس مکان کی مرمت پر صرف ہوا کرے گا۔

درویش : جو اتنی ہی پائیے مگر جو کہ مکان کالی مرمت ہے۔ لٹا فی اللہ بجائے ایک چھینے کے دو چھینے لاکریہ مرمت پر صرف ہوا مگر اس کے سخی نہیں ہیں کہ وہ دو چھینے لاکریہ چلیا جائے۔ اسی طرح صرف ایک چھینے لاکریہ چلیا لے سکتے ہیں اسی طرح پر عمل کیا جائے آپ لوگ تشریف لے جاسکتے ہیں۔

شکور : (ڈرنا دے دے) چور چور ہوئی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ انے کی ایک کوئی سی رقم اور سائے باغیں گے کچھ دن جن۔ جے کی آخروں کی پلوں کے پر بار وڈے میاں نے سارا قہر ہی سار کر دیا۔ بس ایک بیڑ لاکریہ کو اور لگا دو مکان پر نہ باسی بچے نہ کھانے نہ شکر میاں تھلاؤ گا کہ اسی میں تھاکر پختے یہ تاش پتے کچھ۔ کچھ لے جاتا تم کو بھی پلوں سے۔ اللہ ملک ہے اپنا بھی۔ تم کہیں اس میں حکومت سے کہ تم تو تم میں ذیرہ میں دستوں کی گروہ میں مدیہ تاش بھی دیکھ لو ڈرے جانی شاید کہ روڈ لگنے ہیں پھر نہ جانی ہے۔

حکیم : (شیم کا کتاب کرتے ہوئے) کالی جان۔ ات تو نیسے۔ کھڑے تو سی۔

شیم : میں میں کچھ سنا نہیں ہاں جو آپ کا جی چاہے کیجے۔ میری جگہ سے آپ ایک چھینے لاکریہ بھی نہ میں لکھ کر یہ دار کو اپنے گھر میں رکھنے کا مسودہ خود اپنی گروہ سے دیں میں اب اس گھر کے کسی سائے میں رضی دینا ہی نہیں پاتا ہاں ہاں ہاں اور۔

آپ کا نام

حکیم : میں تو مرمت یہ کہہ رہا تھا کہ آپ حکیم صاحب سے خود بات کریں گے یا

شیم : میں کسی سے کوئی بات دات نہیں کروں گا۔ آپ کا گھر ہے آپ الگ و مختار ہیں آپ کے اشاروں پر اس گھر کا انحصار مل رہا ہے۔ میں ہر اکون میں کسی سے کوئی بات کہنے دو۔ مجھ سے اب کوئی صاحب نہیں۔

حکیم : آپ اس وقت تو راض ہو رہے ہیں۔ مگر بعد میں آپ ہی کو معلوم ہو گا کہ پلوں کے بیٹے کے جرم سے پڑ کر آپ نے اپنے احساس کو کس قدر شبک رکھا ہے اور پھلی کرایہ نہ لے کر اپنے ذمہ داریوں کو کس قدر کم کیا ہے۔

شیم : اچھے آپ کے ان عجیب مشوروں کی ضرورت نہیں آپ اپنے بیک احساس اور اپنا ذمہ داریوں کی بیک دھکے ساتھ جو چاہیں کریں مگر مجھ کو بخش دیں میں ان مساعف میں پڑا ہی نہیں چاہتا، میری جگہ سے جرم ہے یا تمہارے۔

(جاتا ہے۔)

شکور : (ڈرنا دے) دشکور میاں میں۔ وہ تو بالکل ہی روڈ لگنے لگا۔ مگر پچا پچا کہ ہے یہ سناٹے کے بات اتنی ڈرنا دے آتی نظر

آتی سچی۔ نہ جانے کیا کیا منصوبے ہوں گے۔ سب عاک میں ہی کر رہے۔ جو سے سال بھر کے ہوا پاروں کی کھانڈنی تو

ہی جاتی چھینے دن ایک مرتبہ ہر ملک دکھا جاتے۔ مگر ان چھینے میاں نے سدا رزہ کر کر دیا۔ پر ہم سے کیا۔

کہہ دیجیے ذیرہ میں دستوں کی گروہ۔

خزانے کا سانپ

علی عباس حسینی

دو سالہ مسکینہ لڑکی میں سب سے اونگے بیٹے پر تھا۔ وہ گاونڈی کا سب سے بڑا کسان اور "بھوم دھر" تھا۔ چارہل کی کھیتی تھی اور
 لکھنؤ کی پیداوار۔ اتنا دلچسپ نظر اور کھانے والے تھے، ایک وہ ایک اس کی بیوی یا اور ایک ان کی محبت یا رفاقت جو بیٹے
 اور کھنڈر باپ بیٹے کی صورت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ دو سو پانچ فیٹ کا سونا، تو ذیل، چنیا بھی صاف اور داڑھی سرخ بھی۔
 راکڑا، اور اسی کڑے کی اونچے دھوٹی پہنے، نگھے پاؤں، نگھے سر، بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ظرافت چڑھا ہوا بہت ہی
 اور کی جمل ہے!

نہتر سو برس کا وہ جوان تھا۔ سبز آواز، چمیرا بدن، ساٹھ پانچ فیٹ سے نکلتا ہوا، متناسب اجسام، کھٹکتی دھت۔
 آج اس کے بھی جوتے اور اکڑ پٹے بھی، مگر جوانی خود ایک ٹھہرے اسے کون چھپا سکتی ہے؟ یہ دلچسپی اسے باپ کی جگہ ان
 زمی یا کسی دماغ میں تھیں صورت شکل کی اچھی بری ہوئی۔ وہ اب بھی نہ بھایا، نگھا پھول تھی جسم کی ڈیاں ابھرا نہیں تھیں، اور
 اب جوئی تھی، بڑی بڑی آنکھیں، نیروں کے بان، نہ پھلتی تھیں۔ وہ تیر نفی پلوں کے کونے کی کچڑ میں بیٹھ کر رہا تھے۔
 وہ کسی نہ کھانے دیتی تھی نہ پہنے۔ مرنی مارکین کی ساری اسی وقت اترتی جب وہ میلی پلٹ جوباتی۔ گھنوں میں سے صرف ہاتھ
 پہنا، نہ کھانے کڑے تھے۔ چھپتی تھی تو سر کی تھیں والی کھڑا کراہٹ سنانی دیتی۔ باتیں کرتی تو معلوم ہوتا کسی کوئی تھی یا نہ کلی ہر
 اور یہ کہ تامل کر دینا پڑتا ہے۔ نہیں شکل سے متی ہیں اور وقت سے منہ سے نکلتی ہیں۔ بروقت خیال رہتا کہیں کوئی ایسی بات نہ
 دل جانے کا شور مچاتا ہے، لیکن اس سر کی گلابیاں کھو کی حیات کے رقص پر کسی نیل کا جوار جاتا آجاتا۔ اس وقت وہ گویا چمک
 رہا ہوتا تھا۔ اکڑاٹھا کھانا، اتر پاؤں سے جل، ناک نچنے کا درست، پھر بے زبان ایسا کہ دیکھنے میں ہٹ کی از جوان ہو کر
 دست پر ہوا۔ جہاں باپ نے کھرا نکھایا، جو پھلایا، پنا۔ دیکھتا تھا کہ گھر پر چارہل کی کھیتی ہے، سونوں نقد پیدا ہوتا ہے، ہزاروں
 اور وہ ہے مگر نہ گیسوں کھانے کو مٹا ہے نہ ہاتھ پاؤں۔ میں جو اور چنا، جیسے قسمت میں کھ گئے تھے۔ مگر یہ بھی دیکھتا تھا کہ
 اب لاکھ تھا، جس کے سب کے خیمہ میں تھا، وہ خود بھی اسی کھٹے جھٹے کڑے میں اور اسی رُکے سوکھے کھانے پر
 رہتا تھا، پھر کھو کا کٹا، کیا سنا! وہ کیسے کوئی چیز اپنے لیے ملک سے اٹھتا۔

ظہار کا صحت مند تھی۔ اب اس حراں کھٹے جھٹے کے بنے کی حراں کیا ہے، زندگی کا کوئی مقصد تو جوتا ہی ہے۔ وہ یہ نہ کہ
 زخمی رخصت روپیہ کٹا، اسے کھلا کر اسے حراں کر رکھنا بھی منزل و مقصد حیات ہی سکتا ہے، اور اس کا شور ہوا حراں کی
 سب سے بڑی منزل جھٹ ہے۔ منزل کا انسانی خواہشوں، منہروں اور دلچسپی کی حراں کسی مت کلاہ نہیں جوتا! پتے ایک قریب

کا منزل دکھائی دیتی ہے۔ آدمی وہاں پہنچا تو اُسے سوس ہٹا کر اُس کے آگے ایک مرد مغرب تمام ہے۔ تو نے ہر لہجہ کی کھانا پرتا جب تک سال کی حاصل کی تو اسے عہد بہت کچھ گئے کس دکھائی دینے لے۔ جب جان کا بازی لگا کر اس صلا میں رہا دکھا تو اس کے دینے ایک لڑکھائی لال کھڑا کر دیا۔ (حسن یہ راہ ہر منزل پر کھلنے کی جگہ بڑھتی جاتی ہے)۔

» حو کے دینے کے ساتھ ساتھ اُس کا پانچ بھی بڑھتا جاتا تھا۔ جیسے جیسے اُس کا کتہ عین دوسرے سے عین ترو دوسرے ز بنا اور اس کے سقے کو اور بھی بڑھانے کے خواب دیکھنے لگا۔ اور وہ ان میں اس طرح ہو جاتا، کھڑا آگے سے بیٹے کی ہونٹ لگا دیتی اور نہ لایا زیادتی پڑتی۔ وہ کتہ آگے دوں کی بڑاری یا ماری لگا رہتی ہے۔ اب ہولے آؤ، کھڑا کام بند لے۔ کتہ اب جہاں ہوا، دیکھتے نہیں اس کام میں اب دیا بھی نہیں تھا، ابھی شام اور آخر کچھ لگا آئی ہو جاتا، کھٹکا آچکا ہے کوئی ایسی دیجات ہونٹی تو بیٹے بھلے جگہ بنائی ہو جائے گی۔

» حو اپنی توہ پر اُتر کر کتا، تم تو سخت میں دیکھ رہی ہو اور پریشان کرتی ہو، میرے پاس دھرا ہی کیا ہے کہ ایک جوتہ کاٹے وہ اس کھ میں لے آؤں، پھر کتہ بڑا ایک دوسرے جاتے۔ یہی کچھ کبھی جھاک آگے تو ہم بھی اس کے سے بھی کر دیا کرتے تھے یہاں ہی تھا، وہ دوسرے کھی سکی ہو کر آگے کر کتہ لگا آئیہ مردانہ وار کتہ نہ جوتا تھا۔ اس کے نزدیک جذبات کو اتنی فضل خرچ کرئی اچھی چیز نہیں تھی۔ اس سے اگلے جوتہ بھی جوتا۔ یہی ممکن تھے جو بے پھول کی جگہ اور کس کھائی کی۔

مکھاب کے اپریسے اور بہت خوش تھا، گیہوں کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ سرکار سے کٹر دل بھی اٹھ گیا تھا۔ زہرا نے تھوڑا سا زبانتا تھا۔ اس لیے خواہ مخواہ سستے جھاڑ سے چھانڈا تھا۔ پار سال تو اس نے روت پانچ سو گیہوں کتے میں چھوڑا تھا اور جب جھاڑ سیر کی جگہ اٹھائی سیر پہنچا تو اسے پتا۔ اب کے اُس نے لے کر دیا تھا کہ پانچ کچھ بھی جو وہ پتا تو نہ ہو گیا۔ اس وقت محمد ستانے گا جب تک کھلے سے منگتا تو نہ بچنے لے۔ اس نے کھڑے بڑے کھی کو پرسی فٹ کر کھڑا کر دیا اس کے تہ میں بھر سا بھر دیا اور گیہوں کی بڑی بڑی ہریاں اس پتے اوپر رکھوا دیں۔ اگلے فصل میں اور بھر سا کٹھنٹس کر اُس نے کھی کو لایا کہ بابا کر دیا۔ یہ سلی اس نے اٹھائی اور پل نہ رہنے دی۔ اُس نے دو دن پار پار مزدور لگا کر کھڑے سے اسے کھڑا کر دیا کہ طرح کھڑا دیا اور اسے ہر طرح مضبوط بنا دیا۔

اب وہ بے فکر تھا۔ بڑے بڑے آڑھے ہار کا پورا کھٹے آتے، گیہوں خریدنے پر امرار کتے ملکر اور حو کے سانپ کی طرح کتے پر چننا کہ چننا ریاں مار کر بگاڑ دیا۔ وہ کتا یہ جب ہی کھلے گا جب کبھی صبح بھر میں گیہوں کھانے میں نہ لگے گا۔ چھوٹے کسان نہ اندہ پیدوار بازاروں میں بیچ چکیں گے اور واکوں اور گردا میں بھی کبھی ایک دانہ نہ دے گا۔

اور کتے، گل بول، جھنڈے، کڑک، دھوکا کھاتے تھے۔ بکتے تھے اس اصول میں غلامی طویل ہو گا۔ ایسا نہ ہو کہ سے عقل سے کیا دوسرا ہو گا کہ ہوشیار اور مستقل مزاج تھا۔ آج صبح پوری سب سے بڑی کاشتکار کے اور سب سے اچھے بھائی اس

ت اہمیت تھی۔ باپ صاحب تھا تو اس نے دو عجیبے کیفیت: وہ وہ طریق ادا کیا تھا مکان چھوٹا تھا، اور وہ نے اپنی محنت اپنی کمزوری اپنی روح پر جسے پیسے کو دانت سے پکڑ کر گاؤں کا سب سے بڑا مکان بھی بنوایا۔ وہ پارلر کی کمی تھی بھی کرنے لگا اور پراس عجیبے زمین کا بہرہ دہی بھی ہو گیا۔ مکان کی خریدنے پر بڑی مہری ڈال دی تھی۔ اسے اس کا خیال تھا کہ میری پورے مکان کے کتا ہے اور دریا اس کے کھر سے اور وہ ملک کے کتا ہے پر ہوتا ہے۔ لیکو ایسے سہاگت میں آگم کا سپرچ۔ اس کا اصل تھا۔

اس لیے اب وہ کھر کے طرف سے بے فکر اور کتنے کی طرف سے ملے جو کہ سکھ پر بیٹا زیل کو گڑا تا اور اس کی آواز میں ایک رہتی اور اس کے دھڑکیں میں ایک رقص کی کیفیت محسوس کرتا۔ اسے معلوم ہوتا ہے کچھ دیو کی نگاہ میں غوطہ کھانے کر سب آب سے نکلے ہوئے اپنے کو کھڑکی کے بل سے بھی زیادہ ایک ساری میں لپٹی جاتی ہیں اور اپنی جاتی ہیں اور ان کے کھنگھڑوں کی جھنکار تھی کی دھڑکیں اتنی ہی تھریں، اتنی ہی دھڑکیں تھی جتنی کہ کھال میں گرتے اور بہتے ہوئے زرد سپید ستوں کی اور ایک بارگی اٹھ کر زیل کو دبا کے کھنے سے لگا دیتا، اپنے ہٹا، سوچنے لگا، کھانے لگا اور اس طرح سکوا پڑتا جیسے کئی جوے کو کھا کر سکواتی ہے، جیسے از نیک پر پنی جی کا آپریشن کے سکواتا ہے، جیسے گدہ میدان جنگ کو دشمنوں سے بھرا ہوا دیکھ کر کھنکھاتا ہے۔

پیسے گزرتے گئے۔ نیت بدلی موسم بدلا، جون کا مینہ آیا، ابدل کے جھوم آئے، انھوں نے کچھ دنوں تو آسمان پر چل قوی ہو کر قدم ذرا اتیر کیے، دوڑنے بھاگنے لگے اور آخر میں تنک کر جگہ جگہ پر دم لینے کے لیے ٹھہرنے لگے۔ گاؤں والوں نے پھیل کر بیروں کو سینا شروع کیا، کھیاڑوں میں پڑا ہوا، اناج، بھوسا، اکیہ، پتیاں، پھلے، انھوں کے گھوڑے، سوکھی مکھڑیوں کے شے کھا کر توڑ کر پھیروں کو ٹھڑیوں میں دھکنے لگے۔ جہاں پانی روکنے اور دھان لگانے کے لیے دس بیس کھیتوں کی میٹھیں اڈ چکی کرتے، انہیں پانی سات لگا کھر کے جتنے تیر بھی ضرور دیکھ آتے۔ میری پر بند پر بند، تھا کھر لگا کھڑا کیا، اعتبار، کس وقت کوئی سی کر دٹ کر وہاں رہتے ہیں، آپ سے باہر ہو جاتا ہے، اتنا بڑا اور یا پھر پانی ہندی میں بدل جاتا ہے، اور اڑا اڑا اور ہڑا ہڑا، اس کھانے والا، اس جیسے کھانے ڈوبا، کتنے ہیں، دیوانہ راہ کے مسات، اس دیر کے لیے ہر ساقی ہوا کا ایک جھوٹا ہی کافی سے زیادہ ہے، اس کی قطع ایک بدست ہستی کی طرح ہو جاتی ہے، اس باغ کے درخت فہمے، اس سبزہ زار کو رو خدا، فیصل خانے کی دیوار میں پاش پاش ہے، اور ایک کے محل کا چاکر سونڈ سے کھینچ کھینچ کر توڑ پھینکا، اخبار والے، ریڈیو والے بھی برابر خبردار کر رہے تھے، اب کی بریت لڑائی ہے، پچھلے برسوں کی سی جانی پہانی نہیں ہے، جینک میں گرانے ہانے دھلے ہول اور سانپ یا میں تانلے جانے والے عربوں نے صاحبین نہ جانے کتنی تبدیلیاں کر دی ہیں، روسی اسپتکوں اور امریکی راکٹوں نے پوری ہوائی فضا میں ہل ڈال دی ہے، پانی کی قیامت کا سے اندی لگے کتنے پڑھیں دھیں کچھ نہیں کا جاسکتا۔

اور ایسی سنی، اسی سنی کر دیتا، اسے قیہ تھا، اس کا مکان اس کا کھتہ، سب دیر سے کئی فراہم کے فائد پر اپنا بند ٹھہرانے کی بات نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی تو مرنے سے جب اس طرح کی آفتیں آئیں، ہزاروں اپنا پنا، ہزاروں کھنکھڑا، ہزاروں خانوں ہزاروں کے، کھوکوں کے جمع خیمہ میں، تو انے جب آثار ہوں، ایسے ہی سے میں کھنکھانے، دام میں گئے۔

خود دھپانی بنے گا۔ ایک ہندو متاخر دیات ہوا۔ دل کھل کے ہوا۔ ہی توڑ کے ہوا، کوئی کوئی کھڑا کھڑا
 کر کے ہوا۔ کچھ دیواریں اور چھتیں جو گئیں، چھروں کی تختیاں اور کچھاؤتھیں کے ڈانے لیر ہو گئے۔ کچھ مرثیہ لکھنے والے
 کچھ لوگ نہ تو ہی سے مٹوئے کر لے گئے، کچھ جگ کر، نظریں، اور میرا میں گرفتار ہوئے۔ اور دیا نے اچھا لکھنے والے سے
 تو دونوں کا۔ دن کو بھرا، پیر چھٹ کر پھیلے اور ڈھکا اور اس پھکا اس طرح اور اس شخص سے پچھلے تیز تھا اور دھونے ا
 کو نہ کانت نہ کمن اٹھل کر جاتا اور گڑے، اوادیاں پی کے پی میں پکرتا اور پھون کو کرتا، شرکوں کو پال لکھتا، ہرے دن کو
 کرتا، جگروں کو اکھاڑتا، آبادیوں کو ڈھتا، چل جاتا، میدان پور کی جہیوں کو چاٹتا، کھنڈیں اڑاتا اور کٹا شروع کر دیا۔ ایک ہ
 دیا سے قریب دسے گھروں میں شور مچا۔ پانی دیواروں کو توڑ کر اندر گھس رہا ہے۔ دل ملیشیں کو ہلکاتے، پھٹکتے بجاتے
 تھوڑا سا سالانہ کنہ صلا سوں پر رکھ کر اور بہت کچھ گلوں میں چھوڑ کر نکل جاتے۔ مقام ضح کی طرف سے بھی کچھ لوگ آئے ا
 کی رہنمائی اور ان کی ہدایت پر عمل کر کے دوسری شام تک سارا گاؤں دوسرے دیات میں پناہ لینے چلا گیا۔

مگر ادھر اپنی جگہ سے نہ جھٹکتا ہے، شل ہے، جا رہا ہے تو جھل ہے، یاں تو کتہ کی جان تھا اور گھر ہی جان۔ اسی کے
 کی طرف اس نے اپنے گھر میں مضبوطی میں گاڑ لی تھیں۔ اُس نے اس دن کا پچھلے ہی سے بندہ است کر رکھا تھا۔ وہ کیوں جاتا، پانی
 چھتا ہے تو ہٹھنے دو۔ بھوکے بھی تو بڑھیں گے۔ اسی روز سیاہ میں تو اس کی تھری پگھنے والی تھی۔ اسی اندھیرے میں تو اس ا
 نہیں کے چراغ جگ تک جگ کر رہے گے۔

ببیری لے ڈرا کی او بیٹھنے بھی ڈستے ڈرتے، دم نہ ہونے پر بھی اوادیا چھائی تو ادھر کڑا کر پڑا۔
 دونوں ہی جاؤ اور ملیشیں کو بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ میں بعد میں آؤں گا۔ بیانے بھی وہ جتنی لکے گری، برسی تڑا پی سکو وہ پ
 باجدار اپنی بات سے نہ ٹھو اور گھر سے قدم نکالنے پر تیار نہ ہوا۔ یا ڈر گئی مگر شہر پرست ہونے کے ساتھ ساتھ وہ
 بھی تو تھی۔ اُس نے کھٹو کو سمجھا کر ملیشیں کو کھٹو ڈھکے جانے کے جانے دوسرے گاؤں بھی دیا۔

کھٹو کا سارا دن اسی کام میں گزرا۔ ہزاروں کے پیچھے چارے کا بندہ ویت کرنے میں رات ہو گئی۔ پانی بھی پیسے
 دھندلے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس گرجا ٹرپ کے ساتھ آیا کہ ہر شخص اپنی اپنی جھومت کر بیوی گیا اور رام رام کرنے لگا۔ کم
 میں باہر نکلنے کی بہت نہ تھی۔ گھو بھی بیگ کر چو با جو گیا تھا۔ گاؤں کے پناہ گزینوں نے اسے زبردستی پکڑ کر اپنے پاس لٹھیاں
 اسے ایک شوکی دھوتی دے کر کپڑے بدلے اور آٹے کے پاس لٹھیا۔ اسے اپنے پیچھے پھینے میں شریک کیا اور اسے اُس کالی ڈرا
 بھیا تک رات میں کسی طرف میدان پور نہ جانے دیا۔ شیتر کے ہی کوؤں کی پہلی ہی کاشیں کانیں کے ساتھ وہ اٹھ کر میدان پور کی جا
 بھاگا۔ گاؤں سے دھوکہ بجا دھر ہی اُس نے دیکھا ساہے میں جل تھل ہے، صرف ادھو کا گھر جی رہا ہائیچ میں کھڑا ہے۔ کن
 ہی سے کھڑے کھٹے اُس نے پتیا ہی پتیا ہی کہہ کر پکارا۔ ادھو نے پھت پر آکر آواز دی۔ منشی اور پناہ ڈھکے کر آؤ
 نہیں یہاں سب ٹھیک ہے۔

دیکھو یا ہر کھٹو کٹی ڈھونڈنے لگا۔ اسے پس دے لی گئی۔ دروازہ ہی نے کٹھی بھی دوئی، پناہ ڈھکے اور

اور غوث خان ایک سپاہی کو بھی ساتھ لیا۔ وہ جہاں بھی تھا بہت دوا بھی تھا اور پیرا کی کاما بھی۔ دونوں کشتی میں پہلے علیکس پانی کے ہاڑ سے زیادہ دو غولے تھے۔ ایک تو ڈوبے گاؤں کے ڈیو تھیر ڈوسے بستے ہوئے درختوں کے ڈیو تھیر پر موجوں سے لڑتے دھارے کاٹتے نیچے اُپر کی جگہاں سے پتے جب دونوں کنارے پر پہنچے تو ادھو اپنے دوا میں کھڑا بے چین ہوا۔ اس نے جھٹ کر کشتی سے پھاڑا اٹھایا اور اندر گھس گیا۔ گھوٹاں اُپار پکارتا کچے دوڑا۔ زان خانے کے کربے سے کرا بننے کی آواز آئی۔ ہا کر دیکھا تو ان پخت سے گرے بے کے نیچے دبی پڑی ہے اور کمر دھاتوں سے دھنی اور مٹی بنانے کی کوشش کر رہی ہے اور ادھو ازخنی بیوی کو گلے کی جگہ آٹھ کی زمین کھود رہا ہے۔ گھوٹے بھارنے پر غوث بھی دواں کے کچھ میں کشتی باندھ کر اندر آگیا۔ دونوں نے مٹی پا سڑکا ڈیر دھاتوں سے بنایا اور بے ہوش لیا کو نکالا۔ گھوٹے گودیں اٹھا کر کشتی میں لیا۔ دواں اپنے زانو پر ان کا سر رکھ کر اُس کے چسکے سے خاک و غول پاک کیا۔ اُپار اور جواب نہ پانے پر اُس کے منہ پر منڈ رکھ کر رونے لگا۔

دوسرے کنارے سے گاؤں دواں نے شور کیا۔ "اے گھوٹ جلدی کر جلدی! عبر آئی ہے تاجر ادھو پانی میں کس بحر ادھر ہے۔ جلدی سب کو لے آجھا! آجھا! غوث خان نے پکارا۔ "ادھو! ادھو! جلدی کر دجی جلدی!" اور جواب نہ پانے پر گھوٹ کو مرنے اُپار پھوڑ کر پھر اندر گھسا۔

مٹی کے کھم کو پانی نے جگہ جگہ سے کاٹ دیا تھا۔ کچھ کا حدت صاف اُبھر آیا تھا اور تاجہ انوں کی جگہ تیزی سے کھتے تھے بار بار تھا۔ ادھو نے دیوار دار آس پاس کی مٹی پھاڑے سے کاٹ کر دڑاڑوں میں بھرنا شروع کر دی تھی۔ نہ جانے کہاں کی اس میں قوت اور پھرتی آگئی تھی۔ وہ دوڑا جاتا تھا اور سوراخوں کو خالی جھون کو بھرتا جاتا تھا۔ پھاڑے سے مٹی رکھ کر داتا پاؤں سے پھینا اور کہتا۔ "کچھ میں گئے گا! نہیں ہاتا! ادھر کا ہے! ادھر موجود ہے۔ جو نہ دیکھیں اب کیسے جاتا ہے۔"

غوث دواں سے چنا۔ "اے پھوڑا سے! ہاں چل! سارا گھر گرنے والا ہے۔" ادھو نے اسے جس سے قنارت سے دیکھا۔ اُپار پانی۔ میں تو جیتے ہی پناکتے برباد نہ ہونے دوں گا! غوث پکا کر زبردستی پکڑے پلے۔ ادھو پھاڑا اٹھ میں قتل کر کھڑا ہو گیا۔ ایک دم بھی اُسے بڑھایا تو سر توڑ دوں گا۔ غوث نے بھانے کی کوشش کی۔ ادھو ہنسنے لگا۔ "خیر کر کس نے یہاں بولیا! جانا کیوں نہیں! جانا یہاں سے! چل!" اور وہ مار کرنے والے انداز سے سپاہی کی طرف بڑھنے لگا۔

دھننا زمین بننے لگی۔ پھر ترانے کی آواز ہوئی۔ ایک بستی جو بے شیشم کے درخت نے ادھو کی دیوار کو ٹکرای۔ پانی کی پھینٹ! بنت مٹا۔ اُسے اُڑ کر بہت پر زریں مسمیٰ کر پاش پاش ہوئیں۔ ادھو نے قہقہہ لگایا۔ ول ول! انھیں کس کے غوث کی طرف بڑھا بیٹھتا دھڑا! ادھو پھاڑا اٹھ سے پھل کر غوث کی طرف چلا۔ سپاہی جگ کر بھاگا کشتی میں اُچک کر آگیا۔ ساتھ ہی تارے اُپار کی موج ادھو کے انھوں سے اُڑ گئی۔ موجوں نے کشتی کو ڈوب چیک دیا۔ ایک پاؤں اب پیچ جس میں نہ مکان تھا نہ کتہ اور تارے ہاں سے عزیز رکھنے والا ادھو!

گھوٹ دیوار دار چیا۔ چتا چیا! چتا چیا! غوث پاس دواں کے غیر جہد دانہ بے میں بولا۔ اسے جانے بھی ہے! غوث نے سر پ تپا چیا!

اپنے ایک افسانہ کا تجزیہ

ممتاز مفتی

میرے نظریں آپا حردہ ساز تک ایک مہر و محنت میں غافل پر کافی رہی۔ اس کی دودھ جوتھیں۔ پہلے دوجہ تھی کہ یہ کافی کسی کی فراموشی ہوئی کہنے کے لیے کچھ گنج تھی۔ (داخل کرنے والے ملک پر شہر تھے۔ بلکہ ان کے احصاء کا جدید پکا تھا۔ ایک انوکھی فرض پڑا کرنا تھا۔ آپا ہنسنے میں کہ انوکھی فرض پڑا کر کے کی خواہش پہلے کتنی ہی شدید کہلائی۔ مگر پھر بھی اس سے حردہ بتا ہوا ہاں پڑا کر کے مترادف سمجھا۔ مطلب یہ کہ آپا میں نے اپنے جذبے کی وجہ سے نہیں کچھ تھی۔ اور اگر فراموش نہ ہوتی تو شاید میں آپا پر کچھ افسانہ نہ لکھتا۔ دوسرے دوجہ بھی شرمیلے۔

میں ان کھنے والوں میں سے ہوں جنہیں شہرت پہلے ہی سے چلی حردہ پر مل گئی۔ اور بعد میں افسانہ نویسی کی پٹری دکھائی۔ حردہ سے جتنا ملتا ہے کہ لوگ پہلے کھتے ہیں، بار بار کھتے ہیں۔ پھر بچتے ہیں۔ بار بار بچتے ہیں پھر کہیں شہرت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ بھی لازم نہیں کہ حردہ شہرت حاصل ہو جائے۔

میں نے پہلی چیز بھی فراموش پر کھیں۔ جذبے سے نہیں ویسے ہی کھڑی دی۔ جان بچھڑانے کے لیے۔ وہ چیز چھپ گئی نہ کہ چھپ چکی ہو۔ جس طرح جسے دھوم دھڑکے سے چھپ گئی۔ پھر بیٹھے بیٹھے ان ہانے میں شہرت حاصل ہو جانے کے بعد یہ مشکل آ پڑی کہ مجھے ہمیشہ کے سوجنا پڑا کر کیا کھوں۔ کیسے کھوں۔ سوچا سوچا کر میں نے یہ طے کیا کہ ہنسنے کا موضوع اور کھا ہوا چاہیے۔ مگر اب کوئی حکیم حقیقت۔ عام حقیقت نہیں۔ دل کی تہوں میں چھپی ہوئی کوئی بات۔ جنہی خود کی کڑی کا لانا ہی اچھا۔

اس زمانے میں آپا ایک ماحول دار تھا۔ مگر میں مجھے کے قریب چاکی یا پیرے پر ایک ایک آپا بیٹھی ہوتی تھی جو میں جھانک کر دیکھتی۔ تو کی لاش میں مسکاتی اور دیکھی اور میں بات کرتی۔ اس زمانے میں سبھی آپا کی تعریف کرتے تھے کیونکہ کئی بھی اسے دل سے نہیں جانتا تھا۔ اب اسے وہی سا جو باجی عام نہ تھی۔ جسے ہوش سے اس کو دیکھ کر کاؤں پر اتر کر کھتے۔ بڑی ہڈیاں منہ میں اٹھائیں۔ ڈال دیتیں۔ نوجوان سا جو باجی کو دیکھتے تو انھیں کھل کی کھل نہ جاتیں۔ انھیں کھل جاتیں۔

آج کل تو سڑکوں پر بازاروں میں دکانوں پر بسوں میں دھڑوں پر گھبریں میں ہر جگہ سا جو باجیوں کی بیڑی بٹے آج کل تو آپا نہیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں کچھ اس زمانے میں آپا ایک عام چیز تھی بے حرام۔ ایک ایسے افسانہ نویس کے لیے جسے چٹو شہرت مل چکی تھی آپا سے عام موضوع پر غور اٹھا بعد کوئی بات تھی۔ اس دودھ والی باریک میرے نزدیک آپا کی حیثیت ایک مہر و محنت میں غافل افسانے سے زیادہ تھی۔

سب غرائش کی تفصیلات بھی سن لیجیے۔ یعنی آپا بھنے کے غرائش کرنے والے لگ کر کہتے تھے کہ حالات میں غرائش کی گئی اور میں اس غرائش کو چھنا کرنے پر کیوں مجبور تھا۔

یہ ۱۹۴۰ کی بات ہے ان دنوں میں ایک اپنی سکول میں ٹیچر تھا۔ خواہ نہایت قلیل تھی۔ کھانے والے تعداد میں زیادہ تھے۔ اگرچہ میں نے یہ اصل بنا رکھا تھا کہ ٹیوشن نہیں کرنی تھیں حالات نے مجبور کر دیا۔ میں نے اپنے ایک بھڑا اور صاحب رسوم دوست سے کہا کہ اگر ہمارے کچھ تو کئی ٹیوشن دلاؤ۔ ایک روز میرے دوست میرے ہاں آئے کچھ ٹیوشن کرو گے ارادہ بدل تو نہیں گیا۔ میں نے کہا ضرور کروں گا ارادہ ابھی پتا ہو گیا ہے۔ وہ مجھے شہر کے ایک رئیس کے گھر لے گئے۔ تعارف کرایا۔ معزز رئیس نے میرا ہانڈہ لیا۔ پھر کچھ عرصے میں ہمیں تھکے شاگردوں سے ملے۔ معزز رئیس میرا تعارف کر کے چلے گئے تو میں نے آزادانہ انکھ اٹھا کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ دونوں میرے روبرو بیٹھی ہیں۔ آپا اور سا جو باجی۔ آپا بڑی تھی سافلی تھی۔ نظریں جھکائے ہوئے تھی کبھی کبھار نکھیروں سے دیکھتی اور توکی اوٹ میں مسکاتی۔

سا جو چھوٹی تھی گوری تھی پھل تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی۔ مسکراتے باقی اور نگار باقی کیسے جاتی کچھ دیر تک وہ دونوں میرا ہانڈہ دھتی رہیں تو پتا چل چکی تھیں کہ انھوں سے سا جو طایفہ حور پر۔ سا جو نے منہ بنایا۔ بات بدلنے کے لیے میں نے پوچھا کیا زحمت۔ سا جو چپے سے اٹھی اور حساب اور الجبے کے کتابیں اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیں۔

حساب اور الجبرا میں نے صرف میٹرک تک پڑھے تھے۔ میٹرک کے امتحان میں حساب اور الجبرا کے پرے میں نہیں نے۔ ۱۰۰ میں سے صرف ۱۰ نمبر حاصل کیے تھے۔ حساب الجبرا اپنے کسی کی بات نہ تھی۔ دراصل میرا خیال تھا کہ ٹیوشن اٹھریزی کی ہوگی اور اٹھریزی میں میں اپنے آپ کو قیس مار خان سمجھتا تھا۔ حساب کو دیکھ کر بھی اپنی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اسی پر سپینہ آتیا۔ سا جو بات کو سمجھا نہ گئی۔ اور اس کا اٹھا کیے بغیر نہ رہ سکی۔ بحث اپنا ردال نکالا اور میرے ہاتھ میں تھادیا۔ میں نے کلاس میں روٹی سے کیا بنے گا۔ گھر سے کوئی تھکن اٹھاؤ۔ بس اس جگہ نے مجھے قائم کر دیا۔ ابتدائی جائزے کے اثرات گہرا سدوم ہو گئے۔ میں نے کلبھاؤ اس مسئلہ کو۔ ہم نہیں کامیاب نہیں پڑ جاتے۔ اٹھریزی پڑھو۔ مسنون ہونا۔ سا جو بولی اٹھریزی کیوں پڑھیں اس میں تو ہم آپ فائق فائق ہیں۔ اس پر میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل سے پڑھنے نہیں آؤں گا۔ لہذا ادھر ادھر کی گپیں بوقت گزار دیا۔ اس کے بعد میں انہیں پڑھانے لگا۔ قیسے روز وہ رئیس بزرگ سکول میں آگئے بڑے میاں تم نے کمال کر دیا ایک روز آئے اس کے بعد رسیدی بند دی۔ میں نے صاف کہہ دیا جناب عالی حساب پڑھا اپنے بس کا روگ نہیں۔ بڑے میاں کس نفسی کی حرج ہوتی ہے کوئی۔ دیکھیں اب کتنی ہی کہ حساب میں تم سے زیادہ فائق آتا ہے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ میں نے ہاتھ سمجھا اٹھ کر وہ نہ اسنے اور مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔

میں پہنا تو وہ دونوں مسکرا رہی تھیں۔ سا جو کی مسکراہٹ میں مسند اعظم کی جھلک تھی۔ میں نے بے ہمتی سے کلبیوں مجھے سب کے جھنجھٹ میں ڈال دی ہو تم۔ ایک سوال حل کرنے میں اپنا چٹاٹ بھر نکالے ہو تا ہے۔ اس پر سا جو نے اٹھا کر میرے سامنے دو حل کیے ہوئے پرچے رکھ دیے۔ یہ دراصل امتحان کے حساب کے پرچے تھے۔

نے سوچیں سے سنبھلے تھے اور سامنے سوچیں سے ا۔۔۔ میں جیوانہ لگا۔ سا جو ہلکا آپ تو غلام غلامہ لکھائے۔ میں نے کلمہ پڑھ کر شکر کیا حسب۔ سا جو ہلکا۔ پڑہ کر شک با ڈاکو کت بھی تو شانی ہوئی ہے۔

پڑوسے دوادہم کنڈوں کت ملاتے رہے۔ کتابیں ملنے پھو کر گتیں ملتے رہے۔ خاص ہے کہ انھوں نے کہا آپ یا ناکہ میں جاتہ ہوں۔ اور وہ حاجت دوائی کر رہی تھیں۔ جب سا جو لکھا احمد سادہ دیتے تھے مگر ان کی تو میں لکھا پتا تو یہ پتہ ہی نام کی کالی ہے۔ اس پر وہ جھٹ بوتی۔ جھل کی کالی سے کبھی کبھی مٹا جاتا ہے کیا؟

وہ بیچنے کے بعد میرا تادہ لکھا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے اندازہ اذان کلاش کر میں کر کی خدمت کر سکتا۔ اس پر آپ نے سا جو کشارہ کیا۔ سا جو ہلکا کر سکتے ہیں آپ۔ میں نے پوچھا وہ کیسے ہلکا۔ آپ ہم پر ایک کالی کھدکے ہیں۔ وہ دوادہ کے دوران انھیں علم ہو چکا تھا کہ میں انہیں لکھتا ہوں۔ رخصت ہوتے وقت آپ نے دلی زبان سے کہا۔ کالی مزد لکھیں گا۔ آپ کی وہ سرگوشی بھی تمک نفساں پر رہی ہے۔

آپاچی دیکھی سکتی پر تیل پڑی۔ چلی شہت سندھ ہو گئی اس کے باوجود میں نے اس حقیقت کو نہ سبھا۔ کہ وہ حقیقتیں کس قدر خیرانوس ہوتی ہیں۔ اور حقیقت کو پھیلنے کے لیے حمایت کا پردہ ویز تری پر وہ ہے۔ آئی تمک یہ حقیقت یہ سدا کہ گراہوں میں نہیں پڑ سکی۔ اور آنا تمک میں انسانے کے یہ ان کے موزوں ڈھونڈا ہوں۔

آپاچی ترشہ اور اندازہ میں مسکری نے بے پل مرتبہ خدا کھا کھا تھا۔ آپا بپت پنڈانی بیکس اذراہ کرم کبھی سا جو اچھا کا پتہ لکھ بیٹھے۔ میرے اس انسانے پر اس سے بہتر تنبیہ نہیں ہو سکتی تھی۔ جس مسکری کے اس ایک جگہ میں نہانی کی چیز لگی ہوئی تھی۔ آئی جی بیکہ سا جو اچھا کھ کر ہو دیں اور سا جو اچھا کا پتہ پوچھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آئی جی مسکری کا وہ کچھ اس طرح اسنے ہے۔

انگریزی میں ایک کادت نام ہے۔

"Gentlemen prefer blondes but they marry brunettes."

میرا اندازہ آپا اس کادت کی ضد تھا۔ میں نے اس انسانے میں یہ کاکثر آپا کے ذرا ہوتے ہیں لیکن سا جو سے بیاہ کر کے کتنا رکھتے ہیں۔ لیکن اب بگے شک ہونے لگے ہیں جن تیز رفتاری سے سا جو اچھا ہم ہوئی جا رہی ہیں اسے دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید جلد ہی میرے اس انسانے کو پڑہ کر لوگ یہ محسوس کرنے لگیں یا کوئی نادر بگے خدا میں لگے کہ سا جو اچھا بہت پنہ آئی کبھی آپا کا پتہ بتائیے۔

حالات تاریخ دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید مستقبل قریب میں آپا ایک خیالی کردار کی حیثیت اختیار کرے۔ اور آپا کی محبت کی تصویات اضیلا کی اچھی معلوم ہونے لگیں۔ اور جس مسکری کا وہ ملا اپنی آفاقیت کھڑے۔ کیونکہ شاید کہ کوئی ایک اس سا جو اچھاں میں کے کئی خطی پر نگینوں کی طرح آئیں۔ بڑی دل کاہن ہو اور ہوش۔ لیکن بیشہ یہ سنگنگ اندھی کی طرح آیا اور بگے کے طرح چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے کسی ان ہانے اصول کے مطابق سہریں کے بعد سا جو

جس کا دور آتا ہے۔ اور موت آتی دیر نہ ہے۔ جتنی دیر سکڑا ٹوٹا ہے۔ آتا ہے اور چلا جاتا ہے اور پھر صدیوں آپا میں راج کرتی
ہی نہ انہیں بے حد پسند کرتے ہیں لیکن سا جو باجی کا پتہ لپکتے پھرتے ہیں۔

سا جو باجی انہی محبوب ہے اور قدرت سا جو باجی کو شاید اس لیے عام نہیں ہونے دیتی کہ مبادا وہ اپنی محبوبیت کو
دے اور موت کی کشش عام ہو کر ختم ہو جائے۔ نہیں کسی عسکر کا وہ جھوٹی آفاقیت نہیں کھو سکتا۔

میں نے محبت کے موضوع پر کئی ایک افسانے لکھے ہیں۔ میں نے بار بار یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ کئی ایک ڈھکے چھپے
سات جنت کا ہر وہ پہلو دیکھ لیتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک سرتر ایک بھر میں جھجکتا ہوا پروازوں کی عقل میں، دھماکا جھجکتا
دھماکا جھجکتا ہوا پروازوں میں۔ اسی طرح کبھی نفرت کا بنیادی جذبہ بھی جھجکتا ہے کہ کتنا ہے میں محبت ہوں۔ کبھی انتقام کا جذبہ اپنی
سیر کے لیے محبت کا دوسرا پہلو دیکھ لیتا ہے۔ کبھی موت ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ محبت کا سراپا بھرنے کے بغیر پارہ نہیں
رہتا۔ کبھی قہر و کثرت ایجاد کر لیتی ہے۔ کبھی پڑوس کی شرارت محبت کی شکل میں پھوٹ نکلتی ہے۔

ان میں نے محبت پر کئی افسانے لکھے۔ دود وود کی کوڑی لکھنے کی کوشش کی۔ ان باقی باتیں کہنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ خیال
ہے کہ عام محبت کی بات کروں۔ میں کوئی چھوٹا سا لکھنا تھوڑے ہی تھا کہ عام محبت پر افسانہ لکھتا۔ اور کسی عام کردار کو پیش کرتا۔ آپا
آب کا کردار تھا۔ اور اس افسانے میں محبت کی عام تفصیلات درج ہیں۔ یقیناً اگر فرمائش نہ ہوتی تو میں کبھی یہ افسانہ نہ لکھتا
— لیکن قادی نے آپا پڑھ کر تائیاں بجا لیں اور سیسٹر محبت کے دوسرے افسانوں کو نظر انداز کر دیا۔ یہ دیکھ
رہے تھے کہ ان میں اعلیٰ ضد پیدا ہوئی۔ اگر عام پڑھنے والے ایسے عام افسانے پسند کرتے ہیں تو کیا کریں میں کیا عام آدمیوں کے
بے غمازوں؟

اور پھر آپا۔ آپا کا افسانہ تو غلو سے خالی ہے۔ لیکن خالی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں جو آپا کا مصنف ہوں،
میں نے لوگوں کی نگاہیں آپا کی طرف منعطف نہیں کی۔ یہ دیکھیے۔ یہ آپا دارموتی دیکھیے۔ اس کی آپا دیکھیے۔
محبت کا اندازہ کیجیے — لیکن لوگوں کی توجہ آپا کی طرف منعطف کر کے میں خود سا جو باجی کا پتہ لپکتا پھرتا ہوں۔ کسی سا جو باجی
پر تائیں۔ جلد کسی سا جو کا پتہ بتائے۔ اور پڑھنے والوں نے افسانہ پڑھ کر کہا۔ آپا ٹوبہ ہے بے حد خوب ہے۔ لیکن کسی
بے غماز ہے۔

مفتی نالال کیپور

مثال کے طور پر آپ ہماری اس نظم کو بھیجیں جو ہم نے "آل انڈیا شامو کنفرنس" میں پڑھا اور جس کا عنوان "عقباتِ حیات" ہیں گرجے۔

میں ہی میٹک ہی ہی کچھ سے ہی ہیں
 آہن میں دیکھ کر تو ہی تھنہ
 بگیا کیوں تھم کو پھر تر خیال
 دیکتا ہوں جب ہی تبا آب پر مرغیاں
 سہتا ہوں کاش اڑ سکتا میں شکوے کی طرح
 تجھ سے تو اپنے ہی میٹک اور یہ مرغیاں
 میں ہی گہرا وہی کا میں ہی ہی کا ہزار
 کوئی کچھ اور دیکھ کر تجھ کو اوس
 تجھ سے پوری جاننے کی ہے

اپنے ہر لمحہ کئے گاکھوں؟
 تم کو جو تجھے ہزاروں کوں فور
 حال دل تم کو کتنا ہے حال
 ترغواہ کو آج کیا دُن کا جواب
 کل بڑی مشکل سے ملو تھا اُسے
 لاش میں حوٹا ہی ہوا دہر میں
 ٹامیں ٹامیں کرتا رہتا شاخ پہ بیٹا ہوا
 دیکھا دس سے کر سیکر سامنے جو جھل ہے
 اُس میں کھوڑوں کے علاوہ چار سو سینک بھی ہیں۔

آپ ہی فرمائیے اس نظم کا کیا عنوان ہو سکتا ہے۔ آپ کہیں گے: کچھ سے اور سینک، ہم عرض کریں گے اس میں مرقاہوں اور
 نعرے کا بھی تذکرہ ہے۔ اس لیے: شکر اور مرقاہیاں۔ کیوں نہیں۔ اور آپ تو سب قرض، کوسوں اور بیٹی مجربہ اور ترغواہ کو کیوں بھول
 گئے۔ اور پھر آپ نے اُن داخلی واردات کے بارے میں کیا سوچا ہے جو اس نظم کی جان ہیں۔
 چلتے چلتے آپ کو ایک نقاد کا فتنہ بھی سنا دیں جن کی خدمت میں ہم اس لیے حاضر ہوئے کہ وہ اس نظم کا کوئی مناسب عنوان تجویز
 کریں۔ نظم سننے کے بعد وہ ہم سے پوچھنے لگے: آپ کو برل یا خضائن کے دور سے تو نہیں پڑتے؟ ہم نے حیران ہو کر جواب دیا نہیں
 یہ آپ کو کیسے دہم ہو گیا کہ ہم ان نامزد امراض میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے دوبارہ سوال کیا: کیا آپ جنگ یا چرس کے زیر اثر
 رہیں نہیں کہتے؟ ہم نے جب اس سوال کا جواب نفی میں دیا تو بڑی شدت کے ساتھ فرمایا: آپ داخلی بیماریوں کے کسی لائق
 ازب سے فرما رہے جو ع کیسے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کا داروغہ پہل گیا ہے یا پل جانے کی تیاری کر رہا ہے؟ ہمیں اُس نقاد
 سے ان رخصتیں باور ہوئی۔ مگر ہنچ کر بھنے آپ اور نظم کھی جو آپ کی تفریح میں کے لیے پیش کرتے ہیں۔

بھنے نقاد میں زمانے میں
 یمن قدرت کے کارخانے میں
 ان سے مل کر خوشی نہیں ہوتی
 دندگی دندگی نہیں ہوتی
 ان سے مل کر اُداس رہتا ہوں
 وقت مہمان و یاس رہتا ہوں
 مات آتی ہے اودھ کر کھل
 منکر کہ ہے کھنٹ شاعر سے

کس لیے شعلہ آہ و ندامت ہے
 زندگی موت سے پیار کی ہے
 اظہار کہ دنیا ہے منظر تیری
 ہر طرف کی دہے ہیں تھامے
 باغ میں شور ہے حلال کا
 پالے تو بھی سراغ منزل کا
 موت کا ایک دن مہینہ ہے
 چند کپڑوں رات بھر نہیں آتی
 ایسے ہیں وہ اگر یہاں آنے
 زندگی میں ہمارا آجانے
 یہ منظر محض ہے جنوں میرا
 پی کے فتراہک گیا جنوں میں
 کتنا کڑوا مزا ہے طہرے کا
 روتے رہتے ہیں رات بھر کتے
 ان کی شب کی سحر نہیں ہوتی

نظم لکھنے کو تو کھلی ٹیگھی بات کہہ میں نہ آتی اس کا عنوان کیا ہونا چاہیے۔ درجنوں حضرات قائم کے شعر
 کو بھی پسند نہ آیا۔ آخر ایک پروفیسر صاحب سے کہیں کی یاقوت کی دھرم تھی مشورہ کیا۔ وہ نظم پڑھنے کے بعد کہنے
 لگے نہ ساری نظم میں صرف دو کام کے بھرے ہیں اور وہ غالب سے چرائے گئے ہیں۔ اس لیے نظم کا عنوان ہونا چاہیے غالب
 سے ہاں ڈاکر۔ زمین ان کا مشورہ ناگوار گزرا۔ ہم ان کی یاقوت کے عہدہ ان کی نیت پر بھی شک کرنے لگے
 اٹنی دنوں ایک مشورہ والی رسالہ کے ایڈیٹر صاحب سے وفات ہوئی۔ نظم لکھنے کے بعد ان پر شک کا مار
 مارا ہو گیا۔ جب ذرا جوش و خروش ٹھکانے ہوئے تو فرمایا: اس میں کوئی شک آپ اس نظم میں کچھ کتنا چاہتے ہیں
 ٹیگھی کہ کتنا چاہتے ہیں اس کا اتنا پتا نہیں لگ سکا۔ بات تو آپ نے قاعدوں سے چھوٹی۔ اس کے بعد رات کا قند
 بے بجھے۔ اور پھر نہ جانے کیوں آپ کو فضا میں تھامے جتنے سنائی دیے۔ قاعدوں سے ایک خط آپ کا تخیل منہول کی تہ
 پہنچا۔ میرتب کو غائب کا شہر یاد آیا۔ غارتہ آپ نے کتوں کے رونے پر کیا۔ اب آپ کی فکر کام کر کے خیال کیا ہے۔۔۔
 کہ نظم ہماری کچھ سے بالاتر ہے۔ میرتب ایسے تو خراسان کیجئے۔ نہ ہی کے فتراہک گیا جنوں میں۔ ہم نے رحم بردار کیا۔ اور
 وہ اس وقت اس وقت کا آتا ہے ہر وہ عنوان: ایڈیٹر صاحب نے فرمایا: چھپے اس نظم کو ہم اپنے رسالہ میں بغیر کسی عنوان

دے دیتے ہیں مادہ قارئین سے مثنوی تجویز کرنے کے لیے کہتے ہیں :- ہم نے اُن کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے جواب
... میں منظور ہے چنانچہ نظم چھاپ دی گئی۔ پہلی قرق کے خط و قارئین نے عجیب و غریب مثنویات تجویز کیے۔ مثلاً
زور کہ خدا... مجھ کو بھلا... ہماروں گھٹنا پھوٹے آنکھتے... بکسلا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ... اک سوتہ ہے بکھنے کا نہ
کرنے کا... وغیرہ وغیرہ۔

ہیں یہ مثنویات ہر حد کہ قارئین کی عقل پر رونا آیا۔ یوں موسیٰ ہوا جیسے سخن فہمی کا دیوار پٹ چکا ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا
... اس نظم کا مثنوی سرسب سے۔ چنانچہ آج سہ پہر سے منظر پر کر رہے ہیں۔ یہی ہماری مشکل حل ہوتی نظر نہیں آتی۔ آپ نے
... اس نظم کا ملاحظہ فرمائی۔ آپ ہی کچھ دست گیر کر کیجیے۔ ہاں ذرا سوچ کر بتائیے کہ اس نظم کا کیا عنوان ہونا چاہیے۔

احتیاطِ عشق

حجاب امتیازِ علی

میں ادھر کی منزل میں دوشہ لکھو پر پہلی ایک کتاب پڑھ رہی تھی نیچے پائیں باغ مورتیا کے پتھروں کی خوشبو سے ملک رہا تھا۔

اتنے میں باہر کے صدر دروازے پر کسی نے اطلاع کھنٹی بجائی: "کیا وہاں بات ہے؟" میں نے اپنے دل سے کہا: "کتاب کا یہ دوری کتنا عجیب تھا۔ تحریر میں روانی کے ساتھ حق تھا۔ لوگ واقعی بہت ملتے ہیں۔ کم از کم یہ صفر ختم کیے دیتے۔ مجھے چاہیے وہ ایک فیصلے کے پال لڑن تاکہ وہ قوت دوستوں سے نہات لے؟"

کہا کرتے جوئے میں نے کتاب بالحق کی دیوار پر رکھی نیچے باغ کی طرف جھانک کر دیکھا۔ خانے میں نے کتنی ہی کتابیں دوستوں کی ماحولیت سے ہاکی وجہ سے بالحق پر رکھیں اور بھول گئی یا جو اکا بھول نکا اعلیٰ سے اڑا لے گیا۔ اگر اس سب جمع کیا جائے تو اچھا خاصا جھڑا سا کتب خانہ بن جائے۔ اور یہ سب دوستوں کی وجہ سے: ہاں — تو میں نے کتاب سب معمول و عادت بالحق کی دیوار پر رکھی اور نیچے باغ میں جھانک کر کہنے والے کو دیکھنے لگی۔ دیکھا تو میری پٹائی اور ساز مار سیلی ایڈر اوپر چلی آ رہی تھی۔ میرا غصہ غشی سے اور اکا بھٹ مسکرا بھٹ سے بدل گئی۔ ہم مذاق دوست آئے تو دل کی کل کھل جاتی ہے۔

۱۰ آؤ۔ چلی آؤ۔ کاش مجھے معلوم ہو کہ تم تھیں: میں نے چلا کر کہا۔

۱۰ سنو۔ وہ زینے دوڑ کر کھڑے کرتے بولی: "میں تم کو ایک بے حد پیاری بات سنانے آئی ہوں۔"

۱۰ ہاں جلدی سناؤ؟

۱۰ آج رات منیر آ رہا ہے۔ وہ اپنے بھنے بولی۔

۱۰ منیر! میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ ہنس پڑی: "قسم لے منیر۔ پانچ دن کی فحش پر آ رہا ہے۔ میں نے تم سے کہنا کہ اس سے میری طاقت کراں کی بندرگاہ پر ہوتی تھی۔ میں نے بیکایک اپنے دل میں اس کی گہری محبت محسوس کی تھی۔ اور اس کے بعد ہمارے جد و جہد ہونے لگا کہ کہ اس نے تم کو دیوار پر سے ہٹا دیا اور اسے سرگھینے لگی۔"

۱۰ ایسا ایسا۔ تم نے جیت میں محبت تو نہیں کی؟ میں نے مجھ کے دھکے آسمان پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

۱۰ بس بھنے وہ تم اپنی احتیاطِ عشق تو وہی۔ تم دوسروں کو بڑی سکھاتی پھرتی ہو۔ میں نے پہلی ہی نظر میں دل کھل کر کہہ

زیست شروع کر دی۔ بت یہ ہے۔ اس کے منہ کی رنگ اور اس کی دیوتا قاتل کی میں شیدائی ہوں۔ آنکھوں میں گرانی ہے اللہ سکو بہت میں
وہاں بیت :-

میں بولی گئی ہیں ہمیشہ کی ایک طرف دیکھتے آتے اور ایلینا سے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی :- بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا
ہے۔ پنجاب مجھے کیا کنا چاہیے ؟ تم مرے پاس کس غرض سے آئی ہو ؟

ایفونر شہر میں کی ایک بچی سی دیوار پر بیٹھ کر تھیں جادو ہی تھی سسکا کر بولی :- میں چاہتی ہوں کہ اسے بھانے کسی ہوٹل یا رستورنٹ
میں دے کر کھائے۔ تمہارے سنگ مرمر کے شیشیوں میں رات کے کھانے پر مدعو کرنا۔ وہ وقت کے خواب دیکھنے کے لیے
نہیں بڑے۔ شرف نگاہ گردن اٹھا اٹھا کر نیلے، سلاخوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ اعدادوں بھری رات کا ساٹا اس شیشیوں کے
ذریعے دے پاؤں گزر جاتا ہے :-

جب آدمی جنت کے تختے پر قہانے اس کا لہجہ شاعرانہ کیوں ہو جاتا ہے اس کے احساسات شہنشاہ کی بڑی طرح
نہیں اور شہنشاہ کیوں بن جاتے ہیں اور اس کی احساس کمتری پر نگاہ کر کیسے اڑ جاتی ہے۔

میں نے ایفونر کی شادی سنی پھر بولی :- مجھے کوئی انکار نہیں ایفونر۔ تم شوق سے مرے شیشیوں کو اپنی جنت کی
آواز بناؤ :-

اس نے جھک کر مجھے پایا کیا بولی :- "لیکن کھانے پر تمہیں بھی موجود ہونا چاہیے روحی :-"

شکریہ تمہارا۔ میں ضرور کھانے پر موجود ہوں گی۔ بلکہ شیشیوں کے عقب میں جو رات کی رانی کی جھاڑی لگی ہے اس میں
نہیں رہا رڈر کہ کر حشر غزلیں بھی بھاؤں گی :-

کیا بات ہے تمہاری روحی۔ واقعی مجھے تو اس کا خیال بھی نہ آیا ہوتا۔ ٹیپ ریکارڈر۔ موسیقی جنت میں چار پانچ لگاوتی
نہیں سنا ایسی حالت میں جبکہ آئندہ جیسے جادو شادی بھی ہو رہی ہے۔ تم آج رات اس کی رعنائی کی قائل ہو جاؤ گی :-

میں اس بھی قائل ہوں۔ تمہاری زبانی سنی چکی ہوں :-

لیکن دیکھنے کی اور بات جتنی ہے روحی۔ تھوڑی پڑھنے اور عطا نامہ کرنے میں بڑا فرق جتنا ہے۔ پھر یہ جسم۔ آنکھوں
میں سکو بہت میں ہلاکی اظہاریت۔ جیسے مونا لیزا کی سکو بہت :-

لیکن ایندھن مجھے لایکی سکو بہتیں پسند ہیں گویا پتے کوٹنے کی کسی سکو بہت :-

تو یہ وقت اعتراض کرتی رہتی ہو یہ فادہ تمہاری ہری ہے روحی۔ آج رات تمہاری سکو بہتوں کی قائل ہو جاؤ گی :-

نہیں وہ دیر پر سے کوڑی اور فردا جذبات سے ہے یہی ہو کر مے سیامی بے کوزہ زور سے نچکنے اور اس کے کان
مجھے سنائی اور عجیب سا شگ۔ لیکن میں مضبوط رہوں گی۔ میرے کچھ اور کہے ہوئے :- چاہے تو پیچھے نہیں ہٹاؤں مگر چہ
اور بات ہے :-

ایک کے یہ کہ اس کا زون میں گنہگار ہے۔

ایک کے یہ کہ اس پر مہمانوں اور پرستاروں کی حالت ہے۔ تم؟
تجربہ کیا ہے ایسا؟ کہنے والا کئی انداز میں پوچھ رہا تھا۔

لاکڑی کر شہر ہوتا۔ یقین نہ ہوتا۔ ایسا ہے کہ پرستاروں کے ہاں۔ غیر باہر تو ٹھکانہ۔ لاکڑی ہے
ہم تینوں لاکڑیوں میں جا بیٹھے۔ دو تو منٹ موت کی سی خاموشی ماری رہی۔ چشم زدن میں غارت گئے دیکھ کر میں خود حیران
تھی۔ ایسا ہیچ و تاب کار ہی تھی۔ دائیں بائیں میں اداسیوں تھیں۔ درمیان میں وہ انکا بیٹا تھا۔ مجھے زندگی ہنسنا رہی تھی۔
میں سر دیکھنے سے اس کے کدو مال سے اپنا منہ بند کر رہی تھی۔ جدا بازی اور ٹھٹھکی کی ایسی برتاؤ کا کچھ کہہ سکتے ہوئے ہیں۔
کبھی نہ دیکھا تھا۔

ایسا بد حال اور غمناک ہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے سب نے یزید ایک سرسری نظر مال کر رکھا تھا۔ آخر ہاتھ دھو کر آیا گیا۔
انکا لڑکی؟ اتنے بدل کیسے گئے؟

میں بدل سکتا ہوں ایسا؟ وہی دل ہے وہی جذبات؟
مگر۔۔۔ تم وہ نہیں رہے۔ سال بھر میں درخت بھی تبدیل نہیں جلتے تھے تم بدل گئے ہو؟
کس حریف پر بدلوں؟ وہاں عزیز نے مصروفیت سے سوال کیا۔

شاید اس کے لیے کی مصروفیت کا احساس ایسا کر بھی ہو گیا۔ مرا مطلب ہے۔ میں۔ یہی۔۔۔ کہ تم؟
نہ ہے۔۔۔ اچھا۔ دیکھو۔۔۔ یہ آگیا جو مل تھا۔۔۔ تھکے لیے سب سے اعلیٰ درجے کا کروہ خصوص کر
گیاتے۔

میں میری ہر کر ایسا کر دیکھنے لگی بولی۔ یہاں؟
ایسا ڈرا لگی سے بولی۔ ہاں ہاں یہاں۔ یہاں یہ زیادہ آرام سے رہیں گے۔ پھر وہ منیر کی طرف مڑ کر بولی؟
نات کر کے میں ہی چلی گئی تو کل شمع تم سے کھاتے ہو سکے گی۔ خدا حافظ۔ فی امان اللہ۔
منیر خاموشی سے اتر کر اند چلا گیا۔

مترولی دیر بعد جب ہم اپنے گھر پہنچے تو باورچی خانے کی طرف سے گرم کافی کی مسٹرٹیں اور بریانی کے ٹکڑے
ہشتا اعظم خوشنویس کی کچی برسر میں پہلی ہوئی تھی مگر ایسا کی شتا غائب تھی اور وہ گری سوچ میں تھی اور میں بے اختیار
پر غر کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد دوبار بولی۔ زودی۔ تمہاری کھانا کھا کر سے میں بڑی دور جا رہی ہوں۔ پھر کبھی تم سے ملاقات ہوگی؟
وہ بارگے نیچے سے کہے باہر نکل گئی۔

ایک واقعہ ہے۔ مگر سہا۔ لاکڑی آپ سے کافی کھیں۔

کوڑیوں کے مول

تحریر: بل مترا
ترجمہ: احمد سعدی



مختصر حالات زندگی



مصطفیٰ

میں ۱۸ مارچ ۱۹۲۱ء کو کلکتہ کے متوسط طبقے کے ایک ہنگل گھرانے میں پیدا ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے ہنگل زبان میں ایم۔ اے کیا۔ پھر انڈین ریلوے میں ملازمت کر لی اور مختلف عہدوں پر کام کرتا رہا۔ ان میں سے ایک اہلی کورپشن انسپکشن کا عہدہ بھی تھا۔

دوران ملازمت مجھے پورے ہندوستان میں سفر کرنے کا موقعہ بھی ملا اور ملک میں بسنے والے مختلف طبقے اور مختلف حالت خیل کے لوگوں کے مسائل اور حالات جاننے کا بھی۔ ۱۹۵۶ء میں ۱۰ میں نے ملازمت چھوڑ دی اور مستقل طور پر تحریر و تصنیف کو ذریعہ معاش بنا لیا۔

میں اب تک دو سو سے زائد ناول اور سات ناول لکھ چکا ہوں، جن میں "صاحب بری غلام" سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ لوگوں نے مجھے اسی ناول کے بعد جانا۔

میرے تین ناول "صاحب بری غلام"، "کوڑیوں کے مول" اور "اکاکی دھانی سینکڑا" (۱۹۷۹ء) (جب پہلی بار انگریز ہندوستان میں آئے تھے) سے لے کر ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء (جب چین نے ہندوستان کے شمالی مشرقی حصہ پر حملہ کیا تھا) کے زمانہ کو احاطہ کر کے لکھے گئے ہیں۔

میرا تازہ ناول "ہنگم میری سوسائ" زیر تصنیف ہے جو کلکتہ کے ایک ہنگل طبقہ والے "دیہی" میں قسط وار چھپ رہا ہے۔

میری تصانیف کے بیشتر حصے کا تمام صوبائی زبانوں و دیگر غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔

"کوڑیوں کے مول" کا ترجمہ انگریزی اور ہندی میں ہو چکا ہے اور اب اردو اور ملیالم میں ہو رہا ہے۔

پہل منرا

پہل قسط پھر کرنے وقت میں مصطفیٰ کے حالات زندگی میں مل سکر تھے۔ (ادارہ)

کوڑیوں کے مول

دوسری قسط

ترجمہ: احمد سعیدی

بہل مہترا

لیکن دوسرے دن شام کی دیکھو دھریا گیا۔

یہ دوسرے دن سام کی روپیہ دھریا گیا۔
 بہت سے دوست بہت سارے غلطے ٹکرنے کے بعد دیکھ کر احساس ہوا تھا کہ اگر یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت
 تھی دوسرے لوگوں کا دل دیکھ کر بھی تو خام و سادہ سی زندگی گزر سکتی تھا! جیسی زندگی ابھی لکرام مورتی اور سوم گزرا رہے تھے!
 ہنگامہ درست کر رہے ہیں! ملازمت میں ترقی پائی ہے! ٹانگوں کا ہے! ان کے بچے ہیں! شمع کو دفتر باتے ہیں اور شام کو گھر واپس
 اگر دیا ملدی کہتے ہیں! سیلا دیکھتے ہیں! ان لوگوں کو تو کوئی کمی نہیں ہے! پھر دیکھ کر کے ساتھ ایسا کیوں ہوا! وہ بھی ایک
 بار بے میں بھرتی ہوا تھا! دوسرے پانچ آدمیوں کے ساتھ جو کچھ پیش نہیں آتا! اس کے ساتھ پیش آیا تھا! ملازمت میں خلل
 ترقی ترقی ہی تھی! لوگ سب یہ صاحب کہتے تھے! لیکن میں صاحب کہہ کر بھی کیا ہوا! اس میں صاحب بخنے کے بعد بھی بار بار
 اس کے بدل میں یہ احساس ہوا تھا کہ خود اس کے جوہر کے اندر جیسے اس کے جوہر کی کوئی انتہاء تھی! پھر باہر کی روشنی اور جہل کے
 ساتھ باہر کے فائدہ اور پانی کے ساتھ ایسا گرد و شہ کیسے قائم ہو گیا! کہیں اس دن اس نے مٹرا کے پیر کے نیچے کھڑے ہو کر کھڑکی میں
 جھانکا تھا! کہ یہ کس کس تھی! اتنی چھوٹی سی غریب اس کے اندر ایسی کوئی کشش تو نہیں رہنی چاہیے تھی!

باقی: دوسری ملاقات کو دیکھو دھریا گیا۔

کہ اس سب سے پہلے اسکول آیا تھا، اسکول کے بعد دیکھنے پر چھا۔ اے آج اس سادھو کے پاس نہیں جاؤ گے؟
سادھو کے پاس ڈرامہ کر جائیں گے، کوئی نہ جواب دیا۔ چلو سپر کر منگ بھی تقریریں آئیں۔
کہاں؟

پیشتر پارک می:

بریش پاک میں اس لذت ایک بستی جی جنک تھی پرمیں سے میدان میرا تھا، دیکھ کر بچے پہل بہت خوف موس
نہا، پھر بھی بہت ڈرا مجھے تھا۔

کہ اس طرف روڑ میں چلیں بیچے آقا اے کوئی خوف نہیں تھا۔

اِس نے کہا: آؤ، اندازہ

انہ بہت سارے لوگ زمین پر بیٹھے تھے، کانگریس کی ٹھکانہ تھی، دو چھوٹی چھوٹی میزیں اور ایک گیس تپتی رہی تھی، انہ میرا ہونے پر جلائی جاتے گی، دو ستر کر کا پر بیٹھے تھے، نصف پاگ میں لوگ بھرے ہوئے تھے، 'قرب ہی دور' کا کڑیاں اور بھی تھیں، انہاں کے رپورٹر اور ایس کے آئی کاغذ پھیلے ہوئے بیٹھے تھے۔

دیکر گریاہے اور کہو کا ام نہیں جانتا تھا پتا کچھ ہائے کدو ہے ۔ مگر انہیں خبر کی کوئی ہے ۔ اور سب کچھ

ہم کو کون سے مسئلہ پہنچاتا تھا۔

سب سے پہلے۔ سب سے پہلے۔ سب سے پہلے۔

کون سے مسئلہ پہنچاتا تھا۔ سب سے پہلے۔ سب سے پہلے۔ سب سے پہلے۔

وہیں بائیکوپ ہو گیا تھا۔ وہیں بائیکوپ ہو گیا تھا۔ وہیں بائیکوپ ہو گیا تھا۔

گیا نہیں ہوئے تھے۔ ہم لوگ مٹا دیے۔ ہم لوگ مٹا دیے۔ ہم لوگ مٹا دیے۔

ایک آدمی نے جواب دیا۔ ہم لوگ مٹا دیے۔ ہم لوگ مٹا دیے۔

گیا نہیں ہوئے تھے۔ ہم لوگ مٹا دیے۔ ہم لوگ مٹا دیے۔

قریب پہلے جوئے ایک آدمی نے کہا۔ ٹھیک۔ ٹھیک۔

گیا نہیں ہوئے تھے۔ ہم لوگ مٹا دیے۔ ہم لوگ مٹا دیے۔ ہم لوگ مٹا دیے۔

صاحب نے کہا۔ ہم لوگ مٹا دیے۔ ہم لوگ مٹا دیے۔

اسکے لیے یہ ان کو کہو۔ ہم لوگ مٹا دیے۔ ہم لوگ مٹا دیے۔

صاحب نے کہا۔ ہم لوگ مٹا دیے۔ ہم لوگ مٹا دیے۔

اسکے لیے یہ ان کو کہو۔ ہم لوگ مٹا دیے۔ ہم لوگ مٹا دیے۔

صاحب نے کہا۔ ہم لوگ مٹا دیے۔ ہم لوگ مٹا دیے۔

اتنا کہہ کر وہ کہنے لگا۔ ملاکیم جان ہم کو وہیں ہمارا اور صاحب چل گیا۔

ملاکیم جان ہم کو وہیں ہمارا اور صاحب چل گیا۔ ملاکیم جان ہم کو وہیں ہمارا اور صاحب چل گیا۔

نے صاحب کو سخت قہقہہ لگایا، لیکن صاحب کا کئی قصہ نہیں، اس کے بعد ایشیٹن صاحب خود تحقیقات کرنے آئے۔ انھوں نے اپنے میسجین کو کہہ دیا کہ آج صبح دس بجائیں گے تینوں ساتھیوں کو جو پٹریش کے سامنے لا کر پچیس بیٹے لگائے جائیں اور ستر اگر ہم نہ لے سکتے تو ان بیٹوں کے شکایت بلدی میٹھ پر بھی لڑتے، ہم لوگ پٹریش اور پٹریش اسی لیے ان انگریزوں کے پاؤں پلٹتے ہیں اور دوں جو میرے قریب بیٹھے ہوئے ایشیم دوسکے لیے وہ پٹریش تیار کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کو کیا نام دوں۔

جنا کہ کہنا خود نے ہوتے سمیت اپنا پاؤں زمین پر دھرا۔

یہ ایک پس ابر سے دوڑتی ہوئی آئی لہذا وہ بھی پلٹنے لگی، مجمع میں ہنگامہ پیدا ہو گیا اور جو لوگ اتنی دیر سے خاموش بیٹھے تھے، اب اٹھ کر بھاگنے لگے۔

یہ ایک کہنے کا۔۔۔ جاک پو دیو، جلدی بھاگ پٹو۔

اس کے بعد کل گیا کرنا، کہاں گیا، دیکھو اور کہاں گیا، بریش پارک، ابھی تک اندھیرا نہیں ہوا تھا، گلی کے اندر ہی اندر وہ کہاں سے کہاں جا رہا تھا، الجھم الجھم روروں پر پہنچ گیا، وہاں سے چند ہی قدم کے فاصلے پر حاجی قاسم کا مکان تھا، بہت بڑی جڑ گئی تھی، وہاں سے گزرتے ہوئے کہان کی دکان کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک دم حاجی قاسم کے بازار میں جا پہنچا، ٹیپو سلطان کی جڑ تک کے سامنے ایک بست بڑا بنگلا کھڑا تھا، وہاں سے بڑے پتے کے نیچے سے جوتا اور دو سبھا آگئے، کاری کے طالب کا چکر لگا کر ایٹورنگولی میں ہیں شیو تھ کے قریب پہنچا، اس وقت تک دیکھ کر کی حالت سکون سے سوچنے کے قابل ہو چکی تھی، اس طرف کوئی گناہ گئی نہیں تھی، یہاں پہنچ کر دیکھنے والی طرح تھام، دھڑا کر دیکھا، اس پاس، وائیں بائیں، آگے پیچھے کیوں کوئی پوچھ نہیں تھی، دوڑتے دوڑتے وہ بڑی طرح اپنے گھر لگا تھا، اتنی دیر میں اب اس کی سانس درست ہوئی تھی، کہہ گاں گیا، اس کے ساتھ ساتھ دھڑکے پاس جانے کی بات تھی، وہ بھی پوری نہیں ہوئی، دیکھ کر آہستہ آہستہ ایٹورنگولی میں کی طرف پھلنے لگا، بلکہ مکان میں بیٹھی اور آلو چاہنے کے فریادوں کی میٹر لٹا کر رہی ہوئی تھی اور دھڑک رہی تھی، میر پر اس وقت تک اڑھ جا رہا تھا۔

کہتے میں داخل ہو کر اس نے کہا۔۔۔ ان۔۔۔

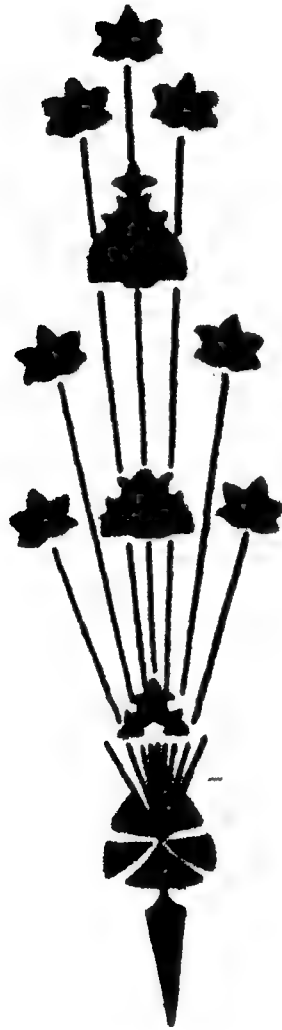
اس نے اسے دیکھتے ہی کہا۔۔۔ تم اتنی دیر تک کہاں تھے کہو، میں یہاں بیٹھی بیٹھی گھر میں گھل رہی تھی۔

شام کو مل کر دھڑکی رکھ دیا کرتی تھی، صبح شام نشست میں بیٹھی رہتی تھی اور گرمی میں کسی کسی دن پتا بجات۔ اس کے بعد وہ اب نہیں ملتا تھا، شام کے بعد ہی وہ پڑھنے بیٹھ جاتا، لیکن پڑھتے وقت بھی اس کا دھیان دوسری طرف رہتا، کہہ اس وقت کا کہہ رہا تھا، کہہ رہی تھی کہ وہ بھی کھا کر رستے میں پڑا ہوا، کہہ رہی تھی کہ وہ ہسپتال لے گئے، کہہ رہی تھی کہ وہ بہت سا کا ہیں وہ سوچتا رہتا۔

ہاں کہتی۔۔۔ کتا ہی سامنے رکھ کر بیٹھ گیا، سہا را ہے وہ؟

تھوڑی دیر بعد ہی ان کا دھڑکنا بند ہو گیا، پٹے پر اڑی چڑھائی اور وہ اگھر داد کے صندوق سے ٹپک لگا

پہنچے تھے۔



نقد و نظر



دوسرے دن کو صبح سویرے بھر کا تھا۔ سبھی لوگ گئے ہیں ایک دم سب صاحب لوگوں کا گھر۔
دوسروں کی دین پر بچان کے بارے میں تبصرے ہو رہے تھے۔

دو دفعہ لاکھ کا تھا۔ کون آیا ہے سبے انھوں بٹھارہ کے مکان میں، کیا کرایہ دار معلوم ہوتا ہے؟
دوسروں کے ٹپے بھائی نے کا تھا۔ اس سہ میں ایسے لوگ آئے ہیں، معاملہ کیا ہے، یہ تو جیسے ہنسوں کی ٹولی میں

ایک۔

تھے ہر میں خبر سبھی گئی تھی، اس تھے میرا کیا کرنا، دار کچھ نہیں آیا تھا، اس تھے کے لوگ پر میں ساگ کے غریبہ رتھے، تھوڑا سا پیاز
زکرم ملے کے خدمت نہیں پڑی، کبھی مکان کے سامنے بیٹھ کر کھڑی ہوتی، تو یہ لوگ حیران رہ جاتے، پتہ لگاتے، کون آیا ہے،
زادہ پاتا ہے، یہ لوگ دوسرے کو دعوت دے پھرتے ہوئے دیکھ کر کرات سے ٹول کر ہانپتے ہیں اور اس کا قیمت کا انمازہ کئے ہیں، یہ
ٹپ ہے، بھائی تو نہیں ہے، شام باند نہیں ہے، یہ تو ہم گنگا کے پرانے خاندان کا شتر ہے، باون مقدس مقامات میں سے ایک
مقام ہے۔ بیان تو ایسے کرایہ دار کے آنے کا بات نہیں تھی، اس طرف برش مگر جی دودھا، اس طرف لیڈس ڈاؤن روڈ اور اس
بجلی روڈ، اٹھنا تو پھٹ اسٹریٹ۔ وہ سب متزل لوگوں کا ہوتا تھا، انھوں داند کے سبھی بھائی اسی طرف بہتے تھے، اسی
شخص ان میں ایک بی، ایشی گنگری میں گیا تھا۔

اس نے پھر ایک بار آواز دی۔ — الوداع —

کیس پرچھے پرچھے بھی دیکھ کر پھر زور چھ سکا، اس وقت وال ٹکڑی رہی تھی۔

دیکھ کر اٹھی پارک کے سونے کے کمرے میں آ رہا تھا کہ اتنے میں اسے چھ چھڑکی آواز سنائی دی، دیکھ کر کے قدم ہڈ گئے، اچھ
بتا، بہت اندھیرے میں چھو گیا، اور اڑا کے پڑ کے نیچے پڑا، جو کہ تھوڑی دیر تک سوچا رہا، بڑے آدمیوں کا چہرہ کی مختلف ہوتا
یہ لوگ اس تھے میں کھینا، گئے ان کے گھر میں بھی اسی کام کر کوئی دوا ہوتا تو بہت اچھا ہوتا، اس کے ساتھ ایک ہی کوس میں وہ
رہتا، یہ تو اس تھے میں کیوں آ گئے؟

یہ ایک اُسے کوس نما، جیسے ٹکڑی آواز دے لگتی جو۔

آواز کیوں دے لگتی؟

دیکھ کر کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا، پھر اس نے کھڑکی کا پتہ لکھ دیا اور اس کے بعد اندر بھاگ کر دیکھا۔

کون ہے؟ کون جس سے وہاں پر؟

چوہ کا وہ بھاگنا ہی پاتا تھا کہ ایک آدمی نے آکر اس کا بات پکڑ لیا، دیکھ کر اندھیرے میں بھی پہچان لیا، یہ وہی

م تھا۔

حاذم اس کا بات پکڑ کر کہتے ہوئے کھڑکی کے دروازے سے اندر کرے میں نے گیا، دیکھ کر بات پکڑنے کی کوشش

نے ہوئے گا۔ — مجھے تم نے کیوں پکڑ رکھا ہے؟ واہ رے، میں نے کیا کیا ہے؟

نیک ہی سہا سہا گیا۔

لاہور میں رہ کر دیکھ کر قریب قریب وہ منہ سے نیک دیکھا ہی رہے تھے۔
لاہور کے ایک چھوٹے چارے میں رہتے تھے۔

نئے زیر کار بن گئے۔

دیکھنے کا سب سے پہلا دیکھ 'میں پر کبھی کسی حرکت نہیں کروں گا۔'
لاہور کے ایک چھوٹے چارے میں رہتے تھے۔

میرزا نام دیکھ رہا ہے: دیکھ رہا ہے۔ میں آگے دلوں کے اسی مکان میں رہتا ہوں؟
اور آگے دیکھ رہا ہے صاحب اور تھوڑے سے رہتے ہیں؟

میرزا کو نہیں لگے۔ وہ اگلے ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں، انہوں نے ہی لگے اور میری ماں کو رہنے
نے اپنے گھر میں جو رہا ہے، لگے کالے پتے کو دیکھتے ہیں، لگے رہتے ہیں۔
لاہور کے ایک چھوٹے چارے میں رہتے تھے۔

دیکھنے کا۔ میں نے پرسوں ایک خواب دیکھا تھا کہ میرے گھر کے پاس کوئی پارک ہے، چمچ چمچ تو چمچ
ہو رہا ہے اس کے بعد کل جب کوئی گیا تو پارک تھا، ہمارے بیٹا نے نہ پوچھا، کس نے کون سا خواب دیکھا ہے، میں
نے خواب دیکھا تھا وہ ان کو سنا دیا۔

اس کے بعد، رات کیوں گئے، اور؟

وہ خواب سنوں گا تو آپ دیکھنا ہوں گے۔

لاہور کے ایک چھوٹے چارے میں رہتے تھے۔ میں آگے دلوں کے اسی مکان میں رہتا ہوں؟
دیکھنے کا۔ لکھنؤ کی آواز سن کر میرا پیٹا کر جا کر دیکھ آؤں، کون پارک ہے، اس کے بعد میں گھر
نے مل کر چلے میرا، آگے پارک کے آپ کے مکان کے سامنے آیا، وہاں آکر دیکھا کہ پانی منزل کے ایک کمرے سے لکھنؤ کی
آواز سنائی دے رہی ہے، میرا پیٹا کر جا کر دیکھوں، کون پارک ہے، اس کے بعد آہستہ آہستہ کھڑکی کا کچھ کھول کر
دیکھا۔

اور، رات کیوں گئے، پھر کیا دیکھا؟

دیکھنے کا۔ میں نے دیکھا کہ ایک بھڑا۔

بھڑا، بھڑا پارک ہے؟

اللہ سے شکر کہ کچھ نہ ہو۔ وہ تو ایک بیکار ہے۔

لکھتے ہو! کچھ تیس ہزار آؤ؟

خاتون بچتے بچتے ہو۔ اداں کیا ہوگا! ایسا خوبصورت چہرہ اس کے ہاتھوں میں ہے۔

دیکھنے کا۔ وہ تو خوب تھا! خوب کیا ہے! خوب ہے! یہیں ہی دیکھنے کے لئے آؤ؟
جہانگیر دیکھ رہا تھا، دیکھا کہ یہ خوب ہے! یہیں تھا! یہاں سے آؤ گے۔ جو گیم لے رہی ہے اس کے خوب ہے! یہیں ہی
تو قریب آؤ! کارا کا بڑا بیٹا خوب ہے! یہیں ہے! یہیں آؤ گے؟

لاکھ ہونے کا۔ دل لگا کر دے۔ کچھ اس مرتبہ کلاس میں کیا ہوئے تھے؟

میں ہر مرتبہ فرسٹ تھا ہوں۔ دیکھنے کے جواب دیا۔

وہ! دیری لگا کر ہی چٹا ہے تھیں؟

میں خود چٹا ہوں۔ دیکھنے کے جواب دیا۔ حساب کلاس کا! ابھا دیتے ہیں، کلاس کا! ابھا دیتے ہیں۔

ہاتھ ہیں۔

وہ تم کھاتے حساب اور انگریزی پڑھتے ہو۔ کچھ تھیں بہت، اپنی انگریزی سکھانے کی، کچھ بہت، کچھ ناز

ہاتی ہے۔

کچھ دیدی نے کلاس دہرائے، لاکھ آؤ! آپ بھی کیا اپنے آؤ! میں میرے پاس وقت کلاس ہے، کچھ تو خود اپنے
پڑھنے کے لیے وقت نہیں تھا، اس کے علاوہ سہلی ہے، رقص ہے۔

کچھ بات نہیں؟ لاکھ ہونے کا۔ غریب لاکھ ہے، ڈراما سنا دو! تو کیا تھا۔

دیکھنے کی کیا بہت بڑھ گئی، اس نے کہا۔ گاؤں میں پہلے ہم لوگوں کی حالت بہت اچھی تھی، میرے باپ کا ڈاکٹر
نے قتل کر دیا تھا! اس وقت سے میری اس جگہ سے کہ کھڑے چل آئی تھی، ان گھوڑوں کا کھانا پکائی ہے، اگر گھوڑوں کا دودھ ہم ان
کو پناہ دیتے تو بے موت رہ گئے ہوتے۔

لاکھ ہونے کا۔ ٹیکس ہے، تم آہٹا کہ کچھ تھیں پڑھا دیا کہ۔

کچھ یہ سننے کا۔ مگر میری اپنی پڑھانی نہیں ہو سکے گی، کا کا پڑ۔

انہوں نے کہا۔ سچی تو کھلتی آہی رہی ہے، سچی کے آنے کے بعد اسے کچھ تو نہیں پڑھنا ہوگا، اس کے لئے

بھی پڑھا دو گی۔

دیکھنے کا۔ انگریزی ہی مشکل ہے، حساب ہی کلاس کے باب سے پکڑ لیا۔

انہوں نے کہا۔ انگریزی، حساب اور جلالی سب کچھ تھیں کچھ پڑھا دیا کہ، کچھ بہت کچھ پڑھا دیتے
جاتے ہر دو بجے ہی پڑھا لگتے ہیں۔ کیوں لکھی؟ اس کو اس مرتبہ دس روپیہ اسٹارٹ ہے۔ نہیں معلوم ہے کچھ

مندیہ باہنکے درخت کی ٹبرشک بہت تلاش ہوتے ہیں، انھوں نے کھانے کے واسطے کرکھی ہیں لیکن رہے ہیں، دونوں بینس ایک ساتھ کر رہیں گی۔

مندیہ نے کہا:۔ ایک سترہ روکر جوڑ چائی ہوگی، وہ میں جانتی ہوں، سچی کہ تو اپنے دیکھا نہیں ہے کاکا ابو۔
نقد نے کہا:۔ تجھ یا مہی، میں نے سچی کہ چھوٹی سی عمر میں دیکھا تھا، تھاری ہی طرح گری تھی ہے نا؟
مندیہ نے کہا:۔ تو ہی تھا اب ایسے ہو گئی ہے، اگر دیکھ کر آپ پہچان نہ سکیں گی کاکا ماں۔ اسی طرح میرے برابر ہو گئے ہیں۔

مندیہ نے ایک خادمہ دھانڈے پرنا کر کھڑا ہو گیا۔
کاکا ماں نے پوچھا:۔ کیا ہے شاکر؟ کیا کنا پہتے ہو؟
کاکا اتا رہے ماں:۔ شاکر نے جواب دیا:۔ نکال دوں؟
کاکا ماں نے کہا:۔ کیا کتے ہو شاکر، ابھی تو چائے پی ہے، ابھی کھاؤں گی؟ تم تو دیکھتے ہو ان ستانی کے کہ وہ انی حاصل کرنا رہتے برا، تھوڑی دیر پہنچیں غروں گی۔

دیکھنے کا:۔ ماں کو کھرکھی ہوگی، میں جانتا ہوں۔
کاکا باؤنے کا:۔ جاؤ، رات بڑھ رہی ہے، پڑھو کھو جا کر۔

دیکھ کر عجیب سا احساس تھا، ایک احساس سوزنیت سے اُس کا دل بھرا آیا، اُسے ایسا محسوس تھا جیسے ایسا پیار، ایسا محبت ایسا جہد کی اُسے زندگی میں کسی سے نہ ملے ہو، اچانک وہ کاکا ابو کے قدموں میں ٹھک گیا اور اُن کے دونوں پاؤں کو چھو کر ان کے قدموں کی خاک سر پر رکھی، پھر اُس نے کاکا ماں کو بھی پر نام کیا۔

اتنے دن کے بعد اب جب کبھی اُسے بیتے دن کی یاد آتی ہے تو حیرت ہوتی ہے، ان لوگوں کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہ تھا، ان کے ساتھ کبھی کوئی سڑکار بھی نہیں رہا تھا، اس نے کبھی ان کو دیکھا بھی نہیں تھا، لیکن پھر بھی اس روز وہ دیکھ کر اپنا دل جیسے طعنے دیکھ کر کو بڑی سرت محسوس ہوتی تھی، وہ صرف اپنے ہی نہیں ملے تھے، صرف پیار کی بناء ہی نہیں دی تھی، بلکہ اس دن وہ ہی سحری سے آکر کو مرکز بنگلہ کے ساتھ وہ متعارف ہوا تھا، جب دوسروں کے حکم و کرم پر اس کی زندگی کا دار و مدار تھا، اس وقت انھوں نے اس طرح کی محنت کیوں نہ تھی؟ لیکن مگر ایمان ہوتا تو کیا وہ اس طرح زندگی کا روپ دیکھ سکتا؟ اس طرح دنیا کو سمجھ سکتا؟ یہ وہ اس طرح حقیقت معلوم کر سکتا کہ زندگی صرف زندگی ہی نہیں ہے، دکھ صرف دکھ ہی نہیں ہے، خوشی صرف خوشی نہیں ہے، زندگی کے کچھ دوسرے سنی ہوتے ہیں، دکھ کی بھی ایک الگ شریعہ ہے، اور خوشی کا بھی ایک الگ دستور ہے۔

اور کھی دیتی؟

واقعی کھی دیتی؟ کئی تھی اسی لیے تو تھی بھی آئی تھی؟

اور تھی آئی تھی اسی لیے تو دیکھا اس حقیقت کو کہ دنیا کا کھانا زندگی کے کچھ دوسرے سنی ہوتے ہیں، دکھ کی بھی ایک الگ

کے ساتھ باور دے کہ جو کہ بننے لگے۔ وہ خانہ کی یکایک خبر لیا۔

لاہور کے کلاب کیا کہتے ہو؟ کچھ نہیں جاننا نظر آئی؟

خاتون بھی ہنستے ہنستے کہیں۔۔۔ اور ان کا ہر گام ایسا خوبصورت ہوا اور انداز بھی ایسا تھا کہ۔۔۔

دیکھنے کے لئے وہ تو خواب تھا! خواب کیا ہے؟ خواب ہے کہ ہستی میں نہ ہو مگر اپنے آپ کے لئے قریب آجی جیسا کہ دیکھ رہا تھا، دیکھا کہ میرا خواب ہے نہیں تھا، پرانی بات کہنے کا ہے۔۔۔ جو کچھ ہستی میں ہے، خواب ہے کہ ہستی میں تو قریب آدمی کا لڑکا ہو، میں تو خواب کس طرح ہوتے ہوں گے؟

لاہور کے کلاب۔۔۔ دل ہلکا کر ڈرو۔ کچھ اس مرتبہ کلاس میں کیا ہوئے تھے؟

میں ہر مرتبہ فرسٹ ہوتا ہوں۔ دیکھنے کے خواب دیا۔

وہ، دوسری لڑکی، کوئی چڑھا ہے نہیں؟

میں خود چڑھتا ہوں۔ دیکھنے کے خواب دیا۔۔۔ خواب کہنے کے بابا بھجادیتے ہیں، کہہ کے بابا بے انتہا ہوتے ہیں۔

وہ تم کھلے خواب اور انگریزی پڑھ سکتے ہو۔ کچھ نہیں بہت اچھی انگریزی سیکھا ہے گی، کچھ بہت اچھی لڑکی جانتی ہے۔

کچھ دیکھنے کے لئے وہ رے۔ وہاں تو آپ بھی کیا اپنے آپ سے اس وقت کہاں ہے، مجھے تو خود اپنے

پڑھنے کے لیے وقت نہیں ملتا، اس کے علاوہ سوائے رقص ہے۔

کئی بات نہیں: لاہور کے کلاب۔۔۔ غریب لڑکا ہے، ذرا سا تباہ ہو گیا ہو گا۔

دیکھنے کی یکایک بہت بڑھ گئی، اس نے کہا۔۔۔ گاؤں میں پہلے ہم لوگوں کی حالت بہت اچھی تھی، میرے باپ کو دارا نے قتل کر دیا تھا اس وقت سے میری اس جگہ سے کہ کلکتہ چلی آئی تھی، اس گھر دارا کا کھانا پکاتی ہے، اگر گھر دارا کے گھر کو پناہ دیتے تو بے موت رہتے جوتے۔

لاہور کے کلاب۔۔۔ ٹھیک ہے، تم آہا کہ کچھ نہیں پڑھا دیا کہے گی؟

کچھ دیکھنے کے لئے کہ۔۔۔ سب کو میری اپنی پڑھانی نہیں ہو سکے گی، لاہور۔

انہوں نے کہا۔۔۔ سنی تو کلکتہ آئی رہی ہے، سنی کے آنے کے بعد اسے بھی تو کچھ پڑھانا ہو گا، اسی کے لئے بھی پڑھا دو گی۔

دیکھنے کے کلاب۔۔۔ انگریزی ہی مشکل ہے، سب ہی کہنے کے بابا سے سیکھ لوں گا۔

انہوں نے کہا۔۔۔ انگریزی سب اور بھلا، سب کچھ نہیں کچھ پڑھا دیا کہے گی، کچھ بہت اچھی لڑکی ہے جانتے ہو، وہ مجھے بھی پڑھا سکتی ہے۔ کیوں کچھ؟ اسی کو اسی مرتبہ دس روپیہ اسکا رٹبہ ہے۔۔۔ کچھ معلوم ہے کچھ

ماتھے ہاتھ سے دینٹ کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے ہیں، انہوں نے لکھا ہے دوستی کبھی نہیں بھیج رہے ہیں، دونوں ہمیں ایک ساتھ کر رہے ہیں۔

ٹھیکہ دیئے گئے۔ ایک ساتھ رہ کر جوڑ جانی ہوگی وہ میں جانتی ہوں، سستی کو تو اپنے دیکھا نہیں ہے کاکا بابو۔
ناتھ نے کہا۔ مجھے یاد ہے، میں نے سستی کو چھوٹی سی عمر میں دیکھا تھا، تمہاری ہی طرح گوری تھی ہے نا؟
ٹھیکہ دیئے گئے۔ وہی سستی اب ایسی بگٹی ہے، ناکہ دیکھ کر آپ پہچان نہ سکیں گی کاکا ماں۔ اسی عمر میں میرے برابر بگٹی ہے۔

اتنے میں ایک خادمہ دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔
کاکا ماں نے پوچھا۔ کیا ہے ٹھاکر؟ کیا کتنا پہنچتے ہو؟
کاکا ایتار ہے ماں۔ ٹھاکر نے جواب دیا۔ نکال دوں؟
کاکا ماں نے کہا۔ کیا کہتے ہو ٹھاکر، ابھی تو چائے پی ہے، ابھی کھاؤں گی؟ تم تو دیکھتی ہو، ہاتھ نہال کر کے رانی حاصل کرتے ہو، تھوڑی دیر بعد نہیں خبر دوں گی۔

دیکھنے کا۔ ماں کو ٹھیکہ جی میں جاتا ہوں۔
کاکا بابو نے کہا۔ جاؤ، رات بڑھ رہی ہے، پڑھو لکھو جا کر۔
دیکھ کر عجیب سا احساس ہوا، ایک احساس منونیت سے اس کا دل بھر آیا، اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایسا پیار، ایسا
نات ایسی بھر دی اُسے زندگی میں کیسے نہ لی ہو، اچانک وہ کاکا بابو کے قدموں میں جھک گیا اور اُن کے دونوں پاؤں کو چھو کر
اُسے قدموں کی خاک سر پر رکھی، پھر اُس نے کاکا ماں کو بھی پر نام کیا۔

اتنے دنوں کے بعد اب جب کبھی اُسے بیٹے دنوں کی یاد آتی ہے تو حیرت ہوتی ہے، ان لوگوں کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہ
تھا، اس کے ساتھ کبھی کوئی سروکار ہی نہیں رہا تھا، اس نے کبھی ان کو دیکھا بھی نہیں تھا، لیکن پھر بھی اس روز وہ دیکھ کر انہوں جیسے
ہے تھے، دیکھ کر بڑی حسرت محسوس ہوتی تھی، وہ صرف اپنے ہی نہیں ملے تھے، صرف پیار کی پناہ ہی نہیں دی تھی، بلکہ اس دن اسی معمولی
سے اتنے کو مرکز بن کر اُس کے ساتھ وہ متعارف ہوا تھا، جب دوسروں کے علم و کم پر اس کی زندگی کا دار و مدار تھا، اس وقت انہوں
سے اس طرح کی محبت کیوں نہ تھی کون جانتے، لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وہ اس طرح کی زندگی کا روپ دیکھ سکتا؟ اس طرح دنیا کبھی سکتا
یہ اس طرح حقیقت معلوم کر سکتا کہ زندگی صرف زندگی ہی نہیں ہے، دکھ صرف دکھ ہی نہیں ہے، خوشی صرف خوشی نہیں ہے، زندگی
سے عجیب و غریب سمجھتے ہیں، دکھ کی بھی ایک الگ شریعت ہے اور خوشی کا بھی ایک ڈومر مقصد ہے!

اور ٹھیکہ دینا؟

واقعی ٹھیکہ دینا کی تھی اسی لیے تو سستی بھی آئی تھی!

اور سستی آئی تھی اسی لیے تو دیکھ کر اس حقیقت کو جان سکتا تھا کہ زندگی کے بھی دوسرے سمجھتے ہیں، دکھ کی بھی ایک الگ

اس وقت سے کہتے ہیں کہ میں نہیں آؤں گا، میں دھوکہ کتا ہوں مگر دیر پہلے کہیں نہیں آؤں گا۔
 کہ کیا کیا ملے گی، پھر قریب ملے گا کہ سر پہ پیادے ہات پھرنے لگی۔
 کہ : ہات لگی ہے ؟ زور سے کہ گیا کیا رہے ؟

دیکھنے کا سہم نہ ملے گی کیوں دیکھیں دیا، میں نے شکریا کی کہ تاجوہ نے مجھے دیکھ لیا۔
 ڈاکو نے جواب دیا۔ ”یہ سنی، میں دیکھ رہی تھی کہ تم کون سے گویا نہیں؟“

دیکھنے کا۔۔۔ ابیر تھکے میدان میں آؤں گا، کا کا بارکیں گے تو بھی نہیں آؤں گا، بچے چھوڑ دو۔

لاکھ لاکھ اس پر لکھنے لگی۔ "نہیں دے" میں دیکھ رہی تھی، تم ڈرتے ہو یا نہیں، تم کل پہر آنا، بکے،
 مزدور آنا۔"

آتا کہ کرمی دیدی چلی گئی اور دیکر حیرت سے بڑی دیر تک خاموش کھڑا ہو گیا۔ اسی طرف دیکھا کہ اس کے بعد آہستہ
سہ کھڑک کے دھماکے کے ساتھ آغوش میں آیا، اس کا سرا بھی ہلکے سے دھڑکا تھا۔

کون سے کچھا۔۔۔ اس کے بعد کل تم کماں چھ گئے تھے؟ میں دیر تک ڈھونڈتا رہا۔۔۔

”میں حاجی قاسم کے بڑا کہ حرف بھگ گیا تھا۔“ دیکھو نے جواب دیا۔ ”اس کے بعد آگن کا وہی آلاب کچھ لٹکا کر
 برہنہ کی حالت کے قریب پہنچے جو نے شیعہ قو کے رستے لھر دیا تھا۔“

دانشی ان دنوں کالی گنج اب پہنچا نہیں جاتا۔ اس وقت اس بہاری دیو نیر کے موڑ پر حاجی قاسم کا بازار تھا، اس کے بعد اسی
ان کے زوی مشرقی کرنے پر شیر سنگھ کی قریح حملت تھی، اب قلعہ دو قنارہ دکائیں بھی گئی ہیں۔ وہ رات ٹرامیں اور بیس بج گئے دوڑتی رہتی
نہیں اس وقت وہ اس وقت کالی گنج اب نہیں تھا، اب گنج بھی آج کے ایسا نہیں تھا۔ ٹیپو سلطان کے عظیم آقا کی حالت اس موڑ سے
بڑا ٹکڑا ہی کہہ سکتے ہیں، جوئی محمد تن کے مسکو کی طرح دکائی دیتی۔ حدت کے سامنے ہی بڑے بڑے برنگ کے پڑاگ آئے تھے۔
سے وہ جگہ کے وقت بھی اہاڑا بازار کی دکائی دیتی۔ وہاں پر جاتے جہنے بھی خوف محسوس ہوتا، ایک ایک دوپہر کے وقت ہوا کے
وٹ کار ہنگام کے چنے مجھم اٹھتے اور چاروں طرف پر امرا کی آواز پھیل جاتی اور کبھی کبھی کوئی سڑناک ساپ زور زور سے چنچنے
اور اس وقت سارے محلے میں ایک عجیب سا خوف طاری ہو جاتا، اس موڑ کے مغربی جانبی کھنڈے پر بھی بازار تھا، ٹیپو سلطان کے واسے
سے ہی پر جاتے تھے، ان کے تختروں پر ٹیپو سلطان کے لیے رکھ دیتے، اس کے شمالی جانب آشرہ لوکی سرسوں کے تیل کی دکان
اور دوپہر کے وقت کتنی ہی بار میں سنا، ان دکان سے تیل خریدنے کے لیے اُسے بھیجتا تھا، دیکھو وہاں جاکر کوٹھو پر بیٹھا تھا، کوٹھو
وہ تھا، کوٹھو میں بندھے ہوئے تیل کی انھوں پر ٹیپو سلطان رہتی اور وہ وہاں سے مسلسل کوٹھو کے گرد پکڑا کرتا رہتا، دیکھو وہ وہاں
باندھ کر کوٹھو پر بیٹھا تھا، اس وقت تک اسے یاد بھی نہیں رہتا کہ اسے سرسوں کا تیل خریدنا ہے اور جب وہ تیل کے
بازار کے ان کے کتوں کی ڈانٹ کا کافی بڑتی، اور وہ آشرہ لوکی گدا کی شمالی جانب حاجی قاسم کی بڑی سی حالت تھی اور اس حالت

سزا پر ڈال دی اور اس کے بعد بھی طرح طرح کی مرمت کر دی، کھسکی اس وقت عجیب حالت تھی، وہ نہ تو کھسکی دیدی کو مار سکتا تھا اور نہ مار سکتا تھا، غلطی تو قیام کا کر بیسے وہ لکھو گیا تھا، اتنی دیر میں دیکھ کر اٹلا کر کھڑا ہو گیا اور دُور سے اس حادثہ کو دیکھنے لگا، کہا ہے سرپا، ٹھیک چڑا، اچھا ہنسا، اتنے دن کے بعد آج کھسکی کی شکست ہوئی تھی، آج پہلی بار کھسکی زیر ہوا تھا، جیسا اس کو مارنا تھا وہ ہی جتنی چاہے۔

دیر تک اس کی مرمت کرنے کے بعد کھسکی دیدی نے کہا ————— اگر اب کبھی تو نے اُسے مارا تو تیری آنکھ نکال لوں گی۔
مگر جگ پیاں سے ————— جا۔

اتنی دیر میں دیکھ کر کھسکی کا پیڑ بڑھ گئی۔

کھسکی ہما سہا، اٹھا لہو جسم پر لٹی ہوئی وصول بھاڑتا جو اسید کا مخالف سمت پہلا گیا۔

اس کے بعد کھسکی دیدی نے راستے پر پڑی ہوئی اپنی کتابیں اٹھا لیں۔

دیکھنے پر قریب جا کر کہا ————— وہ مجھے ہر روز لادتا ہے کھسکی دیدی، روز مجھے اسی طرح مارتا ہے، میں اُس کا کچھ

میں نہیں بلاتا پھر بھی لادو مجھے لادتا ہے؟

کھسکی دیدی کا چہرہ غصے سے تنہا ہوا تھا۔

دیکھنے کے لئے ————— کھسکی دیدی تم نے اچھا کیا جو اسے پیٹ دیا، مجھ لادو ہر روز مارتا ہے۔

کھسکی دیدی نے کھسکی اُس کا کان پکڑ کر اس کے سر پر کئی تھپکے دیے۔

اسٹوڈنٹ کھسکی کا، وہ مجھے ہر روز لادتا ہے اور تو چپکے سے مار کا قتل ہے، لڑا ہے پیٹ نہیں سکتا، تیرے بدن میں

دفت نہیں، اسٹوڈنٹ کھسکی کا، اچنک کی طرح مجھ سے کتاب ہے کہ وہ مجھے روز مارتا ہے ————— میں تجھے بھی پیڑوں لگیں۔

اتنا کہ کھسکی دیدی غصے سے پھر نہ شروع کیا۔

دیکھ کر کھسکی کی آنکھوں سے دھواں اُڑ رہا تھا، اتنی دیر تک کھسکی نے مار کا کچھ نہیں ہوا تھا کھسکی دیدی کے ات سے مار

مار کر دیکھ کر اس سے زیادہ تکلیف ہوئی۔

دیکھنے کے دونوں بات سر پر رکھ کر کہا ————— اب مت مار دیکھنی دیدی، اب ایسا نہیں کروں گا، اب ایسا

سیراں گا۔

کھسکی دیدی اس وقت اپنے تپہ میں نہیں تھی، وہ اور بھی زور زور سے اس کے سر پر مارنے لگی ————— میں تمہارا

سر پر زور دے گی اسٹوڈنٹ کھسکی کا، دُور میں کی مار کا کرتھیں صرف دونا آتا ہے، روتے ہوئے تجھیں شرم نہیں آتی —————

ج۔ اور ہے۔

اس کے بعد کھسکی کے قریب آکر کھسکی دیدی بولی ————— جاؤ، لکھو باؤ، پھر کبھی نہیں روؤ گے مجھے پھر د

ممت جو کس لیے۔

ایزید پھر اٹھ کر کھڑا بیٹھا۔ "سکندر اندر دوسرے اس نے جواب دیا۔
 پرانے تھوہار نے کلب بند کر کے ایک طرف دھک دی "پوچھا۔ "دو تو دوسرے کون تھا؟"
 پٹک نے جواب دیا۔ "ایک راجہ تھا سر۔"
 پرانے تھوہار نے کلب۔ "خوب، خوب، لیکن راجہ کے معنی کیا ہیں؟ تم بتا سکتے ہو؟"
 انھوں نے کون کھڑا منہ لگی سے اشارہ کیا۔

تم؟ تم؟ تم؟

یہ بعد دیکھئے انھوں نے کئی لڑکوں سے پوچھا مگر کوئی جواب نہ دے سکا راجہ کے معنی راجہ، راجہ کے معنی اور کیا ہوا؟
 اس بعد کوئی بھی اس آسان سوال کا جواب نہ دے سکا، ابھی پرانے تھوہار کی طرف منہ کھولے تھے رہے۔
 پرانے تھوہار نے کہا۔ "راجہ کے معنی تو اگل نہیں جانتے تو اس میں شرانے کی ایسی کوئی بات نہیں، راجہ کے معنی بہت
 سے لوگ نہیں جانتے بہت سے راجہ بھی نہیں جانتے۔ تو پھر سنو۔"

اس کے بعد ڈبے سے پانچ سال کر مڑ میں دکھایا اور بولے۔ "ایک وقت ایسا تھا جب دنیا میں کوئی راجہ نہیں تھا
 راجہ بھی نہیں تھا، سزا بھی نہیں تھی، سزا دینے والے بھی نہیں تھے، جس کے معنی یہ ہونے کہ سبھی لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے
 تھے، جب سبھی لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں تو نہ سزا کی ضرورت رہتی ہے نہ سزا دینے والے کی، لیکن یہ حالت نر
 اور تک قائم نہ رہی، آہستہ آہستہ کشش نے جنم لیا۔ یعنی آہستہ آہستہ غریب دنیا سے غائب ہونے لگا، مذہب لہ
 سے ہی دھاکا دیا، لوگوں کو خوف محسوس ہوا، کوئی پوچھا نہیں کرے گا، لیکن نہیں دے گا اور لیگ میں آہوتی نہیں دی جائے
 اور آگ لگائیں گے کیا؟ ابھی دیر آگ لگے پاس لگے اور برہا کے پاس جا کر بولے کہ اب کون سی تدبیر کی جائے؟ تب برہا نے ریشم
 سے کہہ کر ایک راجہ تیار کر دیا، راجہ کا نام پرستو پڑا اور یہ پرستو دنیا کے راجہ ہو گئے، وہ دشمن کے آثار تھے، ان کے راجہ ہونے
 سے پھر پوچھا ہونے لگی، لیگ دیا جانے لگا اور مذہب پھر لوٹ آیا، وہ اپنی رہا کو خوش رکھتے تھے، اسی لیے چاروں طرف ان کی ت
 ہونے لگی، وہ دھاکا دیا، لیگ دیتے معنی خوش رکھتے تھے، اسی لیے غدار بھی سے راجہ کا نام نہیں ہوا۔"

اس کے بعد سبھی لڑکے جھپٹتے جھپٹتے انھوں نے پوچھا۔ "اب تو کچھ لگے اور کس کو کہتے ہیں؟"
 تھوہار کے ایک زبان جو کہ بولے۔ "کچھ لگے سر۔"

"لیکن ابھی راجہ پرستو راجہ کی طرح اچھے راجہ نہیں ہونے، ایسے راجہ بھی ہیں جو رہا کو خوش نہیں رکھتے، رہا کو ک
 ہنسنے کی سہولتیں نہیں دیتے، ہمارے دیش کے شاعر اعظم راجندر ناتھ ٹیکو کا نام تو لوگوں نے سنا ہے؟"
 سبھی خاموش رہے پرانے تھوہار کو کہتے رہے۔

کون کیا ایک درمیان میں بولی اٹھا۔ "سر، سر، آہ، اس جب راجہ ہوں گے تو بہت اچھے راجہ

ہوتے ہوں گے۔"

•••••

وہ گرا وپیش سے بے خبر کھڑے تھے، اسی کے ساتھ چند لڑکے اور لڑکیاں تھیں، وہ سب بھی دیوتا کی طرف دیکھ رہے تھے۔
 بے چہرے کتے خوبصورت تھے، اسی کے پاس کتے خوبصورت تھے، وہ سب عورتوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔
 وہاں کھانسی دیکھ رہی تھی۔

• وہ کہہ رہے ہیں؟

میں نے جواب دیا — "اچھا نام دینی ٹھیک ہے۔"

زندگی ظالم کو کہتے ہیں؟

”بہت اچھی اچھی نہیں سمجھتے ہیں۔“

میں کا وقت تھا اس وقت منہ میں بھڑ نہیں تھی اس روز رابند ناکہ کو دہان کسی نے بھی نہیں پہنا تھا، کیسے ماں پہلی ہی سو سو بست مقلد تھی اگر باا سے نہ گئے ہوتے تو ان اور بھی بست کچھ جلی گئی پھر ماں کو گھر وادو کا کھانا پکانا نہ چڑا اور دہان کے ساتھ وہی اسی حرف دیکھنے لگتا تھا۔

145

یہ ایک اپنا نام سنا کر وہ مسکرایا۔ اٹھ اٹھ تاریخ کی کتاب بند کر کے باب وہ کرے سے باہر آیا تو یہی رہ گیا، رہ گھو،
سہی وہی کا لہذا دم رہ گھو کھٹا تھا!

مکتبہ کا نام : تعمیر کا کابو لا ب ہے جو دیوبند

دیکھو! انکھوں کے تلخ حیرت سے پھیل گئے۔

اُس نے پوچھا۔۔۔ مجھے؟ مجھے کیوں جو رہے ہیں؟

دُھنکے چاہ دیے۔۔۔ لاکھاپا بھی دفتر سے ملے میں، کھسی دینا تو میں کہ سامنے کے کمرے دیوہ بابو کو جا کر

دیکھ کر کہ سوچنے لگا، اسے پھر کیوں ماری ہے؟ ایسا اسے تو کیا قصور کیا ہے؟ دیکھو دیدی ہی کا تو قصور ہے! یہی ہی نے قرا سے مارا ہے، اٹھا، دو دن مارا ہے، پھر بھی دیکھ کر پھر نہیں مارا ہے، اور یہ کبھی بے گناہ، چودہ سال تک دیکھ کر مارا، کبھی سے کچھ نہیں لے کے مارا، چودہ سال تک اور چودہ سال بھی ایک سال تو گزر رہی ہے۔

پران متہا بننے کا تھا۔۔۔ اگرچہ وہ سال تک تو ہو گیا کہ تو ایسے دن تمہاری زبان سے جو بات بھی نکلتی تھی وہ
 بننے کی جو پروا کے درجہ پر تھی۔۔۔

موجودہ نسخے پر چھاتا تھا۔۔۔ سر، بڑی کھول کو میروں پر بندھا ہوا۔

دی برک : پرانتھ اوسے جواب یا قلم راجہ جی برک ، مکین و دو مسلیم مسکن ، متواتر لکھا تاریخ جون ہے

بات بھی سمجھتے ہیں وہ کھٹکتا ہے۔
کون سے کچھ تھا۔۔۔۔۔ اگر میں کہوں کہ میرے باپ کی باری بھی ہو جائے گی۔

”اے بیٹا، یہ تو گناہ ہے۔“

”اگر میں کہوں کہ میں بہت بڑی دولت کا مالک ہوں۔“

”یہ بھی گناہ ہے۔“

اور اسی دل سے کہہ کر وہ دیکھنے لگے کیا تھا کہ وہ دوڑوں چوہہ سال تک بچہ ہو گیا۔ ایک بات بھی سمجھتے ہیں وہ بچوں کے
بچوں کے اپنے لیے۔ یہ تو وہ نہ سنا تھا۔ انہوں نے بیسک کے پیسے جو کہ کچھ بچوں کی دکان سے لوہا پاپ اور بچوں کے خرید کر لیا تھا اور گھر
بائیں لگایا تھا۔

دیکھنے کا۔۔۔۔۔ یہ وہ دیکھ رہا تھا۔

یہ بچہ سو رہا تھا کہ وہ ایک بار اس سے پوچھے، ”اگر تم سے بہتے ہوئے وہ اور چلنے کے کھانے کھاتے جاتے دیکھ گیا
وہ نہیں، اے اس سے بہت ساری باتیں پوچھنے لگے گی اس سے بہتر ہے کہ وہ وہیں اگر کبھی کبھار دے گا۔“

دیکھنے پر پاپ۔۔۔۔۔ کیوں نہ جانتے تھے کہ کچھ سوچ رہا ہے۔“

دیکھنے جواب دیا۔۔۔۔۔ میں نہیں جانتا۔

انکھوں کے باہر کے رات سے ان کے کان میں داخل ہونے کا وہ دانا تھا۔ دیکھنے کے آگے چل رہا تھا اور دیکھ
نے کے پیچھے تھا۔ ان لوگوں کے صوفوں کی دیوار پر چمکتے ہی زینہ شروع ہو جاتا تھا۔ دیکھنے سے اوپر چمکتے ہی وہ انہیں حرف بولتا تھا۔
اگر کہیں میں ایک بار لکھا ہوا بیٹے ہوئے تھے اور ان کے قریب ہی کھڑی دیکھنے کی تھی اور صاف ستھری کاکھی انہیں۔

”کیوں دیکھ رہا ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

دیکھنے نے ایسا ہی دیکھ کر دیکھا۔ کھنکھائی ہوئی دیکھنے نے پوچھا۔

”بیشمار باتیں تم اس کی پریشانی میں کیا کر رہے ہو؟“ ایک بات بھی سمجھتے ہیں وہ بچوں کے۔

دیکھنے نے بڑی جھنجھکی سے جواب دیا۔۔۔۔۔ میں سمجھتے نہیں ہوتا، ایک سال سے میں نے کچھ کے ساتھ کچھ سمجھتے

ہیں۔

”ایک سال سے نہ جانتے تھے کہ جو سمجھتے ہیں وہ بچوں کے ہیں۔“

”نہیں، میں اور بھی ترس رہا ہوں۔“

اس کی بات سن کر کاکھی اب حیران ہو گئے، کاکھی اس نے بھی سمجھتے ہوئے کاکھی کی طرف دیکھا۔

”وہ لڑکا ہے۔“

”کھنکھائی نے اسے پوچھا۔۔۔۔۔ ایسے بارے سنو، وہی جو حضرت آدم پر۔۔۔۔۔“

کا ہونے لگی دیدی کو منہ کیا

بے — تم چپ رہو گھس اب بکڑو تیرا ملن تک کہیں پہنچا لے گے ؟

دیکھنے جواب دیا — میرے ہیڈ مشرکتے ہیں کہ اگر چودہ سال تک کوئی مسلسل چپ رہے تو اس کے بعد اس کی زبان

سے بات نکلے گی ہنگ بوجھنے گی ۔

اس کی بات سن کر کاہا ہونے لگا ، اکی ماں بننے لگی اور گھس دیدی بھی ہنس پڑی ۔

کاہا ہونے لگا — اور تم نے اسے چپ کب کر یقین کر لیا ؟

بھڑوں دیکھتا ایک آگتہ سیدھا اور کتنا مسرور تھا ، کبھی کبھی دیکھ کر کیا مسرور ہوتا جیسے وہ زانا اچھا تھا ، ہو کئی اس سے جو

پرتا وہ نہیں کر دیتا تھا اس نے یقین کر لیا تھا کہ کہل کے بابا کی پیاری اچھی بوجھنے گی ، یقین کر لیا تھا کہ کڈی سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے

جو ریتا کر کے آئے اس ایک دن راجہ ہوں گے اور اس نے یہ بھی یقین کر لیا تھا کہ اگر چودہ سال تک چپ رہو ہونے کو جو بات بھی زبان

سے نکلے گی — اس کے علاوہ بھی بہت ساری باتیں نہیں دیکھ کر یقین کر لیا تھا ، آری اتنے دنوں بعد اب

اسے اس خبر کا تھا کہ دنیا کا یقین کر لیا ہی بہتر ہے ، تو کیا یقین کر کے آخر کار اسے کچھ بھی نہیں ملے گا ، اور اس نے یقین کر لیا تھا اسی

سے کہ اس کا بچہ کبھی نہ ہوگا ؟

کاہا ہونے کو چھا — راتے میں جو دوکانیں لاتا ہے ، وہ کوئی ہے ؟

دیکھتا میرے ہی اکول میں پڑتا تھا ، دیکھنے جواب دیا ۔

نہیں کیوں لاتا ہے ؟

یہ میں نہیں جانتا ، میرے اہل میں جو کچھ ہو گا وہ چھین لے گا اور کچھ نہ رہے گی پتہ بھی لاتا ہے ۔

اسی جیسے آج میں نے اسے خوب پٹایا ہے کاہا ہوا — گھس دیدی بولی — یہ غامضی سے اڑیوں کھائے ؟ یہ نہیں

ہے ، اہل کے بدل میں طاقت نہیں ہے ؟

دیکھنے لگا — ابجو وہ جتنا چاہے مجھے مارے ، ایک دن میں اس کا بدلہ چکا دوں گا کاہا ہوا ۔

کاہا ہونے کو چھا — وہ کیسے ؟

میں غریب ہوں اس لیے وہ مجھے لاتا ہے ، دیکھنے جواب دیا — میں جب لڑا آدمی بن جاؤں گا تو وہ نہیں مارے

اس لیے میرے پاس بہت سارے ہتھیار ہونے لگے گا تو وہ مجھے نہیں مارے گا ۔

کیوں ؟

دیکھنے لگا — گھر وہ اور کتے ہیں کہ روپے سے سب کچھ خریدیا جا سکتا ہے ، روپے سے ہر چیز خریدی

جاسکتی ہے ۔

کھس نے لگا — گھر تو بہت قلیل مند ہے ؟

اس کے بعد میری بیماری کا کیلن کو بھی لے گیا۔
 کبھی دیدی نے پوچھا۔ "میں اس وقت پیدا ہو چکی تھی یا اب؟"
 لالا بولنے لگا۔ "اس وقت تو ذرا سی بچہ تھی۔ میں تجیں گد میں لے کر گھر تارہتا تھا۔"
 "اور سنی؟"

"سنی اس وقت میں تھی، اور تو بھی اسی وہی پیدا ہوئی تھی، برصط کا موسم تھا، اور ہم گرم جھج باریش جو رہی تھی، میں دفتر
 اور گھر کے گھر ڈالتا تھا اور اس وقت صحت کے قریب آ گیا رہنے لگے تھے، سنی گل کر کے سیرا ہی تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، ایک
 سنی کہنے لگے کہ تم اس دن آنکھ دات ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا، اتنی رات گئے کون ٹیلیفون کر سکتا ہے، ریسپر رکان سے ملنے کے
 ریسپر بڑا، بھریشور رہا تھے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا ساد ہے، اپا یک کیا بنوا داتا؟"
 "اور ہے بھریشور کی آواز، تھی۔ تھیں ایک خوش خبری سنائی ہے، میرے بیان بھی پیدا ہوئی ہے۔"
 میں قریبے اچھل پڑا، پوچھا۔ "کب؟"
 "بھی ابھی۔"

میں نے لگا۔ "پھر سنیش کھنے داتا، ایک نہیں اب دو بچیاں ہو گئیں، اس کا نام سنی رکھے، لڑکی کا نام کھنچو۔"
 پھر بڑا اور سنی ہے، دونوں کی کستی کھنچو کر رہیں گی۔"

لاک ان کو فحاش کہنے لگا، لالا بولنے پوچھا۔ "اے جی انھیں یاد ہیں وہ سب باتیں؟"
 لاک ملنے جواب دیا۔ "یاد کیسے نہ رہے گا بھو، تم اتنی رات ہی کو پھر پچھنے لگے تھے۔"

لالا بولنے لگا۔ "ان ترمیں کہہ داتا کہ عزت کرنے سے پہلے میرا بھی یہ خیال تھا کہ روپے سے مرچیز خریدی
 رہتی تے، انھیں بھریشور سے نکالتے جھٹنے کے بعد میرا یہ خیال بدل گیا۔ ان دنوں بیماری لاک ان کو ساتھ لے کر گیا ہی تھا کہ نیکار
 ہو کر رہ گیا، ابھی اد میں اس کی سیٹ میں آ گیا، بڑی خطرناک بیماری تھی، گھر کے تمام ذرا چاکر بھاگ کھڑے تھے، ایک آدمی بھی
 وادوں کے لیے نہ تھا، تھکی لاک ان بھی باطل جینی تھی، کسی کو پہچانتی نہ تھی، میں تھکے جوشی کے ہاں میں بے سندھ پڑا ہوا
 رہتا تھا، ان کو رہا تھا، سوچا۔ زندگی کا سنا ہی طرح ملک کی زمین پر کام ہو گا۔"

نیکس نہ جانے کائن کے رہنے والے بھریشور بابو، جس سے سات پشت تک میری کوئی رشتہ وادی نہ تھی، کھنچتی آدمی
 نہ نے پاتے ہی دوڑے جھٹنے میرے پاس آئے اور اس کے بعد ڈاکٹر اور دوا کی فکر سے میں آنا دھو گیا، جس دن وہ میرے
 رہنے لگے تھے اس دن سے لے کر اس وقت تک جب تک میں باطل صحت یا بد ہو گیا، وہ میرے ہی پاس رہے، وہ کھنچتی
 نہ نہ نام کا وہ باطل کھنچ کر صرف میری ہی بیمار وادی کر کے، ایسا کو کرنا ہے، بچے صحت یا بکھلنے میں ان کی کوئی غرض پوشیدہ
 نہ تھی، ان کے ساتھ میرا کھنچ رہا تھا، میں ان کا کھنچتا جس کے بچے انھوں نے اتنا کھنچا، اپنا دیر، اپنا وقت اور اپنے آدمی

نہیں جو ایسے کالا بول کی بات ہی سمجھتا ہے۔ اسی روز روپیہ ہوتے ہوئے بھی کالا بابو حاکم کی تائی میں سر رہے تھے۔
 بابو بخیر رہا جسے کہیں انہیں پھانسا کیوں، کس طرح سے انہوں نے کالا بابو کو صحت یاب بنا دیا، پھر اُس نے سزا پا کر
 رہا تو بے شک کہ کالا بابو بھی صحت یاب ہو گئے ہوتے، بہت دنوں پہلے ہی صحت یاب ہو کر وہ پھر کسی اسکول میں بیٹھ
 گئے اور پڑھنے لگے ہوتے، لیکن کالا بابو کی عمر صحیح قریب زیادہ ہو چکی ہے، کالا بابو نے بھی تو بہت کچھ دیکھا ہے، تو کیا کالا بابو نے جو
 بات سنا لیں گے ہی جو کچھ دیکھا ہے وہ سب غلط ہے!

دو ہر روز دیکھتا کہ کالا بابو سوٹ پہن کر دفتر پہنچ جاتے تھے، ایٹورنگنگولی میں سے نکل کر وہ سیدھے کنڈو پوٹھر کی گت
 پہنچتے، وہاں سے بس یا ٹرام پر سوار ہو کر دفتر پہنچ جاتے، ایٹورنگنگولی میں کے بہت سارے لوگ دفتر جاتے تھے۔
 سو، وہ بابو کے دفتر پہنچنے کا وقت ان سے پیچھا تھا، ان کے پہلے کا کوئی متروقت نہیں تھا، کسی کسی روز وہ صبح سویرے
 دس بجے پہنچتے اور ٹری رات گئے واپس آتے تھے، اس وقت مکان کا صدر دروازہ بند ہوتا تھا، کیڑا اٹھ کی طرف سے ہری
 کی آواز اور بھی صاف سنائی دیتی تھی اور حاجی قاسم کے باغ کی پرلی طرف سے بہت سے گیدڑوں کے ایک ساتھ چیخنے کی
 آواز سنائی دیتی، اس وقت بھی لوگ سو جاتے تھے، والی گھاٹ میں منہ میں پتھر پٹی میں اور پیالہ بھجارتی اسٹریٹ میں کوئی
 گجراہ جواز ہوتا، اٹھو واو وہ بھی شاید اس وقت برتن اور گھڑوں کی ڈھیری کے قریب ہی کہیں پر لڑا جھک کر کچھ دیر کے لیے
 بے پروا ہوتے تھے، کیوں ان کے یہاں۔۔۔ اس کھدی دیر کے مکان میں کبھی کسی اس وقت تک روشنی ہوتی رہتی، اس وقت
 تک ڈرہاکر کی آواز سنائی دیتی، شاید اسی وقت کالا بابو دفتر سے لٹتے تھے، ایک دفتر تھا، جہاں اتنی رات تک کام ہوتا تھا وہ
 رہا، نہ تھا، کالا بابو کس دفتر میں کام کرتے تھے، کیا کام تھا؟

کیوں یہ بھی حیرت کی بات تھی کہ جب سے وہ وہاں آئے تھے چوڑی سی جیسے بالکل خاموش ہو گئی تھی، دو چھٹی پتوٹی اب
 بھی کیسی اب اس کی آواز میں وہ تیزی نہیں رہی تھی، شاید ان کے یہاں جو اس نے مراہم پیدا کیے تھے، ابھی اسی دن وہ گھبراہٹ
 نہ کر ایک قحطی بھرت لے کر آ رہی تھی۔

اور آتھی میں آتے ہی ایک اُس نے شروع کر دیا تھا۔۔۔ وہ بوجھا، پیرے لڑا میں آں، اس وقت بھی کھانے
 یعنی ہوں تو تھم سے برداشت نہیں ہوتا۔۔۔

دیکھنے سے دیکھنے ہی پوچھا تھا۔ کس کو کالی سے رہا ہو چوڑی؟

پیر دیکھ نہ پیر، اس جہن کی حرکت دیکھ، ایک سو گھنٹہ سو گھنٹہ کر چلی آئی ہے۔

دیکھنے دیکھا، چوڑی کی دو پرتیاں تھیں جو سر اٹھانے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

دیکھنے پوچھا۔۔۔ تم ان لوگوں کو کالی کیوں نہیں کہتی چوڑی؟ یہ جوئے کر رہا دار آئے ہیں، ان کو جہنم کہہ

انہیں دیکھتیں، اس گھم ایک لڑکی کے بہت ملتی ہے۔

چوڑی نے جواب دیا۔۔۔ آہا، جہنم کی جہنم ہے، آپ کو جھوڑ کر پرانی آگنی ہے، اس کو کیسے کالی سے سکتی

جوں پیا، اس کو گالی دینے سے تم بچتے ہو گئے گناہ نہ ہو گا۔
 اسے وقت چڑنی ایک مثال میں لکھ دے چھاپے ہوئے ایک چاروں کلمات یہ ہوتے تھے پھل کے دو گتے
 تھے اور دال کو لکھی ہوئی تھی، چڑنی اب پہلے جیسے چڑنی نہیں تھی، ان لوگوں نے جیسے چڑنی کو کوڑی دے کر غریب یا جو چڑنی
 جیسے لکھ کر خریدی ہوئی، انہی کو لکھی تھی، انکو دوا دوا کی بات ہی لگتی تھی، انکو دوا دوا کی بات ہی لگتی تھی، روپے سے سب کو
 غریب سمجھا جاتا ہے، روپے سے کھس کر بھی خریدنا جاسکتا ہے، دیکھو کہ پاس انکو روپیہ جو بڑے قلمی بھی اُسے نہیں ملے گا۔
 اوپر سے اگر کلا کی کے دروازے کے قریب آتے ہیں تو ایک پیچھے سے کسی نے گتے آواز دی۔

اُسے تھی۔

وہی جو بی آواز تھی، دیکھ کر پیچھے پڑ کر دیکھتے ہی متحجب ہو جاتا۔
 کھو دیدی اور جہاں ایک تھی، اس کے پیچھے سے بالکل بچے ٹھیک کڑا کی کے دروازے کی چوکت پر کھو دیدی دیکھ کے
 جسم سے ٹکڑی ہو گئی۔

بول۔ اچھے بھائی دیو، میرا ایک کام کر دے گا۔

دیکھ کر حیرانی کی انتہا رہی، کھو دیدی اس کے ساتھ اتنے ہیاد سے بت کر ہی تھی!

اُس نے پوچھا۔۔۔۔۔ کون سا کام؟

یہ خط ایک آدمی کو ملے گا۔

کھو دیدی کے ہات میں ایک خط تھا۔

دیکھ کر پوچھا۔۔۔۔۔ کس کا؟

پچھتاؤ، ٹھیک دے آگے گا،

ٹھیک دے آؤں گا، دے کر دیکھو۔

کس سے کہو گے تو نہیں؟

کھو دیدی نے اس کے ساتھ کھو اس طرح بات نہیں کی تھی، کھو دیدی اتنی ہی دیر میں پیچھے سے تڑپ گئی تھی۔

نہیں، کسی سے نہیں کہوں گا، تم خط دے دو، دے کر دیکھو میں دیتا ہوں یا نہیں۔

تو پھر آئیہ نام کرو۔

اتنا کہ کر کھو دیدی نے خط اُس کی جیب میں ڈال دیا۔

بول۔۔۔۔۔ کوئی دیکھ کر نہیں، تمہاری ان تو نہیں دیکھ لے گی؟

دیکھ کر نے۔۔۔۔۔ میں ٹھیکاً رکھوں گا، تم سے وعدہ کرتا ہوں کبھی نہیں دکھاؤں گا۔۔۔۔۔ کس کو دینا ہوا؟

تھے۔ وہ دیکھ کر اس خوف سے

پھرل دینے کے بعد دیکھ رہا تھا کہ ایک بڑا بچہ کھڑا

ہوئے تھا اور ایک بڑا بچہ کھڑا تھا۔ وہ دیکھ کر اس خوف سے

سکون

اور بہت دیر کے بعد جب دیکھ کر وہ یہ دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ نے اس کے قدموں پر سر رکھ کر بات کرنا شروع کیا۔

حضور آپ میرے باپ ہیں۔ آپ کا بھائی ہے حضور۔ بھائی آپ کو بہت دے گا حضور۔

اس دن وہ دیکھ کر خوشی آئی تھی۔ بہت سے لوگ بیڑوں میں بیٹھے تھے۔

تھے۔ کبھی ایک زبان پر کھڑے تھے۔ کبھی ایک زبان پر کھڑے تھے۔

کی بھائی نہیں پتا تھا۔ اور کچھ پر اس کے دو بچے تھے۔

دیش کھڑی تھی۔ پڑھتا تھا۔ پڑھتا تھا۔ پڑھتا تھا۔

پاکیت : جو پاکیت کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹکڑے تھے۔

نے دیکھ کر غور کیا تھا۔ کڑی سے دیکھ کر اس نے دیکھ کر اس نے

حالی بات تھی !

اسے

دیکھ کر بچے بولے۔ دیکھ کر وہ دیکھ رہا تھا۔

ہوئی تھی۔

اس نے وہی جوتی آواز میں کہا : خولے پلے آئے۔

دیکھ کر اس نے نہیں یہ دیکھ کر اس نے نہیں یہ

دیکھ کر اس نے نہیں یہ دیکھ کر اس نے نہیں یہ

نہیں

نہیں تھے۔

دیکھ کر اس نے کھڑے ہوئے۔ میں نہیں ہوں۔

کھڑے ہوئے۔ میں نہیں ہوں۔ میں نہیں ہوں۔

کوٹ کے افسروں میں کھڑے ہوئے۔

یا ہے۔

ہنا کہ کر دیکھو پھولوں والی ٹوکری یہ جو تے باہر چلا گیا۔

دو تھی لالی گھاٹ میں جتنے رگ تھے ان سب کا ابا بابل ہی مختلف تھے، دیکھنے کتنے ہی سکنات دیکھتے تھے، پھولوں میں
 ہر رنگ کے زلف خلیفہ میں جا چکا تھا، سکن کا اندر دنی سے دیکھ چکا تھا، کرن کا مکان بھی دیکھ چکا تھا، اکس کا مکان بھی
 وہ نہ، بمان، پٹنگ اور رکال، بھوں کے سکنات دیکھ چکا تھا، لیکن کا کا باؤ کے سکن اور ان کے سکن میں کوئی مماثلت نہیں
 ان گھاٹ میں ان دونوں کسی کے یہاں نوکر اور باورچی نہ تھے، کرن کے گھر کا خرچ تو بھیک کے پیسے ہی سے چلتا تھا، بیوقوفیت
 کے لئے گھر میں چادل وال اور آؤ آتا تھا اور حرف ہی نہیں، ————— دھوسو دن

دھوسو دن ہا کر اس نے دیکھا تھا، دھوسو دن کے تمام بھائی ہیں، ہا کر بیٹے بھات کھا رہے تھے۔ ایک بڑی سی تھالی میں دھوسو دن
 اور دن بھات اعداد لکال کر رکھ دیتی اور وہ کام بھائی ہیں، دائرہ بنا کر تھالی کے گرد بیٹھ جاتے اور کیلی دھوسو دن کی مان لے
 کرتے، لکھتی دیتی، پٹنگ پھر ملی کی گلی میں رہتا تھا، پٹنگ کی، ہا کر بھی بھرتی تھی اور گڑھی بھون کر اسے کی دکانوں میں سے
 رہی، وہ سی پیسے سے اس کے گھر کا خرچ چلتا تھا، بیشتر گھنوں میں سے بہتے بہتے آئے جانے کے بعد، وہی میں امداد کا گھر تھا،
 یہ رہی بھائی سب آئے رہتے، گھاری پوجا جاتا، پٹنگ، آؤ، وہ لانی پر جانے تو قہر پرماں کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا، اس
 کے اور در زبوں دیکھا تھا، اس گھر کی شکل بھی ایسی نہ تھی اور گھر، دادو، اٹھو، دادو سے پاس بھی تو بہت سارے رہے تھے،
 اور دادو سے پاس گھارہ دیر تھا، اس کی گھر اور گھر دادو میں معلوم نہ تھی، پھر بھی اٹھو، دادو کا مکان بے رونق اور بد صورت
 اور دادو کو دیکھ کر سچ پٹ جتنی کے بڑے کی تصویر اس کی کتابوں میں پھر ملتی تھی، گھر بھر میں حرف مٹی دیدی ہی ایسی
 اور صورت مٹی ہا سکتی تھی۔

ان جہر مٹی دیدی کی آؤ گھر میں نہ تھی۔

ہا سکتی ————— یہ کیا پڑا، ہم رکھا ہے تم نے مٹی، کوئی اچھی سی ساڑی ہیں، آج سال کا پہلا دن ہے۔

مٹی دیدی نے منہ پچھا رہنے ملتی۔

ہا سکتی ————— کیوں کپڑا نہیں ہے شاید؟ اتنی ساڑی لال کارے کی ساڑی یا ہرئی یا سب، ہا کے خزانے پر ملی

نے، آؤ، مٹی دیدی نے برو تو؟

مٹی دیدی خوف سے مہم بھائی۔

ہا ————— تم دادو سے مت کہو، دادو بھیک کے کر میں نے ہی تو سے کہا ہے۔

ہا سکتی ————— تم ہی بھی جب تہہ پر ہے مٹی، اور نہ تمہاری قسمت، سچو، میں پھر لیتی؟

سچو، دادو اٹھو، دادو کے مٹتے ہی ماں نے گھیر لیا۔

روٹی، بابا، آپ کو بات کتنی تھی۔

مکھڑا داد کی باب بک جھک جھک تم ہی نہیں ہوئی تھی۔
مکھڑا داد کے جاننے کے بعد شتی دیدی اپنی جگہ سے باہر نکل آئی اور اس کے قریب آکر خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔

دیدی۔۔۔۔۔ تو ظہر تو تھی، اتنا ڈسنے سے کام نہیں چلے گا، حوریت بن کر پیدا ہوئی جو تو برداشت کر انہیں پڑے
اور برداشت نہیں کر سکتی تو خود بھی دکھ اٹھاؤ گی، کوئی تمہارے لیے کچھ نہیں کرے گا۔۔۔۔۔ تم ذرا بہت سے کام دو

اس کھٹے گلے میں نے یہ سب بہت دیکھا ہے، ایک کپڑے میں ایک او کے پتے کو لے کر میں گاؤں چھوڑ کر بھاگ
آئی تھی، مجھے بھی شتہ قاصدوں نے کتنا خوف دویا تھا کیسے تھاری طرح میں نے کیا خوف کھایا تھا؟ خوف کرتی تو اس لڑکے کی پرورش

پہنچ مانی کتنی محبتیں اٹھا کر اس کی پرورش کر رہی تھی، دوسرے کے گلے کا کام کام کے بھی ماں چاروں طرف کتنا بھاگتی
روزی روتی تھی، اس نے ہی اسکول کے بیٹا سڑے سے کدھر اسکول کی فیس معاف کروا دی تھی، ماں ہی اسے اپنے ساتھ چڑا کر لے گئی
میں وہاں شہر چیتا اور اتنی دکھایا تھا، بندہ روکا کھوٹا تھا، ماں ہی تھا، بہت سی باتیں سنائی تھیں، اس نے اسے کالی گٹاٹھ
اور اس جیسے داخل کر دیا تھا، آج اگر اس زندہ ہوئی، دیکھ کر کبھی کبھی سر پہنے تھا، اگر اس زندہ ہوئی تو کیا اسے دیکھ کر خوش ہوئی؟
اس کا یہ اس کا تہہ اس کا صدمہ دیکھ کر خوش ہوئی، اس نے کیا اسے صرف میں سبب بنانا چاہا تھا، اس نے تو اپنے لڑکے کو انسان بنانا چاہا
میں نے کیا وہ انسان بن سکے گا، اسی انسان بن سکتے ہیں، یہ عزت لی ترقی، یہ ڈی۔ ٹی۔ آئی، یہ ڈی۔ ٹی۔ ایس،
میں نے دیکھا ہے، ایک مرتبہ ایک واقعہ تھا۔ اس وقت وہ کالی گٹاٹھ اسکول کا طالب علم تھا، کالی گٹاٹھ اسکول کا ہی اسٹوڈنٹ
ہوئے وہ ڈرامہ جوڑا تھا، دیکھ کر اس سے کدھر گیا تھا، اس کی دہی میں دیر ہوئی، وہ نیا دھات لگے ٹھکڑے کا، ڈرامہ کا نام "تیاگ" تھا
اسے پچھلے ہی اسکول رکوں سے لے گیا، دیکھ کر اسے جاکر بیٹھا تھا، اگر بھی اس کے ساتھ تھا، اپنے مدعوں میں پڑنے والے لڑکے
ان میں کڑا اور جیسے تھے، ان سے گھٹنہ بچنے کے ساتھ ہی سب تھوڑا ہوا، اٹھ گیا، اُف وہ بھی کیا دنیا تھی، دیکھتے ہی دیکھتے دجا
اور اس کی دور پہنچ گیا، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ وہاں موجود نہ ہو، اس روشنی سے اس اجتماع سے اس گھٹنے کی آواز سے
ان کی گٹاٹھ سے بہت دور کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا جو۔

کہہ رہا تھا، کالی گٹاٹھ۔

لیکن دیکھ کر کا خیال اس طرف نہیں تھا، اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے پرانے تھوڑا ایک دن گلاس میں اسی دنیا کی ابتداء ہے
نئے ایک وقت تھا، جب دنیا میں کوئی راجہ نہیں تھا، یہاں تک کہ نہیں تھی، سزا بھی نہیں تھی، سزا دینے والے بھی نہیں تھے، ایسی
نئے، بہت شش نے جم دیا، وہ مذہب دنیا سے ختم ہونے لگا، تمام دیوتا، ڈرگٹے، سب پر باکے پاس دوڑ پڑے۔
دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دور یورپ تھا، جیسے وہاں نے دنیا میں کچھ نیا شروع کر دیا، جو اب یہاں

انسانی کرتا ہے، راجہ غول کر کے ایک سو تیس کا تدارک کر کے گا، اس وقت اس کا تدارک
کرنے والے کہاں ہیں؟ اس وقت دیر تا ب کمال ہیں؟ برہم کے پاس کہاں ہے؟ پر تھوڑا جگہ لپکتی کر کے کھٹا ہوا
وہ دشمن کا وقت کہاں ہے؟

اور دیکھتے دیکھتے دیکھ کر انکھوں سے آنسو بہنے لگے، راجہ جی کے ساتھ دیکھ کر بھی رونے لگا۔

ان قہر نے فریادوں کی دہشت چھیڑ لی: راجہ اگر چہ دی گئے،

پہلے سن ہے کہ دنیا کا بھی ایک راجہ ہے۔ تم اگر چہ

نرا تھا، انصاف کہاں کرے گا!

واقعی تو کون انصاف کرے گا؟ راجہ اگر غول کرے، کس سے انصاف کی درخواست کی جائے؟ کہاں جہود دنیا کا راجہ
مٹی دینے کی شادی کرنا اور داد دینے کے تو لہ کر کے ان کے باپ کی بی بی اور لپکتی ہوئی وہ کس سے اس کا تدارک کر کے گا؟
کہہ گا؟ اس دنیا کا راجہ کہاں ہے؟ اسے کس پر دھجکا ہو سکتا ہے؟ وہ کون کس ریاست میں رہتا ہے؟

ان نے کہا۔۔۔ انہوں نے کہا کہ وہاں سے کہا جائے تو ان کو جیتی ہے اور صرف ان کا ہی نہیں، شیش شیش، شیش

اور دوسروں، تھکے دیر تا جی والی گھاٹ ہیں، کسی شیش پیتے ہیں، یہیں یہاں ان کے چہرے دیکھ کر کڑے سے پتے پتے کی شیش

دیکھتے ہیں، پتلی بھی نہیں چھین سکتا، ہت و زون پتے والی گھاٹ میں آئے، سادھو آیا تھا، وہ کوئی بہت بڑا سادھو تھا، اور زون

تھا اس کے ساتھ آج، سو اناٹ پر پاس ٹھٹھ اور تھیں، ہتھی بھی نہ تھے، پر والی گھاٹ سادھو کو دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑ

تھا، ان کے ساتھ دیکھ کر دیکھ کر کہہ رہے تھے، یہاں کے سادھو کے سامنے ایک لاکھ کے زون میں ہیں یہ ایک لاکھ

ہانڈی دیکھ رہی ہے، وہ سادھو اگر کھانا ہو گیا تھا۔

ایک ایک کر کے بولے مٹے جا رہے تھے، اور ملائی کی ہانڈی میں جو کر قرانی دی جا رہی تھی، کھتے ہی ٹوٹ ملائی

ہانڈی پر سر نہ کر پڑا، اور بڑے تھے اور نیچے کی ٹی کو انٹھی سے لٹک کر کھانا سے ہاٹ بیٹھے تھے۔

ایک آگے کو آکر چوں کی رہا، ان کی قرانی لڑتی پاتی، سادھو نے بات ان کے سامنے سے روک دیا، سادھو نے

ات نہیں کرتا تھا، اس کے بعد اس نے ملائی کی ہانڈی میں اپنی ڈھنکڑی اور کھانا دیا۔

چھپے ہوئے، سادھو نے ٹوٹا، ہونے لگی، دیکھ کر دیکھا کہ ان ایسا ہو کر رہا، پتھر کی سادھو کی قرانی کاٹ

کسی سادھو کی قرانی کاٹنے سے، اتنے میں پتہ نہیں لگتا، یہ جس انکی اور وہ کیا آئے، کے بعد وہ ٹوٹ گیا، چھپ کر

پتے آکر چھپیں ہیں، انٹھی میں ان کی آواز لگتی کہانی، دی جا رہی، سادھو نے ایک لاکھ بڑا ہو گیا، ٹھٹھ کے ٹوٹوں

ہونے اور اس ہٹا کے میں کئی سے دیکھ کر ہٹا کے مٹے مٹے، ان کھڑی رہی۔

وہ جھونے میں سے ہو گیا تھا۔۔۔ وہ کھانا کھانا، انٹھی میں۔۔۔

یہاں کر کے قرانی بند کر کے، ان نے جواب دیا تھا۔

کیوں — ۹۰

ان نے کہا تھا — "ان کی بھی تو جان ہوتی ہے، ان کو بھی تو طبیعت ہوتی ہے۔"

لیکن ان کا دل جو بکسے گا توں چلتی ہے پھر وہ کیا کھٹے گی؟

ان نے کہا تھا — "ان کا دل تو دیر کی ہیں، دیوی دیوتا جیگر کھٹے پیے بھی زعفران کھٹے ہیں۔"

ان کو اس وقت معلوم نہیں تھا، وہ نہیں جانتی تھی کہ جو لوگ دیوتا کے نام پر کھٹے ہیں وہ ضرورت پڑنے پر دیوتا کا نام یہی لٹک سکتے ہیں، جو لوگ ان کے نام کے مادی جوڑتے ہیں ان کو کھٹے کی کمی نہیں ہوتی، اس کے علاوہ کوئی — دیوتا کا نام لے کر انصاف کرتا ہے، کوئی راجہ کا نام لے کر انصاف کرتا ہے اور کوئی ملک کے نام پر انصاف کرتا ہے، بات ایک ہی ہے، دیوتا راجہ جو یا ملک جزا اس میں یہ ایک بھانہ ہی جوتا ہے، بکسے زبان ہاڑ ہے اس لیے کہہ نہیں سکتا، لیکن کیا انسان بے زبان ہے؟ گھر، داد دیتا ہے، نام پر جہان کو کھٹے ہیں، لیکن کسی جہان نے بھی تو کبھی احتجاج نہیں کیا!

ایک روز وہ پکڑنے لگے، داد دے پوچھا تھا — "اچھا، لکھو، دلوں کو اپنے جہانوں کو کھٹے ہو تو وہ تمہیں کچھ

کہتے ہیں؟"

لکھو، داد کو شاید اس روز بہت زیادہ سلامی ملی تھی۔ اس روز وہ بہت خوش تھے۔

وہ — "دور، دور، دور، کس کے کیا، وہ لوگ بھی تو ڈر، ڈر، ڈر، کھٹے ہیں!"

وہ لوگ کس کو کھٹے ہیں، دیویوں کو؟

"دور، دور، دور، یہ سب دیکھیں جہان کو کھٹے ہیں، ڈاکٹر جہان پر نہیں کھٹے ہیں۔"

داد، داد، کس کو کھٹے ہیں؟ مہین کس کو کھٹے ہیں؟

لکھو، داد کی ذہانت دیکھ کر اس روز وہ پکڑنے لگی، ان کو کیا تھا، لکھو، داد کو سب کچھ معلوم تھا، ان کی معلومات ان میں زیادہ تھیں، لکھو، داد سے بھی زیادہ تھیں، شاید ان کی معلومات پر ان سے تھوڑا سا بھی زیادہ تھیں، لکھو، داد کی چٹائی کڑو رہی تھی، کھٹے تھے، لیکن حیرت ہے، ان کی معلومات کتنی زیادہ تھیں!

دیکھ کر پوچھا تھا — "کویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں، دیوتا میں بھی ایک دوسرے کو کھٹے ہیں؟"

لکھو، داد نے جواب دیا تھا — "ہاں، ہاں، ہاں، سب ایک دوسرے کو کھٹے ہیں، میں جتنی کھٹا ہوں، جتنی

تو کھٹتی ہے، اور مجھے پھر نہ کھٹتے ہیں۔"

دیکھ کر نے کہا تھا — "لیکن میں کسی کو فریب نہیں دوں گا، لکھو، داد، دیوتا۔"

لکھو، داد نے کہا تھا — "لیکن میں کسی کو فریب دے گا، اور تیرے ان لکھے فریب میں؟"

دیکھ کر نے جواب دیا تھا — "نہیں، لکھو، داد، میں کبھی کسی کو فریب نہیں دوں گا۔ کبھی نہیں تو دیکھو

کھدی دیکھنے کا۔۔۔۔۔ آؤ، اندر آؤ۔۔۔

عسبیتہ کھدی دیکھنے سے مدد دے کر دیا تھا کھدی دیکھنے سے روز اپنے ہاں میں کوئی خوشبو دار تیل لگایا تھا جس کی بھینی
شیراز بھی دیکھنے لگی کھدی دیکھنے کے چہرہ کی طرف دیکھا، اس سے کوئی خطا تو سرزد نہیں ہوتی ہے، آخر کھدی دیکھنے کا چہرہ اتنا
بر ہے !

کھدی دیکھنے پر چھا۔۔۔ اے، تو نے کل خدا نہیں دیا تھا۔۔۔
کیوں ؟

دیکھ کر حیرت ہوئی، نہیں دیا کیا مطلب ؟ ٹھیک اسی آدمی کے بات میں تو وہ خط لے آیا تھا۔
اس نے کہا۔۔۔ کیوں ؟ ہر روز میں کو خود دے کر آیا ہوں، اُسی کو تو نے آیا ہوں اُسے نہیں لا ؟
کھدی دیکھنے کا۔۔۔ پھر اُسے میرا خط لا کیوں نہیں، اُس نے مجھے کھلے !
دیکھنے کا۔۔۔ واہ بے، اتنے دنوں سے تمہارا خط اُس کو دے آیا ہوں اور کل کا خط کیوں نہیں دوں
جو خوب ہو۔۔۔

پھر اُسے دیکھنے نہیں، تو نے وہ خط لے آیا کیا، ہاں !
کھدی دیکھنے کی آنکھوں سے قطرے جھپکنے لگا، اُس نے بہت دنوں سے کھدی دیکھنے کو اس طرح غصے ہوتے ہوئے نہیں

بنا، وہ خط تو لے گیا کیا ؟ کس کو دے دیا ہے ؟ کہاں رکھا ہے، بتا !
دیکھنے کا۔۔۔ واہ بے، بیسٹہ آؤ پر تو فضل خدا جو رہی ہو، میرا خط لے کر آیا کر لیا، اتنے سارے خط لے
لوے آیا ہوں پھر سب خط کیوں نہ دیتا ؟
تو اس نے کیا خط کھلے !

دیکھنے کا۔۔۔ میں کیا جانوں !
تو نہیں جانتے تو کون جانتا ہے ؟ میں نے تو تمہارے ہی دستاخط بھیجا تھا۔
تو کیا تو یہ کہنا چاہتی ہو کہ میرا خط غلط لگ گیا ہو ؟
تم نے کس کو خط دیا ہے، بتاؤ !
کھدی دیکھنے کا ایک اُسے پتہ نہ تھی۔
اُس نے کہا۔۔۔ میں جیسے کچھ نہیں کہوں گی، دونوں ہی نہیں، پھر ان کے لڑکوں کی بات تو خود لے آؤ گے کیا !
دیکھنے کا بے شہید !

تم کیوں چکا ؟ میں تو ہر روز جیب میں رکھ کر لے جاتا ہوں، کل بھی جیب ہی میں، مگر تو نے لے لیا تھا۔۔۔

”نیکو خدائے بزرگ! میں کہتا ہوں کہ اس خدا کی باتیں کبھی تمہیں دعا کر کسی کے ات میں ملے ہوں؟“
 رلی اگر نہ ہے؟“

”دیکھو یہ ایک فن کر کھلا ہو گیا اور سر اٹھا کر دیا
 ”کیوں تم پروردگار! وہ خدا کیوں کہتی ہو کبھی دیدی؟ وہ تمہارا کون ہے؟“
 کبھی دیدی یا ایک جیسے گم گم ہو گئی۔

”دیکھو کہ! — وہ ہر روز صبح کے وقت تمہارے خدا کے انتظار میں تھا۔ بتا ہے وہ تمہارے گھر کیوں نہیں آتا؟
 گھر میں تم سب کے سامنے اس سے کہیں باتیں نہیں کر سکتیں؟ اور ایسی کونسی باتیں ہیں جو تم پروردگار سے خدا کہتی ہو؟“

”کبھی دیدی دیر تک خاموش رہی پھر رلی
 ”تم نے خود میرا خدا پڑھ دیا ہے کیوں؟“
 ”دیکھو کہ! — میں خواہ مخواہ تمہارا خدا کیوں پڑھوں گا۔ تمہارا خدا پڑھنے کی بجائے کیا غرض پڑی ہے، مگر وہ
 اور تمہارے گھر میں نہ آتا؟“

”کبھی دیدی نے پوچھا — یہ کتے ہو؟ تم میرا خدا نہیں پڑتے؟“
 ”یہ کتا ہوں کبھی دیدی، میں نے تمہارا ایک خدا بھی نہیں پڑھا ہے؟“
 ”یہ کتے ہو؟“

”میں تو پڑھا ہوں کہ میں مجھ سے نہیں جانتا۔“
 ”پھر وہ خدا اُسے کیوں نہیں دے؟“
 ”کبھی دیدی جیسے کئی گھر میں پڑ گئی — بچے وہ کسی گھر میں سو رہے ہیں جو
 ”یا ایک اُس نے کہا — ہر سو میں اُس کے وقت ایک اور خدا دے آئے؟“
 ”دیکھو کہ! — کیوں نہیں دے آؤں گا؟“

”پھر ہلنے سے پہلے تمہارے خدا کے دئے کیوں؟“
 ”دیکھو کہ! جواب دیا — اچھا —
 اتنا کہ کر دیکھو جہاں تھا یا ایک کبھی دیدی نے اُسے آواز دی
 ”سنو دیر —“

”میں بڑی تیار۔“

”کبھی دیدی نے کہا — تم بڑا دماغ ابھی آتی ہوں —“

”اتنا کہ کر دو تیزی سے نکلے کرانی اور پھر کئی کئی گھنٹوں کی تیزی سے زینہ پہنچ گئی جونی نے آگئی تھی

88-210

١٦٢

نفس دیدی نے بات بڑھاکر دیکھ کر کوششیں بھریا کلیٹ دینا چاہا۔

دیکھو اپنی بات کھینچ لیا۔

١٠٠

نقص دیدہ نے کہا :— اس روز جو چیز دی تھی :

تختہ راہ پاکلیٹ میں نہیں لوں گا۔

سید ریاض الحق صاحب مدظلہ العالی۔

ہوں، کیوں نہیں لوگے، تم پاکلیٹ نہیں کھاتے؟

کتاب نمبر : دو چکر نے جواب دیا ۔۔۔ لیکن تم سے نہیں لوں گا ۔

ابوں! میں نے کیا قصور کیا ہے؟

بچہ نے کہا: — اس دن مجھ میں نے چاکلیٹ نہیں کھائی تھی، مگر میں نے جس طرح دیا تھا اسی طرح رک دیا ہے، تم مجھے

۱۰۰. داکٹر وکٹس ویدی —

بکروں، کیا ہوا؟

جنگل کے کھمبے۔ تم چاکلیٹ نہیں بھی دو گی تو میں تمہارا سنا پھیلا دیا کروں گا، مجھے شک ہے کہ تم چاہو گی میں پہنچاؤں ہمدردی کا۔

۱۱۔ میسرور، میر کردوں کا، لیکن ترجمے پر کلیث : دیا کرد، میں تمہارے پاؤں پر تاجوں —

خسرو دینی نے پوچھا: — کیا ہے کیوں کیا ہوتا ہے؟

دیہ بھرنے جواب دیا۔۔۔۔۔ تو سمجھتی ہو کہ چاکلیٹ نہیں دو گی تو میں تمہارا غلط نہیں لے جاؤں گا کیوں؟“

نصوح دینے کا — دم خدا کے آئینوں کا، تمنا تو ہے، لیکن پاکلیٹ پینے میں کیا ہے؟

”دے کر دھیرا“ دینکرنے کا — خط پہنچا، ہوں یا نہیں؟“

سحر و جادو جنتی ہوئی اس کے قریب آگئی، دونوں آؤں سے اس کا چہرہ غلام کر اُسے پیار کرنے لگی۔

یوں ہے، میرا دیکھنے سے تجھے اتنا دہی کیوں ہے؟

اور بکتر نے سر جھکا کر جواب دیا۔

میں نے اس کے لئے ایک نیا ہیرو بنایا۔

[illegible]

اس طرح کے کوئی جواب
میں نے نہیں دیا تھا

میں کھڑے رہنے میں دیکھ کر بھی بڑا لکڑیسی ہوئی اس کے بعد پٹر پر نگاہ ڈالتے ہی اس نے دیکھا کہ پٹر پر چٹیا ہوا تھا
بڑے قہر سے دیکھ رہا ہے، اتنے دیر سے وہ مسلسل کائیں کائیں کر رہا تھا لیکن اب خاموش ہو گیا تھا اور اب اس کی طرف
رہنے والے بھی جلیں کیا سوچ رہا تھا، وہ تو ابھی آج اس کا حربہ ایکا تھا۔

اے اے اے اے اے اے اے

دیکھتا ہوں کہ اسے جھٹکے گا۔

کراپٹے ذرا چمکا ہوا ادا ڈانٹنے کے لیے پرتے گا، لیکن پھر نہ بدلے کیا سوچ کر ڈک گیا اور پھر دھچکی طرف غور سے

دیکھ کر وہی غور سے ہوا جیسے یہ کڑا اس روز اس کی تھالی سے جھپٹ کر بات لے جا گا تھا، یہی تو شاید اگلوں دادوں کے گھر میں
پیرا دل کیٹا اور سندسٹش ہر روز کھا جاتا ہے۔ حاجی قاسم کے باغ کے ایک کونے میں لادیل کے کچھ درخت ہیں شاید یہ کڑا
میں رہتوں پر رہتا ہے، اس روز بھی کڑا کچھ تو کھائے گا، اڈالے کر بھاگ گیا تھا، یہ بہت بد سانس کڑا ہے، دیکھ کر بہت
بے دیا تھا کہ اس کڑے کے ساتھ ایک پتر بھی تھا، اس وقت تک بھی طرح اس کے پر نہیں نکلے تھے اور وہ دیر تک مڑ کھولے
نے نہ دیا تھا اور اتنے میں بھی کڑا کہیں سے مڑ میں کوئی چیز آتا، اس کے مڑ میں ڈال دیتا، پتے کا مڑ لال تھا شاید بہت چھوٹا
مڑ ہے، کبھی ایک روز جب وہ باغ میں پھول چنے گیا تو اس نے دیکھا کہ بہت سارے کڑے ایک جگہ جمع ہو کر ایک ساتھ
بہاؤں کرتے ہوئے ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے ہیں۔ تقریباً ایک سو دو سو اور تیس سو کڑے جمع ہو گئے تھے، پتے تو دیکھ کر
اس کو برا تھا، اتنے سارے کڑوں نے صبح سویرے یہ کیسی غصہ جھڑکی ہے، درختوں کی پھلی شاخوں پر بیٹھے ہوئے بڑی بے چینی
ہے، اس کو دیکھ کر پتے ادھکی اڑکی اس شاخ پر آئے تھے کبھی اس شاخ پر جا رہے تھے اور شور مچانے ہوئے تھے۔

پتے دیکھ کر کچھ بھی نہیں آیا، اس کے بعد اس نے قریب جا کر دیکھا کہ ایک کڑے کا پتر کچھ مڑ میں چپٹا ہوا ہوا ہے
اس نے پرچاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، آبا، اس پتے کو کس نے مار دیا، باز پرندہ

اس کے بعد دیکھ کر اس پتے کو کبھی نہیں دیکھا، اس کے بعد میں کڑا کیسٹا اڑا کے پٹر کی شاخ پر آکر بیٹھا اور کچھ
روز، آبا، کچھ ہی اگلوں دادوں کے گھر میں کھس کر چاول، کیٹا اور سندسٹش جھپٹ کر لے جانے کی کوشش کرتا، ان کے باورچی
میں بھرتے پتر میں مڑ ڈال دیتا، بجات کی تھالی اور پھل کے ٹکڑوں کی طرف آہستہ آہستہ بکھتا رہتا اور ان سے دیکھتے ہی
سُخا کر ہٹا دیتی۔

بش، بش —

یہی تو زیادہ دیر نہیں بھٹکا، پھر اڑا اسے پٹر کی شاخ پر آکر بیٹھا، اتنا اور ادھر ادھر تک بھاگ کر لے لے لے لے لے لے لے لے
باز اب کائیں کائیں کرتے لگتا۔

دیکھنے آئے پھر گھبرا

اے اے اے اے اے

اگر اس وقت تک شکر تھا تو دیکھ کر ہی کسے دیکھنے لگا۔

دیکھنے تہہ پاکیٹ آگئی میں پھینک دیا۔

کھانے تو یہی سب کھائے۔ میں نے کچھ روٹی سب سے دیا۔ سب تو ہی پیٹ بھر کر کھائے۔ اب کھو دیو۔

تو پاکیٹ بھی سے گئی تھی۔ دیا کروں گا۔ اے اے اے۔

کراٹے اٹتے اڑتے آگئی میں علی۔

کچھ پاکیٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ کھو دیدی کا خود میں روٹی سے آکر لوں گا۔ پاکیٹ پیسنے سے کچھ شے آؤں گا۔

پیسنے سے بھی شے آؤں گا کھو دیدی کچھ بڑی آگئی تھی۔ یہ سب تو کھائے تو ہی کھائے یہ سب۔

میں کوڑھتے ہی دہنے لگا۔ اتنے سو رہے کہ نہ پا۔ ہے ہوا تو مت ہاؤ۔

میں دوڑ کر سے آؤں گا۔ دیکھنے جواب دیا۔ میں لگی کے اندر سے ایک ہی دوڑ میں جا کر دے

آؤں گا۔

نہیں یہی طرح کھر کر بادل منے میں نے ان سے کہا۔ ابھی پانی پر سننے ملے گا دیکھ لو گے۔

دیکھنے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایسا وحشت دکھایا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا تھا رات کے چار بجے ہیں مندر میں گھنٹہ بجے

کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ چنڈی بابو کے مندر میں کچھ شائع ہو چکی تھی۔ چنڈی بابو کے گھر میں رادھا کرشنا کی مورتی تھی اور اب

موجود پر دیکھی جی نہیں ہوئی تھی۔ نہت جسم اسٹیم کے موٹر پر بڑی دھرم دھام ہو رہی تھی اور دیکھ کر کتنی ہی بدچمک تھی کے وہ دن

ہا کرنا شکر کچھ تھے اس روز وہاں جو بھی ہوتا تھا اسے بنا شر پرست رو دیا جاتا تھا۔

میں روز فلنگٹ اسول میں ڈرامہ۔ تیاگ کو کھڑو کر دیا تھا۔ رات زیادہ ہو چکی تھی بڑی رات تھی اور میں

ہوا تھا اور ڈرامہ دیکھ کر سب وہ کھڑو کر دیا تھا تو اس چنڈی بابو کے سونے پاس اُس نے نہت دیکھا تھا۔

اکٹم مملی زندہ نہت۔۔۔

دیکھنے بڑے ہونے کے بعد دایا میں بہت سے نہت دیکھتے تھے میں اس روز جو نہت اُس نے دیکھا تھا اس نے

مثال نہیں۔

اس وقت دیکھنے کے گاؤں میں ڈرامہ کے ٹوٹے گئے۔ ہتھے اور سے پرانے کھڑو بابو کی سنائی ہوئی کافی یاد آگئی

ست بجے ہی آگے کا زمانہ تھا جب دنیا میں کافی کام نہیں تھا۔ سزا نہیں تھی۔ سب کی پہا میں ایک نور۔

کی بھولی کہتے تھے ایک اور سے بہت کہتے تھے اسی کے بعد ایک اور کشش سفر خریدا۔ پورے جہیز اور خستہ

نہیں ہوئی اور اس کے ساتھ بکھرے آدھے تعلق کی بنیاد ملی، لوگوں کی عام عقل چھٹی گئی، وید کا پید ہو گیا اور لوگوں نے پوجا دینا بند کر دیا، ان دنوں وید کا پورا کھا کر زندہ تھے، وہ سب ناکارے کرنے لگے۔

اس حالت کو دیکھ کر تمام دیوتاؤں نے برہما کے پاس ہاکر دربار کیا۔

برہما نے کہا: تم لوگ دشمن کے پاس جاؤ، وہ اس کا تدارک کریں گے۔

آخر کار تمام دیوتا دشمن کے پاس گئے۔

ہوئے: دنیا کے لوگ اب پوجا نہیں کرتے، وید نہیں پڑھتے، اب ہم لوگ کیا کھا کر زندہ رہیں گے، آپ اس کا

تدارک کیجیے۔

دشمن نے جواب دیا: تم لوگ اپنے گھر جاؤ، میں اس کا انتظام کرتا ہوں۔

آخر کار اس کا انتظام ہو گیا، کیا انتظام؟ وہ یہ کہ انھوں نے دنیا میں ایک راجہ کی تخلیق کی۔

پہلے اب اس کی فکر، زندگی مزدت نہیں، اب ہی راجہ تمام لوگوں پر حکومت کرے گا، جو ہیں، انھیں سزا دے گا، جو نہیں، انھیں پاداش کرے گا۔

اس طرح پر تصور کی تخلیق ہوئی، دنیا میں اب لوٹ آیا، مسرت لوٹ آئی، مذہب لوٹ آیا، سب کچھ واپس آ گیا اور دنیا

اب پھر انی و سکوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔

کیسے کیا ایک پیرا بیت و شیشی آیا۔

کرن بھی ڈرامہ دیکھ کر اس کے ساتھ ہی واپس آ رہا تھا۔

اس نے کہا: جانتے ہو جو پیرا، انگریزی بارب سب سے بڑے دشمن ہیں، ان لوگوں کے ہاتے ہی دیکھو گے، ہم سب بڑے

دشمن ہیں گے، اس وقت کوئی بھی چیز غریب نے کھینچے، روپیہ کی مزدت نہیں ہے گی، دیکھو یہاں۔

دیکھنے کا: تم سے کس نے کہا؟

میں تجھے میں جا کر کچھ نہیں دیکھتا، کرن نے جواب دیا: اس وقت میں اب آدمی کہہ رہا تھا کہ ہمارے ملک میں بہت

سارے بڑے بڑے آدمی تھے، ان سے تمہارا کہہ کھینچنے لگے۔ اب تمہارا بیٹے کے لیے میرے نہیں دینا ہو گا؟

دیکھنے پر پیرا: کیسے کیا ہو گا؟

کرن نے جواب دیا: سب چیز تو تم ہی جانتے ہو، کسی کسی میں وہ لوگ بہت کھاری اسول جاتا ہوں، صرف

وہ راجات، میں وہ ملک نہیں جانتا، میں بہت کھاری نہیں کرتا۔

تمہارے بابا اب تک پتے نہیں ہوئے؟ دیکھنے پر پیرا:

کرن نے جواب دیا: میرا کرنا چلے سارا، اب تو زیادہ دیر بھی نہیں۔

سارا کس طرح آئے گا؟ کرن کو بھی معلوم نہ تھا، وہ پارک میں جا کر تقریباً سنا اور جو کچھ سنتا، اس کو پوسے کہہ دیتا۔ تقریباً

اور جو شہر آجاتا اس کا خون کے غلے تھا اور وہاں وہ ایک جہیز میں سارے ہوتا اور وہاں وہ بے غم رہتا اور اس کا ہر
نفس غم نہ ہوتا اس کا رنگ گرا تھا لیکن یہ کچھ پرہیز میں اس کی رخت بیشہ ڈھکی تھی اور جب کبھی وہ صحت مند ہوتا
تو جراتا تھا کہ وہ نہ کیوں دیکھا دیتا تھا۔

اس روز اس نے دیکھنے کے بعد کہی میں پٹے بٹے ماستوں پر چلتے ہوئے وہ دونوں کالی لہجے پہنچے تھے کالی لہجے کے بعد
بیشہ گھول فرست میں تھا یہاں سے کہی کو ذرا راست ہوا تھا اور وہ پھر کو سیدھے پہنچ کر کی طرف آتا تھا اس نے پہنچتا
ہا کہیں بھی کسی ایک آدمی کا بھی پتہ نہیں تھا۔
کہنہ دک گیا۔

۱۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ گے؟

۲۔ وہ ہڈوں گا۔ وہ پھر سے جواب دیا۔

۳۔ اور نہیں ملے گا؟

۴۔ نہیں ڈر گیا۔ وہ پھر سے جواب دیا۔

۵۔ اچھا تو اب میں لکھ جاتا ہوں۔

تاکہ کر کر رہ گیا تھا۔ وہ پھر سے ایک بار سامنے کی طرف دیکھا۔ سامنے نوا پر گیس پٹی ٹنڈر ہی تھی اس گیس پٹی سے تھوڑی
دور آگے سے کھڑا تھا۔ اس ایک ہی بیشہ گھول لہجے کا ایک آدمی ہے پھر ڈرامے کے مکالمے یاد آ گئے۔ چند لمحوں کے بعد وہ بھی اس
لہجے میں پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔

میں تم سے طریقوں کی مدت چھیوں: راجہ اگر چہ رکے کہے

میں نے سنا ہے اس دنیا کا بھی ایک راجہ ہے۔ تم راجہ ہی

کہہ تو تمہارا انصاف کو کہے گا:

لہجہ کے مکالمے اسے ہر طرح کی ادویس تھے۔ واقعی راجہ تو راجہ ہے۔ دنیا کا راجہ۔ وہ تمام ہر کام کا انصاف کرتا

ہے۔ ہر مرد کو سزا میں دیتا ہے۔ گناہوں کو سزا دیتا ہے۔ وہی دنیا کا راجہ۔ مگر انصاف کرے۔ اس کا انصاف کوں
کرے گا:

یہ ایک آدمی اس نے دیکھا۔ چنڈی والے کے مکان کے قریب: غامی کوئی چیز حرکت کر رہی جو۔

کیا ہے؟ وہ کیسے؟

وہ جگہ اہل تارک تھی۔ دریا کے قریب تارکی اور بھی گری اور بھی دینے ہو گئی تھی: وہ اب ایک ڈھیر پائے گھریں

سکتا تھا لیکن وہ پھر کی چٹنے کی حالت جیسے سب ہو گئی تھی جیسے اس کے دونوں پاؤں زمین میں دھنس گئے تھے اور اس کے دونوں

کونے ہر گھٹا اور اسے پاؤں تک لپٹنے لگا۔

کیا ہے وہاں پر وہ کیا ہے؟

اے ایسا عجیبے ایک بھرت عانت نکالے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا ہے اور سر جھٹکا جھٹکا منہ رہا ہے اور اس
ناخوش ہنسی مانتے میں گنگا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ دیکھ کر اس کا جسم ہر طرف کی طرح سر ہو گیا وہ اپنی پرکھت
ہٹ کے کھڑے ہاتھ تھا، لیکن اس کی جیج سوتی میں ایک لٹی اور وہ سلیہ تاریکی میں ڈوبا ہوا اور بھی زور زور سے فتنے لگانے لگا
تے ایسا عجیبے اس کی ناخوش ہنسی کے صدائے بزدلشت سے ایشورنگولی میں چلایا ہوا ویز تاریکی کا پردہ آتا رہ گیا ہے۔
اس ناکہ کی جیج ہاتھ مہل کی پاپٹے ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔

کہو، کھو کا تم آگئے؟ اتنی رات ہو گئی؟

لیکن دیکھ کر اچرہ دیکھ کر ان کو بڑی حیرت ہوئی، دیکھ کر کیا زباں جیسے لگے ہو گئی تھی اور اس کا سا جسم پیٹنے میں
رہا، کھو کا اندر داخل ہوتے ہی وہ دونوں بات پھیل کر اس سے پٹ گیا۔

کیا ہوا تمہیں کیا ہو گیا؟

دیکھنے کے لئے۔ ان میں نے بھوت دیکھا ہے۔

بھوت؟

ان کہے وہ تعجب ہوا، دیکھ کر تخت پرش پر شا کر لپٹے سے ہوا کہنے لگی، ڈار دیکھنے لگا تھا کیا ایک راکے کر یہ کیا

تم نے ڈار دیکھا؟ میں نے پوچھا۔

دیکھنے اپنے جوتے جواب دیا۔ ڈار دیکھ کر آ رہا تھا کہ کیا ایک چنڈی باب کے مکان کے کونے میں کھڑا ہوا ایک

بھوت دیکھ کر بچنے لگا۔

میں بچنے لگی۔

بول۔ وہ پتہ جس تہلے کیا دیکھ کر کیا بھڑیا، بھوت دوت کا کوئی وجود نہیں کہاں ہے بھوت؟ بھوت اس کی کئی

پر نہیں اتنی حیرت ہو گئی پھر بھی بھرت سے ڈرتے ہو؟

دیکھنے کا۔ نہیں ان میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر۔ ہاں، میری طرف دیکھ دیکھ کر بھوت نہیں رہا تھا، تم پر

میں بھی لگا دوا گا۔

اچھا تو کچھ سمجھتا ہوں بھوت کہاں ہے میں بھی دیکھ لوں۔

اس صداقت کی رات میں میں دیکھ کر ساتھ لے کر عمل پڑی تھی اس وقت سات کے بارہ ایک بجے ہوا گے کال گھنٹے کے

اڈا سوچے تھے اور پادروں طرف گزرتا تھا پھر اٹھتا تھا راستے میں تھکتے چنڈی باب کے مکان کا تیس نمبر تھا، تیس نمبر نمبر گھنٹا

کے اندر ہی تھا نمبر صحت تھا، وہ بنم فٹنگ کے کو قہر میں دیکھنے کیلئے کئی بار چنڈی باب کے مکان میں جا چکا تھا بہت

تھی، لیکن ماہر سے اتنی بڑی معلوم نہیں ہوتی تھی، محنت کے اندر پوچھا کہ وہ ان کے مسموم میں سے کون سا ہے؟
 ان میں سے ایک نے اوجھڑا کر کہا کہ اس کا نام کنی اور دوسری دیریاں بھی تھیں اس کا نام کنی کے اندر تھی میں
 نے کہ وہ ان کو مل جائے اور مسموم سے بھر جائے اور اس کے پاس وہ دوسرا شخص بیٹا کی تمہاریاں کہ دی باقی بہت سادہ
 ان میں سے دو مسموم تھیں کو دیکھتے ہوئے تجربے کے لیے پا کر اوجھڑا کر ایک ان کو ان کے تجربے پر سادہ کاروں کی دو مسمومان
 کی جو تھیں اور چھپنے چھپنے پھرتی تھیں کہ وہ ان پر ایک ایک ہاتھ پر شاؤ تھا۔

پوچھا کہ وہ چھپنے والے کے مکان میں کون سی چیز تھی؟ اور اس کے بعد اس نے بڑی حیرت انگیز کہانی سنائی کہ اس کے بعد بہت کم
 ان ہاتھ تھے، سونے مسموم میں ہی مکان کے دو چار بچے، ان کا نام دیکھتے رہتے، ایک مرتبہ اسی چند ہی باہر سے اسے اپنے گھر
 ان دیا تھا۔

اس وقت اس کے خوار ہو گئی کہ تھی اور وہ دھرم دہی ٹرسٹ مال سکور میں پڑتا تھا، بھائی پور میں بعض دن ایک دفعہ چلے
 اس کے چھ بچے کا وقت تھا اور وہ ان کے ساتھ ہر مل پانک سے بھی بہت دور تھے، اس کا انداز تھا کہ تقریباً پانچ یا آٹھ کے قریب چلے
 اور ان پر سید ان میں کٹ ال یہی ہوا تھا وہ ان سے ٹک ال یہی دیکھ کر وہ دہی آ رہا تھا اس وقت شام کے پانچ بج چکے تھے۔
 ایک حکم تھا جیسے کہ کوئی مسموم ہو۔

اسے اپنے کان کا پتہ چلا اور پتہ چلا کہ اس کا نام دیکھ کر چلا گیا تھا، راستے میں چلے لوگ تھے وہ بھی چوکھٹے تھے وہی
 بڑے تھانہ "مسموم" دیکھنے لگے تھے۔

• یہاں پور پر سب سے کہنے کا اور آنا کہ وہ وہ ڈرے۔

اور اس کے ساتھ ساتھ دیکھ کر بھی جاگ لگا رہا۔

رہتے ہیں ہر طرف بھڑکی پانچ گنی تھی۔

اس کے بعد ہر ایک کا وہ ہوا اور اس نے دیکھا کہ ایک مسموم کا آدمی جو سائیکل پر جا رہا تھا، سائیکل سے نیچے گر پڑا، اس کے

پہ ایک اور آدمی سائیکل پر سوار تھا اس کے سینے میں گولی لگی اور وہ بھی زمین پر آ رہا اور وہ جس کے قریب ہی ڈیر ہو گیا اور

بہت سے لوگ ان کے فرار سے پھرتے تھے؛ یہ سب دیکھ کر وہ دونوں بدحواس ہو گئے اور پھر بے گناہ جانے لگے؛

وہ بھڑکا تھا پشیمت شریٹ سے دوڑتے ہوئے باہر دوڑے مگر تھوڑی دیر کے لیے رک گئے "اس کا دم پھرنے

اور وہ دونوں بڑی حیرت منانے لگے تھے، اور اس وقت مسموم بچہ نکلا اور بھڑکی پڑی ہوئی تھی۔

ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور وہ

• بہت پشیمت ہو کر لوٹا گیا۔

• کہنے لگا "ا"

• سو دیشیروں نے "ا"

وہ دونوں تباہی کے ہنسنے پر حیرت کر رہے تھے۔ کس نے مارا؟ یہ سب کچھ وہ کئی دن کے، جس کو بدھ بھی مرقع
 نہ جاکر دیکھا۔ وہ دونوں وہاں پہنچ کر دیکھ سکے، پھر ہال کھڑے ہوئے اور دوڑتے دوڑتے ڈیڑھ گھنٹہ میں آکر
 رہ گئے۔ ان دونوں نے دیکھا کہ غلط سمت سے ایک بڑی سائیکل پر چوڑا رہا ہے، اُسے دیکھ کر دونوں گھبرا گئے۔
 وہ بے خبر کھڑے تھے؟

کون نے کہا۔۔۔ ہال پر دوڑی۔
 ماننے پر چنڈی بابو کا مکان تھا جس بڑی کاروائیٹ کھڑی تھی۔ وہ لڑکھڑکیا اور اس کے پیچھے پیچھے دیکھ کر
 فرس کی۔ اتنی ہی دیر میں سلسلے نکلے۔ یہ خبر پھیل چکی تھی کہ پولیس کے ڈپٹی کمشنر ہنسنے پر حیرت کر رہے تھے۔
 چنڈی بابو بڑے آدمی تھے۔ وہ اس وقت ایک کڑی ریٹھے پر بیٹھے ہوئے تھے۔

انہوں نے سوچ کر کہا۔۔۔ رام دھنی گیٹ بند کر دو۔
 رام دھنی کیس دوسری طرف تھا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا اور گیٹ بند کرنے پر جلد ہاتھ مارا۔ وہاں اندھ گھس پڑے۔
 چنڈی بابو ان دونوں کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر آئے اور بڑے
 گیٹ آؤٹ۔ گیٹ آؤٹ۔ گیٹ آؤٹ۔

اُسے آج بھرا دیا ہے۔ اس روز چنڈی بابو کو دیکھ کر دیکھ کر کہ شام کے اندھیرے میں یہ منظر حالت میں ان کی پسند
 نہ آ رہی تھی۔ وہ موسم بہار کی کس روز چنڈی بابو نے پناہ نہیں دی تھی۔ شاید انہوں نے ان دونوں کو قسمت کے ہاتھ
 سے رانا اٹھانے دیا تھا۔ لیکن ان کی قسمت کے ہاتھ نے ان سے آخر کار خود انہیں بھی زیادہ دونوں تک زندہ رہنے نہیں

دیکھی۔ یہ بہت دور بعد کا واقعہ ہے۔

اس روز بھی اُسے اسی چنڈی بابو کے مکان پر ہاتھ مارا تھا۔ اس نے بالکل سنبھل کر چلے گئے۔ وہ دوڑتے آئے۔ ایک آدمی کا بھی پتہ
 نہ دیکھ کر ساتھ ہی ہوئے۔ اُسے لگی۔ شیتو کے بے سایہ کمرے تھا اور اس کے بعد ہی چنڈی بابو کا مکان تھا۔ مکان کے
 دروازے پر وہ باغ تھا اور پھر کچھ اور طرف دیکھ کر اس وقت بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔

اس نے کہا۔۔۔ اُس نے کیا بات نہیں کہ میں تو تمہارے ساتھ ہوں، ادا کاں ہے، تمہارا بھرت کاں ہے؟
 دیکھتے ہوئے ہی اس نے غصہ اٹھایا، اُسے چیز نظر آگئی، اسی لمحہ وہاں پر اندھیرا تھا اور اندھیرے میں وہ بھرت ابھی تک
 وہاں سر رہا تھا، ٹھیک اسی طرح حالت نکالے ہوئے تھے۔ ٹھیک رہا تھا۔

دیکھتے کہا۔۔۔ وہ دیکھو، وہ رہا۔

اس نے بھی چند لمحوں تک غور سے دیکھا۔ اس کے بعد وہم اور نگاہ دھار کر اچھی طرح جائزہ لیا۔

دیکھنے کہا۔۔۔ دیکھو، یہاں اب اس نے کیا کیا تھا۔

اس مندر میں آگے کے اندر سے بدلی جلدی پھول تھی کروہ مندر کی طرف دوڑ پڑا تھا پہلے ماں کے مندر میں گیا تھا ماں نے مندر میں جیٹھ کے کئی پھول مینے کے بعد سے مینا مارا تھی، گیش، جگ، ناتھ، خریشی اور اس کے بعد بھویشیو کے مندر میں پھول دینا تھا۔

دیکھنے کا۔۔۔ پنڈت جی مندر بدلی سے پھول لے لیجئے، بہت دیر سے پانی آ رہا ہے۔
 ماتھی آسمان بادل سے ڈھکا تھا، نالوں مندر کی چیت کے آگے پر سیاہ بادل کا اجتماع تھا، اس کے بعد چوڑے پر
 بتی ایک کر مندر کے گرد گھوم کر لگی کے اندر سے کڑو پر کھر کے دروازہ تک جانے کا راستہ تھا، دوسری طرف جھٹکے
 پڑتھی، پیڑ سے کی دوکان تھی جس کے اندر پڑے ہتے تھے اس کے بعد پورب رخ کا دروازہ تھا۔

اس وقت تک مندر میں کافی بھڑک گئی تھی، بڑی بڑی لاریں لگی ہوئی تھیں اور کاروں سے اتر کر گوری گوری ڈواری
 ورتیں اور ٹوسے چٹے مارواری مرہنگے پالوں مندر میں آ رہے تھے اور ان کے پیچھے بھکاریوں کی ٹولی لگی ہوئی تھی، ان کا
 رات ستر اور تھتے تھا اور سرخ و سپید چمڑے، ان کے اندر بڑی گشتی تھی، وہ پنڈے کو بہت زیادہ دانی دیتے تھے اور اسی
 سے ہنسنے بھگانے کی بڑی خاطر و محاسن کرتے، اس کے برعکس وہ دیکھ کر کوئی خاطر نہیں کرتے تھے کیونکہ دیکھ کر انہیں ایک
 یہ بھی سلائی نہ دیتا تھا، صرف پھول مینے سے بھی کہیں ماں کا پیٹ بھر لے؟

یہ ایک بارش کی دوپہر تھی، پٹ پٹ اس کے جسم پر پڑ رہی۔
 دیکھ کر کوئی بچے آکر کھڑا ہو گیا، یہاں پر اس کا سر جھکے سے محفوظ ہے گا اور خط بھی نہیں بھیجے گا، ٹکسی دیدی کا خط اس کی
 سبب تھا، وہاں پر کھڑے ہو کر، جہاں تک اس کی نگاہ جا سکتی تھی وہ جھستیں نگاہوں سے دیکھنے لگا، بارش ہو رہی تھی، شاید
 وہ بعد آدمی بارش کی وجہ سے نہیں آ رہا ہے یا ٹکسے ہے کہ براؤ آدمی ہونے کی وجہ سے وقت کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا ہو
 اس دو خود آج وقت سے پہلے تو نہیں آ گیا، سات بج چکے ہیں کیا، اس طرف پیڑ سے کی دوکان میں ایک دیوار گھڑی جھے
 تو یہ وقت دیکھنے سے پہلے چل جاتا!

دیکھ کر سر کو پیچنے سے پہلے ہونے دوکان کے مقابل آکر کھڑا ہو گیا اور گھڑی پر نگاہ ڈالی، سات بج کر میں منٹ ہو
 گئے تھے، دوسرے دن کی نسبت آج دیر ہو گئی تھی اب تک تو آ جانا چاہیے تھا، وہ بعد آدمی اسی وقت تو آتا تھا، انہیں اس
 ان ایمرہ بہت خوش ہوتا ہے۔

کبھی کبھی وہ بعد آدمی پہنچے ہی سے آکر کھڑا رہتا تھا۔
 دیکھ کر دیکھتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔
 آگے کھو کا؟

دیکھ کر جیسے خط نکال کر سے لے رہا۔

نہ لیجئے

چینی کون کے ہاں مل گئے ہیں، دیکھ کر خاموشی سے کون کا ہر دیکھنے لگا۔

• میں تھکے ہی پاس جا رہا تھا۔ کون نے کہا۔

• کیوں نہ کیا ہو؟

کون کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

دیکھ کر نے پوچھا۔ • تھکے ہاں مل گئے ہیں کیا؟ کب؟

• نہیں۔ کون نے جواب دیا۔ • انہار میں خبر بھی ہے بھائی۔ سی۔ آر۔ داس قضا کر گئے۔

جاہوگا؟

سی۔ آر۔ داس قضا کر گئے؟ کیا ہوگا؟ کون کو کتنی امیدیں تھیں، اُسے امید تھی کہ سی۔ آر۔ داس راجہ ہوں گے!

نہیں اب کیا ہوگا، کون کا ہر دیکھے مڑ جائیگا تھا، کون نے کچلے کی طرح دیکھ کر حرف دیکھ رہا تھا۔

کون نے کہا۔ • سادھنے تو کہا تھا کہ سی۔ آر۔ داس اس ملک کے راجہ ہوں گے۔

دیکھ کر کچلے کچلے میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے، وہ بھی چپ چاپ کون کا منہ نہ کھلے لگا، کون کی نگاہوں میں ساری دُشیا

ہے سرفروشی، اگر راجہ ہی مر جائے تو دُشوں کی حالت کیسے بہتر ہوگی، کون کے بابا کی حالت کیسے سُہل ہوگی، تو کیا

اسے ہم فرجیتو بیجا ہوگا؟ تمام غریب ایک اٹھنا پڑے گی، پھر اس کا سماں کیسے بنے گا؟ پھر سوراخ کیسے ہوگا؟ اس روز کون

سے ساقی کا کوئی مل نہ پا کر جیسے دیکھ مایوس ہو گیا تھا۔

بہت دیر تک چپ رہنے کے بعد دیکھ کر نے پوچھا

• اسکول نہیں جاؤ گے؟

• اسکول میں آج چھٹی ہے۔ کون نے جواب دیا۔ • کل بھی چھٹی ہے گی۔

اس کے بعد وہ لڑکے کو لے کر لے گیا۔ • کل کبہڑا تھا میں سی۔ آر۔ داس کو دیکھنے کے تم دیکھنے جاؤ گے بھائی؟

• جاؤں گا۔ • دیکھ کر نے کہا۔ • سب دو دنوں ایک ساتھ چلیں گے۔

کون نے کہا۔ • ذرا سویرے ہی چلیں گے، کچلے، ورنہ کبہڑا تو اٹھ میں بڑی بیڑ ہو جائے گی۔

اس بندہ کو دیکھتے ہی دوست پہلے کھڑے رہے، کون نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، انہار میں بڑی بڑی بیڑ ہو جانے کی

اب وہ بہت بیڑ ہو چکی تھی، انہار میں بڑی بڑی بیڑ ہو چکی تھی، اور اب اسے جا کر بیٹ کر بیٹے تھے۔

دیکھ کر ایک منٹ کے لیے وہ بڑبڑا کر گیا، قضا کر کے کوئی کوئی بڑبڑا کر گیا، وہ فی الحال کی طرف سے زیادہ تھی۔

دو دن کا کام بچتے۔ • رات کو چھان بھان ہو کر سب پر خوراک کا کیا فائدہ، ہوتا بھائی، پھر خوراک کا کرنا

• آج ہے؟ یا پھر خوراک کا کرنا، آج ہے؟ ہر لمحہ کھاؤ۔

دوسروں کے بڑے چیلنے کا۔ • کاندھ میں تو آسانی ہو گئی، کچلے دو دن کا کام دیکھ کر بات پر پریشان نہ رہے، حال

”بھارتیوں کے لڑاکا کرتے ہیں تم ہانتے ہو؟“

”دوڑی دوڑی کرتے ہیں۔“ دیکھنے جواب دیا۔

”پچھنے دسے پھر پوچھا۔“

”کس دوڑی؟“

”دیکھنے جواب دیا۔“ ”تو کبے نہیں معلوم۔“

”دوڑی لڑنے پچھنے واسے پوچھا۔“

”نہیں ٹیک معلوم ہے؟“

”پچھنے واسے جواب دیا۔“

”میں نے دیکھا جو ہے، میں نے خود لڑنے آنکھوں سے دیکھا ہے، دوڑی لڑا۔“

”اسے برسوں کی کہ آپس میں لڑا لڑا کر کے باہر سے آئے ہیں کتنے بچے، دیکھو ان کی باتیں مجھ سے اس وقت وہ صرف یہ کہ

”اسی آئے۔“ اس کی موت پر کوئی بھی رونا نہیں ہے، سبھی لگتے تو پچھنے ہی کی طرح آج بھی غسل آنے سے کہنے تھے، کوئی تبدیلی بھی نہیں

”دیکھتے ہی کھٹی دیدی کے مکان میں داخل ہو گیا، لڑکیاں اس وقت برآمدے میں بیٹی ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، غسل

پڑھنا اور پچھنے سے بالوں کو چٹنے پر مجبور دیا تھا۔“

”دیکھنے جاتے ہی پوچھا۔“ ”لڑکیاں ان کھٹی دیدی کاٹ رہی ہیں؟“

”ادھر پر لڑ رہی ہے۔“ لڑکیاں اس نے جواب دیا۔ ”دیکھو ہا کر۔“

”آپنے ساتھ لڑکیاں اس کی آواز داس مگنے؟“

”نہیں؟“ لڑکیاں اس نے کھٹے سے لہجہ میں پوچھا۔

”ادھر جگہ میں۔“ دیکھنے جواب دیا۔ ”کل کیڑا تو میں بڑی بیڑ ہوئی۔“

”لڑکیاں اس کے حوالے سے بیڑ ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، اس کے بیڑ ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، دیکھنے بہت ساری باتیں اس سے

”اس کے حوالے سے بیڑ ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، اس کے بیڑ ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، دیکھنے بہت ساری باتیں اس سے

”اس کے حوالے سے بیڑ ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، اس کے بیڑ ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، دیکھنے بہت ساری باتیں اس سے

”اس کے حوالے سے بیڑ ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، اس کے بیڑ ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، دیکھنے بہت ساری باتیں اس سے

”اس کے حوالے سے بیڑ ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، اس کے بیڑ ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، دیکھنے بہت ساری باتیں اس سے

”اس کے حوالے سے بیڑ ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، اس کے بیڑ ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، دیکھنے بہت ساری باتیں اس سے

”اس کے حوالے سے بیڑ ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، اس کے بیڑ ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، دیکھنے بہت ساری باتیں اس سے

”کسی دیدی تھنے کا، سہی۔ اور داس مر گئے؟“
 ”کسی دیدی نے حیرت سے دیکھ کر چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد بولی —
 ”میں سچ بولی، لیکن تم نے خطے دیا تھا؟“
 ”ہاں دے دیا تھا؟ دیکھنے جواب دیا۔
 ”اس کے بعد قہقہے دکھ کر اس نے پوچھا
 ”اتنا کھسی دیدی یہ جو سہی۔ اور داس مر گئے ہیں تو اس سے کچھ نہ ہوگا؟“
 ”نہا ہوگا؟“

”دیکھنے کا — اتنے بڑے آدمی مر گئے اور کچھ بھی نہ ہوگا؟“
 ”کھسی دیدی نے کھڑے ہونے سے روک دیا۔
 ”ہوگا کیا؟ ایک ہی تو کچھ کو مر رہے۔“
 ”یہ بات دیکھ کر اچھی نہ لگی، بسوں کے ساتھ سہی۔ اور داس کا ساتھ! سہی۔ اور داس کیا دوسرے لوگوں کے ہمراہ تھے؟
 ”وہ تو بات اسے اچھی نہیں لگی، کوئی کچھ کہہ کر اسے کتنا برا نقصان ہو رہا ہے! پیدا دلیک ہی کہتے ہیں۔ دانت ہتے ہونے
 ”اس کی قدر نہیں کرتے۔“

”دیکھو وہاں سے پو آ رہا تھا کہ یکایک اسے ایک بات یاد آگئی۔
 ”اس نے کہا — ”تھانا ایک خط ہے کھسی دیدی؟“
 ”نہا؟“ کھسی دیدی یکایک اچھل پڑی — ”خط ہے تو بتا کیوں نہیں؟ لاؤ —“
 ”دیکھو لے جیسے خط نکال کر دے دیا۔
 ”میں ایک دم بھول گیا تھا —“

”نادرے کر کھسی دیدی اس کا ایک سراپا کی کہ کے پڑنے لگی، ”خدا پڑتے وقت وہ بڑی خوبصورت لک رہی تھی جیسے
 ”... سہی دیدی ہے مد میں ہو گئی ہے؛ ”خس کر کے اس نے ایک سرخ ساڑی پہن رکھی تھی اس کے میں سرخ کا ایک ہار پہنا
 ”... وہ ایک خط بڑا تھا اور اس کے لے کا وہ خط بڑا جتنا بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا، ”خس دیدی کا خط اس طرح تھا کہ
 ”... وہ اس سے کہیں میں چھپائے رہتی تھی، لیکن کھسی دیدی نے اسے لے لیا، ”خدا پڑتے وقت وہ بڑی خوبصورت لک رہی تھی جیسے
 ”... یہ میں بتا گیا تھا، ”نہا؟“ اور کھسی دیدی بھی برسرِ زکوا کی طرح تھی، ”نہا؟“ اور وہ آدمی بھی سب کام چھوڑ کر برسرِ زکوا کی طرح
 ”... یہ خدا کے اتار میں کیوں کھڑا رہتا ہے اور خدا پڑتے وقت اس کا چہرہ اس طرح خوشی سے کیوں کھل اٹھتا ہے؟ اس نے
 ”... اس کی کہیں سرخ ہو جاتی ہیں اور وہ اتنا سرخ کیوں رہتا ہے اور سرخ پتے ہونے ایک ہی خدا کو بار بار کیوں پڑھتا

خدا پر حقے جسنے یہاں کھسکی دی آپ ہی آپ ہو —

• کی تو میں نہیں جا سکوں گی •

• دیکھنے پر مجھ — کہاں نہیں جا سکوں گی کھسکی دیدی •

• نہیں • میں تم سے نہیں کہہ رہی ہوں •

• اس کے بعد دیکھ کر کی طرف دیکھ کر ہوئی —

• دیکھ کر تو کیا مشکل آ پڑی ہے • کل تو میں نہیں جا سکوں گی •

• تمہیں نہیں جانے کے لیے کھاتے کھسکی دیدی • دیکھنے پر مجھ •

• کھسکی دیدی نے جواب دیا — وہ تم نہیں سمجھو گے • وہ ایک خاص جگہ ہے لیکن کل تو سنی آ رہی ہے •

• سنی • سنی آ رہی ہے •

• کھسکی دیدی نے کہا — ان کل سنی کو دھونے کے لیے ہانا جو گا • کل سنی آ رہی ہے • ابا نے خاک کھا ہے •

• سنی پانچ بجے سنی کا ہانا یہاں پہنچے گا •

• سنی • اس کے بارے میں دیکھ کر اتنی باتیں سنیں • کاتھا کٹاؤں کے بارے میں اسے پوری واقفیت ہو چکی تھی • جیسے وہ سنی

• سے لے کر پورا سنی کو دیکھ کر اس کو کافی ضرورت باقی نہ رہی جو بہت دھونے سے اس نے اپنے ذہن میں سنی کی ایک تصویر بنی •

• دیکھ کر سنی اور اس کے کاکا اور داداں اور کھسکی دیدی کی زبانیں اتنی سہری باتیں سن چکا تھا کہ سنی اب اس کے لیے جتنی سنی بھی

• تھی • جیسے کھسکی دیدی کی طرف سنی ہی اس کے دل میں گھر کر چکی تھی •

• دیکھنے پر مجھ — • سنی آ رہی ہے • یہ بات تمہیں لگے پتے کیوں نہ پائی •

• آج ہی تو باا کا ٹیکو گرام آ رہا ہے • کھسکی دیدی نے جواب دیا •

• مگر وہ کس کے ساتھ آئے گی • سنی ایک آنکھ کی •

• کھسکی دیدی نے کہا — براہ راست اور ایک صاحب لکھتے آ رہے ہیں • انہیں کے ساتھ بابا نے بھی کیا ہے اور

• اس کی تقسیم انہی نہیں جو رہی ہے اسی لیے — وہ دیکھتے نہیں • وہ بستر سنی کے لیے ہی کیا گیا ہے • سنی وہیں سنی

• گی •

• اتنی دیر بعد دیکھ کر کی زھر پڑی • کمرے کے ایک طرف کھسکی دیدی کا بستر تھا اس کے دوسری طرف ایک دوسرا

• بستر تھا •

• اس دن اپنے کمرے میں آنے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک سنی کے بارے میں سوچتا رہا تھا • دیکھنے اس وقت تک

• سنی کو نہیں دکھاتا • لیکن اسے ایسا محسوس ہوا • جتنا جیسے اب اسے کھینکے کے لیے گھر میں بھی ایک ساتھی مل گیا جو کھسکی دیدی

• بڑی تھی • لیکن وہ بڑی تھی • لیکن یہاں بھی اس سے گھر میں بڑے تھے • اس لیے وہ کسی کے ساتھ نہیں جکیں سکتا تھا • جب اسے

کے لیے یہ کہیں جانے کے ساتھ میں بڑی بیڑ لگ گئی تھی، انسانوں کے سروں سے بیٹک بجا رہا دکانی کے ساتھ
ساتھ چمکے یا لہے ایشی میں بڑی بیٹھنے کے بات تھی، اس کے بعد اس سے پہلے پتے ٹھکے اجرو دھڑ، گالی گلاطہ دھڑ
گالی گولی دھڑ پر آئیں گے، اس وقت تک تمام رنگاخت پر چڑھ کر چڑھ گئے تھے، پتے جہاں بھرنے دھعت کے شاخوں پر پانی پر
جگہ بنائی تھی۔

پھر ارادے ایک ہوا کیوں نہ ہو کسی کا پتہ نہ تھا۔

ہم ایک اے بی بی کی کہ نظر آئی۔

۱۰۔ اسکوہ: قریبیاں: میں نے تمہارے گھر ہار بہت آواز دی تھی۔

کہنے کا۔۔۔ میں تم سے انتظار میں ہوں دیر تک کھڑا تھا۔ آخر چو آئی کہ کیاں اگر کھڑے چر جائیں

سے مرثیہ لکھا ہے کہ :

آخر کار ڈھائی بجے دن کو یکایک سامنے سے افسانوں کا مستند شائیں ملتا ہوا دکائی دیا اور اس مستند کے گوجوں نے ہوا میں تمام جگہ کی آمیزش اور دھڑکیں خواہشیں اور سرسبزی جیسے ایک جگہ میں پیدار ہوا اٹھیں جیسے مغللوں کے اس عظیم مستند کے ناز و نعم نے زندگی بھر دیکھا اور بھی تیز کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تمام آتش کی قریموں میں ڈھل کر رہ گئی۔ جیسے یکایک کڑے شہرستان ہو گیا۔ جیسے کہیں بھی کوئی آدمی نہ ہو کہیں سے بھی کوئی آواز نہ آئے رہے رہی جو اور دیکھ کر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے ساتھ کسی کے ہوا کرتے ذکر و خیروں کا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہو۔ ہر حرف پھول ہی پھول ہوں۔ اتنے پھول تھے کہ ان میں دیکھ کر ڈھلنے سے جیسے یکایک ہوتا چلا آ رہے جیسے جی بھر کر پچھنے سے اُسے تھوڑا سا سکون مل جائے گا۔ پھر جی بچنے کے رات تھوڑی سی کھینچ لی جائے گی۔

بہنوں کو بہادر، اسی کے سامنے عزت دینا، ٹیکس سے پرہیز کرنا۔

پروٹوٹائپ

اسے نیا لکھ ہونے والے ہے ترتیب کتبہ کا پاس دیب ہی ایڑی ٹٹا اٹھا جاتا اور جیسے ہی واقعہ بھی پانے

سے

کھانے کا : دیکھو ساتھ ہی

ایک ایک کر کے کہوں نے بیٹوں کی چپاں کرادی کہیں بھڑکی کرپھٹتا تھا۔ وہ بھڑکی کریشک میں دیکھ چلا تھا۔

دیکھنے کا وقت اب آگیا ہے۔

بگھڑا دو دو فٹ پانچ کے ایک کنارے کھڑے تھے۔ ان کی بنیالی کردہ تھی۔ پھر بھی دودھ کھینچنے آئے تھے کہیں جانے

پرسنہ ہائے نعلی پست کو بھی دیکھا گیا، اس کا اسکول چھڑ کر جساؤتہ سو رہا ہو گیا تھا، وہ مجھے دیکھا اور دیکھ کر

نامور کٹر، غدار، کھڑا، نہ ٹھیکہ، اقطاع اور اس کے قریب ہی اس کا درہ بن کر تھا۔ پتک بھی آیا تھا، کس بھی آیا تھا۔

موجودہ سرکار وہ بھی آج یہاں آیا ہوا تھا مگر وہیں جا کر اس نے سنا تھا کہ جتنی دیدی کو ساتھ لے کر ان بھی آئی تھی، دونوں کا کوئی پس منظر نہ تھے، پھر وہ وہاں سے واپس لوٹ کر آیا اور پتا چلا کہ وہی وہی تھا۔

دیکھنے کا وہ دیکھ چھپے بھی آتا ہے۔

موجودہ کا بڑا فرسہ چھپے بھی آیا تھا اور لوٹ کے کش مگر آتا تھا اور دھرتی کو ٹکی جا کر پہلے دکھاتا، بڑی بیڑ تھی ایک دن بھی یہاں آئی نہ چکا تھا جو آیا نہ جو، صرف کا کا بڑا لاکھیاں اور کھلی دیدی نہیں آتی تھی جیسے وہ لوگ دوسری جہالت کے لوگ ہیں یہ وہ سب دوسروں سے طوطا جیلا۔

ایک ایک بجلی بارش ہونے لگی۔

اور اس کے ساتھ ہی سریش کے پیر کی ایک شاخ چڑھتی جوتی زمیں پر آ رہی اور اس کے ساتھ ہی انسانوں کا ایک ٹھنڈا فوڈی کا آجھانچہ آگیا اور اس کے ساتھ ہی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، چاروں طرف شور مچ گیا، بولو ہری ہری بول —
میں سے کہ شام تک وہ وہاں سوگوار سا گزرا، جیسے سارے کلت کے باشندے اپنے عزیز کی موت کا سوگ منا رہے ہیں، اب اس روز کی بات کہی کر یاد بھی نہیں، بھی بھول چکے ہیں، تمام باتیں کیا انسان یاد رکھ سکتا ہے؛ دیکھ کر تمام باتیں سن سکتا تھا، اس روز اس کا دل بہت غراب ہو گیا تھا، مگر لوٹنے کے بعد بھی اسے کچھ بھی اچھا نہ لگا تھا۔
کہنے لگے مگر دھتے ہونے کا تھا۔

پھر وہ اس سادہ سرکس پاس چلیں اپنے سے دریافت کریں۔

شمال سے لوٹ کر وہ لوگ کے ساتھ ساتھ سیدھا سنا کار ٹمک کے گھاٹ پر سادہ کے پاس گیا تھا، ایسا کیوں ہوا؟
اس نے اس کو گھر گئے۔ تو اس سے کیا ہوگا؟ اس کا جواب دیکھ کر بھی کوئی نہ لے سکا تھا، دونوں کا پھر وہاں چلا آیا اور کھلی دیدی کوئی بھی نہ لے سکا تھا، کبھی کے دل میں ذرا بھی تم کا احساس نہیں تھا، حالانکہ نظر کے سامنے آتا تھا، جو چکا تھا، سب کچھ خاک ہو کر ختم ہو گیا تھا، پتا کے دھوئیں سے آسمان سیاہ ہو گیا تھا، پھر اتنے آدمیوں کا سوگوارے ہوا تھا؟

دیکھنے پوچھا۔ سو جاش بوس کیوں نہیں آئے سے کریں؟

کہنے لگا۔ سو جاش بوس تو جیل میں ہے انہیں نہیں معلوم؟

دیکھنے پوچھا۔ پھر کیا ہو گا جانی؟

پھر اس سادہ سرکس جا کر دریافت کریں، کہنے لگا جواب دیا۔

پھر پتہ چلا کہ وہاں کے اندر کے آئینے سامنے سنا کار ٹمک گھاٹ جانے کا راستہ تھا، دونوں طرف غونپنے کی دکان تھی، پتہ لگا۔
اور نہ تھا، پتہ لگایا، اس راستہ تھا، پتہ دیر پہلے بارش ہو چکی تھی، کہ اسے کھینچا تھا، غراب کی سمت لے پڑا، سڑک کی سمت لے لگا، اور لوگ گاتے، سنا کار ٹمک گھاٹ تھا، کہ ایک گلی کے اندر سے بائیں طرف نہ لگایا۔

مشائے کثرت میا تھا، دیکھنے جواب دیا — کسی اور واسی مر گئے ہیں نا۔

”اور ہم بھی تو بھی آ رہے ہیں۔“

7-2-44.

”سزا کو دے گا تھی : کھنکھائی دینے پر جواب دیا :

دیگر کامل دیکھنے کا۔

”ستی آگنی ہے کیا؟ اُس نے پوچھا۔ ”کماں ہے دیکھو،“ آگنی نے کسی ٹپتی ہے؟“

کھو دی گئی سکرانے کی

”میں دے نہیں آئی، وہاں سے جہاز ہی سیدھی کھلا، بڑے ذرا خوفناک لگتا تھا ابھی ہے۔“

دیکھ رہی ہیں جو گیا۔

پھر بھی وہ مختصری دیر تک کھڑا رہا جیسے وہ بڑی امید میں ہے کہ یہ جو حالات کو یہ امید بیکار تھی کہ اس بات کی امید ہے
وہ اتنا استیاس کی کوئی تھی ابھی تو اس کا ٹھیک نہیں تھا۔

کھو دیدی: اپنے سچے اترنے والی اس کے حقے حقے دیکھ کر بھی اترنے نہ

یہ ایک اس نے پیچھے سے آواز دی۔

ایک نئی دینی

•

دیکھنے پر چھا۔ ۔۔۔۔۔ شاید دیکھنے میں تھکادی ہو رہا ہے؟

فصل دہم میں مذکور خطری جہتوں - ہوں

”اوماں، تو شب و روز رات تھی کے بارے میں سوچتے رہتے ہو“

وہیچر شرمایا۔ اسی نے اپنا سر تھکا کر کہا

— ۱۱۰ —

تذکرہ: تم ہر وقت سنا کہ اسے میں کیوں پڑا ہے۔ جتنے ۹۰

دیگر کو خود بھی مسلم و عیسٰی تھا کہ وہ بار بار اس کے بارے میں کہیں کو چھوڑتا تھا۔ کہیں چھوٹی دھوبی، بازار، مسکن، خواہ کہیں

نہ صرف جو لوگ وہ بھی دینی کی حرمت چھینا نہ پھر کسی کو سزا نہ تھی۔ سستی خود اس لیے بھی جو لوگ وہ کسی دینی کی حرمت آئینہ کے سامنے

فرد اور قصہ کے ساتھ بھی کھنڈیہ کی زبان پر سننے کی میز ہے۔ پاس میں رکھی جڑی بوٹی کی تصویر دیکھے، سٹینک اور چھلا لاک

میرا یہ کائنات نہ جو وہاں سے بگڑا ہو، نہ جو تیرے ہاتھ سے تیار ہو۔

اس سلازم کو بھرتے ہوئے پانی میں منہ کے دو دائرے پر کھڑے ہو کر بھی دیکھنے میں سہا جاتا، شاید سنی: آئے

گھسے جے سٹی پیاں نہ لکے اتنی ڈورے، آگیا آسان ہے اگلاں ہوا اور کلاں لای کے تیر جھوٹو، ابو بھر شیور متر۔
کی چھوٹی وکی سٹی کیا اتنی ڈور، لکھے آئے کی، اگر آئے ڈور، اس کے فیرے اس طرف سونہ پیچے، دو ہی ویکر لکھی دیدی کا کسے
تعب نہ لے اور اس کا نہ پچانے کے لیے سچ کہہ وقت سے بدشہی بیگانہ پڑے۔

اب وہ شمس نہ پاتا، وہی کشت تھوڑا، وہی سامنے جتا ہوا مکائی سے ہوا تھا۔
ایک ٹیسو کی حرف کشہ ہاکر کی حرف، بری تھی، ٹیکر نہیں، وہ ٹیکہ کڈو ہاکر کے کاسے سے ہوتی، جوتی ایک کی جی۔

نہی

ویکرم ایک سہ پڑے کی دکان میں ہاکر گڑی دیکھا، غب ہر گیا، آئی کی گئے، آب وہ پڑے کا، آب ہکل جانے
کا آب کلا کلا کا۔

بہش ۱۱۔ بھی تیز ہو گئی تھی، پانی کی ہڈی، ادھی تیزی سے پسنے لگی تھیں۔
ویکرم بدشہی وہاں سے جی پڑا، ان کا لی کے منہ سے ویشر گھڑی میں تک بہت تری فاسد تھا، اس کا تیسرے
پانی میں جیسے گئے اور دوستہ دوستہ جہد لکھی دیدی کے مدداز، کسے پچا تھا پانی میں سر سے پاؤں ایک جگہ چکا تھا۔
دو مارا دھک دھکا تھا۔

اُسے لکھی دیدی کا اس کا خدوا میں کرنا تھا، اس سے کہہ دیا ہر کار کو دھکا آدمی نہیں، شاید لکھی دیدی کا خدوا ہو گا،
خندہ لا کے ہے، لکھی اس میں اس کا کیا تصور ہے، وہ بعد آدمی نہ آئے تو وہ کر چکا سکتا ہے۔
نیف کے لیے، اور چھاننے کی حرف سے لاکھ کی ان کی آواز سنی دی، دھک لکھے کے نیچے جی بنا ایک تال میں ہوا
وحدہ تھا۔

ویکرم نیف پر چڑھ کر اوپر چو گیا، اوپر برآمدے میں کوئی نہیں تھا، وہاں طرف سونے ادھ پڑنے کے حرف
کر گئے۔

ویکرم نے اندر جھانک کر دیکھا،
لکھی دیدی۔

وہاں لکھی کا بھی پتہ نہ تھا، ڈور سے کسے میں لگا لی نہ تھا، ہوائی منزل پر ہرجت سا اچھا جھٹکا تھا، کوئی ایک آؤن ہو گا،
نہیں تھا، ویکر کھپڑے جیکر اس کے ہم سے چپ گئے تھے، اس نے ہر کسے میں جھانک کر دیکھا، لکھی دیدی کو گھنیر
کا باہر ہی کہاں چھ گئے، وہ تو ہمیشہ ہی برا منہ میں لیے، خبر پڑتے رہتے تھے، جس روز سی، اور اس کا آتشل جھٹکا تھا،
بھو وہاں ہی نہ بیٹھے، خبر پڑو رہے تھے، لکھی دیدی کے کسے میں سنی کا چنگ، اسی طرح پچا تھا، دو زور چنگ اسی
دو زور حرف در آمد سے سنے پچا گئے تھے، سات شتوں، ہر سٹک جھٹکے، حرف چھوٹی نیز پر تیں حد چائے کی ب
پیرا لیاں پڑی ہوئی تھیں۔

کھسی دیدی؟

دیکھنے پھر نکلا۔

اس کے بعد وہ ذینے پر چڑھ کر اوپر چھت پر چلا گیا۔ اوپر چھت پر صرف ایک کمرہ تھا، اس کمرے میں لاکا باہر بستے
نے اس کمرے سے پورا کالی گھٹا تصویر کی طرح نظر آتا تھا، پچھلے چھوٹے گھر، بستی، گھاس پھوس کی چھت، کالی کامنڈر،
پورے مکان، چنڈی باہر کے باغ، مکانوں کی چھتیں، اور بھی بہت کچھ دکائی دیتا تھا، اور اس طرف میونسپلٹی کی وہ عمارت جس میں
خزوں کا مکان تھا اور اس سے پرانی طرف آگے گھاری آداب اور اس سے بھی پرے وہاں کے کھیت ڈور تک پہلے جہنے تھے
وہ وہاں کے یہ کھیت جنوب کی سمت پھیل کر دیوے وادی سے جاتے تھے۔

اوپر جاتے ہی دیکھنے لاکا باہر کے کمرے میں جھانک کر دیکھا، کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اور وہاں میں اس کمرے میں
بٹا، جاتا تھا، کھسی دیدی اس کمرے میں بھی نہیں تھی۔ دروازہ کا پش پش کر اس نے ایجا پھر جھانک کر اندر دیکھا، چنگ پر انجا انا
جیسے کچھ دیر پہلے اس کمرے میں کوئی تھا، ٹینٹ میں بہت ساری کتابیں بھی جوئی تھیں اور بہت سا سے کاغذات کا بندوق
اور ایک ٹرک تھا اور ٹرک میں ایک چمٹا سا ناؤ بھرا رہا تھا، شیخ کی اوصاف فرشر پر چنگ کی چادر پر اور دیوار کے کنارے
سبز تھی۔

کھسی دیدی کہاں چلی گئی؟

نیچے ہار کا کی ماں سے دریافت کرنا ہو گا، اتنے سویرے لاکا باہر بھی کہاں چلے گئے اور کھسی دیدی بھی کہاں چلی گئی۔
چایاک اس نے دیکھا، چھت کے شمال مشرقی کونے پر کھسی دیدی کھڑی تھی، دیکھنے کی طرف اس کی بہت تھی، لاکا باہر وہ بھی
بہت ڈور کچھ دیکھ رہے تھے، انھوں نے بھی دیکھ کر نہیں دیکھا۔

آہستہ آہستہ دیکھنا کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

اس وقت کھسی دیدی، انھوں سے ڈور میں گھنے جہنے کچھ دیکھ رہی تھی۔

دیکھنے آواز دی۔

کھسی دیدی؟

کھسی دیدی چونک اٹھی، اس نے ہٹ کر دیکھ کر حیرت سے دیکھا۔

تم، تم کب آئے؟

میں بہت دیر سے آیا ہوا ہوں، دیکھنے جواب دیا۔ میں تم سے ابھی ڈور میں تھا۔

خدا دے دیا تھا؟

نہیں، وہ نہیں آئے تھے؟

نہیں آئے تھے، کیا سبب؟ پھر تم نے خط اس کو دیا؟

دیکھ کر وہ سہال کے۔ وہیں رگشت ہی تو نہیں کہیں چکست دیا۔
 اگلے دن دیکھ کر اس کے بچے وہ آدمی اور اس کے بچے وہ لڑکی پنے لگی
 دیکھ کر حیب سا حاس ہنسنے لگا۔ ایا کیوں جو۔ ایا کیسے ہو گیا۔ تب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ اسے کچھ کہنے اور کچھ
 دے کا سوچ ہی نہ لگا۔

۷۸ برس کے عاں کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

بھلا کون ہے؟

دیکھ کر کنڈے سے بڑا تکر جواب دیا۔

اے۔

لڑکی نے پوچھا۔ کتنے پیسے ملے؟

دیکھ کر شان سا ہو گیا۔ اس نے ایک بار لڑکی کے چہرے کو دیکھا، اسی کے بارے میں کھی دیر ہی سے وہ سنا
 تھا۔ ایا کیا بھی سنی ہے؟ ایا کی چہرہ تو کھی دیر ہی نے بنایا تھا، ایسے ہی سندر رشت! ایسے ہی گھوگرے

اس آدمی نے کہا۔ اس کو ایک آنہ دے دو۔

دیکھ کر کہا۔ نہیں پیسے دینے کی ضرورت نہیں؟

اس آدمی نے کہا۔ کیوں؟ تم ڈاکو سا تو ساں ہے، وہ بھی اصل لٹا ہے، اس کے پیسے ایک
 سا کم ہے، گردن تک مٹی کھودنے سے کہیں پار پیسے ات آتے ہیں؟ بڑے ذاب ہو گئے ہیں سب یہ سلاں
 زور ڈال کر دے سکتا تھا۔

لڑکی نے کہا۔ میں ایک آنہ سے زیادہ نہیں دوں گی۔

اور ات بڑا کر اسے پیسے دینے پا ہے۔

نہیں، دیکھ کر انکار کیا۔

اس آدمی نے کہا۔ اسی وجہ سے بھلا ہوں کہ کچھ نہیں جوتا، بھلا سا ساں ہے اس کے پیسے

انے دینے ہوں گے، نہیں جتا تو تے میرا کیا ہے۔

لڑکی نے پھر پوچھا۔ اگے قے؟

نہیں، دیکھ کر جواب دیا۔

اس آدمی نے کہا۔ تم اور اس کی خوشامدست کر دتی ہو، ہنسنے دو، میں بھی دیکھتا ہوں وہ چار پیسے

سے آتا ہے۔

دیکر ابد آہت آگے بڑھ گیا۔ تشریح دیر دہاؤں میں پکڑا دیا تو اس کی جگہ پر پوتی، اس نے دیکھا کہ
 تیس کی آہستہ سے اپنی انگلیوں سے اس کی
 ایک سر کے جسم کے کئی چیز نکالی، سو کہ کیا تو اس کے ہاں پیسے تھے، ہاں میں پیسے اس کے جسم کے
 کہ جس میں کہتے ہیں، اور اور کچھ لکھتے اور دیکھ کر کہ یہ اس میں پیسے یا ایک اس کے اندر چھ آٹھ سو
 کا سو سو دوسرے لوگوں کی کاروں ہے، کچھ دیکھنے لگے، اسے چاہیٹ دیا تھا، تو کیا سوچ میں کھینچ کر لایا ہے، اور
 دیکھتے ہیں، تو کیا دنیا میں کچھ لکھتے ہیں، کاروں میں —

جوتے کا خطبہ

قاضي عبد الستار

ہم کے معبود کا مرکز یا بیوہ تھیں۔ پتھروں اور چروں سے چمک رہا تھا۔ ادیب و دانشور پر و غیر طبابت صاحب
 فرما: صلاہ سب اس مدد دہنے کو گھور بیٹے تھے جس کے دونوں طرف دو انٹرنیڈ مہمان خصوصی کے انتظار میں کھڑے
 رہتے تھے۔ انفرمونی سیارہ موڑا لگایا۔ جس پر سوار ہو کر کوئی بھی سماجی جبری کو غریب سمجھتا ہے۔ نیز ان دن کا جو ہم چلوں کے
 احاطہ میں رہتا تھا۔ اس پر پھیلا ہوا آجوا مہمان خصوصی کے حوالہ کا انتظار کرنے لگا۔ پھر ہاس کا تعجب دیکھنے ہی
 رہا۔ ان کھڑا ہو گیا۔ خاص صلاہ کے گڑھا صلاہ پر جلوہ افروز ہوتے ہی ادبی کانفرنس نے سیکرٹری (ایڈیوٹر شپ) کے مشور
 دہرے تھے۔ انگریزوں پر آئے اور قلعہ کے بارے میں مشورہ صلاہ کی شان میں مشورہ قیودہ چڑھ دیا۔ مشورہ صلاہ جو۔ رونا
 اپنی کے ایک تھے اور سارے ٹھکیں۔ شوکلک کے نام سے مشورہ تھے۔ ہنس و قہار سے زور بٹھکواتے رہے۔ آخر
 ہزارہ نے ٹوڈش کی کوسہ فرم اپنے اختیاریہ ٹیچے سے ادبی کانفرنس کا آغاز فرمایا۔ سب فرم مغل شہنشاہ کی طرف
 سے ایک ایک ستم ایک سلطنت پر پڑا ہوا۔ ایک کے سامنے کھڑے ہوتے کھنڈارے ٹیلے میں اٹھنے لگے
 ادبی حلقہ بھرے ہوئے ہال۔ کوتھکتے سے دیکھا جیب سے ایک کاغذ نکالا اور نثر اتر بونے لگے۔ یہی

میں نے

میں پیش میں قابض ہوا۔ ریڈیو نے اس کے ذریعے مصلحانہ کارنامے کیے۔ اس کی فائز کی سہارا دے دیے۔ میرا
 ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے میں اور خوش ذاتی کا ثبوت دیا ہے اس کے لیے مبارکباد پیش کرتا
 ہوں۔ اب وہ جو تھے کہ وہ باہر کوئی تھی نہیں معلوم ہوتا میں کہوں۔ میں اور شرف نگاہی سے دیکھا جائے تو
 اس سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ نہیں جانتا۔ میں نے آپ کی دعوت اس لیے قبول کر لی کہ مجھے آپ کی دلجوئی اور
 ان کے ہر جہت سے وہ آپ کی خدمت مقبوض ہے۔

نوابی حضرت:

جس میں حب قوموں کے دماغ و ذہن کی داستانِ عجائبات کا عجیب و غریب طرزِ تعبیر کی تاریخ اور تہذیب کو آئینہ دکھاتا ہے۔

سے مل دیا جائے تو گھر اساری دیا کے اور خصوصاً ہمارے ملک کے اقتصاد کی ساری مل جو بائیں۔ ایک طرف میں
 دوسری جگہ جو کر رہے تھے گا دوسری طرف عدالت کی مساوات قائم عمل میں آجائے گی۔ یہ نازک بات ہے۔ اسے
 نہ سے ناپسند ہے چور بازاری اور غیرہ اندوزی سے دس روک روک کر لایا۔ اس کا سرخرو یہاں زمین میں دفن کر دیا۔ بین
 دوسری جو قوم میں گروشی کے ساری قوم کی قوت نہ یہی اضافہ کرتا وہ بازار کے نقطہ نظر سے گر گیا۔ اب فرض کیجئے آپنے
 اپنے کے بجائے دس روک جوتے کا بیٹہ جسے تو ان کا کل رکھتے۔ رکھ بھی بیٹے اس وقت سے کس حزن چھاتے
 نہیں بھی بیٹے تو کر کے کیا؟ دوسرا اضافہ میں آپ اتنے ہی جوتے کاٹنے پر مجبور ہو جاتے تھے جس کی آپ کو ضرورت
 اپنے ساری دوست سچے سادے جوتے بازار میں پھنے پر مجبور ہیں اور معاشی ترقی یقینی ہے۔

انہوں نے اپنے جیسی خفیہ کی قوتیں کے لیے پتے کی حرکات کا بڑی شدت سے بیان کیا ہے۔ میں بھی اپنے دوسری
 ان کی ٹیکس بر عمل کروں گا۔ جوتے کی قیمت انسان کے غیر میں شامل ہے۔ اس کی غنیمت پر آدمی ظفریت سے کموت
 میں یہ شور مچا یا قیمت شور ہی پر جوتے سے پتہ چلتا ہے۔ مثلاً آپ اپنا جوتا کٹا دیں۔ پتہ فوراً اس کی طرف
 لے لے لے یہاں تو ہی ایک میسٹر دونوں ثابت سے۔ اور ان کے بڑے۔ عید کی یاد رات کا تصور کیجئے۔ کیسے ہی
 سے کس۔ ہمیں نہیں پتے یہ وہ کیفیت سماجی جوئی جو یہ معمول تو آپ یہ کٹ کا۔ پتہ اسے بیٹے سے دکھائے ہے
 بات بھی اپنے آپ سے جدا تر پسند نہ کرتے کو یہ جوتے کی ذاتی قیمت ثابت ہے۔

اس کے بعد اس کے جوتوں کے سنے میں نامور شاپیں ہیں مجھے تعجب نہ کہ اس سے الگ کو کسی جویدو جوتے
 بہت خوب کر دیا ہو گا۔ اور اس نے اپنے پاؤں کے ٹوڑا اپنے ٹکڑے بن کر دنا دنا کر ساری دکان کے پیروں پر چڑھ کر
 بھی جاتا کسی پٹھنے کے پتہ سے کاٹا۔ ایسا تو غیر مستحکم ہے کہ وہ سچ کی باتیں نہ جانے کا نہیں پیروں
 سے پتہ پتہ نہ آئے گا۔

اتنے اور انسانیت میں بڑا اثر تسلی سے ملانے انسانیت کی تعریف میں بڑی بڑی باتیں بنائی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے
 کہ انسان اور میرا میں حد فاصل قائم کرتا ہے۔ جو انسان جو نہیں پتے جو آدمی انسان سے دور۔ جو ان سے فاصلہ
 ہے۔ اس کے لیے پرکھتے سے روشنی ڈالنے کے لیے نکال دیتا ہوں۔ آپ تمہاری سوٹ بٹے ہوں لیکن اگر
 تیار۔ لکے ہیں یا ان میں ہر دو جوتے دھنسنے ہوئے ہیں تو آپ کی قیمت ستر ہو جائے گی اس کا آپ بھی سمجھ ہی
 ہے۔ پتہ پتے ہوں لیکن میں جو آپ کی ذات کو ذرا دور سے دیکھتا ہوں کہ یہ اصل سامنے کی اور۔ کوئی

سامنے کی پیدائی ہوئی دنیاؤں میں ادب و دانیت ہے جہاں جو تمام جوتے کی تعداد نہایت انجام دیتا ہے۔ نتیجہ اس
 ہے کہ حزن کو دور دشاوری کی تہہ دکھا ہے۔ اور دشام کی دس تہہ دشاوری کی فاصلہ نہایت جوتے کا ایک جوتہ ہے
 اس کے حلقے کا شیبہ دشاوری کی آپ حزن دشاوری کی خیال کا پیرمونا زبان کی دشاوری میں بھی ایک نکتہ کا پیرمونا

میں نہیں کہ سکا کہ ادب کا اغرت سے کیا تعلق ہے بلکہ جوتے کا ہے۔ ہماری کمپنی کی مشرقی برادر کے مسلمان
 بہتے میسے جوتے وضع کر کے ہیں جنہیں میں کہ خود سے پٹی مراد سے جو بال سے زیادہ بار یک اور سٹوار کی دھار
 سے زیادہ تیز جٹے بیزو کوئی گزریں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ ادب اس خاص ضمن میں بھی جوتے کی ترقی سے فیض
 اٹھنے کی کوشش کریں۔

ابھی کہنے کو تہہ سکا باتیں باقی ہیں بلکہ میں نہیں کہ سکا کہ اس ادبی اجتماع میں مزید جوتے کا ذکر چلے۔ اس
 ہے آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے پڑے سون اور خلوص کے ساتھ میرا
 غمناک؟

ان دیر تک تمہیں آفریہ تاملوں کی ملاکلاہٹ سے گزرتا رہا۔

اشفاق احمد

یاد رہے کہ اس کتاب میں کچھ نکتے درج ہیں۔

کریسمس نہ تو تو اپنے تمام بھائیوں کے ساتھ مل کر منایا گیا۔ اس کے بعد اس کی سیکرٹری نے اس کی سیکرٹری کے ساتھ مل کر منایا۔

اس کے بعد اس کی سیکرٹری نے اس کی سیکرٹری کے ساتھ مل کر منایا۔ اس کے بعد اس کی سیکرٹری نے اس کی سیکرٹری کے ساتھ مل کر منایا۔

اس کے بعد اس کی سیکرٹری نے اس کی سیکرٹری کے ساتھ مل کر منایا۔ اس کے بعد اس کی سیکرٹری نے اس کی سیکرٹری کے ساتھ مل کر منایا۔

اس کے بعد اس کی سیکرٹری نے اس کی سیکرٹری کے ساتھ مل کر منایا۔ اس کے بعد اس کی سیکرٹری نے اس کی سیکرٹری کے ساتھ مل کر منایا۔

اس کے بعد اس کی سیکرٹری نے اس کی سیکرٹری کے ساتھ مل کر منایا۔ اس کے بعد اس کی سیکرٹری نے اس کی سیکرٹری کے ساتھ مل کر منایا۔

اس کے بعد اس کی سیکرٹری نے اس کی سیکرٹری کے ساتھ مل کر منایا۔ اس کے بعد اس کی سیکرٹری نے اس کی سیکرٹری کے ساتھ مل کر منایا۔

کے ہر اکسے چوٹی سے پکڑ لیا اور تین بجے دسے کر ایک دینے اس زور کا اس نے کندھے پر دار اکٹس کی آنکھوں کا کلا پنہریوں کی طرح
بیزیل کر مفید فائدہ سے اور خوشبودار گلاب پر سونگیا۔

جب سے وہ کریم پر مستحضر زیر دغہ وہ "جو گیا۔ وارنٹ ہارٹی چھوڑا بیوہ ماں بچھاڑ کر گریزی۔ اسوں مسلم ناؤں
سے بھاگایا۔ بکر کا دوست ڈاکٹر حوزینے ضمانت بری۔ مکے کوٹ دسے شعلہ خان نے صراحت سے استغاثے کی نقل ماسل کی
ڈاکٹر کے اتھوں کے طے اڑنے سے رقم تھا۔

جناب عالی۔ مستیٹھ حب ذیلی ارض پر دانہ ہے

مکان پر دو فریق ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں بکر ایک دیر اور مشترک رکھے ہیں
ابو موسم گر افریقی اپنے اپنے کونوں پر رات کو سوتے ہیں۔ مستیٹھ با عزت
بیوہ ہے۔ ازم شیخ کو کر اپنے کٹے پر مستیٹھ کی جانب نہ کہے کہے بروز
نیت تو بھی شرمسار مستیٹھ پر بنے ہو کر پیاب کرتا ہے جس سے شرمسار کی
توہین ہوتی ہے۔ چنانچہ کل شیخ کو ازم مذکورہ اسی طرح پیاب کر رہا تھا۔ مستیٹھ
کے منہ کرنے پر فریٹش گالیاں۔ نیت توہین بالقصد اپنی شروع کر دیں۔ بسا
اتہ عابے کو ازم کو سرنے کا فانی دی جانے۔

خدیجہ شاموں پر دہر پال مزید سا کہ کٹری گلیاں

پیر نازی روڈ۔ اچھڑا۔ عابور

جب کریم بازر عدالت چلا تو اس کا سارا عودیت کی حوں کا پ۔ با تھا اور اس کے ملق میں ٹھڈی قلعہ لا اٹھا

جوا تھا۔

لیکن اس سلسلے واقے کا کریم کی کٹائی سے کوئی تعلق نہیں۔ محمد سیم کی اس کٹائی نہیں۔ یہ تو اس واقعے کا ذکر ہے جب

اس نے پہلی بار عدالت کا سفر کیا۔

کریم صحت مند اور شریف آدمی تھا اور متوسطہ طبقے کی امیر جو کا پوتہ ہوتے ہوئے بھی اس کے صرف ایک صحت

سے تعلقات تھے۔ عدالت سے دو دن ذوق نداشت تھے۔ محمد سیم کو تھوڑی سی سودا کی میسر آ جاتی اور دوسرے دن کو تھوڑی

سی مال فراغت۔ اس بات کا حوالہ دے کر وہ کہتا تھا کہ میں نے اس معاملے پر خصوصی قوم زدہ تھی

ایک بات کہنی دینا چاہیے کہ کریم کی آنکھیں کٹیں۔ اس کے بائیں بازو میں کچھ عجیب طرح کا زور اور

تھا۔ اس نے مات کی خاموشی میں پوری قوم باز دیکھت دے کر قیاب لے کے یہ رنگ نہیں دیکھ سکتا تھا اور یہ یہ اس کی

برکتی۔ پھر اچانک اسے لپک کر ہوا۔ اسے کٹتی تھوڑا سا اور اسے باقی سب کو فانا ہوا اس کے ماتے مل گیا ہے محمد سیم نے

خود ہوا کر انداز اس کے سہت سے چینی۔ وہ لڑائی پڑھتا تھا اور پھر محمد سیم سے چٹ گئی۔

سیم نے کہا: "میں سب سے زیادہ اسی درد مند ہوں۔"

لاکی نے بازو کی فٹیلہ بھرتے بھرتے کہا: "میں سب سے زیادہ اسی درد مند ہوں۔"

"نہیں، نہ تو سیم نے کہا کہ تم، نہ تو لاکی نے کہا کہ میں۔ یہ تو لاکی اور سیم کے درمیان کی بات ہے۔"

پھر:

"نہیں، لاکی نے کہا کہ میں سب سے زیادہ اسی درد مند ہوں۔"

جب وہ سولیا تو سیم نے قہر سے کہہ کر میرا حق بیکار ہو گیا تو میں بیکار ہوں گا۔"

لاکی پھر بھی اسی کے لیے: "دیکھا تو یہ دماغ سے گری نہیں نکلتا، اسی لیے مجھے بسے بسے خیالات تھے۔" پھر اسی نے کہا کہ سیم نے بازو میں اپنے ہاتھ سے لٹکا دیا وہ سیم اس کا سر چھیننے لگا۔

قہر سے کہہ کر سیم نے دماغ کی گری نکالتی اور سات لاکھ اور ایک سو تین تو لاکی نے پوچھا: "بناؤ اب مجھ

درد مند ہوں۔"

اُن دنوں میں: سیم نے سر ہٹا لیا۔

پھر:

پھر کیا: سیم نے کہا: "اس میں تمہارا کمال ہے، درد کو ختم ہوا تھا ہو گیا۔"

"نہیں، پھر لاکی نے کہا: "لاکی چلی اور میرے رُخ کرنا شروع ہو گئی۔"

مجھے جب وہ تین دن پائے پینے کے تو لاکی نے کہا: "اثر نہ پڑے، سات لاکھ کے بازو میں لٹکاؤ، دماغ:"

اثر نہ پڑے تو اس کا تے بونے لگی ہیں سر ہٹا لیا۔

وہ تو میں نے کوئی لٹکا ہر اس کی دھڑکی کی درد: یہ تو کچھ اور بھی وہ میری ڈوب رہے تھے۔"

اثر نہ پڑا اور بہت بھر پور نظروں سے سیم کو دیکھ کر وہ: بازو میں لٹکاؤ، دماغ: یہ تو کچھ اور بھی وہ میری ڈوب رہے تھے۔"

وہ بھی کیا بات تھی۔"

سیم نے کہا: "کچھ نہیں میں یہ بھی خوف مان، یہ ہو گیا تھا۔"

"اب: اب: لاکی نے پوچھا: اب تو کوئی خوف نہیں کھاتم؟"

"اب تو کچھ اور بھی نہیں کر میرے بازو میں درد: کچھ تھا تو نہیں۔"

وہ پائے پینے رہے کچھ میں کچھ بھرتے رہے اور ایک ایک کر کے کڑے بستے تھے۔ لاکی نے اثر نہ پڑے پھر:

سیم نے اپنے پیروں پر ہڈی پھینک دی، لاکی نے اپنے پاؤں کے انگوٹھ سے منہ۔

پھر اثر نہ پڑا، اب سیم اپنے گھر روانہ ہو گیا، لاکی دھڑکے سے قہر سے کہہ کر بھاگ گیا: پائے اور گوشت

وہی ہے جس نے کہا:

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب... ٹھیک ہے آپ

کے خیال پر

”نہایت... نہایت... ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

”یہ ڈاکٹر عزیز نے کہا کہ یہ کبھی نہ ہو سکتا ہے“

دن کے مشورے سنائے۔ میں نے مشورے کی پیروی کر دیا جس نے اپنے بیک سے کپڑے کاٹنے پر مجھے مقرر کیا اور اسے
برکات دیں۔ اس نے چل کر اس کے لیے کپڑے کاٹنے کے لیے مجھے مقرر کیا۔ اس نے مجھے مقرر کیا۔

اس کے بعد مشورے اور اس کی پیروی کا وہ دن میں وہ دن شروع ہو گیا۔

سیم کو باوجود کہ وہ بھی کچھ کچھ لڑائی لڑا کرتا تھا۔ اس کا تعلق میں کچھ نہ جانتا تھا۔ اسے نیند آتی تھی۔
میں نے یہاں سے نکلتا تھا۔ ذرا کچھ لڑائی لڑتی تھی۔ سراسر جی ٹیوں سے جی ٹیوں کا ہونا دیکھتا تھا۔ اس پر بھی اسے زلزلہ کا مزدور تھا
نہ کہ یہاں پہلے آدمی کی جگہ نہیں ہاں ہوتی تھی۔ یہ نہیں ہاں ہوتی تھی۔ یہ نہیں ہاں ہوتی تھی۔

ڈاکٹر دن سے آپریشن ٹیبل پر ٹاکر اس کے اسوں سے کیا۔ ڈاکٹر کا کام زلزلہ کا تھا۔ ڈاکٹر کی حرکت اسی کوشش پر
زیر ہوتی ہے کہ زلزلہ گہرے زلزلہ کی قوت میں۔ ہم وہاں کہ زلزلہ کے کوشش کرتے ہیں اس کے اس کا رہنا۔

اس کی مرضی کے بغیر تو یہ بھی نہیں جاتا۔ اسوں نے کہا اور ڈاکٹر نے آپریشن ٹیبل کے وہاں سے بند کر دیے۔

کئی دن کے قریب امیر کی بیٹی کی مرضی کے بغیر اس کے اسوں اور اس کی اس کے ساتھ دیا گیا اور دونوں
میں اس سے پہلے گھر پر ڈاکٹر کی مرضی سے۔

ڈاکٹر گھوڑے کا دگر آپریشن میں تھا۔ اسے اسے دے دی تو آپ کی مرضی میری ہو گئی۔

اور اگر آپ چاہیں، ڈاکٹر فینے کا۔ تو آپ اسے لے جا کر دفن بھی کر سکتے ہیں۔ یہ آپ کی حکمت ہے۔

میرے گھر کے مال نے روتے ہوئے اس کے اسے کد تم لے لو۔ تم کو۔ میں کیا کہتا ہے اس کا اسے۔ ہمارا

ڈاکٹر بستر پر تھا۔

ڈاکٹر کے بعد سیم کے پرستار نے اسے لے لیا۔ وہ وہاں پر گیا اور پندرہ دن بعد جب اس نے جام کو ہمارا
زیر کرائی تو اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

پارے پتیں دن بعد جب وہ ہسپتال سے نکلا تو ڈاکٹر نے اسے گھر کر لیا۔ سیم صاحب ڈاکٹر قاتل ہوتا ہے۔ یہ سیم
براہ شرم سے جھک گیا۔ ڈاکٹر نے ایک دوسرے کو کھدکھادی اور تھوڑی دیر کے لیے خالی کمر کو دل میں مسکرا کر

دیا۔

اسی وقت مشورے کی پیروی کے سیم سے کہا: قوم! ہمارے بچے تو پہلے سے بچ زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔

سیم نے کہا: دیکھا پھر میں سمجھتا ہوں۔ ہاں! ہاں! اور اس کے کلاہ کے نڈ پر اتار پھرنے لگی۔

میں نے سیم کے اس کا پی۔ ہاں! اس کا ایک شہر مزدور اصل کالی سے بندھا ہے۔

چند روز بعد جب سیم نے سدا کٹری پر کراہنے پر لگا دی تو اس کی اس نے اپنے اگوتے پیٹے کے خلاف ایک اشتار

سے ہوا کہ سیم وہ صاحب کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور اسے ستر فی صد حکیم کا ہانپا د پر کسی قسم کا حق نہیں اس لیے ہ

ان کو سیم وہ صاحب حکیم سے بھی دیکھ سکا وہ فیض نصیب کا خود زور دار ہو گا۔

اے روشنیوں کے شہر

۱۔ اسی

لکڑی پھٹ پر لکڑی ہو گئے تھے، اور وہ تھک، دوست اجلبا فوجی اور سر میں ادا ت بن گئی تھی، صرف دکان کے سامنے
 رہا، یوں لگتا تھا شہر میں بڑے بڑے نقش و نگار، حد قاتل لگتے تھے، ہر طرف روشنی کے شادیاں لگی رہے تھے، اٹھالی ہزار سے تھے،
 سے روکنے شادیاں پانی تھیں۔

سب محول اٹھکے، حد قاتل وقت سے چند منٹ پہلے آگئی..... وہ حیارہ سے فضا میں دیکھے
 جاتے جاتے تھے، اٹھ اس پر نظر پڑتے ہی کلمہ نہ کہہ سکتے۔

جب بیٹ بیٹا ایک سب پر نہ لگے، طے پڑتا ہوا، ایک کی ساج سے متوازی ہو گیا تو دل سے بے اختیار نکلا
 سارباں آہستہ ران کا رام جان در محفل است

نہاں کے ہر جب حیدر کے کراچی میں ناانی تھی کے مکان پر سے پرواز کرتے تو وہ ہمیشہ کہ اٹھتے تھے۔
 تھک کر خیر سب سارا دن کی خیر۔

میں کھوں میں تم ہا رہے جو ان کی خیر۔

میں دھڑکی میں سادگی اور نیکی جھلکتی تھی، آج ایک حیارہ مشرقی پاکستان کے غار حیدر یا دن پر سے اڑا آتا ہوا، اس کے سنوے
 سر پہ پاتا ہوا، ان کے پوتے کا جہد ننگی و رات کا اٹھنا کی مانت، درمیان میں پھر دناک کرنے کے لیے، بیوی کا ناٹا سا ک، بہنوں
 اور وہ بے فوہ آتا، بہنوں کا خوش باب، اوہ ایک بھر شلیق باب تھا، ایک یا تھی، اور ایک ان کا وہ، ایک جس تھک دوست، بہنوں
 نے تیرے جانے والے دن کی چھٹی پھر تھی فوہوں میں برابر کا شریک، انھیں پہلے پہلے جانے والے..... یہ اس کی
 سنت تھی کہ ساتھ تھی جب اس کے بڑے میں سوجاتی قورات گئے، اسنے سے پہلے وہ خود انھیں اپنے اپنے بستر میں لاتے،
 سب اس پر چہ جتے کے بعد کر کے قوم نے صیغہ سے پڑھا تھا، سب اپنے آپ کو بہت دے دے کرتی ہو گی، تو سب
 وہ خانہ کچھ لکھ لکھتی تھی، آج وہ سب کچھ ہے، پاکستان ہے تو اس سے کئی جواب بھی نہیں پڑتا، اپنے تھکے پا پا کی نہیں
 کے وہ اب کد سے جہد میں ہیں، تم انھیں کد دیکھو، ان کے وہ دودھ ویسے چھلنے بہت ادا، ان کی دسترس سے دور.....

میں نے کچھ نئے کا سفر ایک کام سے زیادہ دیا تھا، اس میں تکلیف تھی، نگہ کش چند لوگوں میں وہ زندگی کی جہد وہ ہر سے آزاد ہو چکا
 تھا، ان کا تھک نام ہے میں کا جہد، ان کے دھندے کا ان تم ہو گئے تھے، بچوں کی تھیم، بچوں کی تھیم تھی، ان کے کیریکچر کی چٹک
 ان کی، بچوں کی تھیم، ان کی دھندے کا ان تم ہو گئے تھے، ان کی دھندے کا ان تم ہو چکا تھا، ان کا تھک نام ہے میں کا جہد،

اب کئی سفر کی تیار ہوئی تھی۔ کئی بہ امید ہو کر جو کہ ہم ملتا تھا کوئی دروازہ اور اس کے بند ہو جاتا، دونوں کنبے
بہت بے تحاشہ ہو کر دیکھ کر اس کے ٹکڑا کرنا جاتیں لیکن اس کا دور کم نہ ہوتا تھا، جب اسے آشکارے پہلے تو ایک مشربا
پر کیا، ایک اندیشہ لگ کر اٹھنے لگا۔

یاد رکھنا غضب کر رہے ہو؟ اسے کلاں لے مار رہے ہو؟ (اس فراو میں انسان کی بے بسی کی داستان ختم تھی۔ روز
رے یہ فراو گنبد گردوں تک پہنچ جاتا ہے اور صلیب پر گشت کی طرح غالی (تھوٹ آتی ہے) اسے وہاں لے مار رہے ہیں جہاں
کئی وہاں نہیں آتا، جس کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں، انہوں کو اسیل رکے میں نہیں آتا۔
نیں بھڑکاؤں کی رخصت کا وقت

وہ دروازہ کے منہ پر گیا

اس شخص اندھیری رات میں آخری ساتھ دینے والے عزیز غم سے جھڑکوشی سے راستے کر رہے تھے، کوئی اپنے
ساتھ کی دنیا میں گم تھا تو کوئی کسی حوالے غیب، دوازدہ ماہ رو، کوسلہ دے دیے تھے۔ قہروں کی تہم چاہ اس ناشی
بہل ہو رہی ہو۔

اس کے ذہن میں بیانیوں نے پڑے احمد کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ اب اپنی دل پہ پتھر رکے کے آخری رسم کی ادائیگی
نارنگی بڑی تھی اور اپنے صلیب کے آمد کا انتظار کر رہی تھی، مصافحات کی روشیاں نشانہ بنیں، قبرستان میں صرف تو تھی، قدوں
وہ اور شہر کی تہوں کی وہ قدیم گھنے اشیاء تھے اور پتھروں سے وہ سہارے پڑے، جب اسے لہ میں آتا پکے اور اینٹوں کی
ساتھ شروع ہوئی تو عزیزوں نے اس پیکر انعام سے یہ آخری نظر ڈالی، اب چند منٹوں میں دروازہ بند ہو جاتا تھا، چند منٹوں میں
نویں دروازہ کھل جاتا تھا۔ وہ اذلی تھائی جو مذہب انسان کا ساتھ دیتی ہے اب بھری حوالوں کی حقیقت میں جوہر
کی کیفیت غیب و شہود کہنے کی ساعت آتی ہے تھی۔

اے اجل! اے ساعت عشرت استہی

دزدگی کی اے دفنائے اسدہی

اپنا بیگانہ ہو گا جب کہ پاس

دک میں کو کھتے ہیں جوہر کی رات

میں کنول جی کے بکوں کی رات میں

اپنے ایک سے عروں کی رات میں

فردوس میں دیر نہیں چلایا، وہ کھتا ہوا شوق پیرا لگی ہو گیا، وہ شکیا و مشرقی پنجاب میں طبع ہوا تھا، وہ صلیب
کے وقت سفری پنجاب میں آئی، وہ جب ہوا، اگر زمر شریک انسان کی دعوت شینے سے فانی ہو کر، نادیدنی خورشید کا سفر جو میں گھٹے
بہل ہو گیا تھا، مشرقی سے پہلے تک کا سفر نہایت سے رات تک کا سفر۔

مذہب قریشی کا یہ تھا کہ اگر کسی شخص کا مذہب یہ ہو جائے کہ یار دنیا نہ سمجھتا تو اسے گھبراہٹ میں لے کر اپنے گھر میں لے جاتا تھا۔
 پہلے پہل سے قریشیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جس شخص کا مذہب قریشی ہو جس کی نسبت میں اس کا حال کوئی نہ سمجھتا تھا۔
 میری ہی بات۔

پندرہ اور بارہویہ میں تشدد اور اس میں ہائی کا سامنا ہوا اور وہ ہمیشہ اچھے رشتہ دار تھے۔ میری ہی بات۔
 خیال اس کا کہ زیادہ سے زیادہ آدمی جو پہچانے کہ کسی روز ہمارے گھر آئے گا یا کچھ اور اس کے بچے ہوں گے یا اس کے بچے ہوں گے۔
 سترہ کر دیا ہے۔

۱۱۵۰ کے موسم میں اس میں پندرہویں اور اس کے ان قیام کا بلجانب اس کے اس میں دل جنت نظر سے
 پر یہ تھا اور اس میں پہلے پہل سے یہ تھا اور اس میں قریشی تھے۔
 اس کا کر دیا تھا ہے۔

اپنی کہہ دو "نہ" سے ہندو ہوا تھا ہے۔
 دت کے والی کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔
 چھ سال بعد اس کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔

تھے یہ کہ اس کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔
 اس کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔
 اس کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔

اس کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔
 اس کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔
 اس کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔

اس کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔
 اس کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔
 اس کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔

اس کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔
 اس کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔
 اس کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔

اس کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔
 اس کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔
 اس کے یہ کہ اس وقت سے اس میں فضا میں ادنیٰ خیر ہوا تھا ہے۔

زائے داد شعلہ کی، عذاب و دستانِ سخت آزمائشیں ملنا کی زندہ و خیر خواہ و کبھی کی دقہندی نہیں کرتا تھا۔ طنز سے اقتساب اس کے ذہن میں تھا۔ ایک کا شائبہ ہمک نہ جاتا۔ نہ ہی اس نے کبھی اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کبھی قریبی جو یا غیر ہر ایک کا خدمت کے لئے حاضر اس کے عزیز اپنے خدمت پر فخر کرتے تھے۔ لیکن یہ اس کے لیے فردِ بیانات کا سبب تھا اور نہ ہی رشتہ داروں کا چھوٹی بڑ بڑا باعثِ غصہ کی سختی کی نظر پر گرد و مر کے لیے۔

اس کی کئی بھاری ہر کم شخصیت نہ تھی کہ پہلی نظر میں آنکھ میں کب جائے اس کی جلی جلی اور شرافت چپکے سے ہم آہنگ ہو جاتی تھی۔ وہ ابنا نے طور پر اپنے گرد و پیش جو روکی و دور غیر ساری کے اثرات بکھیر دیتا تھا اور آپ سر پتے تھے یہ شریف آدمی میرے کے ان کیوں پریشان ہو رہا ہے؟ یہ میرے لیے اتنا کچھ کیوں کر اچھا ہوتا ہے؟ اب وہ دور و مند دل ہمارے لیے نہیں دھڑکے گا اور ہمارے لیے خاموش ہے اس کی یاد دہانہ ہوں ہے۔ جب میں کوئی نہ سر پہنچتا ہے تو میں یا دوں کے پرے اسی کے درپوں سے بھاگ کر پیریشانی کرتے رہتے ہیں ہمارے وہ ایک بڑے کی موت جو ایک انسان کی.....

بھاری میری ہمارے خواب ہمارے پیٹے ان کی کیا اگست ہے۔ ایک میرے بے بس انسان کی کیا اگست ہے، اگست دار انسان کی ہے.....

میں سوچتا ہوں کہ اس کے پچھلے جانی کی جان چاتے ہوئے ڈوب گئے۔ جب انہیں شبلی ہمارے لگا دیا تو اس وقت بھی چند سالہ بالی تھے۔ اگر بروقت طبی اور اول جاتی تو..... نیاز احمد فار کے اند و ہٹان مادے میں ہاں کی جو راہ کوئی جہاز میں سفر کرے جسے تو شاید پرچ جاتے ہائیں اور جانی کے متعلق میں کیا سوچوں؟ خود ڈاکٹر اور ڈاکٹر کے ہاں جانا میرا یہ انہیں کا شرفیں ہر بات میں اقدار ال پسند اور متادہ کیلئے قلب کا یہ دورہ جان میرا!

احمد زنگی کا اس نے گئے۔ وہ ایک چر کا دے گئے۔ کیا ایک خاص طور کے بعد انسان چر کے کاٹنے کے لیے زندہ رہتا ہے؟ کوئی کھالی جگہ رہتا ہے اور آواز قلب کے موت سے بھی کھو کر رہتا ہے۔

انج میں تیار ہوں یہ ایک جہاز میں پتوں کا تجربہ کیا ڈوبتے سورج کی لچا اور پھلتی ہوئی شعلہ یہ خواہشات و لذت اس کے خاصیت اور وہ ان میں زندہ و تھوکی یاد رکھ گئی ہے۔ آواز کا وقت وہ ان زندہ میں مسلسل میں وہ ان کا وہاں رہا وہ وہاں کے بعد میری نظر ایک اوپر اٹھ گئی تو دیکھتا ہوں کہ اس کا ایک منہ شعلہ میں لٹا ہوا ہے۔ اچھے ان کے لئے بہت بہتہ سرد ہے۔ ہوں بلکہ نیچے آسمان فائنڈ واصل کیا ہے۔ ہے گرد و ہوا۔ وہی آسمان کی طرف سے اٹھانے چکا۔ ان کی تیروں میں سے چاند کی کھیلنا نظر آ رہی ہے اور اس کے میں اوپر ایک روشنی ستارہ۔ اسے آسمان میں اترا آتی ہے۔ شریک جیسے جو اس میں لگی ہوئی ہے۔ کھڑکی کی پذیر صاف کر گئی۔ فوہر کے کھڑکی جانے۔ نصرت ہونے۔ اب وہ مدت و دستان کی خاص چاندنی چھلکے کے درپوں میں سے آتی ہے۔ ساری رات ڈوب کر کچا کر دینے والی سرد و ہائیں رہی ہیں۔ وہ غریب سے زندہ اپنے گھر کے رات کو ملے ہیں۔

مٹی کا ادراک

جو گندربال

پچے اپنی مٹی کٹا گانے کے بعد ہم سفید مٹی کی پھاڑی کا جانب دیکھا۔
پچے دراست لایا جانے۔ رام کا ہاتھ نے طور و ملی۔ پھر اوپر جانے کے بعد دیکھیں گے۔
اُن بچہ۔ اپنی مٹی نے ڈکارے کر کا۔ بجائی کا کا، اتنا فوڈ تھا کہ کا کا کے سب پنا پر بھی نہیں، ٹھاٹھا۔
آپ لگ سکتے۔ کپٹن تبا سٹھ کھٹے گا۔ کڈھٹ۔ ہم اوپر ہیں۔ اس نے اپنی پوری کو صاحب کیا۔ اور تم
تم اندر مہر کی سارے برقی دھڑک رہی تھی مجھ کو آؤ۔ کڈھٹ۔
ادراک اپنے پڑے مٹی کی پھاڑی کی پھاڑی ہوئی۔ پھر ہی۔
چم تم بھی اُس طرح۔ رام کا ہاتھ نے اپنی پوری سے کا۔ اب ذرا کھجے کے کس کی پیش پچے کی۔
میں نے اپنی کے ساتھ ساتھ چٹا چٹا اٹھو وہ قدم بڑھ کر سرور اٹھا کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ بجائی اٹھا رکھا۔
ہوئے بجائی اٹھا۔ کپٹن تبا سٹھ نے گرایا ایک ادا آنے پر کا۔ آپ نے ذرا تھا کہ کئی گائیڈ مائیڈ کے
مہرے جانے گا۔

میں بیان نہیں سکا۔ ایک سیدریش آدمی قریب ہی ایک بچی سے ملا کر ہاسپس آیا۔
توچ مودی صاحب نے چوم سکا۔ کپٹن تبا سٹھ نے گرایا اپنی فوڈ کا جھڑا سے سرپ کر کے چنے کا حکم دیا۔
ادراک۔ ہونے پر فیروز کیوں بیٹا جا ہے بجائی اٹھا۔
آپ پچے ہم آتے ہیں۔ اس نے اپنی فوڈ آدمی کی حوت سنس سنس کر دیکھے ہونے کپٹن تبا سٹھ
اب دیا۔

اچھا، اچھا، بھائیوں۔ وہ سننے گا۔ بچے کو بجائی اٹھا۔ ادراک۔
ہم سب گائیڈ کے پیچے پیچے پھاڑی کی بیڑیاں پڑھنے لگے۔
یہ کچھ ذلیک اٹھنے دریافت کیجئے۔ گائیڈ رام ادا کتا رہا تھا جو اپنی پوری کو پچے اپنی کے ساتھ پھر ذکر اس کے
پنا چٹا تھا۔ وہ میں کس کسٹھ کے لیے آیا ہوا تھا۔ جب وہ اس پھاڑی پر پہنچا۔ وہ ایک کسٹھ پھاڑی کی چوٹی کی جانب
نہ دیکھنے گا۔ تو پناک دھڑک کر لٹک گیا۔ اور ہم۔
کی بڑا ادراک۔ کپٹن تبا سٹھ کی پوری اپنی تین چار سادو کی کو بڑھانے کے لیے طرہ گئی تو اس کا شور مٹا کر اس کے

اس پر تیار ہوا۔ (خیر مجھے بھی پتا ہے کہ اس نے اپنی بیٹی کو اپنی ہندو بیٹی سے نکاح کر لیا تھا۔
۵۔ اس نے اسے چار سال کے نکاح پر بھیج دیا۔ اس نے اپنی بیٹی کے پیٹ کو اس کے پاس لے کر لایا اور اس کی آنکھوں سے ہاتھ
اڑھا کر اسے مرنے سے روکا۔

اس کی بیوی نے پیٹ پر دوپٹا ڈال دیا۔
شرمیلہ آؤدی؟ (شرمیلہ نہیں آتی؟)
جہاں پر وہ کرکٹ کھیلنے کے لئے آئے تھے وہیں وہ رہ گئے۔ یہاں پر وہ رہ گئے۔ یہاں پر وہ رہ گئے۔
۶۔

اس نے اپنی بیٹی کو اپنے پاس لے کر لیا۔
انہیں بات نہیں۔ اس نے کہا۔ شام کو سات بجے وہ ایک آبادی میں گئے وہاں کھڑے تھے۔
وہاں کا ایک نام لکھ کر اس کے ساتھ ایک فارے کے دروازے پر کھڑے تھے۔ وہاں سب کا انتظار کرنے کا۔
پھر وہاں سے وہاں سے آئے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔
۷۔

اس نے اپنے دوستوں کو اپنے پاس لے کر لیا۔
کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔
وہاں سے وہاں سے آئے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔
۸۔

اس نے اپنے دوستوں کو اپنے پاس لے کر لیا۔
کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔
وہاں سے وہاں سے آئے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔
۹۔

اس نے اپنے دوستوں کو اپنے پاس لے کر لیا۔
کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔
وہاں سے وہاں سے آئے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔ کچھ تو تھکے ہوئے تھے۔
۱۰۔

کئی ہندوستانی سادھی گھنٹے کی بات نہیں کرتا گا۔ رام بھگت نے کہا۔ "انگریز حکومت کو پورے ستوریس جو پکے
 نہیں اب کچھ بات بتا میں صرف انگریز کے بل ہی سکتے ہیں اسے ہیں پارلیمنٹ میں گا۔" رام بھگت پارلیمنٹ کا ممبر تھا۔ "اور
 بیشک کے باہر گا۔"

ہم ہندوستانی چپ چاپ میں ہی ساری باتیں کر جاتے ہیں۔ "پر دھیر نے اپنی بیوی کا طعن دیکر کڑھکراتے ہوئے کہا۔
 "اوسنے پر دھیر! کچلے تباہ کر بننے گا۔" ان ساری سبب — آپ اپنی بات شروع کرو۔
 میں کہہ رہا تھا جواب یہ کہ کوئی دھوکا نہیں جو یہ سنی کی حد میں زندہ مسموم ہوتی ہیں ہم بھی سنی کی ہی سہی ہیں۔ ہماری زمین کی
 زمین ذلک سنی سے ہی بنتی ہے اس لیے وہ صاحب ہمارے۔ رام بھگت کی آنکھوں سے آنکھیں مگر جانے پر بڑا میاں ڈھلا
 ہوا تھا۔ اس لیے میرا ایمان ہے کہ اب سب کدوؤں میں کچھ جانا ہے۔ "پر دھیر نے کہا۔ "وہ ہیں انہیں طعن فارکی
 اور کی جانب سے کیا میں کے پور میں ایک بستر کھڑے پر کئی فنڈ کی بانی میں مانتا ہوں کہ اب وہ میں کڑھک اور اذیتا۔ یہاں ایسے
 — ایسے۔"

میں سوچ رہا تھا کہ مانتا ہوں ابھی مسکوتا ہوا خواہاں ظہور مذہبی کی کیفیت سے باہر اگر اپنی آنکھیں کھول لے گا۔

"اب یہاں آئیے اس کو سننے میں!"

اور اب یوں کہ "انتھار کو مانتا ہوں اپنے جسم میں نہیں ہے" "پر دھیر نے کہا وہ ابھی ابھی اپنے جسم کے اندر ہی تھا اس لیے کچھ
 ہی کیفیت سے لڑا ابھی ابھی کئی کئی ہو "اندر میرا گرا روشن کا یہ بھی کے نظر ادا ہو "موت ایک لمحے سے لکھیں یہ لہ
 ن ہو گیا ہو۔"

ایک وقت نہ جانے اور جانے کا یہ احساس موت میں زندگی کی جھلک سکون میں موت!
 "اور — پر دھیر نے سڑ سے بے اختیار چل گیا۔"

نرمیاں میرے قریب کر گیا۔ "کہیں جواب ملے گی میں میں ہے انہیں!"

"ہاں۔" میں نے شدت سے کس کیا۔ زندگی کی ساری داستانیں سے یہ مہلت ہے یہیں زندگی کا سارا سراپا دفن ہے
 ان ہی زندگی کی کہ میں نے اس کے احس سے سانسے پھر بوند جوتے ہیں "ہمارے ہاؤزوں نے کیرٹسے طراؤں کے سب کے سب
 اپنا زندگی بنے "اپنے موت "سودھ" "رہے وکتی کھا اور موتی "موتی اور موتی ہے۔"

سیدھی سادی بولی میں کھاؤ ساری سبب۔ "کچلے تباہ کر بننے گا۔" تو کچھ اٹھے آپ بیدار ہوا کی
 ہو ہی جاتے ہو تو ہماری کچھ دلی پر میں جا رہی ہے۔ پر چر "نیک ہے اب تو شاید دل پور میں کچھ بات کہانی اپنی پارتی جان
 سے کچھ دلی کھڑکتے ہوں گے۔"

مناظرہ کیجئے مگر اپنی زبان اکسیر کروں گا۔

سبب! — یہ تو کچھ بننے گا۔ "سبب یا دھیر! — یہی کوئی بات نہیں آئے ہوں۔"

یدِ بیضا

کوثر چاند پوری

مذہبِ مٹائی پکڑی کی چھت سے کچے اور نٹاک مکان میں پڑا کماؤں کا تھلاؤں کو قوتِ تحلیل ہوتی محسوس ہوتی تھی اور
 ہاتھ لگائی کے شیعہ جگروں سے زیر و زبور ہوتا تھا۔ کچلے چاندی سے وہ جگہ پر چڑا اسی طرح کماؤں کا تھلاؤں کے جاوہر
 جوں کا توڑ جو میں بائیس سال سے بارہ بارہ کوس تک چلتا تھا تھا اب گناہے کھاتا پیتے جو کچلے جاتے خالی چوہاں کو
 بھی جگہ کر کے مگر دیا کہتے تھے اب چاقی تلے پٹائی بابائے گھر کے سونے سے گڑا جاتے ہیں اور صرف کنگیروں سے اُدھر
 روکھ لینے پر ہی کتا کہتے ہیں پٹائی بابائیں جیوں اور کئی دیکھوں کا باب تھا کہیں یہ ساری اوروں دو غلّی آدھی ہندوستانی
 اور آدھی دوتھی پٹائی باباؤں کی طرف سے ہندوستان آیا تھا اور بیان کرتی تھیں کہ ایک چاروں گھر میں ڈال لی تھی۔ اسی کے
 سہ سے یہ اوروں پیدا ہوئی تھی پٹائی بابا کبھی کبھی اپنے بڑے بیٹے کوڑاؤں کی کسی غلّی پر خفا ہو کر کہہ دیا کرتا تھا۔

”وہ تیری تو وہی مثل ہے کہ ان غلّی بابائے پٹائی کی کوکھ سے جنم بناؤ شیعہ کو پتھر شیعہ کھانا۔“

مگر کوڑاؤں کی ان پٹائی کی کوئی تھی اور بہت بڑے گھر کے شوار پستی تھی وہ پتھر نہیں بولی سکتی تھی یہی پٹائیوں کے لیے
 یہ باتیں کہنے کی تھی اور ذاتِ صاف کرنے کے لیے اُردو کی چھال چایا کرتی تھی پٹائی بابائے کتوں جتنے جہان ہو چکے تھے
 ہر وہی اپنے آپ کا دہرائے کھاتے تھے لیکن ان کا وہ جب وہاب نہ تھا جو خان بابائے قائم کر دیا تھا۔ گاؤں کے جو کسان
 انہیں بابائے فرض وار تھے وہ سب کی ساری سے بہت تھکتے تھے غازی کپڑے میں بھی ایک قسم کا سکون تھا میزوں سے پٹائی بابا
 کی کایوں کی ٹوٹی نہ سہی گئی تھی اور یہاں مسوم ہو رہا تھا کہ اب کبھی نہ سہی جائے گی وہ کتوں بیروں اور بیروں کو بھی گالیاں
 دے رہا تھا اور یہ گالیاں بالکل وہی جوتی تھیں جو آدمیوں کو دی جاتی تھیں وہ آدمیوں اور جاوڑوں میں کوئی فرق نہ کرتا تھا دیات
 میں اس کی یہ پالیسی بہت کامیاب تھی جاوڑاؤں سے ڈرتے ہوں یا نہ ڈرتے ہوں انسان بد بھلا نہ کھاتے تھے اور میں کی خود اپنی
 وہ جوتی تھی وہ بہت زیادہ مرعوب رہتا تھا کسانوں کے نزدیک غازی خاں کسی طرح شیر سے کم نہ تھا جو مرتے مرتے بھی ایک
 آدمی گناہی بھری تھا جانتا ہے سب جہاں کو نہیں تھا کہ وہ چھوٹا وہ نہیں ہے چھری وہ اندیشہ میں قسم کے لوگ ایجاد کرتے تھے میں
 وہ خود شیر کی موت کا اہمیان کر کے غرض سے خود ہی سے پتھر پھینکے جایا کہتے ہیں اسی طرح وہ غازی خاں کو موت کے فز میں
 دیکھ کر بھی ایک دم سے پیار دینے نہیں ہل رہے تھے اور شام کو کھیتوں سے ورتے وقت سے پوچھ دیا کہتے تھے وہ پٹائی بابا
 کھسے اٹھائیں تھے پوچھنے والے چوہاں میں چھپا جایا کرتے تھے وہاں کے نوکر جب خاں کو کچلے جاتے تھے حرج کے سوا کچلے
 رنے لگتے تھے ان میں سے ہر مال کی وہ مشیت ہوتی تھی جو مراد شیر کی جانب پھینکے جانے والے پتھر کی جہاں کرتی ہے۔

پیشانی

کریں اور ان کے جسم پر

کیا جو سب کے لئے ہے جس پر نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔

پیشانی پر ایک بڑے پتھر میں مائل کر دیا جائے۔

انہی کے لئے اس لئے کہ ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔ یہاں تک کہ ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔

کے چہرے پر۔ ان کے چہرے پر چکر نہ لگے۔ یہاں تک کہ ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔

جب ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔ یہاں تک کہ ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔

کریں اور ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔ یہاں تک کہ ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔

جب ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔ یہاں تک کہ ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔

یہاں تک کہ ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔

پیشانی پر ایک بڑے پتھر میں مائل کر دیا جائے۔

ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔ یہاں تک کہ ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔

ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔

پیشانی پر ایک بڑے پتھر میں مائل کر دیا جائے۔

ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔ یہاں تک کہ ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔

پیشانی پر ایک بڑے پتھر میں مائل کر دیا جائے۔

ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔ یہاں تک کہ ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔

پیشانی پر ایک بڑے پتھر میں مائل کر دیا جائے۔

ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔ یہاں تک کہ ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔

پیشانی پر ایک بڑے پتھر میں مائل کر دیا جائے۔

ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔ یہاں تک کہ ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔

پیشانی پر ایک بڑے پتھر میں مائل کر دیا جائے۔

ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔ یہاں تک کہ ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔

پیشانی پر ایک بڑے پتھر میں مائل کر دیا جائے۔

ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔ یہاں تک کہ ان کے جسم پر چکر نہ لگے۔

کے ساتھ تھی، وہ کٹر برسات کو لایا، تینوں چھوٹے لڑکوں کے ماحولت کو برائے لگا، اور اپنے دادا جلال خان کی موت کا حال
 بیان کرتے وقت اس کے انھن سے چٹکیاں نکلنے لگی تھیں، وہ آج بھی سینہ دیوں کی موت کے گھاٹ اُٹھ دینے کا آرزو مند تھا۔
 جب تک کہ موصوم شکار غازی خان، چنگ خان کا لڑکا بنایا اور سچے ذکر بہت ادا ہو گیا ہے، لیکن وہ اس سے دُور
 ہی رہتا تھا، غازی کیڑے میں مگر جب تک کی آنکھیں کھلی گئیں، پتلا بابا کے قبضہ میں بزدلوں کی طرح زمین تھی جس میں تاسوں قد
 پیا جاتا تھا، خود پر سد پر بھی ہوتا تھا اور کھنڈ کے اندر بھی تقسیم کرتا تھا جو فصل پر دو گنا ہو کر روٹ آتا تھا، پورے علاقہ پر اس کا اثر تھا،
 فیصلہ دے گا کہ اہل کار انداز فرماؤں گی کہ یہاں کھڑے تھے۔ وہ بکروں اور خرمن سے اُن کی ترافض لیا کرتا تھا، جب خان نے
 بہت سی لڑکیاں سے چاہنے اور اپنے ہی دھندے کو چھوڑنے کے لیے چٹان اُٹارے ہیں رہنے پر مجبور کر دیا، اس نے
 جب تک کہ کہتے ہوئے گا۔

جب خان نے کھنڈے کا کٹہر جو نہیں دشمن تھا، وہ اس سے بھی دُور لی جلتے تو مزور بد ریتا تم میرے متعلقہ کے
 نہیں مگر پتا تھا کہ تم ہمدرداں کی جلد سے تھے وہیں میدان میں کھڑا کر کے گلی سے اُڑا دیتا اور پتلا بابا کی طرف کوئی آنکھ اٹھا
 کر بھی نہ دیکھتا، لیکن میں تیروں پرناضیل چھوٹا جیڈ ڈوں پر نہیں۔

جب خان جہر سکتی ہو گیا مگر وہ چٹانوں کے بندہ استقام سے واقف تھا، بہر حال وہ غازی کیڑے میں رہ پڑا اور کھیتی کھنڈ
 اور ادھ کیا، ایکس قہر کے لیے تحصیل میں درخواست بھی دی مگر خان بابا نے اسے منظور نہ کرنے دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب خان
 اس کا تعلق ہو کر نہ، جس طرح اور بہت سے لڑکیں وہ بھی اسی مشیت سے رہے۔

پتلا بابا نے تینوں لڑکوں سے کہہ دیا تھا کہ جب خان کریں گے صرف اس لیے نوکر رکھا جائے کہ نہ برہنہ شیشی ہی میں بند رہے،
 اور خود ہر وقت پیش نظر رہے مگر میں اس کی طرف سے چٹانوں میں تم لوگ بھی اس سے ہوشیار رہنا، سانپ کا پتہ سانپ ہی جتا ہے
 اور سمجھتا ہے اور چاروں اس کے شیشی ہلکے ٹانٹ ہے لیکن اس کے بیٹوں نے جو خود پتلا بابا کی نظر میں نہ پس تھے ان اتوں کو بالکل
 نسبت نہ دی، ایک سال سے شکر نور سے کھانے سے اُٹا دیا وہ اس کے دامن کی فضا میں چاروں کے بیٹ سے پیا جاتے تھے، دُور

ہی چھوڑا جاتے تھے کھانے اور دوسرے کھانے کی طرح نہ رکھتے تھے، پتلا بابا اپنی جگہ ہر طرح سے ہوشیار تھا، وہ ایک سنٹ کے لیے بھی غفلت
 نہ تھا، اور جب خان کی قتل و حرکت پر کڑی نگرانی رکھتا تھا، اس کی شیان جب خان سے بہت گرا پڑے تو کئی تھیں، پھر بھی جب خان
 ہوتا تھا کہ بڑی دکان پر اس کا ایک آنکھ چپک چپک بیکار ہو چکا ہے، اس کے منہ پر لکڑے کرے لٹا ہوا ہے اور کھلی فروزہ زریں
 بہت جیسے ہے وہ اس غازی کیڑے کی روٹی اور کھانا ہے اور سب سے چھوٹی زرد نگاریوں کو قیمت ہے، مگر ترقی ہے۔

فروزہ زریں جس کی طرف ایک مرتبہ وقت پہنچی تھی، وہ اپنے کچھ اڑے میں لٹا کر ڈھلے آئی تھی، وہاں ہی
 اب بہت لڑا سانپ لی گیا تھا، وہ سم کر وہیں کھڑی ہو گئی تھی، سانپ سے جب خان ابھی تھا اور فروزہ زریں نے چپ کر

لگتا ہے:

پتلا سانپ ہے:

جب خان بہت پٹائی اس نے گاس ہاتھ میں لیا اور اسی جوتوں ہی سے لگایا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ پر دس روپے اڑ گئی وہاں فرزندہ زویں کھڑی تھی اور دوسرے انگلی جاکر وہ دھپینے کو رخ کر رہی تھی جب خان جلدی سے بولا۔
"ابھی ہی نہیں چاہتا پھر کیوں گا۔"

"خیر! ———— خود کا پتا! وہ جاکر وہاں پر سیز کرتا ہے، ابھی چاہو گا بڑے سامنے؟
جب خان لگایا اس پٹا گاس ایک ہی سانس میں چڑھا لیا۔ فرزندہ زویں گئی گئی سہی جوتی آنکھوں سے دیکھتی رہی ایسے اس زویں کے دونوں کے پنج میں سانپ آگیا جو۔"

"جب خان! ———— پٹاں بابا وہ تیرا بپ سندہ رانا سیندی ایک فرسے میں سینہ کھول کر ایک ڈیری کی رانفل کے سے کھڑا ہو گیا تھا گلی اس کے کان کے پاس سے سناتی ٹکائی تھی مگر اس نے سر نہٹ جھٹکا اور تو میرا جھوٹا دودھ پیئے ہی سے۔
بھلا کیوں کا! میرا چاہا پٹا خان دو ٹھپے، مگر زویں پر کھڑا ہو کر شیر مارا ہے۔"

پٹاں بابا کا پاڑا بیل ڈول تیزی سے کھٹا رہا، وہ دن رات میں سیروں بہم اُٹھ دیتا جس میں چٹانک دو چٹانک یہ سہی ہر جگہ جھٹل مٹھ اس امید پر اس کے منہ سر ہاتھ کر آخر وہ کب تک زندہ رہے گا کسی دن اسی طرح ایڑیاں ڈالتے، گڑتے دم توڑ دے گا۔

پٹاں بابا کبھی کبھی موزیں جوتا تو اسے اپنی پتی کے قریب بیٹھے کو کتا۔

"سیندی شیر سینے پاس آجٹا۔۔۔۔۔۔ دیکھ تیرا دادا رانا خان سیندی ٹہا ہادو تھا، وہ اکیلے رانفل کندھے پر در پاڑوں میں گھومتا اور جب کوئی جوانی جاز آسمان میں اڑتا نظر آتا تو رانا خان آک کر ایسی گلی چلا کہ جاز بھائی ڈونٹے کھاتا۔
سے علاوہ کئی ہمارے کا تھا کہ کیلے، رانا خان جتنا ہادو تھا اتنا ہی سکاڑھی تھا۔ وہ پتے کی طرح دشمنی پر گات لگاتا تھا ایک پنہ کی ڈھیں چپ کر اس نے ہارے دو اچال خان کے گولی اڑوی تھی اور وہ گولی کھڑکھی پاس گزرتی تھی کہ وہ لگا تھا ڈھ بچاں! اس کے دادا رانا خان کو سکاڑھا تھا تو جھٹان کا ہی چاہتا کہ اس کا گھوڑا اسے ڈھ بار بار مٹھی کھٹا اور ہند کرتا، اس کا ہی وقت اور وہ زویں کی زلفوں کے وہ بال یاد آ جاتے جو اکثر اس کے ہتھے پر لڑا کرتے تھے اور پھر اس کی وہ گولی گئی آنکھیں یاد آ جاتیں۔
گولی پٹی تھیں پر ہدل سے چماتے۔ جتنے ایسے آسمان میں بڑے گائے اڑ رہے ہوں۔ جب خان کی آنکھیں زخمی جاتیں،
وہ بچاں بابا پر ترس مٹے کھاتا۔ چنانچہ بابا کے تیرن لڑکے جو ان تھے، حرم میں تو غیر معمولی تھے و خوش کام تھا مگر پٹا خان اور
میں ہنسنے بیٹھنے کی مانند سولے آئے اور زخراک تھے مگر وہ اس میں سے کسی سے نہیں گھومتا تھا۔ ڈراتا تھا صرف فرزندہ زویں
کو زندہ زلفوں کے کھبے اور باغی باؤں، منگل گول، آنکھوں میں جگتی ہوتی تھیں، بے جوش کھڑی ہنسنے کے چھوٹے زیادہ تازگی اور
جو بٹھی چٹانک باگرتی کتے کتے کا نسی اٹھتے اور وہ کر وٹ ہل کر پیاد میں جری، آٹھ پر کھٹنے کی جگہ جب خان کو ٹھم دیتا۔

"جب خان اتنے پھلے؟"

جب خان اتنے پھلے دیا اور پٹاں بابا اس کی بیٹی پر ہنسنے دیا پھر اس کے جہانے کی بیٹی تو حشی کرنے لگا اور

راکھ

غلام الثقلین نقوی

ایک سید صاحبِ حادثہ تھا :

یزاب کی بولی صد کام کی دوا اللہ ہی کے ایک ہی دروازے میں پڑی تھیں۔ متوجہ نہ ہو کر وہاں کی بجائے یزاب بی بی اور بچے کے حود پر روت رہی تھیں۔ لاکڑ خانی کی تشریح کی گئی تھی۔ جنازے میں لگتے تھے سبھی دگر ٹہکتے تھے۔ انیس میں سردار احمد اسد بھی تھے جو میرٹھی کھٹی تھیں۔ ایک بچے کی قبر پر ڈالتے تھے اور جو کچھ لگنے کے پڑے تھے سر پر اور وہ لوگوں میں شہرہ آفاق۔ دو شام بھی تھے۔ بڑی بچا جہتی غزل گاتے تھے اور یہ کثرتِ شاکِ شادوں سے غل زینیں ڈونڈ رہی تھیں۔

مسترد متوجہ کا وہ دم چلتا تھا اور قمر کے سر اٹنے کو تھا۔ اس کی ٹھٹھکیں میں ایک آنسو بھی نہ تھا۔ اس کے پرے کا رنگ نہ تھا۔ ان کی بہت پر جہتی تھی اور ایک عورت کو متوجہ کر سنا کچھ کے وجہ سے چلیا اور مسترد کے سنا سے ایک ٹھٹھکی آؤٹ گئی تھی۔ پاس کھڑا تھا۔ سب کو یوں دوسرے جیسے مسترد کے دل سے کوئی ہوا آ کر اسی قمر میں دفن ہو گیا جو !

تو یہ سب ایسے شاد شہر کی وفات کی تو یہ قمر کو دیکھ کر سے گئے تھے۔

اور شاد مگر ! ایسے بے انتہا حیرت برقی۔ شاد نہیں سکتی۔ اسے نہ مانیں چاہیے۔ جو سکتا ہے کہ شاد مگر جو کہیں شاد مگر !
یہ جہت شاد مگر ان کی خوں کے ایک ٹپ شہر میں زندہ وسعت تھی۔ خاص ان کی پیاس میں صفا تھیں۔ شاد نہیں رہ سکتی کہہ کر
نے سرد احمد اسد کے گھن کا اب حیات کی بات ہے

تھیں۔ شاد مگر کئی تھی جو مسترد کی ان تھی :

”جگہ شاد شہر سے کیا غرض۔ دل مرتے رہتے ہیں۔ غصہ میں گئے ازلت مرتے پئے اُنہی ہیں۔ تقدیر کے قاضی یا یہ فتوے
... لے ... دہلی دھوا ... اقبال اور حور و لہو ... میں جی متا پریشان خیال ہوں ... شاید اس لیے
ان میں وہ اقبال کے گم میں گئے ٹپ یا ہوں۔ تقدیر کے قاضی کا ...“

اور پند ہوں بہ دو بجے جس پر دھڑکتے جو مسترد اور شاد شہر کی پائی کے کر رہے تھے :

تقدیر کا ستم دینی دیکھ کر شاد شہر مگر کئی زندہ محرم ہو گئی تھی۔ اس کے ہر سپرد و اذیت کے کوئی آثار نہ تھے۔ ایسا تھا
جسے اُس نے موت کو بڑی خند ویشالی سے خوش آمدید کہہ کر :

بھی پھٹکا کر ٹپ بھی نہیں دے رہا تھا :

بت نہ ہے تو تھکے تھکے کے اندر میں بٹھے پیسے کی کالی کھاتا ہے نہیں توں بھٹکے جیسا ایک نلے کے پے ساری دنیا کا اسی
نہ لے رہا ہو۔ آج وہ تھکے تھکے پڑے دینے کے لیے ہلے گرد آیا تو میں بچنے کے لیے اٹھا۔ میرے پاس کالی جانے کے لیے صاف
پس نہیں تھی لیکن وہ گھر نہیں تھا۔ میں راتا تو.....
”تم کڑے پنے آگے تھے؟“ شادو نے پوچھا

”میں..... ان.....“
”پھر میں ٹھرو۔ میں جب تک لوٹ کر ڈاکوں میں ٹھہرے۔ جو۔“
وہ لگی میں سر جھانے لگا رہا۔ آقا ڈاکو لگ اس کے پاس سے گزرتے دے۔ ایک دوڑنے اُسے حیران ہو کر دیکھا لگی اور اُس
کے پرے پر شرم کے پینے آتے رہے اور وہ سر چارہ میں ایک قدم آٹھ بڑھا تو ہانے کیا ہو۔ جیسے پاؤں زمین کے ساتھ
ہوں چپک گئے ہیں؟
”تم میں کڑے جو؟“ شادو نے پوچھا۔

”میں..... نہیں تو.....“
شادو جھک کر ہنس پڑی۔
”یہ لو اپنے کڑے..... میں..... نہیں تو.....“
اس نے ٹھیک ٹھیک انھیں کے ساتھ کڑے پینے کے لیے اتر بڑھانے۔
”میں..... ایک بار نظریہ اٹھاؤ تو پڑے دوں؟“
اس نے پیسے میں بیک لیا۔
”کے ہانے وہ شادو؟“

”مہا پاپا بے جو تو ایک بار دیکھ تو۔“ وہ لگے آنکھ جو کر نہیں دیکھتے میں اُن کا دست روک بیا کرتی ہوں۔
اور اس نے وہ چٹا شرمین اور شرمینہ انجیل تھا۔ اس لڑکی کو نہ جو کر دیکھ لینے پر مجبور کیا۔
اُسے یوں لگا جیسے اُس نے اس لڑکی کو نہیں پہچان دیکھا جو۔ یہ ابھی لڑکی جو بڑے دلہنہ اناؤں میں سکوا۔ ابھی تھی اور اس سے کوئی
بے پروا میں سات کے چاند کی زرد نور و نور کی وارہی جو رہی تھی۔ جو دھوپ کا پانا ہو کر میں کی ایک سات کو چپک رہا ہو اور اس
سات میں جس ہونہ ایک ستر پیسے کی خوشبو کو میں کے بھر دوں سے لینا آتی جاؤ۔ ابھی نہیں پاتی اور ابھی ایک ستر سینہ پھوٹ
رہا ہے۔

وہ اس پرے کو دیکھتا رہا اور اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔
اور بیا یک شادو شرمینہ۔ اُس کی انھیں جھک نہیں۔ شرمینہ جھکی انھیں اپنے تپ میں کھولیں۔ یہ ہے داغ زرد داغ سا
بہاؤ ابھی گرم گرم زندگی سے بھر پور تھا۔ یہ وہ اُس اُس سا ہو گیا۔ ہوں کی آریں اور اس اُس شرمینہ میں زمین سے ہی

[illegible]

شکوہ نے یہ شہ زنا اور دو لکے غلوں سے زلی سنا :
 میرا اس نے ایک سیلاب میں سٹکا : شکوہ کا یہ جو راجہ : اس کے ہاں دیکھنے : اس کے لیے : رشتہ کوئی کریمانہ : اس میں :
 شہ زنا ہونے : وہ شہر ہے : ایک لکھ کا : اس کی : تاج : اب : اس نے : ہزاروں میں : دیکھ کر : لڑی : ہے : لیس : ہزار : ایک : ایک : ایک : ایک :
 : اس کی : دو : ہزار : پچیس : سے : سو : ہزار : ہیں : پہلی : بیوی : دوسری : گھٹا : پر : ہا : کر : پڑے : دوسرے : میں : ہر : دو : ایک : کہے : ہے : دوسری : کا :
 : کے : انتہا : ہیں : پڑا : اور : ہر : ستر : لکھ : کرتی : ہے : اور : اب : اس کے : تیسری : بیوی : کی : عزت : تھی : جو : گرم : پڑا : اور : لڑائی : کہیں : کر : سکے : اور : اس : لڑ :
 : شکوہ : شہ : پر : پڑی :

تھنہ لے کر پھرے پھٹنے جو ۱۰

۱۱۱۰

پڑے ابھی نہیں دیکھے۔ آتا تو دھولے گھٹے پر گیلے۔ آج شام تک دیکھیں گے۔ پھر ہی انہیں خود اپنے انگوٹوں سے ترکا
 رے گی۔ دیکھنا ایک سوٹ بھی نہ ہوگی۔ تھنوں کی ایسا کریداروں کی کہ پختے ہر ایک خواب نہ ہوگی۔ پھر تم پھیل پھیلے جا کر اس گلی میں سے
 ۱۱۱۱

نہیں..... خیر.....

نہیں..... نہیں تو..... اسے سہرا لٹاؤ پڑھتے ہوئے گا۔

وہ انداز سے گھبراہٹا تو فیسی ڈی کی ٹیکٹ بنڈ ڈیڈا کے سروں کے دھننے ایکسے کے پے ڈک گیا۔ فیسی ڈی کی ٹیکٹ کا ملک
 بڑے پائے لکھوں وہ شخص تھا۔ اس کی موچوں پر خطاب پر تھا اور وہ کوچیں کی ڈک کی سنوارا۔ اتنا اس کی آنکھوں میں سنا سنا
 آتے تھے۔ پھر سے یہ سنا سنا جھڑپاں تھیں جی کہ کوئی استری ہار نہ کر سکی تھی۔ جھڑپوں کا جال۔ جال کو ایک ٹکٹا کا۔ ہال سنا اور شاد
 ب پڑا ایک حرف اس ہال میں پس کر پڑ پڑا لے گی۔
 شاد..... شاد..... وہ تڑپ کر پکارا۔

موچوں کی ڈکیں پڑ گئیں۔

تم کس شوق کو پکڑ رہے تھے ۱۰

اس کا جی پاؤ کہ شوق ڈیڈا جی ابھی ابھی شوق جال میں پس کر رہی ہے۔

یہ اس نے ڈاکا : شاد..... میں نے کس شاد کو نہیں پکارا۔

پچے صوم جتے جو۔ کس تھی میں رہتے جو۔

شاد گئی میں.....

اس شہر کا کوئی قصہ گئی کے نام سے شہر میں۔ اونے شہر ہے۔

کیا بات ہے جیتے ۱۰

اس بابو کو دیکھو..... کوئی پاکی ہے پیدا۔ کوئی تو شاد گئی ہی ہے جیسے شہر میں ۱۰

خیر.....

یہ بابو کتا ہے میں اس کے لادہ جتے وہ جوں..... ابھی ابھی کس شاد کو پکار رہا تھا۔

شاد وہ لوہا بات ٹیکٹ کس نے۔

۱۱۱۲ شاد..... ہاؤ بابو..... کوئی کوٹ دھٹ ڈی کی لیں کہنا جو تو ہے آوارہ لوں کے شہر میں..... پکے

نے کس کا کام جا۔ شاد..... ذوں کو چپا نہات کو آرام.....

اگرچہ اس شخص کے مکان کے ساتھ کھڑا تھا
وہ جگہ پر اس نے وہاں سے پر شک دی تو شاید اس پر
پڑے ہوئے ہوں؟

اے! وہ
نہیں! وہ وہ ہے جسے کہہ گئی۔ اس نے میں نے کہہ دیا ہے، یہ پڑے ہوئے ہوں گے۔
میرا دوست رہا۔

وہ شرمندہ ہے؟

جی... میں تو... دیکھو! اچھے اچھے ہوں، جی ہاں۔
شاید اس کی اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:
میرا اچھا ہے کہ میں اس پر ہوں۔ اس کی اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:
پاؤں میں اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:
میں... اس نے کہہ دیا ہے۔

میں... شاید اس نے اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:
وہ اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:

وہ اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:
وہ اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:
وہ اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:
وہ اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:
وہ اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:

وہ اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:
وہ اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:
وہ اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:
وہ اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:
وہ اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:

وہ اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:

وہ اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:
وہ اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:
وہ اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:
وہ اس شخص کو پتہ نہ ہو۔ وہ کہہ گئی کہ اس نے اس کے مکان سے پر ہوا تھا۔ وہ کہہ دیا ہے:

شاد کو ایک غم نے مسکا آلا ہے اظہارِ اس میں محبِ پناہ ہے۔

جس کی ایک کینک کے لئے اُس نے سائیکل کا ہتھکڑیا۔ عینہ ایک گڑھی پر پٹا توڑ پٹا پیرا تھا۔ اسے کہہ کر شیدا
رہا آج آیا: میسٹر! ایک سال پہلے وہ گڑھا ہے۔

مہلے سے: دلا لڑا ہوا ہے۔ اس سے ایک بات پوچھو گی۔

ابو: شیدے نے تم سے جو کیا۔ اُس نے سائیکل دکھایا۔

تم کس لئے یہی کہتے ہو؟ میسٹر نے پوچھا۔

بچے پر سے می۔

تم شاد کو کہتے ہو؟

ہاں.....

پھر اُس کو کہتے تھے تم شاد کی بیوی رہتے ہو۔

شاد کے لئے کاہنہ شادی ہے۔ تم میں شاد کو تم چوبے جو وہ دیندو صوفی کی بیوی ہے؟

ہاں..... تم اسے کہتے ہو؟

ہاں..... نہیں..... ہمارے کہنے کہنے انداز میں کیا؟ تم کہیں پوچھو بے جو اس کے مشق؟

وہ میسٹر کی ہنسنے والی دلی ہے۔ بہت حد عینہ اس طرح اندکرتا ہے لہجے میں آئے گا۔

شیدا زور دے بنا اور اس کے سر میں تھوڑے پتے رہے۔

شاد، میسٹر کی ہنسنے والی دلی ہے عینہ اور عینہ کی ذرا نیکی نیند و نوری اس کا لہجہ ہے جس کی برقی غلبہ کالی

میں اور جس کے جسم سے شادی کی چوٹی کی بنا آقا ہے اور شاد..... میں کا ہر قسمی راتوں کا طرح ہے۔ جس کی آنکھوں میں تپائی جھلکتی

میں اور جس کے سانس میں گلاب کی خوشبو ہے۔

یہ ایک سترہ نے ایک عیب ہے مہی کا، اس کا یہی ہے تھوڑا سستہ انداز اس کے لہجے میں آیا ہے اور اُس نے شاد کو دلی

باز دلی میں ڈال دیا ہے اور پھر اُس نے ڈال کر نہ مایوسی دیا ہے کہ شاد اُس کے لئے کیلا کی ہے

نہیں..... نہیں.....

سائیکل چوبے جو اُن کا چہرہ: ایک راہ گزرنے کا۔

اُس نے لڑکھاتے ہوئے سائیکل کو سجال دیا۔

سائیکل سسٹو گیا کہیں وہ اپنے آپ کو سجالا۔

وہ عرش سے گرا اور پاؤں تک دھس گیا:

کالی سے دیکھو وہ شاد کے صوفی کے لئے کھڑا۔

تاریخ: ۱۳۰۲ھ۔ اس کے بعد کہ شہر میں خیریت ہو گئی۔ اس کے بعد یہ سب قیدیوں کو
رہا کر دیا گیا۔ ان کے لیے ایک مکان بھی بنایا گیا۔

۲۰۔ اے مسلمانو! میں تم کو ترغیب دیتا ہوں کہ:

• استغفرم! میں نے اسے دیکھا۔ •

۱۰۔ لے شکر کر ہیکر دے کہ اب پانچونے لے دیا۔

۷۔ شائد کے ذریعہ جو کہ پر اثر ہو چکی ہو۔ پروردگار نے انہیں سزا دے دی ہے کہ ان کے دل میں سے وہ جو کہ ان کے دل میں تھے وہ نکال دیں۔

کو بہت جلدی سے اندر کر دیا وہ اپنے ایسٹو اور مل پائی کے ہاتھ ہنسے۔ "شاد نے فتح سے منہ نہ ہٹا
اور میری کہ۔"

شماره پنجم - سال اول

کتب

”میں تو بے پیاسے قافلہ میں تیرے پار میں بہتے نرگس کی بات ہے۔ میں جلی جھوکے گا کہ جھپٹوں گا۔“

مسئلہ: "خداوند پر کسی میں انگوٹہ، پیرا، زنجیر، ہلکار، لکڑی ہونے سے یہ سب کچھ ہے۔"

• سہنے امیر، غیرے پاسکے بے لکڑی، روڑا، کراچی، قادیان، سندھ، کراچی، گلگت، بلتستان،



میں نے نہیں، شائد کہ محمد علی آزاد کو تو یہ سب سے پہلے آگیا ہوگا۔ مگر یہ:

اسلام آباد کی آتشیں اسلحہ کے قبضہ کا سلسلہ دو دنوں کے بعد ختم ہو گیا، جس میں آٹھ گنہگاروں کو قتل کر دیا گیا اور پانچ کو زخمی کیا گیا۔

کاتھولکوں کی بات: ان کے خاتمہ کی بات ہے۔ زمین پر ان کا خاتمہ ہے۔

فلسفہ پرچا : ساتویں باب : شہادۃ علیہ السلام : فقیر :

تجزیہ

یہ دیکھ کر مجھے تانہ نہ رہا۔ میں نے اس شخص کو گھیر لیا۔

ہر روز اس پادشاہ کے لئے ایک نیا کھانا تیار کیا جاتا تھا۔

نیا۔ مجھ کو یہ خبر پہلے سے معلوم تھی۔ شائد اسے کہ مجھے مانتا کیسے ملے۔ میں نے کہ جاکر دیکھ

• **مجلس**

”ہاتھ جو اونچی کہیں“

”اے اُمّ قریشی جو اور شاد دھوپ ہے تم ہی کو چاہتے تھے؟“

”ہاں... وہ کیا میرے خاندان کی پشت پر شرافت کا پتہ دے۔ میں جی جی ہاؤں تو یہ پتہ انہیں مل سکتا۔“

مستندہ! تو بڑا دل چاہنے والا تھا کیا ہاں۔ شادو کے اپنے ہاں کا ایک پانچواں قورہ بھی بخش لے کر میں اسے لے کر

زیر دست مَد چاہاں گا۔ تو تو آگ سے پہلے کا نا؟

نہی کے اندر آئی۔ ہنگامے کا لپکتے تھے اُس کے کھلے کر جس پر۔

”ابھی تو میرا زنا ہے مگر اسے: ہر جب تیرا پیار تو دشمنی کی موت ہے تو میرا نہ یہ شادو تک ضرور پہنچا دیا۔“

ابھی شادو کی گئی سرفرازی اور سنسنی میں نہ جھکی تھی کہ اس کے پیادے خود کشی کر لی۔

ابھی جیسے ایک نر بچہ نہ تو تھا۔ نہ اُس نے شادو کے ہاں سے کوئی کچھ چاڑھا تھا کہ اُس نے شکست قبول کر لی تھی؛ بلکہ اُس

سے شام ہی بھر گئی تھی کہ اس شام کو کہہ لے لی جو سوسا چھٹا تھا۔ وہ دن شام ہی بھر گیا تھا اور رات کے اندھیروں میں سنائے

رہے تھے اور قمر قرابے تھے اور اس پر اپنی جگہ میں بیٹھا تھا۔ ابھی تک اُس نے سب روشنی نہیں کی تھی۔ سب روشنی جو بھی جاتا تھا اس

سے دل کی گئی تھی کہ تھکا

اس کی جھلک کا وہ نہ کہہ سکتا تھا اور نہ کہہ سکتا تھا کہ اس کے پیادے کی کا مڈھیرا اندر آ رہا تھا۔

مستندہ! اندھیرے میں ایک کونہ کی: میں بیٹھی۔

”تم کہیں آہیں شادو! میں تو کل رات بھر بچا ہوں۔ جا! میں نہ اس تو نہیں لے سکتا۔“

مستندہ! پیار کے سہارے بچے رہتے ہیں۔ بچے نہیں۔ یہ سہ پیار کو دھکا دے۔ میرا تو بچہ ہے! تو میں لے لے لے اور بچے

ہے۔ میں نے شادو کی شاکی دنیا بابت کچھ ہے۔

شادو! میں یہ نہیں جانتی۔ ہاؤ! اگلے چھپنے سے ڈولی میں چلے جانا۔ میں اونی کو کہہ جائے وہاں گا۔

مستندہ! تو قربت نہ دل نہ۔ بے وفا! تو میرے ساتھ اتنے قدم کیوں چلے۔ اب شادو! میں یہ پھر ڈر کر جا

ہے جو۔

”کہیں جی نہیں۔ میں وہی جی۔ جو شادو! پر میں تیرا ساتھ نہیں لے سکتا۔“

اندھیرے میں: شادو کی گئی تھی اور اس پر پیسے جی نہ گیا۔

وہ ایک قدم لے لے لے۔ اس پر ایک قدم لے لے لے۔ وہ بڑھتا رہی۔ اس پر ایک قدم لے لے لے۔ اس پر ایک قدم لے لے لے۔

ب۔ شادو نے اپنے خوش پیو دی۔ اندھیرا شادو کی خوش میں چلے گا۔ اس خوش میں: شادو کا نہ دھکا دیا گیا تھا۔ جو پور: خوشی

سے پیار کی طرح نہ رہا تھا۔ ایک بھرا اور وہ اپنے خوشی اس میں نہ رہا۔ اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ تو شادو کا ایک ذمہ ہے۔ وہ

نہاں کے کپڑے اس نے ان کا پیسہ لے لیا تھا۔

وہ انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کے ایک کپڑے کو وہ بچے کو فروخت کر رہی تھی؛

مرد وہ نہ لے۔

کی زندگی۔ انہیں یہ سن کر وہ بچے کو لے کر اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔

لے آ گیا۔

وہ سب دن کی آج تک:

وہ بچہ ایک گھر میں نہاں ہوا تھا۔ شاد کی گھر میں تھی۔ وہ بچے کی کپڑے کو ایک تھوڑی سی لے گیا تھا۔ پھر اگلی سہ ماہی
سناہن تھی۔ وہ اس میں بہت محنت کی تھی۔ شاد نے لے کر فرات کا جہاز نکال دیا تھا۔ اس نے وہ تمام مال بھی
لیا ہے۔ اس کو کھانے کے اکل کاٹ دی خود وہ بھی تھی، اتنا جو بے سہارا تھی، وہ بھی
جو یہ نیا بچہ تو لے کر آگیا ہے۔

بچے کے ذہن نے شاد کو سراغ دکھایا۔

انہی کئی دنوں میں انہیں بچے کی جھنڈی مل گئی تھی۔ بچے کے دماغ میں شاد کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ شاد کو ساقے تھے۔

بچہ جو کہ شاد کو سراہ کر اس کی پشت پر شرافت کا وہ ہار لٹا رہا تھا، اپنے کندھوں پر شاد کی ڈھلی کا جو جڑا تھا اپنا

اُس دن ہے، اس بار اس حلال کے شاد بچے کے تھے!

وہ نئی شاد مر گئی تھی!

اس نے فصل سے جراب کا ایک ٹکڑا ہٹا لیا تھا، اس کے بنے مسکرائے ایک ٹکڑی، وہ بچہ بھی بھی، اس کے بچے پر سے

ایک بوجھ اڑ گیا ہے!

جراب کا ایک ٹکڑا، شاد کو جراب کے ایک ٹکڑے نے تھوکر دیا تھا، نہیں، اس بار وہ شاد سے

اپنی سر پہ کاہ، وہ وہ بندہ کر دیا کہ اس دور کے سے ایک ٹکڑا دینے والی کو یہ ایک راستہ بنا دیا تھا۔

شاد تو اس کے دھڑکے ہوئے تھے، وہ وہ بچے کے کھانے میں آئی تھی!

شاید،

یہ اس کا شوق تھا، وہ شاد کو اپنے ناشی کی منزل کی طرف آہستہ آہستہ وہاں پاؤں دکھایا، دیکھنے دیکھنے پہنچا، وہ

اس کو بھی، شاد کو بھی، اس کا شوق تھا، جس کی عمر بچوں پر شاد کی شاد تھی، وہ اس کے تھوکتھوکی میں ہی بیٹھ کر رہا

نہیں تین ایک فلسفہ کے حوالہ پر چٹ گیا۔ اس کی بات کو تقسیم ہوئی تو شادو اپنے زبانی مکان میں اٹھ اٹھی۔ فیضی ڈرائی کیلنگ اینڈ وڈ کی دیکھ کے ڈکال بند ہو گئی۔ شادو اپنے ہیکل اٹھ بٹانے لگی۔ اسرار احمد اور سید فیصلہ میں عازم ہو گئے اور ان کی ایک نہایت شریف کرنے میں ملوث ہو گئی۔ اب شادو کی طرف انکو آشکار بھی زد کیجئے۔ پہلے کیوں جب کسی وہ کسی مشیت شرکی فکر میں ہوتے تو شادو ان کے سامنے سنگسار کیے، کھڑی ہوتی اور انہیں اپنے اٹار کاڑھ سے شادو کے کنارے کی تیز خوشبو آنے لگتی اور وہ پکرا کر رہ جاتے!

متصور سکول میں داخل تھا۔

شادو کو بچوں کے سر انکی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔

پڑھا پاپ دینو بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا اور اب شادو کو کوس جوا کر وہ اکیس رہ گئی ہے۔ اس نے یہ غصہ جیسے کے دست نہ بے کے ساتھ نہیں کر کے پڑا کر یا۔ شیدا بھی صرف چند سال ساتھ بنا سکا اور ایک لڑکے کا تھوڑے کر غائب ہو گیا۔ شیبے کے اس نے کسی سے نکاح نہ کیا۔ وہ ایک امیر گھرانے میں برقی انجن پر عازم ہو گئی۔ ایک دن گھر کے ایک نے کسی تقریب کے بتنے اب دس کا لڑکے کے ہاتھ میں تھوڑا۔ ذراں کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور متصور پڑھا رہا۔ اس کے ہونے بھائی پتے رہے۔ انکیاں گھر کی انکے شادو کو دھتے لے کر گھر سے نکال دیا!

شادو نے گھر کے دروازے پر پٹ کھول دیے۔

پچھلے دنوں کی آنکھیں زرد اور سے نکلیں۔ ولی زبانی میں باتیں ہوئیں اور باتوں کا شور جند جوا دھتے کی سننا ہٹ شادو کے غریب پہنچا۔

دیکھو شادو! اب جو کہنے کا کام شروع کر دیا ہے اس سے بچنے کی رہی سہی عزت بھی جاتی رہے گی۔ پہلے بھی تم نے اپنے گھر سے بھاگ کر بھاری ہنگامہ ڈال لیا تھا۔

شادو غماز ہو گئی!

اس نے پچھلے دروازے کو بند کیا اور چور دروازہ کھول دیا۔

پھر پچھلے دنوں نے ایک کاغذ منی کی۔ اس میں اسرار احمد اور سید فیصلہ شامل تھے۔ طے پایا کہ شادو کے گھر جا کر اسے متنبہ کرنا چاہیے تاہم نے دروازے پر ٹوکے اس وقت کی۔ اس نے ٹوکے سے ایک خط بھی نہ کیا۔ اس نے ڈب بانی ہوئی آنکھوں سے ایک ایک پہرے اجازت دیا۔ ڈب بانی ہوئی آنکھیں اس کے چہرے پر ٹھک گئیں۔

ان آنکھوں نے کہا: تم بھی!

اسرار احمد اور سید فیصلہ نے نظریہ چاہیں نہیں ڈب بانی ہوئی آنکھیں پھر پھر بنے تھیں۔ اسرار کو یوں لگا جیسے کوئی بند لٹ گیا ہو۔
- بیوہ آنے کا اور سارا خاندان ڈوب جانے کا۔ یہ لوگ ڈوب جائیں گے اور ان میں سے کوئی بھی اس منہ میں سے اُجھڑ نہ سکے گا۔
ایرٹ ان سب کی پشتوں پر شرافت کا جو پر دبے۔

وہ متشدد گستاخ سے ہٹ جانا چاہتی تھی مگر اُس کے گناہ نے اسی کی وجہ سے کئی شریف رشتہ نہیں مل رہا تھا !
شادی کی ناکام شادی تھی.....

نہیں.....

پھر ناکامی کوئی تھا..... ایک گھنٹہ..... ایک حادثہ..... ایک لمحہ.....

نہیں.....

اب یہ مگر کی آغوش میں سونے کی بجائے دفن ہو گیا تھا !

اسرار قبر سے ہٹ کر دو قدم ڈال رہے تھے۔

میاں ایک ہڑھا اداکان کھڑا تھا اور اُس کی جانچوں سے ایک ماتی نوز بھر رہا تھا۔ اسلئے.....

جول اور پیر کی سوگند بھاریوں پر سہیوں کی وصولی تھی !

اور لوگ قبرستان سے جا چکے تھے۔ صرف منہر دکھ رہا تھا۔

پھر وہ سب منہر وہی ہو گیا۔

قبرستان کا اسرار چاروں گھنٹے سے پک کر آیا۔

جانچوں سے پانی کی جھٹکا رہا تھا۔

قبرستان کے آگے میں موت تمس کرنے لگی۔ اُس کے پانی کی جھٹکا میں آواز نہیں تھی۔

تم کوں جو !

پانی کی جھٹکا بھر بھر تھی۔ اُس کے سینے پر موت کی زد تھی۔

میں جوں شادو !

تم !

اُس کا دُک درد پڑ گیا۔ وہ کانپ گیا۔ وہ ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”ابھی ابھی تم تو چھو رہے تھے شادو کو کس نے قتل کیا !“

”اں !“

”جاننا چاہتے ہو اُس ناکامی کوں ہے !“

نہیں !

”سُز تو وہ ناکامی تم جو !“

نہیں !

”اُس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کا گھنٹ دیا۔“

اللہ کا حکم

احمد سعید

اس زمانہ میں کے لائق تھے یہی تھے وہ اس سے ہمارے دوست پڑوسی میں بندہ ہر منہ نہادہ سے زیادہ تھوڑی فرید کر پھوڑ دیتا۔ انہیں اس کی ایک ایک سرفروں سے باہر نکالنے کے بعد ہر دم بے چین رہتا۔ نئے نئے شہرے اور چھوٹی چھوٹی نیکیاں جہیز پرے پرے سے باہر نکال کر صورت میں ایک ایک کی مانند غیر دائرہ بناتے جوئے اڑ جاتیں تو اس کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو ڈبڈباتے۔ اس کے پیچھے ہی سے شوق پیدا ہو گیا تھا جو آہستہ آہستہ بنوں کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اگر اس کے پاس پندرہ ستر یا ان کے کئے ہوئے پیسے نہ ہوتے تو وہ یہ سچ و گند کے نئے مریضوں اور بہرہ مندوں یا تو باور پیچھے چھوڑنے سے تھا۔ پانچ سے زیادہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ وہ چرواہے ایک کے پاس آجاتے اس لیے کہ اس کے پاس کھانا پانا تھا اور وہ ہر شخص سے ملتا رہتے تھے بھی تو لوگ اُس نے سوچا وہ نہت کرتے ہیں کہ اس کے باپ کی طرف غیر محض ہوتے ہیں۔ کبھی قدرت کی ہر چیز گنتی آتا ہے اور وہ دیکھ کر بھی زندہ رہتی ہے۔ اس کے سوچنے کی مدد کیا تو کیاں تو تھی کہ نہت اور ہاتھ پیروں میں بند رہنا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے اُس نے اس کو کھانے میں دیا بیشتر وقت خانہ کر دیا جسے دوسرے بچے اور جوان تھوڑے حاصل کرنے میں مصروف کرتے اور اس سے غارت جو کر اپنے پانچ پرکتے ہونے کے قابل جو ہائیں۔

جب جو کار سے کا تو انداز بنے کا نہ پھوٹے گا۔ چار مار کر پیسے جو کما لیں اور یہ خوب زاد سے انہیں پندرہ پھرانے کی نذر کرانی ضروری ہے۔

اس قوم میں باپ سے سالہا سال سے سوار کرنے کی بے سوا کوشش کرنے کے بعد ایک روز فیصلہ کیا اور ابو سارہ انداز میں اس پر اس کی اس کے سامنے اٹھا۔ اس کے جواب میں وہ ایسے مہر اور بے جا کھنڈے ڈالے بیٹے پر اور اپنی چھوٹی قسمت پر آنسو بہا کر کہی۔ کبھی ان کا وہ تو اس کی زندگی میں ایک کوڑھی کرنا ہم کو اپنے ہنسی و ہنست روئے کے باوجود اس پر بھی دھلنے کے آثار پیدا ہونے کی جگہ اس پر ایک انگشت ہر جوں اور سرشاری کی کیفیت جاری ہو گئی۔ اور جب اُس کی ان سے بھی اُسے ایک بیکار ہستی نظر آیا اور اُس نے شہر پر زندہ کی ظہیر کی اور یہ کام کاش تو پیدا ہی نہ ہوتے اور ایسا۔ دیکھ کر خوبصورت تھے۔ تو اس نے جواب دیا۔

ابن خوشی جو کہ اندر سے لگے کل رات کھڑا رہا کہ میں نے.....
 دیکھا کہ ایک بندہ زندوں کو آواز دے رہا ہے۔
 اس کے جواب میں بیٹے کی آنکھیں کھلیاں گئیں اور اُس نے کہا۔ "ان کہنے تو وہی بات کہ مجھ کی...."
 میں نے لگے جا ہے۔ اگر میں تیرے دل کی بات نہ بوجھوں تو تو اور کون بوجھے گا..... میری نظروں کے سامنے ہے

اور بجا :

”برئے پخیر پر دنیا پہلے بنا کرتی ہے۔“

”توبہ کر توبہ۔ مردود۔ تیرا یہ حال!“

”ہاں میں نے مدت خواب دیکھا ہے۔ اس میں اللہ میاں نے مجھے۔“

لڑکے کا فقرہ اس کے گل پر ان کا زور سے ایک تھڑکے نے نکل کر دیا۔ وہ خود خوف سے کانپنے لگی کہ اس لڑکے کو کیا رہا ہے۔ اس کا داغ لڑکیوں میں پک گیا۔ ایسے شیر جیسے جوہر پر یوں بھی اتنا اٹھانے کو نہ گہرا۔ لیکن لڑکے نے اس کے جواب میں نہ ہی سے سر جھکا دیا اور اپنے کمرے میں جا کر چار پائی پر پتھر کی مانند گر پڑا اور وہاں دیکھتے دیکھتے یوں سو گیا جیسے اُسے بڑی نیند آئی ہو۔

اس کے مجبور و مجبور کر جگانے پر کھانا کھانے کے لیے اٹھا۔ نیم خوانی کی سی حالت میں دو پاروں والے پیسے اور پھر سو رہا۔ پات باہر سے وہیں آئے پر اس کی عزت دیکھا کہ گوارہ کیا لیکن اس نے چپکے سے اُس کے سر پر ہاتھوں سے روپے کے نوٹ دیا۔ یہ سب حالات وہ جب بھی اس پر غما ہوئی تو اس کے سر پر اس وقت کچھ پیسے چھوڑ جایا کرتی۔ اس نے رات ایک خواب دیکھا تھا کہ تجربے میں بند بازو بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ اسے اپنے والدین، اللہ کا یہ نظم صادر ہوا آسانی دیا۔ ”اعلا میسے پیسہ۔ جا اور سارے بازوؤں کو آزاد کر!“

جب لڑکے کا اتنا زور کسی سرسراقی شے سے لگا تو اسے وہاں نہیں روپے کے نوٹ پڑے دھانی دیے جنہیں اس نے ہاتھ لگ کر غور پر تبصر کیا۔

اُسی مہذب کے ذریعے بارہ گھنٹے کی مسافت کے کر کے دو دو ہو پنا جہاں اُس نے اپنا مشن پورا کرنا تھا۔ دُور ہی سے اُسے راز کی خبر ہوئی تھی پنا پنا سے پڑا کہ گھر گھنے سے پہلے لڑکے دیکھنے اس کے باہر انتظار کرنا پڑا۔ اس کا زور دیکھتے ہی وہ معاشرے کے تجربے کی طرف نکلا۔

شیر پر سسکے اندر بڑی عزت سے پھر نکلا۔ ہاتھ زور اٹھانے پر سسکے کے قریب پہنچ کر اس سے۔ ”وہی میں۔“ میں اٹھا۔ میں بھیجا۔ اب فکر نہ۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے دو زور بازو اس کی طرف یوں بھیجا دیے جیسے اسے اپنے لڑکے کا پناہ تھا جو۔ وہ ساتھ ساتھ گھر میں کچھ بڑھا کر دیا۔ ”یہ کوئی ستر نہ۔“ ہاں۔ جب شیر اس کی جانب آتا تو زور اٹھائی لیکن اسے اسیانہ اور فحشہ انداز میں پسلی باتیں اور وہ اسے اشاروں اشاروں میں کچھ کھانا دیا۔ ”تو میں تجھے کھانا کھاؤں گا۔“ اور نرم ہاتھ جو گیا تھا۔ زور اٹھائی اس کی موجودگی سے بے خبر تھا شہر شیر خور دینے اندر وہی تجربے میں چلا گیا۔ اس کی حالت نرم ۹ اسے میں جو کہ تجربے کا احاطہ کرنے کا۔ اُسے نہیں محرم تھا زور آسانی بڑے تجربے اور وقت نہ انداز میں اُسے دیکھنے کے۔ وہ تو تجربے کے مذہب چاہا تھا جہاں قدم کھانا نہیں تھا۔ اُس نے تجربے کی حنائی میں سے ہاتھ اندر

اگلے روز فقیر کو خبر ہوئی کہ اس نے اپنے گھر میں ایک اور آدمی کو لے کر شہر میں لے جاتا ہے۔ وہاں اس نے ایک اور گھر میں جا کر رہ گیا۔

پھر وہی آدمی وہاں سے گھر میں آ گیا۔ یہ سب باتیں فقیر کو پتہ چلیں۔ وہ اس آدمی کو بلوایا اور اس سے کہا کہ اس نے تم کو یہاں لے کر آیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے اس آدمی کو بلوایا ہے۔

پھر وہی آدمی وہاں سے گھر میں آ گیا۔ یہ سب باتیں فقیر کو پتہ چلیں۔ وہ اس آدمی کو بلوایا اور اس سے کہا کہ اس نے تم کو یہاں لے کر آیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے اس آدمی کو بلوایا ہے۔

پھر وہی آدمی وہاں سے گھر میں آ گیا۔ یہ سب باتیں فقیر کو پتہ چلیں۔ وہ اس آدمی کو بلوایا اور اس سے کہا کہ اس نے تم کو یہاں لے کر آیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے اس آدمی کو بلوایا ہے۔

پھر وہی آدمی وہاں سے گھر میں آ گیا۔ یہ سب باتیں فقیر کو پتہ چلیں۔ وہ اس آدمی کو بلوایا اور اس سے کہا کہ اس نے تم کو یہاں لے کر آیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے اس آدمی کو بلوایا ہے۔

پھر وہی آدمی وہاں سے گھر میں آ گیا۔ یہ سب باتیں فقیر کو پتہ چلیں۔ وہ اس آدمی کو بلوایا اور اس سے کہا کہ اس نے تم کو یہاں لے کر آیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے اس آدمی کو بلوایا ہے۔

پھر وہی آدمی وہاں سے گھر میں آ گیا۔ یہ سب باتیں فقیر کو پتہ چلیں۔ وہ اس آدمی کو بلوایا اور اس سے کہا کہ اس نے تم کو یہاں لے کر آیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے اس آدمی کو بلوایا ہے۔

پھر وہی آدمی وہاں سے گھر میں آ گیا۔ یہ سب باتیں فقیر کو پتہ چلیں۔ وہ اس آدمی کو بلوایا اور اس سے کہا کہ اس نے تم کو یہاں لے کر آیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے اس آدمی کو بلوایا ہے۔

پھر وہی آدمی وہاں سے گھر میں آ گیا۔ یہ سب باتیں فقیر کو پتہ چلیں۔ وہ اس آدمی کو بلوایا اور اس سے کہا کہ اس نے تم کو یہاں لے کر آیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے اس آدمی کو بلوایا ہے۔

انچ کر اس سے کچھ کھینچ لیا۔
 ۱۰۔ اندر شربہ دیا۔ وہ کہہ رہا تھا: "میں نے یہ سب کچھ کھانے کا شوق نہیں رکھتا۔ دیکھ کر لگتا ہے کہ میں کھانا کھا کر
 نے بند توں سے پکے کدو کے پتے کھا رہا ہوں۔"
 ۱۱۔ اس کی دیکھ کر اس نے اس کا نام بڑا چار بچہ تھا۔ آپ دوسرے اقا پانی کی آواز آئی۔ یہ مجھ کو نہیں تاکہ وہ دیکھ کر لاؤں۔
 ۱۲۔ انا (میں) نے اس کے دوسرے اقا کے ساتھ ہی کھینچ لیا۔ اس پر وہ اس نے اس سے مل کر کھانا کھا لیا۔
 ۱۳۔ اس کا وہ دیکھ لیا۔

۱۴۔ انا کہہ رہا تھا: تم بچے روکنے کے لئے کہہ رہے ہو: "میں نے پتھر میں کدو
 ۱۵۔ انا نہایت ہی پیار سے اس سے کہہ رہا تھا: "خدا! انا پیار ہوں۔"
 ۱۶۔ وہاں کہ (میں) ہسپتال چلا آیا تھا وہ تو یہ کہہ رہے تھے کہ میں رہا۔
 ۱۷۔ ان دونوں کو آزاد کرادو۔ آزاد: اس کے غریب بھائی تھے۔

کڑی

ستیش بترا

سڑا پٹہ سے اپنے ایک کڑی بندہ جس میں بیٹے ٹاک پر دستا کر رہے تھے۔ یہ اُن کا دفتر میں آخری دن تھا۔ اُن سے ذرا پیچے
نایت ادب سے کڑی اُن کی سیکرٹری بس دائیہ داری باریک آئینہ شہہ خواہش کرتی اور آئینہ رسی دستا کرتے ہوئے کبھی کوئی سوال
پوچھ اُٹھتے تو وہ نہایت احمدا سے ملبوس سواست فراہم کرتی۔ سڑا پٹہ رسی کو بس دائیہ داری کی فراہ داری اُس کی کاروباری سالار
رہنے کے عروج پر بھراور نیپ ریکا۔ ڈس کی یادداشت نے پیشہ متاثر کیا تھا۔ وہ اکثر فرم کے ڈائریکٹروں اور دہلے افسروں سے کمارتے
اُس دائیہ تو اس فرم کے سچے پرتی ہٹا سیکرٹریا ہے !

جب سڑا پٹہ رسی آخری خط پر دستا کر چکے تو اُنھوں نے اپنی سنہری سینک آٹا، کریز پر رکھ دی۔ اور اپنی انگلیوں آنکھوں
و جسمیوں کی پشت سے جے جے اُس دائیہ کی طرف دیکھا اور پھر اُن کا بھڑا ہنہ اچیرہ نکلا دیا۔
اُس دائیہ ! تیس سال کے بچے جیسے بھر میں آج اپنی تلم ذمہ داریوں سے بکدوش جو رہا ہوں۔ اُن اُس فرم کو شرف
سے بھی اتنا ہی عہدہ بر گیا ہے۔ کیوں بچے پندہ برسوں میں جس وقت سے فرم کا کام بڑھا ہے اور میں اُن سے اُن بڑھی ہوئی قدر
داہیں کو بھانے میں جو دہم نے لگے دی ہے میں اُس کے بچے سے شکر گزار ہوں ! اور وہ اُس سے اتنا لہنے کیے
اٹھ کرے ہوئے۔

بس دائیہ کا دھتوہ دھبے سے ایک لڑکے سے لڑ گیا۔ اُسے سڑا پٹہ رسی کے ساتھ کام کرنے میں جو نصف آیا تھا اور
بے کبھی بھی نہ بھلا سکے گی۔ اُس کا کاشتت جذبات سے بھرا ہوا۔
میں آپ کی مرانیوں کو کبھی نہیں بھاسکتی سر ! میں بھر فرم کے سب لوگ آپ کو پیشہ عہدہ کریں گے ! اُس نے اُنے بڑو
سڑا پٹہ رسی کا اٹھ تمام کیا۔

سڑا پٹہ رسی شستت جہی شاہد سے اُس کی طرف چند لے دیکھتے رہے اور پھر سب کے ہوں پر زبان پھرتے ہوئے اُسے اُس
اور میں تمہاری ہونہ تک خدات کے لیے ایک نہایت سولی سا شہد پتی کرنا چاہتا ہوں ! اُنھوں نے سڑا پٹہ رسی کو اور اکھروہ اسیاب
رہنے کی کڑی نکال کر اُس کے اٹھ میں رکھ دی۔

سڑا پٹہ رسی ! وہ اتنا قہقہہ دیکر کہ چوک پڑی اور پھر اُس نے شستت جذبات سے سڑا پٹہ رسی کی تیش کی پشت
ارے کیا۔ اُس کی وہ ہمیں بھرتی تھیں۔

نہ دیا اس سے اس واقعے کی اس میں پہچاننے کے

دو دفعہ پر ایک جانی پہچانی دنگ ہوئی۔

”کم ہونے کی؟“ ان کی آنکھوں میں ایک کھنکھاہٹ ابھری۔ ”ابھی کا قیاس بالکل درست تھا۔ وہ جیک گراہم کا تھا۔“
”ایڈیٹر؟“ تم تعجب سے دنگ ہو رہے ہو۔ میں نے سرہا ایک ریٹائر ہونے والے ڈائریکٹر کے حضور میں اپنا سہم

لاؤں؟“

”ہو ڈونٹ بی تنی علی؟“ ایڈیٹر نے اٹاکر گراہم کو کندھوں پر دباؤ ڈال کر کڑی پریشان ہونے کا۔ ”میں ذمہ سے
نہ ہو رہا ہوں۔ تم سے تو نہیں؟ میں ویسے بھی اب ذمہ کی ذمہ داریوں کا بار جو اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔ ذمہ کو جہاں توں کی
بردست ہے؟“

”ایڈیٹر کی بھی؟“

”وہ تجربہ تو تمہارے جسم ٹیپ میں کر رہا ہے ہی؟“ ایڈیٹر نے قہقہہ کھاتے ہوئے کہا۔ ”جگہ جیتیں جے کہ تمہارے نے
ڈائریکٹر جے۔ لی ٹیل کا پورٹ اور آقا اور تمہارا جانیوہ تجربہ اس ذمہ کو اور ڈونٹ دنگ سے جانیو گے ایسے یے کیا آتا فرم ہے
اس ذمہ کے نام کے ساتھ میرا حق کام بھی سبک ہے؟“ اور پھر وہ ہنس دیے۔

”یاد ہے وہ دن جب تم نے اس ذمہ کو ٹرن کرنے کا چوڑا میرے سامنے لکھا تھا؟ میں تو کچھ دوسرے کے کانپ کانپ گیا

”ہاں“

”ایڈیٹر؟“ تم تو فراموش ہوتے ہو کہ اس ذمہ کو چھنے میں پہلے یہ نائن کے کچھ مارجن آئے اور جب بھی میرے سہم
انگائے توجہ تھی ثابت قریب تھا کہ تمہارے جگہ سہارا۔ یاد ہے وہ خبر تھی جب رونچہ نے اپنا بازار انھیں پہلے سامنے
لجھیں اور تم نے ان ناخنوں کے لٹکے ٹکڑے ٹکڑے کئے ہوئے کچھ فون تمہاری سے لکھا تھا؟ ایڈیٹر نے ”ہاں“ کہا کہ اس ذمہ کو
سے اب گرام کوک سے مسٹر پانڈے میں سے ٹرن ہوئی تھی۔ ایڈیٹر نے ”ہاں“ کہا کہ اس ذمہ کو اور دماغ میں اب بھی اتنی بہت اور
ت ہے کہ وہ ابھی کچھ کمزور کوک سے جمنے لگیں۔“

”مسٹر ایڈیٹر؟“

”اتنے میں دو دفعہ پر کچھ دنگ ہوئی اور تمہارے سے کچھ اور ماننے میں سے ٹیل کے بجائے کچھ ٹیبلٹوں
سے بہت سہارا تھا۔“

”کم ہونے کی؟“ اور ڈائریکٹر کی ایک ہی طرف قہقہہ کراتی تھی۔ ”مسٹر ایڈیٹر نے اپنی پورٹ اور اس میں

”اسٹیبلسٹ انڈسٹری کا

”مسٹر ایڈیٹر؟“ وہ میری آنکھوں میں دو آنکھوں کے ساتھ ہاتھ تھا۔ ”اس نے اپنا اتنے سال کے لیے آگے بڑھا دیا۔“

کتابخانه عمومی مسجد جامع کربلا

۴۰. میں فرماتا ہوں کہ جو شخص میری گواہی دے گا وہ میری گواہی دے گا۔
 اور میں فرماتا ہوں کہ جو شخص میری گواہی دے گا وہ میری گواہی دے گا۔
 نیز میں فرماتا ہوں کہ جو شخص میری گواہی دے گا وہ میری گواہی دے گا۔

وہی وہی ہیٹ! you are the very best! آؤں گا، آؤں گا کرے ہے یہ
پوچھا۔

۱۔ بھلا وہ ہے : "بیشمار دھن ہے تیرا"
 ۲۔ "تو دھن ہے پر کچھ بھی نہ ہو ات پر کتاب : بھگوان ہے کا"
 ۳۔ "وہ ہے : دھن کے خیر ہے سب کراد : ت پرے تھے ہیں"
 ۴۔ "بھلا وہ ہے : میں بھی چوں کہ : تھو ہے کیا اس دے میں : تم میری : ہے کیا"
 ۵۔ "میں بھی : میں : دھن کے : وہ اور خیروں کا :

میں کبھی بولتا تھا کہ یہ مرد اتنا بڑا اور اتنا کانا کھایا جیسے تم نے دو سو سال تک کھانے کے اپنے خون سے
 سے سہا ہے۔ انہیں اس کا زور اور زور ہے۔ انہیں اس سے کہلاتے ہوئے کنگا ٹھیک ہو رہی ہوگی؟
 انہیں وہی کہ تم کو تھے جو میں بتانا دھڑا آتی ہیں ہوں۔ ٹھیک ہے یہی کہ وہی وہی رہا ہوگا؟
 فرم مجھے کہ ان کے بارے میں تم کبھی پتا نہیں دے سکتے ہو؟
 نہیں اب میں نے کھانا دیا ہے۔ وہی میں بھوکا تھا ہوں۔ کچھ آرام ہو رہی پائیے اور وہ رشتہ میں نہیں ہوگا
 ٹھیک ہے اب یہی کہ تم سے خیانت کا احترام ہے۔ انتخاب میں پتا ہوں؟

[illegible]

کھڑا شروع کیا تھا جس سے وہ بڑھ گیا۔ وہ چند گزین اور کچھ ایک تھوڑی سی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔
 تھوڑی سی کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ کے نیچے لگا ہوا تھا۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔
 نہ ہونے نہ تھا کیا کہ ان کے ہاتھ میں ہاتھ کے نیچے لگا ہوا تھا۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔
 سے ہر ایک دیکھ کر ہنسی لگا۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔

سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔
 اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔
 اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔
 اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔

اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔
 اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔
 اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔
 اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔

اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔
 اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔
 اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔
 اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔

اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔

وہ دیکھ کر

اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔
 اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔
 اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔
 اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔

اس نے سزا دینے کے لئے جس نے اس کی کاشت کی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسی لگا۔

مگر یہ سب کچھ سمجھنا کہ اس کا کیا کرنا ہے؟
 نہایت اچھا خیال ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ
 جس کا یہ توفیق ہو کہ شکر کا اصرار دیکھ کر اپنی حالت پر حیران نہ رہے۔

جو کہ مشائخہ کے کام کے بیشتر ذمہ دار شریعت کو سنبھالنے والے تھے جس کا یہ کام تھا کہ وہ جو شریعتی اصول
 بتا دیتے تھے ان کی ایک کتب خانہ بنانے پر کام کرتے تھے۔ یہ چند فرائض تھے جو ان کے ہاتھ میں تھے۔
 لیکن بہت سے ایسے حضرات تھے جو ان کی خدمت میں آتے تھے۔ ان کے پاس فرستے ہوئے سب کچھ
 کچھ اس کا نام تھا کہ اس کی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہاتھوں میں لکھتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں
 کچھ شریعت کے مسائل تھے جو ان کے ہاتھوں میں تھے۔

یہ سب کچھ اس کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔
 ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔
 ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔

۴۲۹

ایک وجہ یہ تھی کہ ان کے ہاتھوں میں اس کے لیے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔
 ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔
 ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔
 ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔

اس کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔
 ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔
 ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔

اس کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔
 ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔
 ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تھے۔

وہ بڑی مشکل سے اپنے ان خیرات کو ان کے ہاتھوں میں لے کر آتے تھے۔
 وہ اس کو لے کر آتے تھے۔

میرے بچے رخصت ہونے والے ہیں۔ میں سنا سنتی دینے کا فیصلہ کر لیا ہے ؟
 اسے کہنا میں والا یا ؟۔ مہرایشہ رس چوک پڑے ۔ تم ۔ تم یہ فرم چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہو ؟
 مہرایشہ نے اپنے لیے ایک ہی سیکڑی لٹا دی ۔ اسے وہ مہر کہہ رہے ہیں اور بگے مہر مہر کے ساتھ کلم کہنے کے لیے
 اٹھ کھڑے ہوئے تھے ؟

مہر مہر کے ساتھ بے چین تھی سیکڑی لٹا دی ۔ کیا وہ فرم میں پھلے سے نہیں تھی ؟
 نہیں ۔ اور ایک لڑکے نے مہرایشہ سے پرچے لے لے کر دی دیکھا ۔

یہ فرم کی پامی کے بالکل خلاف ہے ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ ایک بے ہوشاں نہیں کہتا ؟ اور انہوں نے ٹیلیفون پر مہر کو مہر
 نہیں کہنے کے لیے کہا ۔ میرے بچے ہسٹلر کچھ نہیں ہو سکتا ؟

ہے ۔ ہ میں ایشہ سے ہلا رہی ہوں ۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے اپنے بچے فرم سے باہر کی کوئی سیکڑی لٹا دی اور اسے کہہ دیا ؟
 کی اور میں سول کی طرف خود لٹا دی تھی ۔ وہی تھا جو سال سال فرم کی پامی کے بارے میں اپنے فیصلہ دیتی آئی تھی ۔
 ٹیلیفون کے دوسرے سرے سے ایک نہایت مختصر سی اور آئی ۔

بیکس کیوں ؟ مہرایشہ کی اور میں جھوٹ تھی ۔ یہ فرم کی بنیادی پامی کے خلاف ہے ؟
 دوسرے سرے سے ایک نہایت مختصر سی اور آئی ۔ ایشہ کے سرے کی جھڑیاں ہر گز نہیں ہوتی جاتی ہیں اور ان کی آواز
 میں بھی ایک تھکی سی چٹکی ہو جیسی ہلا ہلا طوطے کرنے والا اور شاہ آواز تھا ہو گیا ۔

ہاں ہے ۔ نہ تو ایک ہی کہتے ہو ۔ بچے فرم کی پامی نے بارے میں اب کچھ بھی کہنے کا حق نہیں پہنچتا ۔ اور انہوں نے وجہ
 سے یہ کہہ دیا کہ میں والا یا ہے ۔ تو میں نے ٹیلیفون کا چونکا دیا ۔ انہوں نے میرے اخبار اٹھا لیا اور لٹا دیا ۔
 ہرے کیسے کا وہ خانہ کھولی کر باہر نکلتے تھے ۔

میں والا یا دیر تک ٹھک رہا تھا مہرایشہ رس کی خالی جھوٹی ہونی کڑی کی طرف دیکھتی رہی ۔

مگر یہ ہے کہ میری اس میں دلیا کہ اس کی گڑی بنائے ہے؟
 نہایت اچھا ہے۔ میں دلیا ہے۔ وہ کہ بہت مدد کرتا ہے؟
 میں دلیا ہی توفیق علی کہ تو گناہ سے مدد دے کہ اپنی کتاب محمد کا پرچہ لکھ

چونکہ مشراشید سے کہہ گئے کہ بیشتر ذرہ مادہ کا مشراشید کو سونپ دیا گیا تھا جس کو وہ ایک اور کچھ تو جمع کر کے بددی مشراشید کے ایک کڑی
 لائی جاتی تھیں ایک بجنہ گڑ جانے پر بھی کئی ایسے آؤں نہیں گئے۔ وہ چند دن تک مشراشید سے کہیں کہہ جاتی تھیں کہ وہ خود کو مشراشید سے
 لیں، بہت باتیں اس کا مشراشیدات ختم ہو گئیں۔ وہ جس میں ہوشے باقی رہنے کے کہ کوشش کرتے تھیں اس کے پاس فرست گئی تھی۔ سب وہ کہیں
 بھی اس کا اتنا یاد کیا کہ اس پر بھی سیٹ پر بیٹھنے سے ہاتھ نہ لال پٹنے میں شمول رہتی۔ نہ جانے سے کہیں اس سے بددی مشراشید کا کیا راز
 ہے مشراشید سے کہہ گئے کہ اس کے ساتھ ساتھ راز ہو گا۔

ایسٹیکہ اس دستان میں باقاعدہ دفتر آئے لیکن گنڈ دو گنڈ کے بعد وہ اپنا کپٹے کپڑے نکال کر چل پڑے گویا وہ تاحور
پنیر سے میں بند رہنے کے بعد انھیں آزاد کرنے کیلئے اپنے پر قتل ہے ہوں۔ دختر کے کچھ لنگ ان کا احترام کرتے لیکن ادھر سڑاوا
کے پیرسپ کے دوست پر رمانہ جو سننے کے بعد کچھ دھڑکنے لگی اور اسے کوس بولنے لگا تھا جیسے نے لی ریگن پٹیل کے دل میں ان کا احترام
۴۱۰

[illegible]

میں دانا ہے۔ یہی سہ نیا گرسا فی۔ مشر طیل کوئی سیوڑی۔ آپ چوک مشر متہ کے کہیں میں جاری ہی مشر ٹیل ہے۔ اس پر
 یہ جیت دینے کے لیے ہے؟

میں دایا کو چپ ایکس پکڑا لیا۔ وہ نہایت مشکل سے سنبھل۔ اس نے اپنی سیٹ خالی کر دی اور اس پر ایک نہایت
دور پہنچا۔ اسے اس نیا کر سٹیل ٹیکسٹ وک کہہ جوتی تھی۔ جس دایا کو ایسے معلوم ہوا جیسے کسی جوان آدمی نے نوردی ماس
دیکھا کہ ٹیکسٹ اور سٹیل دیا جو۔

۱۰۰۰ روپے ان خیرات کو کے مشاشر کے کیوں کی طرف ہجرت، دنگ کے جاب کا تھوکیے بغیر۔

میرزا کا چکر گھومتا تھا۔ میں نے اسے آستین دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔
 اسے کہیں میں واڈیا؟ میرزا بڈر میں چمک پڑے۔ تم۔ تم یہ فرم چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہو؟
 میرزا ٹپل نے اپنے بیک کا ٹیکڑا لٹکا دیا۔ کچھ ادا ہے اور بگے میرزا کے ساتھ کلام کرنے کے لیے
 تیار ہے۔ دیکھتے تھے؟

میرزا کے ساتھ بے ہوشی کے ٹیکڑے لٹکا دیے۔ کیا وہ فرم میں پھنسے نہیں تھے؟
 نہیں! اور ایک لڑکے نے میرزا بڈر سے پرچے لے کر جاری کیا۔

یہ فرم کوٹھیک کے بالکل غلط ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا ہے؟ اتنا ہی نہیں جانتا؟ اور انہوں نے ٹیلیفون پر میرزا کو
 ٹپل کے ہونے کے لیے کہا۔ میرے بے ہوشی کے ٹیکڑے نہیں ہو سکتا؟

جے۔ جے میرزا بڈر سے ہلا کر لائیں۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے اپنے بچے فرم سے باہر کی کوئی سیکڑی اپرا سٹ کر لی ہے؟
 کی آواز میں معمول کی طرح خود اعتمادی تھی۔ وہی آواز جو سالہا سال فرم کی پامیسی کے بارے میں اپنے فیصلہ دیتی آئی تھی۔
 ٹیلیفون کے دوسرے سرے سے ایک نہایت مختصر سی آواز آئی۔

کیسے کہیں؟ میرزا بڈر کی آواز میں جھوٹ تھی۔ یہ فرم کی بنیادی پامیسی کے خلاف ہے؟

دوسرے سرے سے ایک سیل کی آواز آئی۔ میرزا بڈر کے چہرے کی جھڑیاں ہر لمحہ جاری تھیں اور اُن کی آواز
 میں جیسے ایک ٹکڑی سی چمک جو جیسے سالہا سال طومست کرنے والا، دشاہ آج تیار ہو گیا ہو۔

ان ہے۔ ان کی ٹیکڑی کہتے ہو۔ جے فرم کی پامیسی کے بارے میں اب کچھ بھی کہنے کا حق نہیں رہتا۔ اور انہوں نے دوسرے
 صبح کار بانٹوں سے میں واڈیا سے غریب خانے میں ٹیلیفون کا چوٹا پس رکھ دیا۔ انہوں نے میرے اخبار اٹھا لیا اور دیکھنا شروع
 کئے۔ کیسے کا دماغ کھول کر باہر نکل گئے۔

میں واڈیا دیر تک ٹکڑی ہانڈے میرزا بڈر کی مثال سمجھتی رہی کہ وہ کی طرف دیکھتی رہی۔

قرآن مجید کا سب سے پہلا اردو ترجمہ

ہجرتِ حبشہ کے پہلے پائی گئی تھی

حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ مجددِ ملت حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند
میرزا کے گرامی تھے۔ ان کا شمار حدیثِ علم و فاضل اور صاحبِ روزِ بدینہ رنگ تھے۔ آپ کے
قبیلہ مانی کے دو چتر علم و دکان پھیلے۔ ایک سوانح القرآن کے نام سے جانتے ہیں۔
یہ آپ کے دو ترجمہ ہیں اور متعدد قصص بھی جنہوں نے فتنہء معین شیعہ سے بچ
پئے (آپ کریم کا ترجمہ اس وقت کی مرد و آزاد میں کیا۔ ترجمہ) میں کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم
نے سوانح القرآن (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح) کو واضح ... (شعور کرنے والوں) لکھا تھا) اس کا ذکر
اور وقت کے ساتھ کیا گیا تھا کہ اگرچہ اس کو آپ نے دو صدیوں گزر چکی تھی مگر اس کی شہرت
اور عظمت آج تک ابھی ہے۔

اس تاریخی ترجمہ کے مترجم حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ یہ بھی جانتے ہیں
ہستم دہلی پیا ہونے اور وہی ذکر الہی اور خدمتِ نبویؐ کہتے تھے۔ اور قرآن کی حدیث کا
اس وقت تک جتنے معانی شیعہ میں وفات پائی۔ دہلی میں دہلی دارالحدیث کے بار
نصاب میں ان کا مزار زیارت گاہ و محراب خاص ہے (تو کہ حدیثِ نبویؐ کا یہ مزار و مرقع
دارالحدیث میں ملے۔ وفات شیعہ کا ہے جو کہ نہیں)

اس اور دیکھا اب ترجمہ کا ایک قلمی نسخہ حضرت عظیم فریدی صاحبِ حبیب شاہ ریاست
جنوبہ کشمیر کے کتب خانہ میں تھا۔ شیعہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ جس کے بعد ان کی تمام
عربی و فارسی کتب اور ہزاروں کتب و ادبیات کا بے شکل ذخیرہ ان کے مکان میں جمع
اور یہ جمعہ بھی کھنڈ ہوا۔ اسی میں ہمارے کتب خانے سے کچھ ایسا نکلا کہ مرکزِ قادیان میں ان کی
میں جس ہزار سے زیادہ عربی و فارسی کتب کی تھیں اور محفوظ رہیں تھیں۔ میں جب شیعہ میں اس
عظیم و شہرت کا ذخیرہ قادیان میں لایا تو میں نے وہاں خود دیکھا کہ اب ان کتب کے کچھ
شاہ صاحب لایہ ترجمہ بھی دیکھا۔ میں نے اس وقت اس کے دیباچہ کی نقل کی تھی۔ یہی نقل
تھی اور خود کے سر پر سورہ فاتحہ کا ترجمہ بھی لکھا تھا۔ یہ بھی دیکھا ہے۔ یہی ہے

کے بعد یہ دشمنی محض صاحبِ در نقوش کی فراموشی پر نگار ٹھکا کرام کی خدمت میں حاضر ہو کر
پیش کردی۔

یہ دیباچہ اگلے سے پانے دو صدی پہلے کی اردو کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے۔ اس وقت جو
رم چند رائے تھا اس کے موافق یہ ترجمہ لکھا گیا ہے۔ اور میں نے بہت ہی احتیاط کے ساتھ اس
مضمون کو دیکھا۔ اس کا اصل مطلب اصل نقل کیا ہے۔ جس سے آپ کو کڑی ناک اذہ ہو جائے گا کہ
تھا ہے۔ اس کی پیشتر کسی قسم کی اردو دہلی جاتی تھی اور وہ کسی طریق سے لکھی جاتی تھی۔ تاریخ
ادب اور اس کے متعلق کہیے۔ یہ دیباچہ بہت دلچسپ اور دلکش چیز ہے۔ جو قدیم اردو کی حالت
اور طرزِ تحریر کو جانے سنانے میں کمال ہے۔ ————— جہاں تک میر کی طوالت کا تعلق ہے یہ
دیباچہ پچھلے ایشیائی میں پچھلے ترجمہ پر بعد کے ایشیائی میں میری نظر سے تو نہیں گزرا۔
دعوتِ خدا

نکسار احمد اسماعیل پانی پتی

نام کی خبر لاہور

دیباچہ موضح القرآن

اچھو حکمرانی اصلاح کا اور اگر دس کس زبان کی کہ ہماری زبان کو پانی پتی نام کر اور دوسری روشنی دی اپنی کلام کر اور اسات
یہ کیا ہے اس کی تفسیر کے بعد شرفِ دنیا اور بھروسہ میں کی شہادت کی امید دار میں ہم کو پاویں دو جہان کی نعمت اور اس کی مستحق
کر اپنی کمال کی حد بات کی نصیب کر جو حد بہر کسی حقوق کی اور اپنی حیثیت اور پریشانی اور دنیائے آخر میں اور اس کی
آلِ عالم کی اصلاح کا یہ کار پر اور اس کی کمال کی حد بات کی نصیب کر جو حد بہر کسی حقوق کی اور اپنی حیثیت اور پریشانی اور دنیائے آخر میں اور اس کی
اور اس کی کمال کی حد بات کی نصیب کر جو حد بہر کسی حقوق کی اور اپنی حیثیت اور پریشانی اور دنیائے آخر میں اور اس کی
بہر اس کی بندگی نہیں اور جو بندگی مجاہدہ کی وہ بندہ نہیں اور اس کی کمال کی حد بات کی نصیب کر جو حد بہر کسی حقوق کی اور اپنی حیثیت اور پریشانی اور دنیائے آخر میں اور اس کی
چیز کی کمال کی حد بات کی نصیب کر جو حد بہر کسی حقوق کی اور اپنی حیثیت اور پریشانی اور دنیائے آخر میں اور اس کی
یہ کلام پاک اور اس کی کمال کی حد بات کی نصیب کر جو حد بہر کسی حقوق کی اور اپنی حیثیت اور پریشانی اور دنیائے آخر میں اور اس کی
اور اس کی کمال کی حد بات کی نصیب کر جو حد بہر کسی حقوق کی اور اپنی حیثیت اور پریشانی اور دنیائے آخر میں اور اس کی
کرنی اور اس کی کمال کی حد بات کی نصیب کر جو حد بہر کسی حقوق کی اور اپنی حیثیت اور پریشانی اور دنیائے آخر میں اور اس کی
بندگی ترکیب و فی کی بہت عید کی اگر جیسے وہ ترکیب کی تو معنی معلوم نہ ہو دوسرے یہ کہ اس میں زبانِ عربیہ نہیں ہے بلکہ ہندی
مستندتِ آدم کوئی تکلیف دیات جو قیسے یہ کہ بہر چند ہندوستان غیر عربی ہے اور اس کی زبان جو کی لکھی ہے اس کی زبان
وہم کہ قتل معنی قرآن غیر ہندوستان میں دوسری زبان کلام قابلِ دعا ہے اس کی زبان اور قلع کلام کی زبان غیر ہندوستان میں آج بھی قرآن

دنیا کے عرب

بصیرت عالم

مغرب کے صنف جس علاقے کو مشرق قریب کہتے ہیں وہ ایک پاکستانی صنف کے لیے مغرب قریب ہے۔ اسی
 میں مشرق وسطیٰ، پاکستان کے لیے مغرب وسطیٰ ہوا چاہیے۔ دراصل ایسی تمام اصطلاحات ہیں سے سمت خارجی
 بننے والی جہاں ہیں۔ تمام سترن کارکن اس شخص کا اصل وقوع ہو کہ جو سمت تینوں کر رہا ہے۔ اگر یہ مرکز بدل جائے تو سترن
 کی تبدیلی بھی ہوتی ہے۔ مغربی صنف میں طے کو مشرق قریب یا مشرق وسطیٰ کہلے وہ ان کے اصل وقوع
 کے قبضے سے دست ہے لیکن اب مشرق کے بعد سمت نہیں ہے۔ اس بعد اب مشرق اپنی قریبوں میں تہذیب و علاقہ
 و ان کی اہمیت میں جو مغربی صنف نے لے دیا ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ اب مغرب کی تعبیر
 مشرق کے حالات نامہ ہو گئی ہے۔ مغرب کا یہ ایک بظاہر ختم ہو گیا ہے جسے اقتصادی اور کس کہیں نہ فی طلبہ ہونے باقی
 ہے۔ خصوصاً جدید علوم اب مشرق نے مغرب کے لیے اس لیے مغرب کی علمی اصطلاحیں خود و صحیح ہوں یا غلط و رواج
 انکی ہیں۔ مشرقی تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق مغرب کے نام کو درستی اصطلاحات کی ترمیم و تفسیر کے لیے ایک دوسرے کا
 دیکھنا۔ کچھ اس شخص میں اگر اب بھی ابتدائے کار نہ کی گئی تو یہ دوسرا بھی حریف بن جائے گا۔

دوسری جگہ صنف کے بعد ٹیکسٹوئیٹس کے نام مشرق وسطیٰ، مشرق وسطیٰ کی اکثر مغربی صنفیں
 مشرق قریب، اگر ترجیح دیتے ہیں۔ جیسی سلاطین کے مشرق وسطیٰ یا مشرق وسطیٰ کے علاقے کا یہ دو کیا ہیں اور ان میں کون
 سے کاشاں ہیں؟ یہ ابتدائی بائیں، اب اسے نہیں ہو سکتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر صنف اس علاقے کی حدود
 کو ہی تسلیم کر لیتے ہیں۔ جس علاقہ کو روایتی طور پر مشرق وسطیٰ کہا جاتا ہے وہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے خطے کا ایک چھوٹا
 حصہ ہے۔ اس میں مذہب و اہل *Scythia caucasica* کے نام میں واقع، شام، لبنان، فلسطین
 اور ان کے جزیہ و انسانی شاہ میں کہیں بعد میں مشرق وسطیٰ کی حدود وسیع سے وسیع تر ہوتی تھیں۔ بعض صنفیں نے تمام
 عرب ممالک کو مشرق وسطیٰ میں شامل کر دیا اور بعض نے قریب و اسیان، افغانستان، عراق کو اس کی طرف یا سترن اور پاکستان
 اب کو شامل کر لیا ہے۔ علاقہ کی اس چھوٹی ہوئی درست کے پیش نظر بعض صنفیں نے مشرق قریب کی اصطلاح کو کوئی
 دیکھ کر مشرق وسطیٰ کی طرح مشرق قریب کی حدود بھی فراموش نہیں ہیں۔ یہی علاقہ قریب و کاساں ہوتا ہے۔ رہنا علاقہ کی
 آبادی کے خلاف ہے۔ دراصل اس علاقہ کو سترن و اسیان نامہ اس کی وجہ سے ہے۔ اسی کل میں علاقہ کو مشرق وسطیٰ یا مشرق
 یا کاساں کہتے ہیں۔ روایتی طور پر اس علاقہ کو سترن و اسیان کہتے ہیں۔ اس لیے اس علاقہ کو سترن و اسیان

پیار کرنے والی دیا سون کا تقریباً ساڑھے تیل کی آمدنی سے حاصل ہوا ہے۔ گزشتہ سال میں اس علاقہ کی حکومتوں کو تیل کے ایک سو ڈالر ساڑھے آمدنی ہوئی ہے۔ تیل کی بڑھتی ہوئی قیمت کے پیش نظر آئندہ دس سال میں یہ آمدنی ڈیڑھ سو ڈالر تک بڑھ کر ایک سو ڈالر تک ہو سکتی ہے۔ جیسے پٹرول اس سے حاصل شدہ کارخانے کی اشیا اور پانی کا نعمت اہل نہیں ہو سکتے۔ تیل سے حاصل ہونے والی دولت اور ذرا محنت اس کے درمیان جو تضاد ہے اس کی واضح مثال کریت میں نظر آتی ہے۔ گویت کا رقبہ صرف ۱۰۰۰ مربع میل ہے۔ ۱۲ چھوٹی سی ریاست میں ایک شیخ کی حکومت ہے تیل سے شیخ کو حقین کر دئے گئے ہیں۔ پانچ سو کروڑ ڈالر ساڑھے آمدنی ہوئی ہے۔ گویت کی آبادی صرف دو لاکھ ہے۔ گویت کی شیخ اپنی درخشاں قسمت قسیم دیکھتے ہیں اور محرم کی آسائش کا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے۔ پھر بھی انکلیٹ کے جگہ میں اس کی بین شدہ دولت سے زیادہ ہے۔ لیکن کریت کے پاس پینے کے پانی تک نہیں ہے۔ سندھ کے پانی کو منظر کے پے کے قابل بنایا جاتا ہے اور اس مقصد کے لیے تین لاکھ لٹائے بنائے گئے ہیں۔ تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں صرف عراق ایسا ملک ہے جو تیل سے حاصل شدہ آمدنی کو دیگر شعبوں میں ترقی کے لیے خرچ کر سکتا ہے۔ ایسے دوسرے ملک مصر، شام، لبنان اور سعودی ہیں لیکن بدقسمت سے ان کے پاس تیل کے ذخیرے نہیں ہیں۔ ان میں سے چند ملکوں کو ان کے علاقوں سے گزرنے والے پائپ و سٹروں سے فائدہ اٹھانے کی ہوجاتی ہے۔

دنیا کے عرب کی کل آبادی دس کروڑ پچاس لاکھ تک جگہ ہے۔ ان میں سے تقریباً دس کروڑ لوگ عربی بولتے ہیں۔ ہر ملک کی آبادی ملانی اور نئی تقسیم مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ عراق: کل آبادی: ۱۰ لاکھ ۰۰ ہزار۔

لسان تقسیم: عربی ۱۰ فیصد، عربی ۳۰ فیصد، فرنجی ۱۰ فیصد، دیگر ۱۰ فیصد۔

مذہب تقسیم: مسلمان ۹۵ فیصد، عیسائی ۱۰ فیصد، دیگر ۵ فیصد۔

۲۔ الجزائر: کل آبادی: ۱۰ لاکھ ۰۰ ہزار۔

لسان تقسیم: عربی ۱۰ فیصد، عربی ۱۰ فیصد، فرنجی ۳۰ فیصد، (گھٹنہ میں)

مذہب تقسیم: مسلمان ۹۰ فیصد، عیسائی ۱۰ فیصد، (گھٹنہ میں)

۳۔ لیبی: کل آبادی: ۲۰ لاکھ ۰۰ ہزار۔

لسان تقسیم: عربی اور بربر ۹۵ فیصد، فرنجی ۵ فیصد۔

مذہب تقسیم: مسلمان ۹۰ فیصد، عیسائی ۱۰ فیصد، دیگر ۱۰ فیصد۔

۴۔ یمن: کل آبادی: ۱۰ لاکھ ۰۰ ہزار۔

لسان تقسیم: عربی ۱۰ فیصد، عربی ۱۰ فیصد، (گھٹنہ میں)

منهجتیم : مسلمانان ۱۴ فیصد ، میانان ۱۰ فیصد
۵. سوڈان : حقل آبادی : ایک کرث ۲۰۰۰
لغاتیم : عربی ۱۰۰ فیصد ، نوبلی و حبشی قابل که زبانین ۲ فیصد
منهجتیم : مسلمانان ۱۰۰ فیصد ، مشن فاب ۲۰ فیصد

۶. متحد عرب بحرین

مسلمانان : حقل آبادی : یک کرث ۲۰۰۰۰۰
لغاتیم : عربی ۱۰۰ فیصد
منهجتیم : مسلمانان ۱۰۰ فیصد ، میانان ۱۰ فیصد
شام : حقل آبادی : یک کرث ۱۰۰۰۰۰
لغاتیم : عربی ۱۰۰ فیصد
منهجتیم : عربی ۱۰۰ فیصد ، میانان ۱۰ فیصد
۶. اسرائیل : حقل آبادی : یک کرث ۱۰۰۰۰۰
لغاتیم : عبری ۱۰۰ فیصد ، عربی ۱۰ فیصد ، ییدی ۱۰ فیصد
منهجتیم : یهودی ۱۰۰ فیصد ، مسلمانان ۱۰ فیصد ، میانان ۱۰ فیصد

۸. نازده : حقل آبادی : یک کرث ۲۰۰۰۰۰

لغاتیم : عربی ۱۰۰ فیصد
منهجتیم : عربی ۱۰۰ فیصد
۹. لبنان : حقل آبادی : یک کرث ۱۰۰۰۰۰
لغاتیم : عربی ۱۰۰ فیصد
منهجتیم : عربی ۱۰۰ فیصد ، نزاری میانان ۱۰ فیصد ، دیگران ۱۰ فیصد

۱۰. یزدان : حقل آبادی : یک کرث ۱۰۰۰۰۰

لغاتیم : عربی ۱۰۰ فیصد
منهجتیم : مسلمانان ۱۰۰ فیصد ، میانان ۱۰ فیصد

۱۱. عراق : حقل آبادی : یک کرث ۱۰۰۰۰۰

لغاتیم : عربی ۱۰۰ فیصد ، کردی ۱۰ فیصد ، دیگران ۱۰ فیصد
منهجتیم : عربی ۱۰۰ فیصد ، مسلمانان ۱۰۰ فیصد

دریچہ فتح۔ حیات میں حکم و پروردگار ماضی اور سیاسی اقتدار کے کلیل و دست تھام کر رہا ہے۔ کلمہ
 کا ذہب تھا۔ اس کی اصل اندر کم و زیادہ حکومت اور اقتدار پر مبنی تھی۔ دنیا کے حکم و دنیا کی
 پیروی کے لیے ایک ایسی ہی حکومت تھی جو صرف مذہبی پیشانی کا ایک سیاسی مہم تھی۔ اس کے ذہن میں
 وہ بھی کہ بعد میں اس کی سیاست کو مذہبی بنائیں ہوئے دیا۔ پھر بعد میں اس کے بعد گروں کو تھے اور وہ بھی پیشانی
 سیاست و دین کے باہر رہا ہے جو اہل سنت و جماعت نے وہ منہم دیا ہے۔

۱. اٹا اور مذہبی رہنما پارٹی کی عینہ مگر وہ نہیں بنا سکے اور سیاسی گروں کے تابع رہے۔ عینہ مذہب یا ہندو
 کی طرح اس میں پارٹیوں یا رہنوں کا کوئی عینہ اور تربیت نہیں ہے۔ مذہب رہاؤں کو خدا اور اس کے بندوں
 کے درمیان ایک واسطہ کی حیثیت ہی حاصل نہ ہو سکی۔ عینہ اور کا مٹی حکومت سے عینہ نہیں بلکہ حکومت
 کے لئے اس کا قیام کیا جاتا ہے۔

۲. جو کہ دین اور سیاست تک اور اس سے علاوہ نہیں تھے اس لیے اکثر ایسا ہمارا سیاسی اختلافات نے
 مذہبی فرقہ کی شکل اختیار کر لی۔

۳. اسلام کے قدرتی نظریات میں انھوں کی ذاتی صفات اور خصوصیات پر زور دیا گیا۔ اس کو جو یہ حق کو یہی مکر
 مذہبی پیشانی جوتا تھا۔

۴. جس اور اجتماعی صفات میں انھوں کی قدر کے احترام پر زور دیا گیا۔

۵. جنگ یا جہاد کی صورت میں بھی انھوں کی قدر اور مذہبی احکام کی پابندی و ذری قرار دی گئی

نفسانہ، شہی کے دور میں نہ رہا اور اس پر سختی سے عمل کیا گیا۔ کیوں باہر دار نہ نظام اور حرکیت کے
 میں یہ اصل ہونے والے حق کے لیے گئے۔ مگر سیاست سے متعلق مذہبی احکام اور اصول کی تردید کئے بندوں نہیں کی گئی
 اس کی قدر و قدر کے لئے جو کہیں نہیں گراؤں اور اس کی سیاست نے فتنوں کا قیام کیا اور ملکوں کو
 جو باہر داری نظام اور حرکیت کا ذریعہ تھیں۔ تاہم اسلامی دنیا میں حرکیت کا دور عینہ کی دنیا کی طرح ایک نہیں
 تھا۔ اسلام میں عینہ اور قدر و قدر پائی جاتی ہے اس کے باعث حرکیت کے دور میں بھی علوم و فنون کی ترقی ہوئی
 اس دور میں عربوں نے دوسروں سے سیکھا اور دوسروں کو سکھایا بھی۔ ابتدائی دور میں عرب مکرانوں نے ایرانی
 شاہی، یونانی اور یورپی سائنس دانوں، حکیموں اور بخشیروں کو عزم و کما اور ان کے علم و فن کی قدر افزائی کی۔ عباسیوں
 کے دور میں علوم و فنون کو بڑے حد تک بڑھائی۔ ایرانی مکران اور خطہ کے کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ خلیفہ اموی درشت
 نے ۳۲۰-۱۱۱۳ء سائنس اور حرکیت کی کتابوں کے ترجمے کرائے اور سب سے پہلے یونانی و عربی کی عربی تفسیریں تیار
 کیا۔ ابلی علم و فن کی سرپرستی نظام اور ماکوں کے فرائض میں شہر ہونے لگی۔ ایرانیوں کے سکھانے تک بڑھتی جا رہی
 ہے۔ عربوں میں ممتاز ابلی علم و فن کی قدر افزائی ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے یونانی، ایرانی اور ہندوستان کی علمی و فنی روایات

۱۔ جرات کرکھا کر دیا اور دعایات کی بنیاد پر جدید علم و فن کی عمارت تعمیر کی۔ مسلمانوں کی یہ خدمت دنیا کی موجودہ انسانیت
نہیں نہ بھلا سکتی ہیں اور ذکر اگوش کر سکتی ہیں۔

آریہ سماج کی پس منظر
گو ڈیٹلے عرب قدیم ترین تہذیبوں کی گورہ ہے تاہم یہ مرتعجب خیز ہے کہ بظہر جدید تہذیب
تقدیم میں قدیم تہذیبوں کے نشانات نہیں پائے جاتے۔ مگر ان کا قدیر دریافت ہوئے تو تاریخ
کی دنیا کو یہ محسوس ہوا کہ اس سرزمین پر یہی اسیری اور مصری تہذیبوں نے جنم بھی دیا تھا یا نہیں۔ یہ اسلام کی ہرگز حاکم
نئی یا جزوہ کر جس نے اس دنیا کے قدیم تہذیب و تمدن کو ایک جملہ جملی داستان بنادیا اور یہاں کے لوگوں کو جدید تہذیب و تمدن
نہ انہی زبانوں پر مبنی۔ مگر تو یہاں محسوس ہوتا ہے کہ ڈیٹلے عرب کے قدیم کی تاریخ ہی اسلام اور عربی زبان سے شروع ہوتی
ہے لیکن وہ اصل یا نہیں ہے۔ مگر بظہر غائر دیکھا جائے تو اسلام بھی ڈیٹلے عرب کی قدیم تہذیب و تمدن کے تاریخی سلسلہ کی ہی
اسلام و مذہب کی کڑی ہے۔ خود طبرہ اسلام نے یہ فرمایا ہے کہ قرآن شریف آسمانی صحیفوں میں انسانی قربانیات کی تسبیح کرتا ہے
اور اسلام خدا کا دیا ہوا نوری پیمانہ مذہب ہے جس کی شکل کنار اور منافقوں کے اہل حقوں سے جو گئی تھی۔

ڈیٹلے عرب میں ان کی کثرت ہزاروں ویاہریہ یحیٰں ہیں تو دوسری طرف ویاہریہ کی زرخیز وادیاں ہیں۔ ابتدا
میں خانہ بدوش قبائل اپنے حوشی کے لیے چارہ کی تلاش میں ویاہریہ وادیوں تک پہنچے ہوں گے اور پھر یہاں مستقل آباد
کرتے ہوں گے۔ اس طرح انھوں نے خانہ بدوشی چھوڑ کر زراعتی زندگی اختیار کی ہوگی۔ اس علاقہ کے جغرافیائی حالات
یہ ایسے ہیں کہ جس سے ماحولیاتی تضاد پیدا ہوا ہوگا اور اس تضاد کی وجہ سے خانہ بدوش قبائل اور زراعتی قبائل کے
درمیان ایک مستقل کشمکش اور جنگ و جدل کا بازار گرم رہتا ہوگا۔ اس پر متیز وادیہ کی دنیا نے عرب کا علاقہ ایشیا
ابتدا اور یورپ لاسٹر ہے۔ یہاں تو دنیا کے ہر حصے سے خانہ بدوش قبائل آئے ہوں گے اور ایک دوسرے
سٹونے ہوں گے۔ جب درختیہ یا دور قریبی ایک دوسرے سے ملتے ہیں (خواہ وہ میدان جنگ میں یا بازار
میں) تو ترقی ہوتی ہے۔ جنگ کے دور۔ ان ایک فرقہ دوسری فرقہ کے طریق جنگ اور ہتھیاروں سے واقف ہو جاتی
تھی۔ جنگ کے بعد فاتح قوم مغترب کو اپنا نظام بنالیتی تھی اور اس طرح وہ ایک دوسرے کے رہن سہن سیکھنے اور
کھنے کے طریقوں سے واقف ہو جاتے تھے اور کچھ عرصے بعد ان کی زبان تہذیب اور تمدن ایک دوسرے سے
متمم ہو جاتے تھے۔ میں اقبالی میوں اور مذہبوں میں دور دراز قبائل کے تاجر ایک دوسرے سے ملتے تھے اور ز
راعت جاس و مصنوعات بلکہ زبان و خیالات کا تبادلہ بھی کرتے تھے۔ الغرض یہ علاقہ مختلف قبیلوں اور لوگوں کے لیے
میدان کا نام بھی تھا اور مشترک بازار بھی۔ اس لیے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ دنیا کی اولین تہذیبوں کے یہی اسی علاقہ کی
وادیوں میں پائے گئے۔ وجہ وفات اور نیل کی وادیوں میں مصری اور مصری تہذیبوں نے جنم لیا اور ان کی
سماں دور دورہ تک پہنچے تھے۔ وجہ وفات اور نیل کی وادیوں کے درمیان فونیٹیا (موجودہ لیبیا) ساحل
نور واقع ہے۔ مغرب و مشرق کے بادشاہوں اور شہنشاہوں کی فوجیں اس علاقہ میں ایک دوسرے سے نہایت

یہ دیکھ جب بھی کئی طاقت ایشیا، افریقہ یا یورپ سے اُبھری اُس نے موجودہ دُنیا کے عرب کے حقوق رنج کن پایا تو میں فرض کیا۔ خاص طور پر شام، لبنان، فلسطین اور مصر کے ساحلی علاقے مل و ترقی کے اعتبار سے سب سے اہم تھے کہ ہر طاقت ان کو اپنے قبضے میں رکھنا و نفع کے لیے ضروری سمجھتی تھی۔

دُنیا کے عرب کی جدید تاریخ خود ان اسلام سے شروع ہوتی ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے اپنی زندگی ہی میں حجاز کو فتح کر کے جزیرہ نمائے عرب کے اتحاد کی بنیاد رکھ دی تھی۔ ۳۲ء میں پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد عرب مسلمانوں نے اپنا اتحاد بازنطینی سلطنتوں کو فتح کر لیا۔ اسلامی فوجیں ایران سے وسط ایشیا اور ہندوستان تک پہنچ گئیں۔ شام، مصر، شالی اور ہسپانیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور آخر کار وہ فرانس تک پہنچ گئے۔ ۳۳۰ء سے ۳۳۵ء تک پہلے پارسل کی حکومت رہی۔ ۳۳۵ء میں امیر مسلمانیہ نے خلافت حاصل کر لی اور خود امیر شام کے شہر دمشق سے ۳۳۵ء تک حکومت کی۔ خود مزید طاقتور ہو کر اس نے اٹلی دیا۔ انھوں نے عراق میں ہندو کاشغر آباد کیا اور اس دار الحکومت سے ۳۳۵ء سے ۳۳۵ء تک حکومت کی ہے۔ عباسیوں کا دور ان اور فارغ اہل کازانہ کا ہے۔ ان کے زمانے میں ایرانیوں کو دوبارہ اور اور حکومت میں بہت کچھ دخل ہو گیا۔ ۳۳۵ء کے بعد سوبانی حکمران قریباً خود مختار ہو گئے اور علاقہ خلیج کا اقتدار ختم ہونے لگا۔ گیارہویں صدی کے وسط میں سلجوقی ترکوں نے وہاں پر قبضہ کر لیا۔ وہ ۳۳۵ء میں ہندو اور پر بھی قابض ہو گئے اور ان کی سلطنت ہندوستان سے براعظم تک پھیل گئی۔ دسویں صدی میں خلافت دو خانہ خانوں میں بٹ گئی۔ مصر میں فاطمی خاندان تھے جو کاسک شالی افریقہ اور کچھ کبھی شام تک پھلتا تھا۔ اور عراق میں عباسیوں کی خلافت تھی جو ۳۳۵ء تک قائم رہی۔ اسی میں مسلمانوں نے قریباً ۵۰۰ سال تک حکومت کی اور ان کے دور میں یہ ملک یورپ کا سب سے زیادہ منہب ملک سمجھا جاتا تھا۔

۳۳۵ء میں انگلوں، سیر اور دو نے ہندو کی اینٹ سے اینٹ بھا دی۔ اس کے بعد عباسی خلافت کا نام بھی اُٹا نہ رہا۔ اس کے ساتھ ہی سلجوقی ترکوں کی سرداری بھی ختم ہو گئی۔ جس کی عثمانی ترکوں نے ایشیا کے کچھ حصے اپنی حکومت قائم کر دی۔ جدید انھوں نے عثمانی راستوں پر قبضہ حاصل کر لیا۔ ۳۳۵ء میں جب عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر لیا تو مشرق کی بازنطینی، رومی سلطنت کا آخری چراغ بھی گل ہو گیا۔ عثمانی ترکوں نے شام، فلسطین اور مصر کی مملوک سلطنت پر بھی قبضہ کر لیا۔ وہ دو سو سال تک ایران کی صفوی حکومت سے نبرد آزما رہے اور آخر کار عراق پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔

یورپ کے مسیحیوں نے ترکوں کے زمانے میں مسیحی مملوکوں کا آغاز کیا۔ گویا جلیں نہ جب تک اندر پر لڑی گئیں تھیں وہاں اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو دُنیا کے عرب سے بے دخل کر کے ہندوستان اور مشرق بعید سے ہونے والی تجارت کے راستے صاف کر دیا جائے۔ گویا یورپ کے مسیحیوں کو اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی اور فلسطین میں آخر کار مسلمان افریقہ اور اٹلی کے اتحادوں انھیں شکست ہوئی جس پر اسی اور مسیحی مسلمانوں کے اتحاد سے عمل کرنے کا ایک

مقتضیٰ بھی آیا کہ عثمانی سلطان کو لکھا گیا اور بھیجے جسے وہ ظالم اور برائی سمجھتی تھی۔ اس کے جواب میں وہ
 مائل کر کے لکھیں۔ خصوصاً انگریزوں کو یہ پتہ چلے کہ کس طرح وہ برادریاں استبداد سے بے خبر تھیں۔ انگریزوں نے
 انگریزوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کا مدد کیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 یہاں متحدہ شاہی فوجیں اور فوجیں بھیجنا تمام ہے۔ وہاں انگریزوں نے اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 نے یہاں انتہائی کمزوری کی حالت میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 کا لکھا۔ نتیجہ فارسیوں نے اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 کی اور انگریزوں کا ایک نئی فوجی قوت آگیا۔ انگریزوں نے اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 کو بھی اس عہد سے دور رہنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 کا نظریہ بھی فارسیوں سے بہت اہم تھی۔ جب انگریزوں نے اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 مگر اس طرح یا اس طرح سے اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 بریطانویاں قائم کر دیا۔

سلطنت عثمانیہ نے اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 ۱۸۰۰ء کے ایک صدی بعد اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 کی اور یہاں استبداد کی بجائے اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 یہ ۱۸۰۰ء میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 کو سری مغربی طاقتوں نے اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 میں برطانیہ، فرانس اور روس نے اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 کے قبضہ سے نکل گیا۔ ۱۸۳۹ء میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 لکھے اور اس میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں

انیسویں صدی میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 سلطنت عثمانیہ کی تباہی سے اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 نطفہ سلطنت عثمانیہ کی مدد کی اور برطانیہ نے اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 قابض ہو گیا۔ ترکوں کا سلطان اب اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 روس کے قبضہ میں چلے گئے۔ الجزائر اور مصر پر فرانس قابض ہو گیا۔ روس اور برطانیہ نے اس کے جواب میں اس کے جواب میں
 جرمنی کی ایک دیکھا گیا تھا جس نے سلطنت عثمانیہ کے کسی حصے پر قبضہ نہیں کیا تھا اور قیصر جرمنی ترکوں کے سلطان کی دوستی

وہ بھی کہتا تھا میں دوست غازی کا ملازم اس وقت کا برہمن تھا جب جرم نہ نے ترکی کی واسطت سے برہمنوں سے ہندو مت کو قبول کرنے کا سیرم لیا کہ اس وقت کے فوج کو تربیت دینے کی فہم داری قبول کر لی۔ اس صورت حال کا قرآن پر حانیہ نے یہ کیا کہ میں نے اپنے دشمنوں سے دوستی کا معاہدہ کر لیا۔

پہلی جنگ عظیم

۱۹۱۴ء کو پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ سلطنت عثمانیہ نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ انگریزوں نے شریعت ترک اور شاہ سعود سے غنیہ معاہدے کر کے عربوں کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر تیار کر دیا۔ یہ بغاوت عربوں ۱۹۱۶ء کو شروع ہوئی۔ جس کے دو سال عربوں کی یہ بغاوت ترکوں کی شکست کا پیغام تھی۔ ترکوں کو کچھ وقت انگریزی فوجوں سے لڑنے کی قیادت میں لڑنے والے وہ عرب گروہوں کا ساتھ دینا پڑا۔ یہ جو معاہدہ تھا۔ سلطنت عثمانیہ ہمیشہ پیش کے لیے تم ہو گئی۔ جس کے بعد عربوں کو قریح تھی کہ انگریز اپنے وعدے کو نبھائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سکھوں نے عربی ماسٹر اور فطیخوں کی آغا دی کا وعدہ کیا تھا لیکن دوسری طرف ۱۹۱۶ء میں برطانیہ، فرانس اور روس نے خلیج معاہدے کو کھڑا کیا۔ عرب کو آپس میں بانٹ لینے کی نیکم بھی بنائی تھی۔ یہ سب جو بڑے قوتورقیت نظام کے ماتحت تھے یہاں تک اس سے بھی بڑھ کر یہ تھا کہ انگریزوں نے وہ زمرے بنائے کہ انہوں نے ان کے ذریعہ یہودیوں سے یہ وعدہ کیا کہ فطیخوں میں ان کی کوئی راجت کا نام نہ بنے گا۔

شام میں ترکوں کی شکست کے بعد انگریزوں نے سدرے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ۳۰ جنوری ۱۹۱۹ء کو امریکی کافر فرانس میں سے کیا گیا کہ عرب طاقتوں کو ترکی سے علیحدہ کر لیا جائے اور خاتج ٹکڑوں کو ان کا اتھری بنا دیا جائے۔ برطانیہ اور فرانس آریق طاقتوں کی سرحدوں کے سوال پر متفق نہ ہو سکے۔ چنانچہ دو امریکیوں کو یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ لوگوں کی خواہشات معلوم کریں اور اپنی تہمتاتی رپورٹ امریکی صدر کی خدمت میں پیش کریں۔ اس رپورٹ کی سناسات برطانیہ اور فرانس نے قبول نہیں کیں کیونکہ ملک اور کریچ نے اپنی رپورٹ میں شام پر فرانسیسی عراقی کی ضمانت کی تھی اور بالآخر اطلاع کو بھی غیر دانشمند آزاد تھا۔

ستمبر ۱۹۷۹ء میں برطانیہ اور فرانس میں ایک معاہدہ ہو گیا جس کی دوسری آغوشوں نے عرب ممالک کے جسے غائب
 کیے۔ ۲۰۰ مارچ ۱۹۷۹ء کو شام کے سربراہ اور وہ لوگوں کی کانگریس نے امیر فیصل کو شام اور فلسطین کا آغا میں کیا کیوں کیا
 اور فرانس نے اس فیصلے کو نہیں مانا۔ ۱۴ اپریل ۱۹۷۹ء کی سان دیو کاغذ نے شام اور لبنان کو فرانس کی ٹکرائی میں اور
 فیصل اور یروان کو برطانوی قومیت میں لے دیا اور اس کے ساتھ ہی یہ جہالت بھی آئی کہ بالآخر۔ عدوان کی پالیسی پر عمل کیا جانے
 لگا۔ ان فیصلوں نے سان دیو کاغذ فرانس کے فیصلوں کی توثیق کر دی۔

فرائض نے میر نصیر کو شام سے نکل دیا اور انگریزوں نے، جنھیں عراق کا بادشاہ آباد کردیا۔ یہ دونوں اس کے چھٹے بھائی
میر عبداللہ کی مراد میں دے دیا۔ اس طرح سبقت فغانیہ کے خاتمہ کے ساتھ مذہبی حقائق کا اجماع معلوم ہو گیا۔ یہاں تک کہ
ابواب اقصیٰ میں آکر قریب ہونے کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا۔ خطاب خارجی حقائق کے بیان میں۔

انسانی خصلتوں کی روشنی میں

ترکی میں مسیحیوں کی قیادت میں لڑی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ مسیحیوں کو خلیفہ کے حکام کا احسان تھا۔ اس کے
بعد شریعت نے خلیفہ کا لقب قبول کیا لیکن خلیفہ بعد جب ہند کے شاہ سورت نے ہزاری جو کیا اور شریعت کو
خلف سے دست برد ہونے لیا تو خلیفہ کی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد مسلمانوں کو کویت تک قبضہ پانچ ہزار
کئی ہزار قند کے مسلمانوں کی تحریک کا سامنا تھا کہ اگر ہندو ہند آزادی 'عرب قومیت اور عرب اتحاد' کے
لئے۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کا زمانہ عرب قومیت کی تشکیل و تسلیم کا دور ہے۔
دوسری جنگ عظیم کے بعد سے خلیفہ کی عرب قومیت کی پالیسی اور مسیحی ہندو کا دھڑلے سے شروع ہو گئے ہیں اور
ہو رہی ہے۔ اس سے قبل کہ ہم اس ہندو ہند کا تاریخی جائزہ لیں تو نیلے عرب پر مغربی طاقت کا مظہر وجود ہے
(باقی آئے)

اختر صاحب

محمد طفیل

اپنے بیرونی قریب نہ جاؤ۔ اس کی غفلت
مداخلت کے قریب کو برداشت نہیں کر سکتی۔

فريسيين و روضان :

ایسی دو تہیقتوں میں آخر صاحب کدھر۔ آئے انھیں دُھونڈ نہ سکیں۔

وہیے تو یہ پرفیسر ہیں اور کامور پرائیوٹ اور میں اب کا طالب علم ہوں اور فریضہ کا طالب علم اس لیے نہیں کہنے کا
 سنا کہ ہمارے میں کیا کہہ سکتا ہوں جسے پڑھنے سے یہ لڑکا کتنی شراں سے کرتی نہیں ۔ اور پوچھا کہ بچے سے یہ ! — اس
 کے لیے تو اس سے بھی زیادہ ڈر رہا ہوں پارس شخص پر کہ کی ڈر رہا ! — حالانکہ میں کہتا ہوں نہیں پڑھ سکتے تو انسانی پرے
 زور۔ میں کہتا ہوں کہ میں پڑھنے کے بعد وہ انسانی پرے نہیں پڑھ سکتے

جے اختساب نے جھپٹی یا کالمی دوس جے مار پیچ نہیں دے، وہی مار پیچ میں انجمن استادانہوں، امام انا
میں، استاد کے ساتھی میں، امام کی اصلاح میں،

بات صاحبِ مود اور استاد کی چیں نکلی ہے۔ اس لیے میں بھی خست و خوار صاحبِ مہی کے زمانے سے پہچانے کی کوشش کروں گا۔
رفت کوشش! جو انجام بھی ہو سکتی ہے اور ناکام بھی!

[illegible]

یہاں وہ شہر کو دروازے سے جیتے ہیں اور یہاں وہ ہر گھنٹے

مگر نہ رجم اور واقعات میں نیاں دو اور واقعات کا ہونا ضروری ہے کہ ان کی سوانحی قرآن مجید میں نہ ملے گی۔ مثلاً حضرت
سے حضرت عیسیٰؑ کی سوانح میں سے دو اور دوس وقت میں ایک عورت نے حضرت عیسیٰؑ کی قرآن مجید میں نہ ملے گی۔ مثلاً حضرت

اس کی شادی کی سوچی۔ یہ اڑھایا بیس لاکھ روپوں کے بل پر نکلی گئی۔ اس نے شادی کر کے گھر آکر برفروغ و درخشاں و درون کی بارگاہ میں امانت رکھی۔

اترے تو اس میں خرم صاحب نے بتایا کہ انیس ایک نہایت مستحیج بیوی کو کاش تھی۔ اس کے ساتھ نہایت کے غلب بھی دیکھتے تھے۔ اس کے نزدیک مذہب میں بھی یکساں کی رعایت تھی۔

یہ زندگی میں بیشہ و روزی جاری تھی۔ اس کے لئے ایک اور دو تھوڑی مذہب کی تھوڑی سی آمد کا شکر ہے کہ ان میں بیوی مذہبی بھی تھی۔ وہ رعایت کی روزی اور فیروزہ سب سے بڑے کے ساتھ تھے۔

بقول ہی تو اس میں ایک مرد دیا بھی تھا۔ اگرچہ اس نے خرم صاحب سے ملو چلا گیا۔ آپ نے ان کو قسم کھا کر ہل کے میں ۹

مہر فضل نہ۔

بہ اس میں خرم صاحب کے ہونے کو ذرا سی شہادت کا گناہش ہوئی مگر بہت سے مل گئی۔ اس کے پاس میں مشورے کے کم پڑتے تھے۔ اور وہ ان کا کیا یہ کہہ کے

نہایت توجہ میں لے کر اپنے تئیں دلی گئے۔ اس میں بہت سے تھوڑی سی شہادت تھیں۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔

اس شہادت میں جس جرحت کو ملو کہ بہت یا سنا ہوا ایک کے تھے۔ ان میں بہت سے تھوڑی سی شہادت تھیں۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔

یہ انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔

انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔

انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔

انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔

انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔

انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔ ان میں انہیں سے بہت کہ ہے۔

مگر آپ تم پر یہ کراسکون پارکے شام کا : پر ہیں :

۱۰ کا

بہتر تاشنہ ادب نے آپ کے اعزاز میں دعوت کی ہے :

نہیں : باب میں نہیں جاتا :

صرف پلٹنے کی دعوت ہے : وہاں کوئی تیار وغیرہ نہیں پڑنا ہو گا : بڑی عملی اگر کوئی سوال پوچھے تو جواب دے

دیا :

اس دعوت کو گل کیجیے :

یہ کیجیے جو کتاب ہے : میں نے بھی دیکھا کیا خوب ہے اور شیکل بھی وہ دیکھا ہو رہی ہے :

جی ہاں اگر ابھی اپنا سٹوٹ کیس اٹھاؤں اور وہاں چل دوں : اس سے کہیں نکالوں سے کھڑا ہوں : وہ اور ٹکے ہوتے ہیں جو زانہ لہوتے ہیں :

پیارے بھائی : تم اس طرح سے میری پرزے دے رہے ہو : میں نے وہ پارہ سہی کھنے کی کوشش کی کہ اگر سر پر پڑ جائے تو کچھ نہ ہو سکوں :

تم نے بے ملاحظہ سے پہلے بے رشید اور بدیتی کا وہ فقرہ یاد کیا : جو انہوں نے کیا : جیسے میں کا تھا : ” گھر سے جو کچھ یاد کر کے آیا تھا : وہ یہاں آکر ٹھہر گیا ہوں :

اس کے بعد تم نے کہا : وہ دیکھو اور دشمنوں کے ساتھ ملو اور : اے نقل کیے دیتا ہوں :

دوستو :

بقدر اعتراض و توجہ میرے اسے میں آپ انہیں ہوا کہ نہایت مستحق آدمی میں انہوں نے میرے ساتھ کسی قسم کی تعزیت کا ثبوت نہیں دیا : انہوں نے ابھی ابھی بے خبر سنا کر کہہ دیا کہ نہیں تاشنہ : ” کیجیے میں جاتا ہوں : میں نے اقدار سے اور کہا : خدا کے لیے بے باقی : اس سے کہیں جو نہیں لایا : چاہوں : اور سے میری زندگی کا خدا اور تم کا نہیں ہے : لہذا مجھے کما حقہ : بنا جانے کا : گھر پر نہیں ملنے اور یوں یہ سے عزائم کو تھپیٹ کے یہاں سے آئے ہیں :

بات یہ ہے کہ تم پر خدا اور نہایت اور اپنی خوب بانی کے ذریعے اور اس کے دونوں فرما کر اور چاہیں : میں نے پھر حکماء نے میری قدر و بھلائی ثابت کی ہے : میں بھی تم کو یہ یاد دہانی کا رنگا رنگا کے اس سے آگے : یہ ہے : ” گھر کے اندر سے آکر : ” اچھا شکریہ ہے : بشکریہ : ” کی اور میں سے ہوا :

میں نے اعتراضات سے بچا کر جواب دیں : اور تو تادیب سے رہیں تاشنہ : ” کیجیے میں جاتا ہوں : ” اور دیکھا ہو گا : انہوں نے دیا تھا : وہ ایک بچہ سوال پوچھ رہے : جواب نہ دیا :

پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی کو بھی جواب دینا : ” گھر کے اندر سے آکر : ” اس سے کہیں : ” گھر کے اندر سے آکر :

بگڑا ہے، کمال ہمدردی!

یہ خیال ہے جو توڑی ہوئی، اس لیے اس کے اختلاف یہ بھی پوچھنا چاہئے کہ کیا یہ اختلافات سے متاثر ہیں؟
اس سال کے بدھیم کے لیے توڑی ہوئے، موت کی نہیں گئے۔ ان کو جناب وہ ملاقات بائیں گے، جو سے آپ
متاثر ہوئے:

سزا بھی کیا نسبت پہنچا ال کہ ہے۔ میں متاثر ہوا ہوں، جب ہندو جب نہیں، جب کا دوسرے، جب یہ ملک و ملت
کرم، فتح سند، جب پانی پت، جب زادی، ششتر، قسیم ہندو، انتہا فرانس پر ہی ملو کی موت (جب آخر کا
سہ سال کے تھے، چاکر موت اپنے تھے، ہندو کی وفات ————— ہندی ہے!)
پچھلے سب ہم لوگ ان بھائیوں نے مل کر تھے، جو ہندو یا کسی کے سال تھے، اشتراک فکر، چاہے کہ یہ دیکھ کر
کپ پانے والے تھے، ان کو اس لحاظ سے نہیں۔

یہاں ایک دلچسپ قصہ سنیجے تاکہ ذہن کو ذرا سی اسود گئے۔ عام طور پر ان کی زندگی بڑی دلچسپ گزرتی، اور یہی
بھگت و دیو، میر و شکر، مرقاوی سے لے کر شیریںک اور ملا میں دیا نے سو ہی تیرا کی، کم و بیش روزانہ محاکات قصہ یہی
بات اور دیکھیں گے بے وقت، خاصہ —

ہزاروں اور دیکھنے کے اور دل میں ملا لک کر ایک کہہ پر جنات کا سایہ ہے، پند سے آخر سب آئے تو ان میں بڑے
بگڑنے کے لیے پڑی، ان کا تیار تھی، مات آتے ہی غل جیت پر بے ترنگے سید پرش ہی تشریف لے گئے اور غائب ہو گئے، روزانہ
پیشہ، بے جہل ہو گئیں، ہر روز پھینک کر، شہر ہوئی، ملایور کی دیکھیں، وہیں آخر سب متاثر ہوئے، مگر یہ ظاہر دیکھ کر ان کا
کتنے بے شماراں اور ساہیوں کے درمیان تکی اور بند، کی مانند جو در پڑھا تھا۔

یہ یہ جو کہ گزشتہ قریب میں ہندو نے تھے، ہر روز، اتنا کہ یہ سبک بھرا گیا، دیکھ کر کہتے ہوتے ہیں، دیکھیں بھلا
کرتی، ہیں، آخر آخر نے اپنے مذہب سے غافل ہو گیا، اور ایک دھجناٹ کر چلی اور فارسی کے سونے والے غلاموں کی ایک
مذہب کا ڈاکو، اور نصیحت خانی کا اہل عام کو مت سنا۔

پھر روزوں کے بعد دیکھیں، میرش، کچل کچل نہیں، بعد کرتے چھو کہ یہ بعض لوگ مر تھا، آخر خلیفہ ہونے اور شہزادگی
اور ان کے بارے کی دونوں ایک اور فی غمائی کے کرپے سے، آخر سامیوں نے منایا، جن کو کا سایہ تھا، چروں نے
دیکھا۔

بیشیت علم و فضل اللہ تعالیٰ کی اس پر خاص دقت ہے، ہزاروں نے اسے نہیں اٹھایا، بگاڑ کر یہ ہیں کہنے، اس
مذہب سے کچل نہیں، اس کے سوجھے لا اذ انداز ہے، یہ تو دوسرے دہائیوں کے شیعہ ہیں، تو یہ چاہتے تھے،
ان کے لیے کہ یہ آپ اور یہ کہ جاتے اور تیج اس کام کرتے، یہ بھوکے وہ انداز ہوئی، ہرگز دوسرے دہائیوں کی دوسرے

یہ پہنچے ہوئے ہیں اس لیے کہ دیتے ہیں کہ نہیں نہیں۔ یہ غضب بھی میری آرزو کے مطابق ہے۔

اب تمام تئیں کے ساتھ ان کی ایک کتاب اور بھی ہے وہ یہ کہ چپ چاپ بستر پر بیٹھ رہیں اور کوئی بھی انہیں پریشان نہ کرے۔
— عمارت یہودی ان لوگوں کو مانتی ہے۔ جو اپنے کسی بات کو سروں سے نہ کہہ سکتے ہوں اور یوں وہ تنہائی میں خیالوں کی بجائیں مستغرق ہوتے ہیں اور خود کلاہی میں مگن پاتے ہیں۔

بہن ایک میں نے انہیں پڑھنے کی کوشش کی تہہ یہی پتا کہ یہ کسی طرح بھی ملنے نہ جوتے۔ اب جب کہ یہ اپنی یونیورسٹی میں اپنے شعبے کے پروفیسر تھے ہیں کہ اگر میں ڈاکٹر بننا اور آزادانہ پڑھیں گے تو اچھا جوتا۔ اگر یہ تو اکر بڑے بڑے تھے۔ میں ان کا پھنسا یہ آپریشن یہ گی طرحی پاروں کی تھیں اپنے بس کا روگ نہیں۔

ایک وقت میں یہ کہتے تھے کہ مجھے حد پر ٹیکہ سے کچھ بھی ہے۔ یہ بڑی ایثار پسند اور وفا شعار ہیں۔ لیکن مزاج میں تیزی اور سخت قسم کی انفرادیت ہے جو ان کو قہر ہے۔ یہ ذہن سالانہ کی شادی کر چکے ہیں نہ جوتے جوتے تو اب تک یہ سناس لے چکے ہیں۔
یہ اپنے سموات میں بڑے بننا بد ہیں۔ ذہن کی معرکہ سازوں میں داخل ہوئی ہے۔ پاروں نے اور بھی زیادہ بااوسل بنا ڈالا۔
یہ کام میں دنیا کی تبدیلی جہان کے تو پر چڑھ جاتے ہیں۔ لیکن کچھ کچھ بے مضبوط بھی ہو جاتے ہیں مگر صرف حساب کے ساتھ اور نہ ذہن شرق و مغرب و جغرافیہ کا ہے۔

حیثیت میں مدد پر جمیل اور بان بھلی کسا تو خوش مزاجی اور عرافت کی بھی پاشنی ہے۔ بروقت اور انکلام بنے نہیں جتے۔
— حشر یاروں کے ترہا ہیں۔

گوشت و نباتت میں ان کے ذہن کے بسن پیروں پر روشنی پڑی ہوئی۔ گمان کے مذہبی خیالات اور مجاہدات پر بھی کچھ مزید کہنے کی ضرورت ہے۔

مگر یہ مذہب کے بارے میں ان کے خیالات ماننا چاہیں گے تو اس سطح پر آپ کو بڑی بے لگائی کے ساتھ نہیں لے سکتے تمام مذاہب میں اسلام کو سب سے زیادہ ترقی یافتہ مذہب کہنا چوں۔ ذہن کی گواہی سے وہ آفاقی تکمیل انسانیت کے لیے مذہب کو مزید کا جھٹکا ہوں۔
نوع کا وسیع دنیا پیدا کرنے اور غیر مذہب کے انکسار ہے۔ سہولت پر بڑھ چکے ہیں قیام تکمیل کے لیے رخصت و طافت و نطق جس کو نہ مانیت کہ باگ ہے۔ صرف خفاقی کی ذات کے ساتھ تھوڑے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

یہ غیر مذہب کے لوگوں سے بھی رو داری اور تنہا نہیں رہتے۔ یہ کہ ان کا خیال ہے کہ اسلام غضب سے منع کرتا ہے۔ لا احکام فی الدین اور لا احکام فی العلم ان کا عقیدہ ہے۔ رشتہ داروں اور اہل باب میں شیعہ، سنّی، اہل حق، و ہر یہ اشتراکی، اشکالی، ہندو، عیسائی سبھی میں مدد سمجھنے کے لیے تعلقات میں حقیقتاً بھی دوسرے مذاہب کے لوگوں کو حاصل جہت نہیں کرتے۔ نبات کا مٹا دینا خدا اور نبی کا مٹا دینا جتنے ہیں۔

سیاسی اعتبار سے یہ اسلامی جمہوریت اور عرافت کے قائل ہیں۔ اسلامی اقتصاد نظام جس میں اشتراکیت کی غولہ اور

مهند رنانه

کھڑکی میں جیسے ہونے نہ گئے گزریے جوئے برسوں کی طرف بجاء ڈالی۔ چند سال پہلے اُس کی عمر صرف پندرہ برس کی تھی اور وہ لاہوری مدد خانے کے اندر ایک کچھڑے سے مکان میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اُس کا باپ بھیس میں مرچا تھا۔ جوف ماں زندہ تھی۔ ماں نے اُسے کیسے پاؤ پر ساجا، اُس کے شوق اُسے کوئی خاص علم نہ تھا اور دھالے یہ ماننے کی کوئی خاص کوشش بھی نہ کی۔ پانچویں صحت تک ماں نے دھاک پڑھایا تھا۔ اُس کے بعد وہ اپر پکھنے علی تھی۔ چند برسوں میں وہ رات سے اپنی ماسی وقت ہو گئی۔ جب کسی وہ کوئی بھی گا اُس کا لہجہ تھی تو خود بخود اُس کے پاؤں پار کی دھم پر ہٹنے لگتے۔ نہ بلنے اُسے پار سے اتار جس کیوں ہو گیا تھا۔ مگر میں کوئی نہ اپنا تھا۔ باپ کو اس قسم کے آرٹ سے شفقت تھا اور نہ ہی ماں کو۔ اور وہ مدد خانے سے ہٹنے والے آئے انھیں تو اس پیشے یا آرٹ سے سخت نفرت تھی۔ صرف اُس کی ماں ہی تھی جس نے اُسے اپنے کے فو میں دلپسینی کے لیے کی ترفیب دی۔ یوں نہ کہ کات خاصہ لبا تھا۔ سر وہ کہنے میں کوئی مُسبب نہ

جیسی ایسی خردی کی لکڑیاں ضرور اودھ تو آئیں گیں۔ چہرے دار رنگ گندمی نہ تھا بلکہ گندمی رنگ سے زیادہ صاف اور شفاف۔ اس کا چہرہ بال گہرے سیاہ آنکھیں کوئی مرنی چہرہ لمبوتر اور پاؤں بے حد میں تھے۔ اگر کوئی آدمی پہلے نہ ملا کھپا اور دیکھ لیتا تو شاید اس کے چہرے کی طرف نگاہ نہ ڈالتا۔ یوں تو کچھ خاص ذیل لکڑی کی تھی جس کی ڈیریاں گہری تھیں۔ وہ نازک اندام سے لڑکی نہ تھی کہ چھوٹی مرنی کا سر نہ لگا رہا تھا۔ جب سامنے کھڑی ہو جاتی تو ایک ادا کا لڑکی کی طرح تھی۔ کسی کھار تو پورا احساس ہوتا کہ کسی لڑکی کی لڑکی ہے جس کے باپ نے کیستوں میں مل چلایا ہوگا۔ جیسی تو جیسی سے ایک تو انی اور ضرور مل کا احساس ہوتا تھا جو بہت کم لڑکیوں کے سر میں سے بھٹکتا ہے۔

زہرا کا استقبال اتنا دلکش نہ تھا۔ ان کی عمر اس وقت بیستائیس برس سے اوپر کی تھی اور اس کا سوا اسی بیات صرف بڑا
تھی۔ مگر زہرا کی پرورش متوسلہ جتنے میں نہ جوتی تو زہرا کبھی ان کے منہ کی خدمت نہ جاتی۔ زہرا کی ان نے اپنے دل کے دیکھے تھے۔
اسی وقت حیدر گھر کا کیا تھا اور کیا کہیں لایسٹن اس کی رگوں میں ہر شے آتا تھا اور اس نے اپنی جوانی میں منہ کے فتنہ
پانی میں اُن کی لگائی تھی۔ حیدر کے مددگاروں کے تھے پھر زہرا کی آہٹ تھی۔ زہرا کی ان آسانی سے اس راہ کی طرف اُغیر
نہ جاسکتی اور نہ ہی زہرا کو اس راہ پر چلو سکتی۔

جب تک صبح ہو جو ان بوڑھے برادرِ محترم کے اندر ٹھکرواٹھکتے ہوں تو خدا خود راہ گیروں کو ۔

کے کیا اثر یا۔ آتے ہمارے جہاد علی نے یہ غمناک کر دیا کہ اُن تلوں میں تلی نہیں کچھ کہہ کر جب جہاد علی سے بات کرنے لگا تو وہ سیدھی سیدھی گھرے میں چلی جاتی اور جب تک وہ بائیں کنارہ ہمارا نہ کرے سے باہر نہ نکلتی۔ جہاد علی نے اس نفرت اور غمناک کر دیا۔ وہ کچھ گیارہ گز کھل کر بات کی تو منہ کی کافی لپے گئی۔ ایک شادی کے بعد دوسری شادی بکھٹ گئی تھی۔ وہ مسلمان تھا اور بڑا ہندو۔ وہ بد سمنیت تھا اور زندہ تو نبوت۔ وہ بڑے سے غم میں بھی بڑا تھا۔

بس ایک بات میں وہ بڑے سے بہتر تھا کہ وہ دیر تھا۔ اس اندیشہ کی بڑی شکل سے گزر رہا تھا اور جہاد علی اس بات کا احساس تھا۔ رد پیر بہت کچھ کر سکتا ہے۔ وہ کھولے کو کھول سکتا ہے اور پکے کو کھولتا۔ اس کو کھول کے اگلے لپے بڑوں نے کھلے پیاس دیے۔ یہ تو غمناک دو عمر تھی نہیں۔ اکیلی۔ بے سارا۔ بے بس۔

چھر چھر سوچا کچھ رقم دیکھا چاہیے۔ محسن روپوں کی تلاش کے منا میں نہیں غم سے ہاتھ کچھ سیتھ کچھ طور طریقہ وقت، راحت کر دیکھ کر گئے بڑھنا چاہیے۔ پتے زراہ کی اس سے بات کی جائے۔ بڑھیا کے دل میں ڈوب کر اس نے اٹھنا اور کوسپ سے باہر چلا جائے۔ میں اسی امید پر جہاد علی خود زندہ ہوا اور جب خود کا کچھ بھرا تو اچھے میں نہ سب تھا۔ موتی۔ ایک فیر کا چراغ دولوں ہاتھ نکالتے تھے۔

ہاں نے سات کہہ دیا۔ میں آپ کو اتنی گندہ نہایت کا انسان نہ سمجھتی تھی۔ سوچا کچھ کرات کرتے۔ ہم شہر بندو آپ نے کھلا۔ پھر آپ کی شادی جو ہو چکی ہے۔ غم میں بڑے سے شہر میں آپ۔ کھلا بھی یہ بات تھی نظر نہیں آتی۔ وہ بار بار یہ بات فرماتے دھاتیے نہیں تو میں بہت بڑھ کر چلا جاتا ہوں۔

جہاد علی دیا۔ اٹھنے کے چھوٹا گیا۔ جواب نہ کر کے ایسا سوچا کہ دل کی سچی پر کسی نے شہر خلد تھا اور سارا کھانا متاع کے کر چکا گیا۔ جہاد علی کا شاہجہاد وقت کا مشورہ میں نہ ہوا تھا کہ اگر باہر پانچ کر کے کسی دیرانے کی طرف نہ جاتے تھے۔ وہ تو بیسویں صدی کا ماضی تھا۔ سینٹ اور پورٹ کے کا بیرو پارٹی میں نے گھروں کو تھیر کر لیا تھا، جلا نہیں لایا کے بعد۔ اپنے آپ کو غم گرا جا جو، کا کام ہے۔ کچھ وہ ایک بات سے بچا۔ پھرا کے۔ بڑھ کر تصویروں کے ہلا داغ پر ایسی ابھری کہ جہاد علی نے غم سے ٹپکنے کی بات کو شش کی گھر یہ تصویر میں ابھری کہ پڑا نے غمناک شہر کے لئے اور ایک ایسی مسکاتی شہر۔ کچھ کی تصویر شہر میں آئی۔ کچھ کے حراج سامنے تھکر کھڑا ہوئی۔

پانچ برس اور گزر گئے۔ زراہ اور اس کی اس نے وہ جو چھوڑ کر یعنی کا زراہ کیا۔ پہلی تو رشتہ کا شہر تھا۔ پانچ کے بچوں سے جگلا آج شہر جہاں میں لڑکیوں کا غیر ستم کیا جاتا ہے۔ جاں، دم میں کی گئی نہیں اور کس کے بچوں کو مر رہا ہے۔ ہر روز کی جیہ تو نبوت اور پرکشش ہوتی ہے۔ یہ صرف حاکم کی ہر تب بھی چلے گی اور شہر میں کما کما کر لگی۔ شہر کی نہیں مرے گی۔ ہر روز کو بے۔ کچھ کی ہر جبر کو وہ لڑکیوں کو ہر روز کے سبب جو آواز میں کھٹک اور جاؤ دم اور کچھ دے پر پریشان جو۔ چال ایلی اور مٹا فی جو، آٹھیس نیلی نیلی کسی گھر کی بھیل کے پانیوں کی حرج اور جب سیاہ رشتہ خفا میں مڑاں تو آٹھیاں پر لای گشتا چاہنے تو کہہ اور یہ کا چراغ آپ کچھ اس جے اور اس سے فاکر نہ اٹھانا۔

ازدوئیں اور گفتائیں جابجی تک پہنچاں پڑھی تھیں، ابھی تک نگاہوں کے سامنے اپنی رہی تھیں۔

ابھی دندن جہاد علی پھر آدھلا۔ یہ کجست کلاں سے آئی تھا۔ جہاد علی کا رنگ اور سیاہ ہو گیا تھا۔ جسم خضرا ہو گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا دل اور ہمد میں نہ لگا اور اس نے اُن کے پلے پہلے کے جس میں لڑائی کیا گیا تھا۔ آپ کی دھڑکنے سے وہ اور شادیوں کر دیا۔ یعنی اب بھی تمہیں صدمہ پیاں ہیں اور میں آٹھ صدمے۔ سب بیویوں کو ایک ایک مکان دے دیے ہیں۔ مزے کے کما آجئیں، کار میں سیر کرتا آجئیں اور ایک بیٹس دن بدولہ۔ (اے۔ آپ کی دھڑکنے سے پہلے بھی کسی بات کی تھی۔ تھی اور اب بھی نہیں۔) جہاد علی نے کمرے میں نگاہ ڈال کر کہا۔ ”بڑا کلاں ہے ان کی؟“

”درہمیت خراب ہے۔ ڈاکٹر کے لئے گئی ہے۔“ بڑا کلاں نے جواب دیا۔

شاید بڑا کلاں کی کئی تھی جسے جہاد علی نے شدید حد پر سوس کیا تھا۔ پھر جہاد علی نے ٹٹتے جھٹے کہا۔ ”ان کی کئی کئی چیز کی ضرورت ہو چکی ہے۔ بس پانچ پانچ کچھ کر دیکھیے۔ اس آپ کی ڈرائنگ پڑھنا۔ جو تو مستحب ہے اپنی کافی پر۔“

بڑا کلاں نے سوس کیا کہ چند برسوں میں سیٹھ جہاد علی کافی ڈھیٹ اور سٹریٹ ہو گیا تھا۔ روپے کی فراوانی نے اسے کافی مبالغہ اور بے شرم بنا دیا۔ شاید یہ شہری ایسا ہے۔ جو بیاں آتا ہے بڑی جلد کا بے شرم اور بے عزت ہو جاتا ہے۔ وہ خود بھی تو..... یہ سہا کر چوٹی۔

اتنے میں بڑا کلاں نے سیٹھ جہاد علی کا ذکر کیا۔

”ان اس کا رنگ کیا ہے؟“

”اس کا رنگ زریاں خوب پکا ہے۔ بیٹی! وہ اس کی گھومتا ہے۔ بڑا مردوں کی زحمت کو دیکھتا ہے اُن کا رنگ جس دیکھا جاتا ہے۔“

”جس کئی جہاں پھر بھی بکے اس شخص سے نہ جانے اتنی نفرت کیا ہے؟ ایک! تم نے سان جھبٹے دیا تھا۔“

اب پھر.....

”بیٹی! وہ آتا ہے تو تم سے کچھ کے نہیں ہوتا۔“ پھر ان نے بڑا کلاں کی طرف دیکھا۔ بڑا کلاں کی طرف سے کہہ کر وہ خاموش سی ہو گئی۔ جہاد علی کافی غصہ کی تھا۔ وہ کبھی کبھار چکر زدہ ہوتا کہ اُن کی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ ابھی تک حالت اتنی زبردستی کہ جہاد علی اپنے دل کی بات کہہ سکتا۔ اب وہ دل کی بات اس وقت کے گلاب سے بھی مت کا کہنا نہ ہوتا ہے۔ گلاب کا رنگ کتنا زرد دیکھا ابھی کلاں کی حق مندی ہے۔

”مردن پناہ مل اور گزرتے۔“ بڑا کلاں کی اقتدار کی حالت بستر زہری جلد و گزرتی ہوئی تھی۔ فتنہ کی ایک بیٹی تھی۔ زیادہ تر عاشق کلاں اور باتوں کے تھے۔ انہیں بنانے کی کہیں کافی تھیں۔ وہ پیر نہ ارد۔ بس کتنی ایک کر وہ پاس۔

پہلے ہاتھ۔

دوسرے ہاتھ کی متشیقی کرکڑی کا نچلا پڑا اور منہ کا اندھا دل ہائے تو مستقبل سوز ہائے۔ اسی دوران میں
نہی کا ایک مندرجہ شرب پے کر بڑھ کے مگر پڑا رہا۔ شرب کا نہ پینے کے افراط، بابر کی تفریح، سینا، کپڑے،
سہی کے پے روپے دیا مگر ان روپیوں سے زندگی تو نہیں تھی۔ جب بڑھنے لگا، مگر شادی کے لیے کہا تو نیوی کا دفتر
لگے دن رات بکھڑا ہوا، پھر بڑھنے لگا۔

پھر باغی تسم کے پتروں میں بڑھنے پانا حسن و شباب کھو دیا۔ حسن کو بڑی فراخ دلی سے نایا جس جز کی دگ قیمت اور
رتے ہیں اُسے سنبھال کر دکھا۔ وہ عواموں اور قوسوں کا آج کل ایک کھنڈر کی صورت اختیار کر گیا۔ اب بھوئے بھلے مسافر
اتے اور کھنڈر کو دیکھ کر کہتے۔ عمارت غرورِ عظیم ہوئی۔

یہ وہی حالت تھی جب بڑھنے اپنے دل کی گزریوں میں ڈوب کر سر پا کر زندہ رہنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟
اب تو سماج کی خدمت تھی۔ اسی دوران میں حواد علی پھر وارد ہوا۔ اُس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو بجانب یا
رب سب نیچا اٹھنے لگا۔ شیخ حسن بھی نیچا اٹھی سی ہے۔ جس تخت اور رعب و اب سے زلمیات کرتی تھی اُس کی جگہ
زمی اللہ اٹھانے لگی۔ حواد علی نے اپنا رویہ نہ بدلا۔ وہی خوشامد انداز نگہ رکھا۔ دل بے تاب کی احاسن کو اپنے کلام
مردود کا۔ یہ پُرانا عاشق ہر ایک ہندی اور خود سرتا۔ ظاہری زمی تھے۔ انتقامات، مضمون اور توانائی
کی تھی۔ وہ دل کی بات کہہ کر دوبارہ رُسوا نہ ہونا چاہتا تھا۔ جس ماں جی سے کتا۔ اگر کسی چیز کی زناست ہو تو
بندہ حاضر ہے۔ اللہ کی ممانی سے میرا کاروبار خوب چکا ہے۔ اگر میں آپ کے کام آسکوں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔
پچھلے سال آپ کا ہر نگاہوں۔

اس صلا خط اصلاً اُس کی ماں کا میں میٹر کر بابر علی نہیں۔ دوسری پر حواد علی نے زلم کو کچھ چیزیں خریدیں اور جب
زلمہ گھر میں داخل ہوئی تو اُس کے ہاتھ میں حواد علی کی خریدی ہوئی چیزیں تھیں۔ یہ حواد علی کی پہلی فتح تھی۔

اب ہر دوسرے تیسرے دن حواد علی اپنی ماں سے کہتا تھا۔ زلمہ کی ماں حواد علی کرتی حواد علی پوری کرتا تھا
دل ہی دل میں کڑھائی لاتی۔ پھر ماں کے کئے پر سٹے حواد علی کے ساتھ سینا دیکھنے چلی جاتی۔ دونوں جو جو پیر کرنے
عمل ہاتھ میری دانا نو پر کار فرمائے ہر تہی ہوئی عمل جاتی۔ زلمہ نے اس تمام عرصے میں زلمہ میں یہ اچانک تبدیلی کئے کی
کہ اسے حواد علی اچھا لگے گا۔ جس کلمے تک کہ دیکھ کر وہ منہ پیر متھی وہی کا رنگ اسے بھار دیتا تھا۔ یہ وہی
کا بادو تھا حواد علی کے خوشامد انداز نگہ کا اثر یا اسے والی زندگی سے بچنے کے لیے اُس نے یہ راہ اختیار کی تھی۔
اب زندگی کو سوزا ہے تو سوزو۔ اور حواد علی پر یہ بات ظاہر ہو رہی تھی کہ رات کی رانی راہ راست پر نہ رہی ہے حواد علی
سنبھال کھول کر۔ وہ پیر صرف کیا اور ساتھ ساتھ زلمہ کو اُس کے مستقبل کے متعلق اشارے کرتا رہا۔ موقع سے اپنی زندگی

۱۰۔ میں تو تیرے ادا کرتی ہوں۔ ہم سب کھاتے۔ وہ ہم سے نہیں پہلی اور کیا تھا تو اس وقت صرف ایک شاہی کا تھا۔ شہنشاہ نے
اس دشاہان اور کئی دیگر نہیں پاسنے کے بنسبے میں کر کے لڑا۔ میں وہ ہنر نہیں کر گیاں چاکر کو جو سو پہل پہل
کوموں۔ تھیں پانے کا تھا خورج۔ اور جب تک زندہ رہا جس نے کھانے کے لیے میرا دل ڈھکا ہے گا۔ اس سے کیا
بنت۔۔۔۔۔ کے وہ وہاں سے نکلتا تھا۔ اپنی تھیں جیوں کر پاتا ہوں۔ اپنے چھانڈ پھر لکھتا تھا وہ توں کا
دو کرتا ہوں۔ خیر یہ وہ اپنے تقسیم کرتا ہوں۔ کافی خوش ہوا ہے۔ تیری بھی تھی جیوں کر پاتا ہوں۔ تیری بھی تھی جیوں
ہم شکت خود ہوں کر دل کا پھر جو بہت کاد منی ہوں۔ خود مجھے شادی کرو۔ زندگی نہ ہے نہ سے کئے گی۔ تیرے
چھلکے کے لیے کتا ہوں۔ اب زیادہ نہ ڈراؤ۔ ان کو تو سب سے پہلے یا فیٹ طریقہ کر دوں گا۔ شے (خیر) ہے یہاں اس کا
بہن کی تھیں تھیں مش مش کر گئیں۔ اس کو کر دوں کے چھوٹے سے فیٹ سے اب ہر ملک اور ایک خوشگوار اور باوقار زندگی
گوانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

۱۱۔ زندہ جانی سے اس سال پہلے سیٹھ کی شہرت دیکھنا پسند کرتی تھی آج اس کی باتیں بڑے عمدے سے سہری تھی
سہری بھی تھی وہ کیا ماہ ہے۔ آج سے اس سال پہلے اس کے قول کا ایک کھو بھی اس شخص سے بھلا م ہونے کے لیے تیار۔
نہ تھا کر تے شہرت اٹا فیصد کر رہی تھی۔ ان وہ بازی لگائی تھی۔ کلائی تھی سے اتنی تھی تھی کیوں کر ہوا علی کے ان تمام فقروں
کوئی کر دل نے ہمت نہ کی۔ ذہن نے ہمت نہ کی۔ میں بھی کچھ کچھ جو۔ داتا۔ شاید درست ہو رہا تھا۔ اس طرح میں خود
نے ہر دانش سیٹھ سے کی جو علی نے کئے پورا کیا۔ یہ انہیں اس طرح پوری نہیں دیکھنے کی گرفت زور پر مضبوط ہوئی تھی۔ وہ
شہرت پہلے سمجھ کر کہاں میں اسے ہونے لگی تھی وہ پہلے اب فٹ چھوٹ گئے تھے۔ وہ سب کچھ کر رہے گی۔ وہ
ایسا نام تک جلا رہے گی۔ مذہب میں کیا تھا ہے۔ نام بدلنے کے ساتھ آئے۔ وہ مذہب جاتی ہے کہ اب مسجد میں مل
گی۔ ان ایک بہت زندہ کر رہے کے لیے وہ ہر روایت کو آواز کی اور جو کچھ سیٹھ کے لاکھ کی۔ وہ بھوکے مر رہے ہیں۔
پا ہوتی۔ وہ ان دو کروں میں۔ بنا نہیں چاہتی۔ وہ یوں لڑوں اور ہوں میں کھو رہا نہیں چاہتی۔ اب تو کار کا چکا بھی پڑ گیا
تھیں ایک دن وہ چھکے سے ہوا منساں گئی اور سیٹھ کے نے فیٹ میں وہ وہی سیٹھ نے واقعی اس مکان پر بھی نامی تو
خوب کی تھی۔ بہتر ہے کہ وہ سیٹھ کو سہا یا اعتبار سیٹھ جو علی ہر منساں کے ساتھ رہنے کا تھا یا چھو او تو خوب گڑھے اس
کے بعد ملائی ہو گئی۔ ہر منساں نے سوچا تھا تو اس نے اتنی لڑائی کر کے سیٹھ کو بیت میں ہے لیکن سسٹن لڑائیوں سے یہ ات
ہر منساں پر میاں ہو گئی کہ سیٹھ بھی کھو رہا تھا ہے۔ کہت کسی پوری کر چھوٹے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے ملا میں ہر بیوہ کی ہے
ہے۔ وہ انہوں میں دو راتیں اس کے مل کر آتا اور باقی چھ راتیں دوسری بیویوں کے پاس۔ ہر منساں نے ہر طرح استعنا
کے دیکھ لیا۔ رات رات جاگ کے دیکھ لیا۔ غلے کر کے دیکھ لیا۔ گھر میں ہنگام کر کے دیکھ لیا کہ سیٹھ جو علی کے رہنے
۱۱۔ سون میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ سیٹھ نے ایک لاکھ سات سو روپے۔ تو بکے قید کرنا چاہتی ہے یہی نہ ہو گا۔ غاری مند
بلکہ میرا نہیں بنا سکتا۔ اب ہر منساں کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ یہ شخص ملک و ملت کا ہر کے نہیں۔ یہ کتا۔ یہ شخص آوارہ

پہلے نہ ملے دیس یعنی نہ رہے دیس حوی، نہ لاکڑی نہ گھر اچھے لاکڑی بہشتی کنیں میں کہے روگرو پانی کی وجہ سے بہشت پھر ان کے دل لکھہ جنتہ رہا نہ رہا، اندھیرا ہو چلی ہے، ڈانڈا ڈانڈا گھ۔ اس سے سدا اول میں کیڈر کہے حد کتابت فرم فرم کرے اس کتابت میں خدا و گنے والی بھی نزل میں یہ پیڑ پر چلی کی ایک نمود خود بھی خودی و شر کے جگہ کو رو یہ فرض مبارک فی حق۔ اس کے ان جگہ نہ امید رہا، بہتا تھا پہنچے پانی کے گئے اس کے پاس ہی رہ گئے تاقی میں۔ وہ بیاضی شکل و صورت اور خود خودی کی گنا، ہے چھان چلی۔ کیا زانی کی گنت، زانی ہو کر دینی تھان سے پہنچے کہے کہ روں کے نہ دانے بکڑ بند رکھتا تھا۔ اسے بہاؤ تیس تیس بار کی اگے پہنچے لاکڑی دے دیتا تھا۔ اور پہنچے تھے ہی چست پر چڑھتا کہ اسے بنیادی کی صورت نظر آئے اور پتہ اس گڑھ سے غریب کی غصہ بکڑی پر پانی جرنے والی کی حست کی شکل دیکھ کر وہی لاکڑی کے کیڈر دیکھ تو وہی حست لانیس تھا یعنی مسین

کسی خطہ قوم کے آدمی کا ہونا دیکھنے سے ہمیشہ پتا چلتا ہے۔ جب بھی شہر و غور دنیا سے اس کے ہاتھ ملے گی اس کا وہی پراگشتہ ہے۔

مجھ سے اس قدر دل غبار کی برمی، شرم کے غم، گمے کے کھوس اور چرواہا کی گھر کی پڑائی صاف پر غصہ نہ ان کی یادداشتوں میں پڑے تھا۔ یہ اسی کے بعد تھوڑے روز گرام کا ایک بڑا ہوا تھا۔ ویسے تو ان کی گھر کی حدت ہی سے ان کا گھریلو ہی غم آتی تھی لیکن اس کا شرم کی صورت کھٹا بڑا ہوا ہے اور اچھی گھر کا تھا۔ سوچے کی کوئی کوئی سادہ خلیہ والی کمرہ گریں کے چمکے میزوں پر بیٹھے ہونے پر اسٹیل کراک اسے ان تیبیوں کی گھٹے نظر آتے جن میں گھر کی کھلی برادری نہیں دیکھنے کے لیے تھائی بڑے سے می کھڑے ہوں اور ان لائنز چڑا رہے ہوں۔ اسے ان لڑکوں پر بڑا غم آتا اور وہاں تھا شاید ان پر بے حد غصہ۔ گتے بے جوتی نہیں، دو سر۔ کون بے جوتا ہے؟ کس سے کوئی بدمعاش کیا، کس کے سر کسی کا نہیں، پھر کس کا کوئی بدمعاش کتبے؟

اور اس کے ہی سوا ان کا جواب کسی دیکھنے والے کتابت و درمالت و مکتبہ نہ تھا۔

[illegible]

کھینچنے اب سب کا جو ہے چست پر چڑھنے کی بجائے تھوڑی دیر میں کر کے کمال لے لیں۔ وہ جس حالت میں خدا کا نام لیں
 باگ عورت سارے کھڑی ہوتی، نہ کہ کمر کھڑی۔ وہ ہے ایک مگر یہ دیکھا ہے ملک کا اور آگے بڑھ جانا اور عورت کے سر سے جلتے تپ
 تپتے اس کا پچھا کرتے رہتے

بست دون تک یہ فریاد تھا۔ کیا اسے اب نہ کھل پڑی، نہانی اور ناگہان ہی سے دیا تھا اور جانے کس نے اور کیسے اس
 ۱۵ ام چپار کو دیا تھا۔ ہمارے پاس اس کے وہی وارنٹے پہاڑ کر پڑتے تھے اور اس سے بچہ نہائی کرتے تھے۔ انہوں کی زبان سے
 اور صحت پرانے کے فارسی کچھ نہ گنتی تھی۔ وہ بڑی رشتہ منکر اور حق تھی اور وہاں حدیث نہائی اور نہایت آواز رانی اور ان قسم کی چیزیں
 دیتے تھے جس میں وہ ٹکرائے ہوئے تھے یعنی قہر۔ اس کے وارنٹے پہاڑ کر پڑتے تھے اور وہاں حدیث نہائی اور نہایت آواز رانی اور ان قسم کی چیزیں
 اصناف مختلفہ میں سے اولیٰ بن تھا۔ جس میں وہاں قہر تھے جیسے اسے پاک بننے نہایت اور وہاں حدیث نہائی اور نہایت آواز رانی اور ان قسم کی چیزیں

نا سکرٹ دیتا تھا اور کبھی کبھار وہ گری خیز سڑی ہوتی تھی اور کید سکرٹ اس کے نیچے پر رکھ کر سیر کو نکل جاتا تھا۔

پھر ایک دفعہ کید کو یہ جاننا کہ وہ صدر بن چکا ہے اس سے قہقہے اور مذاکرات خاصی نازک صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ اسے صوفیوں جیسے اس کی عظمت کے لئے اس کی ہائیکوٹ مٹی تھی۔ وہ اس کا بڑا ترخ کڑا۔ اسے جیسی تھا کہ سب کو کڑک بنگ ۱۱ اور لاؤ کید بڑا جاتی تھا۔ لیکن اس کے پاس اس بات کو کبھی بڑے تھا اور مگر برتا بھی تو وہ اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ یہ سچی سچی کہ کید کا کیا مشہور کیدار پریشیں ہوتا تھا اور اس کے لئے حالات کا تشدد کرتا تھا۔ بازار کے وہاں دھڑک دھڑک چھینٹے اور اسے تلے اور تلے کرتے۔ وہ اس کے لئے سنس کر لایا جاتی اور وہ بٹھے اور بٹھے لگتے۔ کیدار دیکھتا تو وہ انہیں ڈانٹ بھی دیتا۔ لیکن وہ ہر گھڑی ران تھوڑی مروجہ رہتا تھا۔ لوگ جب بھی مروجہ جاپا کو پریشان کرتے اور وہ بے چارے ایک چھانچا مذاق پر کر رہے تھے۔ لیکن اس کے ہاؤس کی نفسی اس اب بھی کالی تھیں اس نے مانتوں کے موتی اب بھی چلتے تھے اور اس کے من کی جاو بیت اب بھی قائم تھی۔

اوسے بات کے قریب کیدار نے جاپا کی پھول کی آواز سنی۔ اس نے اپنے کمرے لکڑی کے دیوار کے نیچے دیکھا۔ ڈنک گھر کی شہزادی برآمد سے پڑی بڑی طرح کیج رہی تھی۔ کیدار میز صیاد اتر کر فرما اس کے پاس چو پڑا۔ اسے سکرٹ دیا لیکن اس نے سکرٹ نہیں لیا صرف اپنے پیٹ پر اتار دیا۔ کیدار نے اس کے پاس سے ہٹ کر ایک رکت والے کو بٹھا دیا۔ جاپا کو بڑی شکل سے اس میں وہ اور اسے گورڈا ہسپتال لے گیا۔ وہ تمام راستہ سختی اور تھلائی رہی۔ اور جیسی وادو میں داخل کر کے اس نے جاپا کو ڈاکٹر کے سپرد کیا اور خود ہسپتال کے ایسیج احاطے میں دوسری کے درخت کے نیچے بیٹھا سکرٹ پھر نکلے ملا۔ اس نے جاپا کو درخت کے تلے سے لگا دی اور اسے چھنے لگا کہ بڑا پیدا ہوا تو اسے سنبھالے گا کہ باجپا کو آنا پرش کائن ہوا کہ وہ اس کی دلچسپی بھال کرے۔ لہذا ہم کو چاہیے کہ کیدار نے اس سے کس اور وہاں حوریت پر جسے یہ سلوم پی نہ تھا کہ کوئی اسے کال سے جا۔ لہذا اس نے ایک جس کئی حوریت کے دفتر اس کو اس کی حوریت کا گھر بنا دیا۔ وہ انہیں بند کر کے کیدار کے پیچھے چلی گئی اور اس نے اسے پانڈی آغوی چوٹی سے دیکھ کر وہاں سے کئیچے صیت پڑی صیت کئی میں گرا دیا اور اب اس کی بنیاں ٹوٹ کر یہ دھیرہ ہو گئی تھیں اور اس کے جسم کا ایک ایک کٹ گیا تھا۔ کیدار اسی قسم کی وجہ سے جاپا اور سکرٹ پہنچتا رہا اور رات بھر وہ اندرونی سے گھومتی رہی اور جاپا ایک سنسنی کی صیت میں نہایت بے چارہ پڑی رہتی رہی۔ اور پھر برجات کا کھانا اچھا لا کھیا اور پریشیں خیر سے باہر چلی ہوئی اس نے بتایا کہ یہ مرد پیدا ہوا تھا اور کیدار جیسی پانی انہوں سے اس کے پھر سے کو دیکھتا تھا اور اس کی نگاہیں میں گئی سکرٹ ملتی رہی۔ اور پھر وہ دھیرے دھیرے ہسپتال کے احاطے سے گریٹ کی طرف بڑھا۔ اس کے دل وہاں پہلے ایک وہ دھوا دھوا چلا اور اسے صوفی جو رہا تھا جیسے اس پاکی اور بے سارا اور خیر حوریت سے اس کا کوئی خیر فاض اور اس نے اچھا بے شک تھا۔ ایک یہاں صفت جس کی وہ تشریح میں کر سکتا تھا۔ ایک یہ کہ وہ جس کی مصلحت نہ دی جا سکتی تھی۔ سب کی کوئی مذہب نہیں دس سکتی تھی۔ لیکن جو ایک گھر سے سنائی نہ پہلے چوٹی تھا۔ ایک اب بند ہو جانا اس کو پھر یہ وقت اور قبل وہ سب کا اچھا نہ تھے اب وہ سب کے قریب سے آتا ہے۔

جاپا جتنے دفعہ ہسپتال میں رہی۔ کیدار شمع تمام ہے دیکھنے جانا۔ جب تک اس کے جسم میں نہایت اور پاؤں میں نہ رہی وہ ہنر پر پڑی رہی اور جب اس کے فعال جسم میں حالت گئی تو ایک نام ہسپتال سے جاگ پڑی اور ڈاکٹر نے اسے واپس برآمد سے پھر سے

[illegible]

کیا رہا اب بھی اسے طریت دیتا۔ دوسرے تیسرے وہاں ہی کے کٹر سے میں ڈنڈہ ڈنڈا دیتا اور کہیں کہیں اس کی جھولی میں چل بھی دیتا۔ یہی اب وہ سلاکتی نہیں تھی۔ پٹنی پٹنی آنکھوں سے دھیر دھیر تھی اور ایک خفا تک نہ ہوتی۔ چھ اس پر بھی لڑ گئی جو۔ جیسے بے سحر ہو گیا ہو۔ اور ہو گیا۔ نہ کھنکھناتے۔

[illegible]

نیا دیوانہ بنا ہے نیز قسم کا تھا۔ اس نے بھی کسی سے کوئی چیز نہ مانگی۔ کبھی کسی مکان کے سامنے کھڑا نہ ہوا۔ کسی دھڑکے
 بات نہ کی۔ بس پہلے حال میں مست چل رہا ہے تو پھر ہی بار بار ہے۔ بیٹھا ہے تو گھسندہ دیوار کے ساتھ جھنجکے بیٹھا ہے گا۔ پیراں
 پہلے رہا ہے تو سسل پٹے ہمارے ہے۔ جب تک کہ بٹنل کا بڈلی ختم نہیں ہو جاتا۔ شہر میں دوڑانے تو اور ہی تھے۔ لیکن یہ تو دروہوں کا ہانا
 تھا۔ ہٹل ہی ہٹل اور انفریا جس کا غلبہ کرنے دھوکا کوئی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس نے چپا کھرت بھی دھیس نہ دیا۔ جیسے ڈک ٹوٹے
 بکام سے پر سامنے اس کے کسی "درا" دیکھ رہی نہ تھا۔ ہر جہاں چوکیا نہ تھے اب اپنی ذرا بی کر شر کے دوسرے شخصے میں کھاتی تھی اور
 ہب ایک اور چوکیاں لگیا تھا۔ جو سرتا زیادہ تھا۔ ہر مکھ دیتا تھا۔

۱۰۔ ایک دھکیلا نہ بچ سروسے کڑی سے جھٹک کر دیکھا تو پیا پہنے ٹکے کرینے سے چلتے سوجھی تھی اور پیلوڑا۔
 ۱۱۔ سارے پڑ پڑا۔ اٹھا اور سوتی پڑی چپا کو ایک ٹک گھروسے ہلدا تھا۔ چپا کا گھلایا نہا جسم اس کی پٹی ہوئی فیض سے نڈا۔
 ۱۲۔ جھٹک رہا تھا۔ بچہ جھڑ جھڑی پھٹک کر لڑکے دھٹ سے ہٹتا نہا پش چک۔ دابو۔ دیوالے کی نظریں اس کی گڑی تھیں بچے جبر
 کیس کڑاؤ لگی ہوں۔ جلتے کیوں کیا رو کھ سب۔ چپا کا۔ ایک پرشش گھرا نہاں دوسرے پرشش کھٹے نہاں میں دلچسپا پینے کا
 لٹا دوس سے ایک کا دوسرے کرنے کا تھا۔ ایک منہ دھکی نہاں رکھنے کی تھی۔ ایک تھق کی بنیاد پر نہاں جی تھی کیس کی تھک
 کا یہ ایک نہاں تھا۔ اس کے جنوں کی ایک نئی گھٹنا تھی۔ اس سے سوس نہاں بچہ ٹک گھرا تھی سے انا نہاں بڑا۔ اس کے اندر صحت
 کھسے اور میز پر کیوں کی طرح نہاں بٹے کوک سب نہاں میں دلچسپا پینے لگے تھے۔ نہاں کی وہی ٹوبسرتیں دھکیوں اور نہاں تھیں
 کو لگی تھی۔ اور تھیں جبر جبر کرنا۔ جی تھی۔ پرشش کھٹے نہاں کوک پشش پر سب سے تھے اور پشش نہاں پرشش کی نہاں

ہے کہ وہ جگہ تھے جہاں نہیں زندگی کی فوجیں تھیں جسے نور رکھتی ہیں انسان میناؤں میں داخل ہو رہے تھے جہاں سے پسند کے منجھیل
نور ہوتے ہیں وہاں سے انہیں کی طرح نہیں نکلتی ہیں اور انہوں نے شکر خیر ہوتے ہیں اور تنہا کی گلیاں چلتی ہیں اور کھانا کی لکڑیاں
وہاں سے نکلتی ہیں وہاں سے انہیں نکلتے ہیں اور مات اپنے گھر کو لے جاتا ہے اور پچھلے سے جنتوں سے آتی ہوئی عطر ہیز ہواؤں کا
نور نکلتی ہے ۔

میں چہرہ کی یاد رکھ دوں کہ جس نے میرا چہرہ
 ڈاک گھر کے سامنے کھلتی ہوئی کھڑکی بند کر رکھی۔

اور سانچے کے مکان سے رہنے والی خواتین کی ہٹ ماراؤ اور بھی ہو جاتی تھیں۔

جب دس روز کے بعد کیدو واپس لڑا تو سینیٹس سے دہر نکلتے ہی اسے چپا کا خیال آگیا۔ اور اس کے ساتھ اس
 پرانے لاجی جو ایک بیچ چپا کو بڑی محنت سے گھور رہا تھا۔ لڑی تو گاڑی فیک چاہیے تپتی تھی، لیکن میٹ پر نہ کے کارن آت
 کی نہ پر تھی تھی کیڈار کل سے ملان اٹھا کر رکٹ میں بیٹھا اور رکٹ والے کے ہر چھنے پر کہ اسے کبس جگہ جانا تھا۔
 نے جواب دیا۔

”ناک ٹھکے مٹنے“

ہر انصاف کہتے ہیں اسے چپا کا دھیان آیا اور اس کے ہر سے ہر سے جسم کا اور اس کی دوشی آنکھوں کا اور اس نے یہ
 ان کا اور اس کے کچے کا بچے وہ ہر کو اپنے سے پہلے لکھی تھی۔

دکن کے پتہ گنوم رہے تھے اور کھوار نہ ہونے والے کھارے میں سڑی رہتا۔ ہانے کیا کر رہا ہوگا۔ کس وقت وہ مانبا رہا ہوگا۔ مین ب کو روک جاگ رہے تھے۔ سوچا جنے دو تھا۔ میں دو جاگ رہا ہوگا۔ اور بڑی پی رہا ہوگا اور دیوار کے ساتھ بیٹھ چپا کے گردانے ہونے لگوں رہا ہوگا۔ جو کسی کی چنی ہوئی قبض کے دیو کیوں سے باہر جھانکے بیٹھے تھے۔ کیا نہ ملے سے ٹکٹ نکال کر نکلیا۔ اور سو فیصد سیر سے ٹکٹ نہیں پنا تھا۔ پندرٹ وہ اس کے پتا تھا جب پاسے کی گرم بریلیاں اس کے جنوں کو چمکتی تھی۔ لیکن جب اس کا دماغ سڑی کی بول جیتوں میں ہوتا تو امت کی کوئی تخصیص نہ رہی۔ سکرٹ میں ٹکٹ نکلتا تھا۔ چاہے آدمی مات ہو یا بھور لاٹکیا اجاڑا۔ اور اب جو کے چلکے اٹھائے ہیں سکرٹ کا دھواں مٹا دیا۔

ریت و کھیتی۔

ہاگ کریمیا۔

[illegible]

ابن رویت اور سی احمد او

منہجہ ۳۔ ایس۔ ایلٹ ترجمہ: تہ افضال حسین نقوی

انگریزی ادب میں ہم شاذ و نادر ہی روایت کے تسلسل کو نظر کرتے ہیں۔ تو ہم کبھی کبھی اس نام کا استعمال ضرور دیکھتے ہیں تاکہ اس کی عدم حیثیت پر بحث کر سکیں۔ ہم کبھی "خاص اولیٰ روایت" یا کبھی "عام اولیٰ روایت" کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اس لفظ کو صفت کی صورت میں کبھی شاعر سے منسوب کر کے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ "یہ شاعر کا کلام" و "یہ شاعر کا کلام"۔ انتہائی روایتی و برطانوی شکل ہی ہے۔ یہ لفظ استعمال ہی نہ سکتا ہے تاکہ قیاس سے ہمیں روزمرہ کی صورت میں استعمال نہ کیا جائے اور نہ دوسری کبھی صورت میں اس کا استعمال مشکل ہی کے متعلق قرار پایا سکتا ہے کیونکہ اپنے اشعار کے لفظ سے جس کاوش کو بہتر گردانتا ہے وہ فنی تعبیر کی نئی اور عمدہ تراش و تراش سے تسلسل ہوئی ہے۔ غرض آپ مشکل ہی سے اس لفظ کو انگریز سماعت سے آواز کر سکیں گے تاکہ آپ کی واقعی مشافہہ تعبیر کی نظر جمع کرانہ ہو۔

یقیناً اس لحاظ سے کہ قیدی حیثیت سے کسی زندہ یا مرادہ اہل قلم کے متعلق مشتعل ہونے کا بظاہر امکان نہیں کیونکہ ہر قوم اور ہر نسل کا نہ صرف اپنا تخلیقی داغ جو آپس کے ساتھ ایک ایک کا اپنا الگ ایک تنقیدی مذاق بھی جو آپس کے ساتھ ایک ایک کا اپنا تخلیقی استعداد کے مقابل اپنا تنقیدی جبلت کی قوتوں اور قیود سے بے خبر رہتا ہے۔ ہم فرانس کے شہر تنقیدی حیرت سے جس سے اس کی زبان اُڑ رہی ہے اس کے تنقیدی اعجاز اور جہت لاپتہ پاتے ہیں اور ہم اس منہ پر پھٹتے ہیں کہ ہماری بے بسی کتب ہے اور فرانسیسی ہمارے مقابلے میں زیادہ تنقیدی مذاق رکھتے ہیں۔ حالانکہ کبھی کبھی ہم پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ فرانسیسی ہمارے مقابلے میں کم سیرجی اہل ہیں۔ لیکن بے فرانسیسی ایسے ہی ہوں گے ہیں، آپ کو یہ ضرور یاد کرنا چاہیے کہ تنقید اتنی ہی ضروری اور بدیہی چیز ہے جتنا کہ کسی ذی روح کے لیے غرض کی آمد و شد، چنانچہ ہمیں بھی چیز کے پڑنے وقت اس کے صاف کئے اور نکال کئے اور جذباتیت سے متاثر ہونے میں قیادت نہیں ملے گی جوئی چاہیے کیونکہ فرانسیسی ہمارے ہم اپنے قلم نے فرہنگ کو کسی تنقیدی کاوش پر مزید تنقید کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ اس اعجاز کے لیے کہ دشمن میں جو مخالف ہوگا اسے مٹانے غور میں نہتے ہیں، ان میں ایک ہمارا کسی بات پاز ہانے کا رجحان ہے، شہادت کو قلع پر دیکھ کر اس شاعر کا کہنا کہ شاعر کہتے ہیں کہ اس کی شاعری کا ایسا داغ آ جا کر کہتے ہیں میں اس کی دوسرے شاعر کے پاس شہادت نہیں ملتی رہے۔ یقیناً ایسے ہی شاعر کا شمار ہوتا ہے۔ ایسا صورت میں جبکہ کہنے کو کچھ شاعر آخر کار کے کسی خاص انداز یا رنگ کی بات جو کہ بے قلم کو کوشش کرتے ہیں کہ معلوم کریں کہ اس میں نہی کی انفرادیت یا قلم کی انفرادیت اور حیثیت خاص اس کا جو بڑا ان کی بات ہے۔ اس بات

[illegible]

آپ کے لئے ادبی روایت صرف گزری ہوئی نسل کے کامیابیوں کے اندر ہی تنقید کا ایک پائیدار بنام ہے تو یقیناً اس سید صاحب
حق سے ٹکرائے ہوئے ہیں وہ کیا ہے۔ روایات کے ایسے دھندے درج ہو کر ہیں جن سے ادب کو جو کچھ چاہیے وہ
دیکھ کر تو اترے کہیں بترخت ہے۔ ادبی روایت ایک ذریعہ امت کے جذبہ ہے۔ یہ درناؤ حاصل نہیں کرتی۔ البتہ اس کے
صول میں کچھ کر کے کام لیا جاتا ہے۔ ادبی روایت کے شعور میں تاریخ کا تصور سب سے پہلے ابھرتا ہے جس سے نوگرہانی
اُس شخص کے لئے اچھا ہے جسے جس سال کی قوت سے زیادہ حیثیت شاعر اپنا ہمدرد ماننا ہو۔ یہ تاریخی تصور ایک ایسی
کتاب ہے جو صرف شش کیلیت ہوتی ہے بھٹاس کی موجودگی پر ہی روشنی ڈالتی ہے۔ یہ تاریخی تصور ایک آدمی کے صرف
نات پر مبنی رہتا ہے کہ وہ کس اپنے نسل کے متعلق کچھ جانتا ہے یا نہیں جانتا ہے۔ یہ تاریخی تصور ایک آدمی کے ساتھ لگے
رہنے والے ادب پر جو مراد ہے وہ کتاب کے شروع ہوتے ہیں جس میں خود اُس کے اپنے ملک کا ادب ایک نئی
حیثیت دیتا ہے ایک انکار و تاج ہے۔ یہ تاریخی تصور ماضی زمانہ کے ادب و تہذیب کی ترقی و ترقی پر دو سو قد کی کلیا
تاریخ حیات کی کتاب ہے۔ یہ تصور ایک نظم کا ذکر دیتی ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک نئی قوم کے اپنے دور
اپنا مقام متعین کرنے میں مناسب تصور و فکر کا احساس ہوتا ہے۔

[illegible]

میں آدھ گھنٹہ نام نہاد شاعر کے ہونے کا ایک نیا کرکٹ نمونہ میں لکھتا ہے کہ ایک شاعر کا جو حال ہے
 گھنٹہ بیکار یا کسی شاعر کے کثرت اقتباسات کا ایک نمونہ سے مراد ذکر کیا ہے۔ یہ بھی ہے
 کہ شاعر کی کسی قدر وسیع اور مختلف شعرا و شاعرات کا مجموعہ ہے اور کہ دنیا کا کوئی نیم انگریزی میاں اس نقطہ پر کسی گھنٹہ
 سے کام نہ لے سکیں کہ "خدا جانتے ہے" کہ حق نہیں کہ فتنی علی اور ادبی داؤ کی شہنشاہی ہے جو قبل شہنشاہ
 دھاک کے کی صورت میں ظاہر ہو گئے۔ پاؤ (Pao) اور فرانسیسی (Francisco)
 کا قصہ ایک خاص جذبہ کی خاطر لکھا ہے۔ یہیں شاعر کی شہنشاہی کا ایک چرچہ ہوتا ہے اور اس تجربے سے ظنا
 ایک ہے جو کسی شے سے متاثر ہو کر حاصل کیا جا سکے۔ اب اس کی شدت اس درجہ میں ہے کہ کینو پینٹنگ
 "نویس" کے طور میں ہے جس میں جذبات کو براست عزت حاصل نہیں ہے۔ جذبات کی کثرت شکیں
 ہونے کے شاعر کے شکایت میں ہے۔ "الائنس" (Alliance) کا قتل (اوٹیلو) (Othello)
 کی پریشانی ایک ادبی اور فنی اثر سمجھتے ہیں جو ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ "ایچا" (Echa) کی پریشانی
 کے "ایچا" کے نام سے ظاہر ہے۔ "الائنس" میں لکھا ہے اور "آثر حقیقی" کے لیے درجہ تمام ہو گیا ہے۔ "اوٹیلو" میں
 یہ جذبہ "ایچا" کے کردار خصوصاً کی حد تک اور بتاتے "الائنس" کے نثر میں جسے "الائنس" سمجھا جاتا ہے
 جتنا ریاضی کے سفر میں ہے اور جو دور دوروں میں ظاہر کا پہنچنے والا ایک دھماکہ ہے۔ "کینس" (Kens) کا
 اور "ایچا" کے طور پر ہونے کے قسم کے احساسات کا مرقع ہے جو "عادل" کی ذات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ایک
 ایک ایسا ہے کہ کوشش نام کی وجہ سے ایک حد تک اپنی شہرت کی باعث اس بات کی حمایت رکھتے ہیں کہ
 یہی جائز ہے۔

میں جس خط پر کہہ دیتا ہوں وہ دماغ کی اتھاڑ روح کا افسانہ بیانی نظریہ ہے۔ میرا مقصد یہ ہے
 کہ شاعر کے پاس اپنا خاکہ کے لیے اپنی "شخصیت" نہیں بلکہ ایک خاص ذریعہ (میڈیم) ہے جو کہ فقط ذریعہ ہوتا ہے
 نہیں جس میں جذبات، آکٹان، ان کے لیے سے خدا خدا ہوتا ہے۔ "آئینہ" اور "جرات" جو انسان کے لیے ہم حیثیت
 رکھتے ہیں شاعر کی ان کا کوئی مقام نہیں ہوتا اور جو اثرات شاعری میں کچھ اہمیت حاصل کریتے ہیں وہ انسانی اور انسانی
 طبیعت کے لیے درجہ ہوتے ہیں۔

میں ایک نثر کا اقتباس پیش کرتا ہوں جس میں اس کے لیے غیر ادبی تو مزید ہے کہ اسے "تدرج" یا "فیات" کا درجہ
 میں نئی تجربہ حاصل ہوتا ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ میں نے اپنی ذات کو دست کر دیا

کہ اتنی اُس کے منہ کا پسند کر دیا

جس کی موت کے متعلق ہر شخص کا اندیشہ تھا کہ اس کا شہید انتقام دیا جائے گا

کیا یہ شیم کا کٹڑا تیری خالص دہائی شہری صحت ہو کر آئے ؟
 کیا مرنے پر یہ دوسرے کے نژد میں جا اپنے کرنا ہے ؟
 کیا صاحب قدرت اپنی بجلیات کی پل بھر کی خوشی کے لیے اپنے نژد ڈالتے ہیں ؟
 کیوں وہ شخص مرنا مستقیم سے بھٹکتا ہے ؟
 اور اپنی زندگی قاضی کے تجلّیش ب کے حوالے کرنا ہے ،
 (کیا اس لیے کروہ) اپنے نظریات کو جلا دے گئے ؟
 اور نوبت و نفاذ وہ کرنا اپنی بہادری کا ڈھنڈھ مورا پیٹ گئے ۔

یہ تقاباس (جیسا کہ سابق و سابق سے ظاہر ہے) منفی اور مثبت جذبات کا مجموعہ ہے جس میں ایک طرف تو اس کے لیے ایک شہید اور مجروح قسم کی کشش ہے اور دوسری طرف اتنی شدت سے دوسری کی طرف رغبت بھی ہے جو پہلے کاثر سے صرف متضاد ہے بلکہ پہلا اثر مضامین بھی کر دیتی ہے ۔ یہی تضاد جذبات کا بغیر ڈرامائی پرفیکشن کی جانب ہے اس کے لیے زبان خاص ، ریت ، دھن کی ہے ۔ جس میں صرف پرفیکشن ہی اس کے لیے کافی نہیں ۔ یہ دراصل ایک ترقی اور ترقی جذبات ہے جسے آواز دینا کرنا ہے ۔ لیکن یہ کئی اثر اور فکرمبر ہے شمار کیا کہ دوسرا اثر ہے جو ایسے جذبات سے یک گونہ مناسبت رکھتا ہے جو ہر نگاہ نظر نہیں آتا لیکن دراصل یہی جذبہ دوسرے جو است لیا کر ایک نئے "ادبی جذبہ" کی تخلیق کرتا ہے ۔

کئی شاعر اپنے جذباتی جذبات یا اپنی زندگی کے خاص واقعات کی وجہ سے ممتاز اور پسندیدہ شمار نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے خاص جذبات سلسلے کے ساتھ ختم اور سپاٹ ہو جاتے ہیں ۔ لیکن شاعری میں یہی جذبہ انتہائی پسندیدہ اور اعلیٰ قسم کی ہے جو بالکل مگر اس درجہ پسندیدہ بھی نہیں جیسے عام لوگ اپنی زندگی میں یہی تصور لیں اور ان کے ہونے جذبات رکھتے ہیں ۔ اور جو شاعر ان شعراذراق اور طبعی ہے کہ شاعری میں نئے انسانی جذبات کے انکشاف کی راہیں اور حوالہ دہاؤں اور پھر طریقت کے ساتھ انسانی جذبات کی قوت کی جانے میں کاغذ پر ہے تجربہ نگاروں کے شرافت پر ختم ہوتا ہے ۔ شاعر کا کام یہ نہیں ہے کہ نئے جذبات کو جانیں بلکہ اس کا کام عام جذبات کی شاد ہی اور ان کا استعمال ہے ۔ انہیں کھوساتے اور ان کا راز ہے جو حقیقتات اور جو نہیں رکھتے اور ایسے ہی جذبات کا شعور استعمال کرتا ہے جو کائنات کے جذبات خود کو بڑا ہو ۔ انہیں صورتوں میں اسے اپنی ان صورتوں میں مقصد بدلتے کہ نئے قوی نکال ہے ۔ چنانچہ میں یاد رکھنا چاہتا ہوں کہ جذبات کا شعری ماحول میں ماحول ان کے ساتھ جو مل جاتا ہے کیونکہ شعری صورت میں تو جو اسے صحیح سنوں میں جذبہ کا کام دے سکتے ہیں نہ ہی کوئی جوتی بات اور ان کے ساتھ ملنے میں خاص ہے جب تک سنوں کی صورت اور بنیت میں تبدیلی کی جائے جو اسے شعری کیفیت اور جو نہیں لے سکتے ۔ ان کی کیفیت کو صاف سمجھ کر کہہ دیا کہ ان کے تجویز کے ہم سے تیسرا نکتہ ہے جو جیتا ہے شاعر ایسی چیزوں کی روشنی میں خاص ہوتا ہے جس میں ایک ہر شاعر اور اہل انسانی تجربات کا درجہ نہیں دیتا ۔ یہ تو ان کی مرکز ہی ہے ۔ ان کے ہر کر حاصل نہیں ہوتی کہ ان

پچاس چیلک

(ابتدائیہ)

نام: _____ ایلیٹ: _____ سرنام: _____ سید فیضی

بہی باتوں کی طرف لوٹ کے جانے کی بجائے ،
اب نہیں خواہش کوئی !

اب کوئی امید نہیں

اب نہیں خواہش کوئی !

بہ یہ خواہش بھی نہیں ہے

کو کسی کا بچے احاطہ فراوان مل جائے ،

یہ تمنا بھی نہیں ہے کہ بچے

غیر کی تقدیرِ فرداں مل جائے !

میں اب اسی چیزوں کی خاطر

کسی کو شش کے لیے جی تو نہیں ہوں کہ شان

سال خوردہ ہو جو شاہین

تو پر ہاز کو پر کس کے لیے پھیلائے !

عہد رفتہ کی گئی تاب تو ان

نامی کیوں مجھے اپنا ٹھکانے

(۲)

میرا اب ساعت رفتہ کے فانیابِ قبل سے

نہ کا ہونا !

اور وہ میرے خیالوں میں بھی اب
بار نہیں پاسکتی

اور میں جان گیا ہوں

کہ میرے بس رفتہ تجھ کی فانیابی کو اب

پھر سے نہ جانوں گا ابھی ،

اب تمیں سایہ گل میں اب جو

برسہ کشِ زویت نہیں ہو سکتا

(۳)

اور میں جان گیا ہوں کہ

زبان تو تب سدا سے قاصر !

اور میں جان گیا ہوں کہ

تخلف جنہیں کہتے ہیں وہ اک خاص زبان

خاص زبان کے ہیں فقط زبانی !

اسی اور اک سے ہیں خوش ہوں

کہ یہ مادہ اشیاء تو یہی ہے کہ جو سہہ !!

اب کسی تپہ و شاداب

کھنگنی ہوئی تہذیب

کون سے کیا ہے

اسی ادراک سے میں خوش ہوں

کہیں اپنی خوشی کے لیے

بنیاد اٹھا سکتا ہوں

۔۔۔ اٹھ سے دھاکا ہوں

کتا ہوں۔۔۔

اے میرے خدا

مجھ کو ہر چیز بھلا دینے کی توفیق عطا کر دے

کہیں۔۔۔

خود سے

ہر اک بھت کے اُلجھا دے

ہوائے بات کی تھیل سے

آند اور ہوں

وہ۔۔۔ کہ جو ہو چکا

اب پھر تو نہیں ہو سکتا

وہ رفتہ کی طرف

میرا پناہ بھی نہیں ہو سکتا

یہ دعا ہے۔۔۔

کہ تراصل نہیں

تیری عنایت ہی سے دوپہار کرے

یہ پردہ ہاں کہیں۔۔۔

اب پر پردہ باز نہیں

یہ پردہ ہاں۔۔۔

جہاں ہی کو ہر گتے ہیں

یہ تنگ سیر جہاں

نہلک جہاں

میرے دل سے جہاں تنگ آیا ہے ہوا

نہلک جہاں

اے خدا

ہم کو یہ توفیق عطا کر دے

کہ ہم منکر کریں

ظلم نہ کریں

اور سکون اور تسلی کے ہی پیر بن جائیں

ہم گنہگاروں کی خاطر

کرد کچھ اب بھی دعا

اور

دوم آئندہ بھی دعا

ہم گنہگاروں کی طرف سے

کچھ اب بھی دعا

اور۔۔۔

دوم آئندہ بھی دعا

آنکھ اور اندھیرا

عنبر انجاری

فردا کو یا سنت کا ایک ایسا قافلہ طوق بن کر گئے میں ملک ملی تھی جیسے اس کی رہائی کیس لکھی ہو۔ نہ اتارے ہئے نہ
اس نے ہئے۔ جب نصیبت تھی۔

ٹھہری فضا سخت پڑ گئی اور بدبو کی تھی۔ فرزندہ اکثر کھڑکی کے قریب کھینچا ہوا ہے اس کے بند کڑوں کو کھینچتی رہتی۔ اور
سب اسے شوریٰ درد پر یقین ہو جاتا کہ کھڑکی بند اور قفل ہے تو اسے اپنا ملک کرہ چھوئے زیادہ تک اور کھینچا کھینچا مومس ہونے لگا۔ اب
اس کا بھی چاہتا کہ بند کڑا اور تکی بولی دیواروں کے ساتھ سر پہن کر جھلے۔ مگر اسی وقت اسے مومس ہوتا کہ آباپنی سرخ آنکھوں سے
کڑکے ساتھ اندر جھانک رہا ہے۔ سر دی کی ایک لہر اس کی گون میں دوڑ جاتی۔ وہ پھر بری سے کر دوڑا اسے کی طرف اٹھتی رہتی
اور سب سے یقین ہو جاتا کہ دروازے میں کوئی شخص موجود نہیں۔ تو وہ ایک گھڑی سی نظر کرے کے پاروں کو اب ڈالتی۔

بشری کی چادر پائی اب بھی کھڑکی کے قریب جوں کی توں بڑی تھی۔ اسے یاد تھا سب پہلے پہل وہ اس گھر میں آکر پہنچے تھے تو
بشری نے خچے چرے اس سے یہ جگہ چھین لی تھی۔ لیکن اب بشری کے پہلے جانے کے بعد بھی وہ بشری کی چادر پائی کو اداں سے بنا دینے کی ہمت
نہیں کر سکتی تھی۔ وہ غور فرماتی تھی کہ اسے بشری جیسا نہ سمجھنے لگے۔ وہ بشری نہیں تھی۔ فرزندہ تھی۔ سر سے پیر تک فرزندہ اپنی اس
ملک تشنگ شخصیت کو غور کرنے پر مجبور۔ سردی کی ٹھنڈی اور ہر سات کی حاسن راتوں میں بھی وہ اپنے اسی کونے میں سوتی جہاں ہوا اور
روشنی لاگت تک نہ تھا اور بشری کی چادر پائی اسی کڑ اور دھنک کے ساتھ وہاں پڑی تھی۔ اب وہ وہاں کو بھی اسے وہاں سے بنا دینے
کا خیال نہیں آیا تھا۔ بشری کی چادر پہلے پہل سے خیالی ہو گئی تھی۔ کئی بار اس کا بھی پاؤں کہ وہ وہاں سے کھے بھلا اسے اصرار کیوں نہیں جاتا۔
لیکن پھر وہ چپ رہی۔ اور بھی تو بہت سی ایسی باتیں تھیں جن کے بارے میں وہ چپ تھی۔

خدا بشری کی وہ تصویر جو ایک پرانی ڈرنک کے فریم میں بڑی میز پر رکھی تھی۔ وہ بشری کی کسی توہمہ خیاالت کی ایک
تھی۔ کہ اسے وہ میز پر اس نے صرف اپنی تصویر کھینچنے کے لئے رکھا تھا۔ حالانکہ اس میز پر فرزندہ کا بھی بشری جیسی ہی تھا لیکن
اب بشری کے جانے کے بعد بھی اس کی تصویر میز پر پہلے کی طرح قبضہ جمائے تھی۔ تو صرف اتنا تھا کہ جب دن آتا ہے کہ اسے کھانا
لیا سونگے سونگے کر چھوئے اسے اس تصویر کو الٹ کر دیا تھا اور اب فرزندہ کو تصویر میں بشری کے بے نیاز چہرے پر پھیل گئی باخیاں
ملکہ بہت غور فرماتی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ ایک ایک بھی تھا یہ بھی بشری کی طبیعت میں تھا۔ اس طبیعت میں وہ ہر وقت نہایت ہمتی

کھانچا ہوا تھا۔ یہ ناول اور سلسلہ ترقی تھے جو کسی سے بڑھ کر تھے۔ کھانچا ہوا تھا۔ ہر چیز میں دیکھ کر
 کھانچا ہوا تھا۔ ہر چیز میں دیکھ کر کھانچا ہوا تھا۔ ہر چیز میں دیکھ کر کھانچا ہوا تھا۔ ہر چیز میں دیکھ کر
 کھانچا ہوا تھا۔ ہر چیز میں دیکھ کر کھانچا ہوا تھا۔ ہر چیز میں دیکھ کر کھانچا ہوا تھا۔ ہر چیز میں دیکھ کر
 کھانچا ہوا تھا۔ ہر چیز میں دیکھ کر کھانچا ہوا تھا۔ ہر چیز میں دیکھ کر کھانچا ہوا تھا۔ ہر چیز میں دیکھ کر

ہیں جو بھی کسی ماں سے دلی زبان میں ذکر کر دیتے۔
 "یہ بھڑکی گئی خیریت کے استفسار سے کہیں سے تھی ہے؟"
 "میں کیا جانوں۔ آپ سے ہی پتہ چلتا ہے۔" ماں پہلے ہی ان کے بے جا ڈھونڈنا سے ملتی تھی۔
 "کچھ غصہ ہو گئی ہے۔" آبا کا صبر اور اصرار ہو جاتا۔
 "میدیں پر گزرتا ہی ہے۔" خودتہا کہیں سنا نہ دیکھا۔ "ماں بچے بدل کے پہلے چوڑے جاتیں۔"
 "آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی ابھی چھپا ہے نا۔" آبا بات کے سمیہ پتھر کو پچانے کی کوشش کرتے تو من زبانی کہہ جاتیں
 "چھپا تو اس کا ساری فرد جانے گا۔" سنا نہ لگتی تھیں۔ "لاکڑی کے گھر لگے۔" وہی گڑے برنگے۔ گرا آپ کو سنبھال کر لے گا
 کیا ضرورت ہے۔"

"جست۔ بروقت۔" ہاں۔ کہہ سہتی ہی نہیں بلکہ چلی جاتی ہے۔ "آبا کی آنکھیں کھول کر تو رہ جاتیں۔" ان کی کڑک کے آنکھ
 اٹھ لی کیا ہستی۔ گروہ پر بھی خاموش نہ رہتی۔
 "تو رہے جانے۔" ان کی کڑک کے نام سے انہی پر "اور غرت کیوں ہے۔" لڑکیاں تو پرایا دھن برتی ہیں۔ یہ کوئی گھر دیکھنے کی
 چیز تو نہیں ہیں۔"

"اب۔" ان کے ہاتھ کو آجاتی ہے۔ "آفر جا ہی کیا ہو۔ کسی دیا سے اپنا سر پھوڑ کر مچھاؤں کو لڑکی کو کسی کو نہیں میں دیکھ لی وہیں کہہ
 دے کہ ہر کوئی مناسب۔" رشتہ ہوتا ہوا ہوتا ہی کر دے۔
 آبا بھی تھک اڑ کر جواب دیتے۔
 "رشتہ تو نہ مٹا دے ہی سے گا۔" ان کی کہتی۔

"میں جوں کو کوئی چاہتا ہے۔ سب پیسے لے کر رہی۔" ہر غریب کو تو خدا ہی دھوڑے سے بیٹھ جاتا۔
 "تو پھر تم اپنے جیسا گھر نہ مٹاؤ۔" پڑھا کہ ہو۔ بات کی کہ چھوڑیں لگے ہی شادی ہو جائے۔
 "اور آتم سے تو بات کرنا جیت نہ لیا ہے۔" ایک دفعہ کہہ دیا۔ ہر جانے گا سب کہہ۔ اب کہہ نہ ہونا۔ آبا کے
 سر اچھے دھان کا جوش بھی غصہ پڑ جاتا۔ "وہاں خاموش ہو جاتے۔
 "اور غصہ نہ سہتی رہ جاتی۔" واقعی آبا کو شادی کے نام سے اتنی پڑا کیوں ہے۔ "وہاں بیٹھ گئے۔" تن کی ہر کوشش تبا

کی سرودھ کے آگے پانی کا جیلہ ختم ہو رہی۔ بشری ایک دفعہ بیٹے میں قیل ہو کر چہرہ اس کی تیار ی میں مشغول تھی۔ اب اس نے ماں کی حق کشی میں دلچسپی لینا باطل سمجھ دیا تھا۔

ابھی سٹلے میں کوئی حرکت اگلے کے ہاں آئی اور اس لئے اندر جانے کو کہیں تو دو نور دکھاواں تے جواب دیتی ۔
 ”فرقہ کو دکھا دیجئے ۔ میں نہیں جاؤں گی ۔“

"مید؟" مان تکیس ہرگز پوچھتی۔

”میں نے اعلیٰ شادی نہیں کرتا چاہتی۔“ بشریٰ فیصلہ کن جواب دیتی۔ ”جی نی کر کے میرا دوسرا دس کرنے کا ہے۔“

دماغ بے چاری عجب حسیت میں پھنس گئی تھی۔ ایک طرف تباہی کے لالوں میں، دوسرے انارہت تھے۔ دوسری طرف
مجازی زندگی بکڑ بیٹھی تھی۔

نبا بشری کی باقی بچے اور چمبہ رہتے۔ لیکن ان ضرورتوں کا ناکام بشری پلے سے زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔ بشری بشری کرتے ہوئے نہ ٹوٹتا۔ ابرے جب بھی مٹے بشری کے لئے ضرور کہہ دیتے۔ یوں گناہ جیسے بشری کے اداؤں سے اجاہوش تھے۔

یہی یہ تو صرف فرخندہ اسلوب تھا کہ بشری کے اواسے کی تھی۔ دو سال کے اس نائیک نے حوآہ اور امان اس کی شادی
 ۶۰ سے میں کیسے رہے، فرخندہ اس کے اندر کو جس نے جذبات کو بیدار کر دیا تھا۔ اور اب وہ میری اس بات میں یوں نہیں ہے اسی قسمی۔

”بشری کی بازگشت نہ ہوتے نہسے محی اس کی بازگشت تھی۔۔۔ دوسرے حالات کی حالت بشری نے یہاں ہی احسان لے کر کام کیا تھا اور جبرائیل علیہ السلام کی خواہش اور رائے کا خیال کئے سے اپنے مقصد میں لے گیا تھا۔“

ہاتھ پچھے ہٹے جب وہ پہنچا اس سے کہیں فرزندہ آج جس گھر پر سے آؤں گا اس سے نہ دیا۔ ڈارن کا اس لاکھنی
 لکھن جاتا تو فرزندہ کچھ جا رہی تھی مگر ہنسی کر ماس کے استفسار پر چپکے سے ہنسی کے الفاظ دے رہی۔

ان سنس کرچپ کا جب وہ ہاتھ تھاکے جو سے وہ لگے جو ایک لمحے کے لیے ٹھہرا جو جاتا، بٹن پر وہ سنس کرکے : اگلے
جرمی تو سب سے پہلے وہ کوئی زکوٰۃ فکشن پڑھائی کہ اور فکشن زیادہ اہم ہو تو وہ اس کے ساتھ لگ جائیں۔ اب وہ کبھی

انہی کی آغوشیں جا کر بے آواز گم۔ اور فتنہ ایک دم گہرا کئے گئے، اور آواز والی سب سے زیادہ میں۔ عوامی آواز نے کی
نہ کے ساتھ۔۔۔

”بر تو پر شک ہے۔“

تبدیل کرتے ہوئے درج ذیل چیزیں مددگار بناتی ہیں۔

”کسی دوسرے ہاتھ کو کرنا چاہیے۔“

مقام قزوینی کی جتنی ہمت و جاکہ کاری ہے وہاں دوسرے کو سب پر ہمت اور دلدادگی کی جگہ نہیں ملے گی۔

جی۔ بشری نے آپاری محی دھونس جازو نہیں اپنا زواں بنایا ہے۔

تب ۱۱۱ پیر نے عکس کے میں آجاتی۔ یہ کہ جس کے اوپر بیٹھ کے نے وقت تک پہلے سے کہ جس کے غیب کھڑکی

کہا کہ وہ ٹھٹھ پہنے میں جھانک۔ مٹی گردی حائل بگون کی ایک قطار پر میز پر آئی اور حق کی گڑبڑ میں اتر جاتی۔ اور وہ سوچتی
اس وقت بشری افلاق کے ساتھ کسی سینہ آؤس میں غم دیکھ رہی ہوگی۔ - افلاق کے ایک انگڑے جانا تھا۔ - وہ کہہ رہی تھی کہ وہ
آؤسے دیکھا تھا اور وہ بھی چند ایک بار۔ - لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ اس کے بارے میں سب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ -

اے انسانس تھا کہ بطرفِ خلاق کو نہیں بلکہ مخلوق - یعنی وہ خود مرکز سوچتی رہتی - بشری کے پاس جو اونچے اور خوبصورت خراب
ہیں خلاق ان کی تعمیر نہیں بن سکتا - بشری اس چرٹے سے لگنے بڑے دھول سے نکل کر مکمل تضامیں پر دھار کرنا چاہتی ہے - اسے عوارض
سے ہمہ جہد پہنچائی روزی چھوڑتی زندگی پابستہ - اسے اہلوں سے جنت ہے - اس کے خواب بست خوبصورت اور بہت قیمتی ہیں -
خلاق نہیں پروا نہیں کر سکتا - کسی بد اس لاشی مابتا کہ بشری کو سمجھائے - لیکن وہ جانتی تھی کہ بشری ایک تھینڈر آئیز قہم کے ساتھ اس کے
شر سے کرانکر اس کے بشری بہت زیادہ جذباتی تھی اور خلاق کے پاس سے میں تو وہ انتہائی شرت پسند ثابت ہو رہی تھی - وہ
خاموش رہی اور اسی خاموشی میں وہ لانی اور جیسا ایک کات لگی - جو اس کے دیر دگنی میں ہی رہتی تھی -

نہایت گہرے پیرے سے، تو پیر نے بھی ابھی بدو جہانے تھے۔ وہ بات میں کانڈ کا چھوٹا سا پڑو لٹے کوڑے کے
سے گھڑی کا پتہ چہ ہی تھی، اور روٹنے جا رہی تھی۔ سس کی کچھ میں نہیں نہ ہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سامنے شیر میں کا گھڑ
گھوڑا ہے کے کھٹے تھیک نہ کی ہے نظر آ رہا تھا۔ او ابھی ابھی بشری اسنیز کو کیے چبا جانے والے دانوں کی تھاروں کے
دو پہاڑ بنے تھے۔ ایک راستے پر خوشی کے کچے پٹے قدم خانی جی ٹی تھی۔ یوں۔ بشری کو تو آ جا رہا تھا۔ پھر دو کیوں نہ
نہ جہ سے خار میں آ کر تھی کیا، خوشی پانے کے پتے نہ کی سے گڑھا پڑا ہے۔ وہ کانپ کانپ کر روٹنے جا رہی تھی، اور اس جھیل
سنی میں کانڈ کا پڑو جس اس کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ بشری نے اس لی۔ منی کے غلٹ اس پر ہاتھ مار کے اسے ایک بڑی الجھن میں ڈال
دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک ٹوم میں نہ کر رہی تھی، اس نے یہ سب کچھ اس سے چھپ کر گزیر نہیں کیا۔ ایک بار لی اس کا وہ
وہ بشری نے اس کو کھنڈا دے، اور ابھی پہنچ کر اس کا جھید کا شکر کر دے۔ مگر پھر اس کی وہی نہ لی بڑی آڑے آئی وہ نہ نہ

گھڑی رہی

مخبر سے کہیا کہ اہل بانی رگم کی ہند میں وہ بائیس سے آدھیر سے کے باوجود اس نے اپنی بیٹی آنکھوں کے ساتھ آنکھوں سے رو رو کر بچے کی طرف سے ہر سے نہ دیکھ اور اسے نہی پر ہوا ترسیا۔ جس میں اس پر سے پرست کی رو دی گئی۔ مائے کی اس داستان میں جسے ہم نے پہلے کہا ہے تو اسے جوں بٹا کر تین روپ دیکھ۔ شیخ یہ چہ وہ بھی غم سے شت جانے کا اور توجہ و اختیار کے کاموں پر بھٹکے۔ نہیں اس سے کہ وہ تین روپوں سے گڑ چھوڑ کر اپنے بستر میں ایک گئی۔ اس کی ماں نے بازار سے اپنا کیا۔ اس صحت تحریک کی اس نے باقی صحت کو مٹا دی اور بڑے کے بچوں کو اور آیت ٹھیک کر دھن کی۔ اس کے منہ سے یہ بھی آج بھری گئی۔ اس کے بعد وہ چہ دیکھ نہیں۔ اور نہ وہ نے سہا جائیداد کے کوئی جیسا ملک پیدا دیکھ سے۔ اس کا دل غم سے گایت دیکھ دیا اس جہاں سے نونے چھنے کی ادا تائی ہوئے جس سے میں وہیں پرکا وریں ایک دوسری پر چھنے چکی تھیں۔ ساری رات وہ ایک ٹکے کبھی ماں کبھی تباہ کی تباہی سے کہ نہ ایک ٹکے کی صحت دیکھتی رہی۔

[illegible]

میں ہا سائیکل پر اسے کھینچا چوڑے کے ہاتھ۔ پھر سائیکل پر ہی وہ کلاں سے چابی آتی۔ اس پر ہی وہ صاف دیکھ رہی تھی کہ بڑا
انکس اس سے غیر مطمئن رہتے ہیں اسدہ میں کا رننگ ویک کر چوسنی جی ہار ہی تھی۔ اسدہ میں کندہ جیتھ جیوان سی برقی جی ہار ہی تھی۔
کبھی کلاں سے آتے یا جانے وقت کرنی زبوں سائیکل کے نیچے لگ جاتا اسدہ مضران شرمز کر، عہد گھوڑ کر اسدہ کھینچتے
نواس کے ادا پانوں چوڑے لگتے۔ نہ میں لگتا جیسے آواز جاس کے قریب پہنچے ہو ہی کا قصور کج رہے ہیں۔ اگر یہ لے کر
جہ ہاتھ آدہ باطل زورس برہان۔ بعض ہوقات تو اسے ٹھوس ہوتا جیسے اسے پناہ مانو گیا جا رہا ہے۔ اسے کھایا جا رہا ہے کہ وہ
جی بڑی ہے اسدہ اسے نہ خرم کا اثر لگنا چاہیے۔ بعض ہوقات تو یہاں اس آنا شہید ہوتا کہ اسے لڑ لگتا جیسے کسی فیہات
کے زیر اثر ہے، پناہ خاب ہلکے دے گی۔ اس صاف صاف کہہ گی۔ میں اس شے کہ جاتی ہوں۔ لہذا اس سے جھٹکا ہے اسدہ میں
ان آدمی دست کر کے ساتھ چال جانے کا سہما وہ کہہ رہا ہے۔ لیکن میں چروس کے شعل کی پٹیل کام آتی اسدہ یکدم ہر کہ ہلکا
ہلکا اسدہ کہہ کر کہہ لگتی۔

خروج شروع میں یہ خود غصہ مہلت اس کے ذہنی آرائی کو منقطع اور مفلوج بناتے ہیں۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ وہیں مہلت
لیا کر برائی بہت کہیں وہ دلہا ہاں سے کٹ کر فرمائش کرتی اساعا ہے مدد سے وہ وہیں گئیں۔ بس بس یہ فرمائش پوری کرنے کا ہوتا
نیں رہا۔ ایک کے بہت پانچاڑا کر کے دیکھ لیا۔ یہ باتیں اسے ناگوار گزرتیں۔ مگر یہ باحدا سے سخت ناگوار تھ کہ اسے ہر قدم پر
بشری کے برابر کھڑا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

کچھ سے کسی نسبت و نگاری سے دین وادگار نہ لگے۔ اور ہم ایک نسبت بدیہی نے فکر کی خاموشی اور ساک فضا پر نیک
جگہ سے پھیل غنہ سسکی۔

اس میں کچھ ایسی ہی چیزیں ہیں جن پر ہمارے ہمارے خاکسار کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ — شام کو جب

وہ لوگ کہنے لگے تو ان شخص کے گھونٹ پہنے گا انتظار کریں۔ کمانا کاتے نکلتے وہ یکدم برس پڑیں۔

• کھنچے گئے تھے آپ؟ انہیں نے کیا وجہ کھنچا؟

• کہیں کیا کوئی ضروری کام تھا؟ ہانے سڑت سے پر تھا۔

• کہہ جاتے ہیں کہ ہمیں نہیں دیکھیں۔ آپ کیسے نہ جائیں؟ انہں نے جس کی رو بہ دیا۔

• خود ان سے یہ کیا کام؟ بابا بھو بھو ہے۔

• غلطہ کہنے لگے، اشک لانی ہر کتاب سے اب بے وقت منہ کے بل کر کہیں ہر شیار نیس برتاؤ۔ اس نے استعارہ استعمال

کیا یا بابا یکدم جھڑک اٹھے۔ پیلیاں کیوں بھو بھو بر۔ سیدھی طرح بتاؤ کیا کتا چاہتی ہو؟

• میں کیا کہوں گی؟ کیا کہتی ہے کہ اس آدمی نے انہوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ لیکن آئیہا دور کھو خندہ کریں اس کو نہیں میں

نہ کہنے دوں گی۔ اور کہیں میو ساتھ دینا ہوگا؟

• اپنی لہجہ کا بڑا کھنچا جاتا ہے۔ تم سے زیادہ بھلے فکر ہے۔ مگر میرے کس سے آنے کا؟ رشتہ پر ہاں سے کہہ دینا

میں انتظام کر میں گے۔ بھلائی کوئی دس اور دس بھی ہیں۔ ایک اکیل لڑکی کو بھی بیوا نہیں کہتے۔ ہاں خوش ہو رہے ہیں اس

کے بعد بابا اس کے درمیان اکثر جھڑکیں ہونے لگیں اور وہ بھوکنی۔ آج سے دو سال پہلے فانا تک دھوا ہوا ہے۔ وہ اپنے

اس چھوٹے سے بند کمر کی دالے کو سے میں جی سب کچھ دیکھتی اور سنتی رہی۔ انتہائی عریں آتیں اور اسے بلا دیا کی طرح دکھایا

جاتا۔ پھر بھاؤ ناؤ برتا اور آخر میں تانی اپا پر لڑتی ہو میں موقعوں پر کہیں غائب ہو جاتے۔ اسے نہ اپا پر غصہ تھا۔ نہ اس نے سہیت

وہ بشری نہیں تھی خندہ تھی۔ ایک خاموش تماشا خانہ۔

اور پھر پڑیں ہر کہ ان کی دو سال کی کرشمیں رنگ و ایں۔ اس کی گھٹی بڑی، ڈاکٹر اسیات ڈاکٹر اندر خوب سڑت

ہاں تھا جس کی جھڑکی میں ذوق تھی اور شاخہ فروغ تھی۔ خندہ کی قسمت پر ہر کہ کو رنگ اور تھا۔ اور اس وقت ہر شاخہ

کی چاہیے۔ ہذا جو تک سر دھری کا کھار کرنے پہلے ہونے تھے، شادی کے دن کو قریب آتا دیکھ کر وہ بھی سستی جھاڑا اور اٹھ کھڑے

ہونے۔ چیزوں کی خرید و فروخت میں جو بیکھرے نکلتے تو شام کی کوہاں آتے۔ دھن نے سو بڑا تڑ سے ابھاننا صاف اپنی بسااسے

بڑھ کر مزید تیار کر دیا تھا۔ جس سے شام تک چھریں دھو تے ہاں کہ وہ بھی عرواتی۔ شہر کو تک بار کر بیٹھے تو یا تو کی زکس ہانے

دھان سے بھگنے لگتے یا پھر بیٹھے یوں ہی خندہ خندہ سانس بھر لیتے تھے۔ ان وہ چار دھان میں جیتے وہ اندر ہاں سے ہر کہنے

تھے۔ چنیا کھل لگتے تھے۔ اور ہاں کو کھل چنیا کے مکھنوں پر تھے۔ وہ بھی سفید ہاتھ تھے۔ انہوں نے ہر کہنے کی تھیں

اندھوں کی ہڈیاں ابھرا آتی تھیں۔ کہہ کہ گشت کھ گیا تھا۔ پچھ کے فٹ پڑے اب ایسے ہوئے تھے۔

اب کہہ کہ ہر کہہ ہر کہہ۔ خندہ جب بھی کہہ سوتی اسے بشری ہیہ جات اور وہ اپنے۔ ان میں اس کے لئے اندھ اور

خندہ غصوں کرتی۔ ہاں سے اس کہہ کہ کسی نعمت ہاں کیا تھا۔ اس کا ہم تک کسی کی نہیں ہر کہہ تھا۔ ہر کہہ ہر کہہ

غصوں پر تھا تھا جیسے ابھی تک اس مگر ہر بشری کا قصہ تھا۔ وہ جا کر بھی نہیں گئی۔ اس کی چھریں ہاں سے ہر کہہ کی تھیں

[illegible]

” شادی پر بھرتی کر نہیں جا سکتے؟ میں نے جاواں لڑکیاں چنگ کر کے ہونے بات چیر دی۔

ہنسنے جو تک کہ اس کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ایک لڑکے نے چمک سی آئی۔ اسے پھر نورنا ہی اس کا سپرویز کر چمک کر کہہ
 بے جا جس اس بے حس ہو گیا۔ وہ نورنا وہاں سے اٹھ کر گئے کے اندر چلے گئے۔

خوشہ کچی میں کھانا تیار کرو ہی تھی ملام چھوڑ دے وہ بانے سے کرے کے ساتھ سے گزری۔ ہتھکڑیاں لگا کر کسی پرندہ
تھلا دے ساتھ لے کر دیا کر بڑے غم سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی انگلیوں میں پھنسا ہوا لکڑی کا دھڑک رہا تھا۔

علامت سے بگڑا ہوا ہر جانے کے بعد آنا کے دفتر کے عورت میں بڑی یکسانیت آگئی تھی۔ بیک سیر سے اٹھنا، ہانا سے خور و پی، شلو و دودھ دہی، بھری گوشت وغیرہ وغیرہ۔ وہ پہلا کھانا کھا کر لمبی تان کر سوجاتا، یا اپنا ہڈیا کھڑا کرتا، یا بڑے مائیکل سے کہہ کر باہر نکل جاتا۔ شام کو کسی مکان پر جا بیٹھتا اور بات گئے تک بیٹھے کھپ شہ پی مشغول رہتا اور بات کھانا کھا کر سوتا۔

ہب سے بشری گئی تھی وہ زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو عورت دیکھنے کی کوشش کرتے جیسے وہ بشری کے خیال سے ڈرتے ہیں۔ اور یہ حقیقت تھی کہ انہیں نے کبھی بشری کے شوق سوجا نہ تھا۔ بشری ان کے دل کے بند کراڑوں کے پاس ہاتھ سالے۔

کڑی مسک رہی تھی۔

ماں نے ذکر چھڑا کر جامک انیس عشویں برا جیسے ہند کو اڑھ بجو کھٹ گئے ہیں اور بشری ہے دھڑک اندر آگنی ہے لب جب
وہ اپنی سوچوں سے چمکتے انیس، ہاں کہ صدر سا ہوتا کہ ایک سوئی کارگر سوانے بشری کے اور کچھ نہ تھا۔ بشری ایک سوچوں ج
جیسے صفت جا رہی تھی۔ کس روپ کے کچھ باختر کے بت کہ مرث جو نہ بے نکالے نہ نکالے۔

یہ انیس کیا جتا جا رہا تھا۔ ان کا وہ غمزدہ شہسوار وہی لمبی ناک کہیں خاک میں حق جا رہی تھی۔ لیکن بشری کو وہیں سے آتا دینا ان کے اختیار میں نہ رہا تھا۔ اس کے دل پر بڑی مضبوط گرہیں تھیں جو جلد گنتی جا رہی تھیں۔

دانا میں ہوا دک میں کیسے جڑنے نکلے۔ ہزاروں کہہ جاتے تو نہیں پہنچ سکتا ہوتا۔ ایسے سو کے مائیں ہاتھ کی کھے والے دانا
کس نہم نہم اور جیگ جیگ کی آواز ہے۔ پتے پتے وہ بے دھیان میں رنگ جاتے۔ اور جب وہ چمکتے تو کس ہیں دانا یا مائیں دانا
کی دکان پر کھڑے ہوتے۔

• کیا چاہیے جان صاحب؟ دکاندار نے کہا کہ آج اس نے اپنے دو بیٹے بائیں ہاتھ کے بیٹے کو لے کر گھر

ٹیک اس مدت کوئی اس کے کان کے پاس تالی بجا کر، زور بجاگ جاتا، چھپ جاتا، کیں گم ہو جاتا۔

”صاحبہ! کہہ گیا ہے۔ دکاندار کی دوسری تنخواہ میرا خزانہ میں باقی پریشانی کو دیتی۔“

اس کے ذہن پر بھی بڑی بشری کی تصویر کا اٹھا کر دیکھا بشری مسکرا دی تھی۔ فرخندہ کی آنکھوں میں آنسو چمک اٹھے۔
اس نے دوپٹے کے پٹے سے تصویر کو صاف کیا اور سر جھپکے سے اُسے اپنے کس میں چھپا دیا۔

فرخندہ اس نئے کمرے میں کرسیوں کی ترتیب کو تنگ کر رہی تھی کہ آبا چاکل اخبار پر پتے جوئے اذرا لگے۔ فرخندہ کو یوں
چاکل جیسے وہ شخص جاننے سے اندر آئے ہیں۔ فرخندہ نظریں نیچی کئے کسی جرم کی طرح کرسیاں اور صرستہ اُٹھ کر آتی رہی۔ نہ جانے کس
آواز سے کیوں شرمندگی سی عموں جو رہی تھی۔

• اخبار — اچھا! خدا کاں ہے؟ " اُن کی آواز تھر تھرا رہی تھی۔ انہوں نے گھوٹی سی ایک نظر کمرے میں ڈالی۔ بھل کر
میز پر سے میپ کے قریب پہنچی ہوئی تصویر اٹھائی۔

"اوہ آ تصویر انہوں نے گورڈا نیچے دکھ دی۔ یہ بشر نے تھی۔

فرخندہ نے وہ زویدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

آبا کی پہلی۔ ویراں اوپر رونق آنکھوں میں نئی سی تیر۔ جی تھی۔ سون نے باری باری بھل کر دنگ اور ویک کو دیکھا۔
بشری کی تمام نشانیوں اور یادوں کو مٹا دیا گیا تھا۔ اب وہیں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے دیکھ کر بشری بے اختیار یا د آجائے۔

• اخبار نہیں ہے یہاں؟ انہوں نے جیسے وہاں بے صعب لڑنے سے ناخوش کیا۔ پھر باہر جانے کو مڑتے ہوئے
چاکل ان کی نظر بند کھڑکی پر پڑی۔ ایک لمبے کے فٹے دو ٹنک لگے۔ انیس دو وقت دو آیا۔ اب اس کھل کھڑکی کے پاس بشری
بڑے شصے جیٹھی آتم نظم رسالے پڑھا کرتی تھی اور وہ دور سنی۔ یہ کہ نیچے بازو رکھ کر بیٹھے اس کی ان نمود سرریں پر ال ہی دل
میں ہی داب کیا کرتے تھے۔ بشری انیس اس کھڑکی کے بہت نزدیک بہت ذیاب لمس ہوئی۔ سون نے مڑ کر ذندہ کی طرف
دیکھا پھر اس کے تھر تھرتھے ہونٹوں کو جنبش ہوئی:

"ماں سے چالی لے کر یہ کھڑکی کھول دو۔"

نقوش ال آپ یادہ عامہ یادوں میں

آپ بیتی نمبر ۱

ذی کس ایڈیشن مسودہ

(بہارِ خوبصورت، بہار اور کرناٹک کا ذخیرہ، قیمت - ۱۰ روپے)

طاہر نیوز ایجنسی - نکل روڈ - کھارچی

کھلے خط

عظیم و محترم

[illegible][illegible]

مرحوم صاحب نے بیان میں ایک مقام اور بھی لکھا ہے کہ خیال یہ ہے کہ مرزا صاحب کو ۱۰۰
جوں روپے یا اس کے چند روز قبل ارقاہ کیا گیا۔ اس خیال کو بنیاد خود اس ہی کے بیان
کے مطابق "اس کا خد" یعنی ۱۰۰ روپوں کی مشابہتیں اس پر لکھا تھا۔ اول
تو یہ بادشاہ کا خلیفہ ہے کہ ۱۰۰ سے تھوڑا سا بڑھ کر پچھتر کا خدوں کہ تھے خد خد
نکات سے مراد وہ خبریں مل جاتی تھیں کہ اس کے قتل پر کسی کے لیے ۱۰۰ روپوں کی پاداش
تھی۔ پھر قتل ارقاہ کا اور آخر جناح کی قتل سے اس کی ایک اور حکمت مرزا صاحب نے

بہت کوئی کلمہ کہ جس پر اگر کوئی کہے اس کا ہر کام سہل ہو۔ اور
 جس کے اندر اس کی ہر نگاہ اس کا سر سے گزرتی ہو۔ اور جس کے
 آگے اس کی ہر چیز کی جیت بہت آتی ہو۔ اور جس کی ہر بات اس کی
 بہت سے نیک اور شرف اس حرکت سے کہ اس نے اپنے اور حالت میں بہت سے کام کیے
 ہو۔

ایک روز مشرک اس صاحبِ بریل سے مل کر دعا کی کہ وہ اس کے لئے جنت کے دروازے کو کھول دے۔

میرا کہ سے کہ ہم خود بخوبی سپاہیں پکڑوں یہی ہوئی جہ کے انگوٹھے گھاہی
 اسی وقت ڈاکٹر صاحب نے گولڈ کو پہنچا کر کہا کہ اس کا دیا (کلام باب ۱۲ صفحہ ۱۲۷)
 اسی باب سے یہ امر انصاری واضح ہو جاتے ہیں (۱) کہ قتال کا نام (۲) کہ فتنہ کی تدبیر (۳) مرنا کا
 اور اُن کے قتال کے ساتھ پڑھیں کا غیر شریعہ دستور (۴) کہ لڑائی کی سزا کی کہنے کے واسطے کا نام (۵) اور
 جس کے سزا کی گئی تھی اس کا تیس (۶) مرزا صاحب کے ایک شرکی و جہنم اور چونکہ یہ سزا
 پانچ ہے ہم اس سے خود مرزا صاحب کے سبب یا فتنہ کا تائید اور سبب کی تسبیح کہہ سکتے ہیں۔

یہ حاشیہ ہے جو غلامی عثمان صاحب نے اپنی کتاب مکتبہ خانبیہ خاتون کی حراست کے واقعہ پر لکھا اس وقت یہ سننے ملا مکتبہ خانبیہ کی تیسری اشاعت ہے جو ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔ مگر صرف اشاعت ۱۹۲۹ء میں ہوئی ہے اس کی یہ حاشیہ کچھ قبل ہو۔ پر جو بے بر محل لکرم ۱۹۲۹ء کے طبعی حاشیہ کو ہی پیش نظر رکھیں تو یہی ڈاکٹر آغا کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ مکتبہ کی حراست کے بعد میں خاصی واقعہ آغا مکتبہ پیش نہیں کیا گیا کیونکہ چند روز ہی پہلے تاثرات تو مکتبہ خانبیہ کی تیسری اشاعت نے ہی دیے۔

ہے غالب کہ است کے مطلق انکار ایک کے اندر کڑواہٹ کی قوت بھی تقریباً وہی ہو سکتی ہے کہ اس شامت میں پیش کر دیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بھی مشکل ہے کہ ڈاکٹر ہارلڈ جیسے کتاب فروش کی نظر سے یہ کتاب نہ گزر سکی ہو۔ بہر حال میں اس سلسلہ میں اس سے زیادہ کیا کہ سنا جوں کہ فقرہ ش کے قریب فارغی کو خلاصی سے پہنچانے اور ڈاکٹر ہارلڈ کی اصلاح کے لیے آپ مناسب طریقہ اختیار کریں۔

میسٹر اپنے خیال میں ماضی نے قطعے ساتھ نثر اپنے اشار کی تقسیم کے لیے کھلی ہے کیوں کہ جب تک کہ تو ان کو روک رہا ہے۔
 کرنا اور جتنی پختہ دیکھو گا اور قدر اس موسم جو کہ تو ان کا "نہ غریب" ہو کر ہوا اور اس کے جو تیرے سے گھر کرنا خداں میں ڈھانسا۔ یہ
 سب ملکہ چست رہ جاتے ہیں۔

ترقی ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ و نسیم۔

روزنامه است

وہ سب کچھ ہے جسے وہ دیکھتا ہے

جب وہ کھڑا کھڑا کر مڑتا ہے تو

زیریں سے اس کا منہ پھٹتا ہے :

ہلک

اس کی انگلیاں ہیں جیسے تھوڑا سا دھڑکنے والی

کھلے آندھے چوٹی پر رکھ دیا گیا ہو

اور اس انگلی میں جو مٹی پر دیکھ لے گی

وہ ایسے سوچ رہی ہے جیسے جانیں لگتا :

بھول

سیاہ بھری شیشی کا گھر کے کھنٹی ہیں

میں حوت اٹھتی ہیں ویرانہ، زبردستی ہیں :

پلک

پلکوں کا کیا بیان کروں

گہرا دھڑکیں آپس میں تیرا بازی کر رہی ہیں

گہرا رام اور ندوں کی فضا جگمگاتی ہے

دھول پتلیاں جیسا سندھ کے حیران رہی ہیں :

جوش

اس کے سر پہ ہنٹ کو، دیکھ کر جو آب حیات ہے جگمگاتی

کندہ، دھنکھانڈ کر دیا

کئی دوپہر کی طرح اٹھ بھونکا، گھٹنوں سے

وہ جب باتیں کرتی ہے تو چہل چلنے سے

شب و سحر کے برابر تو ہنسی اور ہنسی کے شہم دیدہ گاہ جاتے ہیں :

ہلک گئی گئی اور گندھے سے جھونے والی بھر گئی

نیکارہ زور زور سے بول گئی اور بند ٹوٹ گئی

چوڑیاں بایاں اور ٹھیکوٹ ٹوٹ گئی

ہن کا منہ آگ کی تھنوں اور قشہ ختم ہو گیا : (جینٹل کٹ) یہ بات اور راجہ رانی

دست

دست کی گندھی کی گندھی کی گندھی

دست کی گندھی کی گندھی کی گندھی

جیسے جھانکوں کے اندر سے ہی ہلکی کی ہلکی

سینے

اس کا سینہ مثل ثانی کے ہے میں میں دھندلے گئی

جیسے سونے کے کڑے لٹ کر رکھ دیے گئے ہیں

جیسے مجھ کو اپنا پیش کشی پر مجھو رہا ہے

اسی طرح اس کی گھریاں دھکیا سے چل پاتا ہے

پیش

اس کے پیش کی شیشی مثل منہ کے ہیں

جو رنگ اور حرارت پر مثل زخمیوں کے ہیں

پیش کے دھنسی مثل کالے آنکھ کے ہیں

جوان سے علی کریم کی حوت اٹھتی ہیں :

ناؤ

اس کی ناؤ مثل گرد اپ بھڑکی کے ہے

اس کا سانہ وہ کہے میں کی گندھائی ہو :

ران

اس کی دونوں رانیں اس طرح ہیں

جیسے جیسے کے دو سڈول پیر :

میں نے لکھا ہے کہ وہ خدا کی منکرت میں دیکھے:

پانی کے دو قطرے پادری کا ٹٹوں سے بہ کر آنکھوں پر آئے اور آنکھوں سے نکل کر اس کے کتہا چہرہ پر ٹھونک پڑے۔ گلاب جیسے جوڑوں کو چوم کر وہ قطرے مختلف جہت پر اور چمکے اور نیچے ٹھٹھک کر ————— زبانی کسان فانی ہو گئے۔ (گزار بہتو۔ کامیاب اس)

Number 13

1946

گول یونیفارم & بیفٹڈرٹس سوٹ

تحفہ سیٹ (PRESENT SETS)

نیکریش شرٹ & پارٹی فرائز

ایک سالہ بچوں کے لیے



بچوں کے
تحریرات



ہا اسکے
سبواٹو گنز

بچوں کے
ویڈیو میڈ کپڑے

۴۵- کرشل بلڈنگ- ٹل روڈ
لاہور- غرض فو ۶۲۰۶۲

چلڈرن
ڈولپمنٹ کینٹر

دیر

برائیفیٹ:- ۱۳۶-۱۱ مارکی- لاہور • ۴۶- ایڈورڈ روڈ- راولپنڈی (فہرہ)

نقوش

کے سابقہ نمبر

صفحہ	۴۵۲	۱۔ غزل نمبر	اُردو غزل کی پونے دو سو سالہ تاریخ
	۱۰۹۰	۲۔ افسانہ نمبر	اُردو افسانے کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ
	۱۰۴۸	۳۔ مکتب نمبر	اُردو خطوط کی — سو سالہ تاریخ
	۱۵۱۴	۴۔ شخصیات نمبر	مشاہیر ادب کی سو سالہ شخصی تاریخ
	۹۲۸	۵۔ طنز و مزاح نمبر	طنز و مزاح ادب کی سو سو سالہ تاریخ
	۱۲۰۴	۶۔ لاہور نمبر	لاہور کی نو سو سالہ مستند مگر جامع تاریخ
	۱۲۷۲	۷۔ ادب عالیہ نمبر	نقوش کی دس سالہ تخلیقات کا انتخاب
	۱۹۶۴	۸۔ آپ بیتی نمبر	خودنوشت حالات چار سو سالہ شخصی تاریخ

۶۴۰	۹۔ پطرس نمبر	۱۔ پطرس کے سارے ہی مضامین کے ساتھ فن اور شخصیت پر مکمل کام
۳۸۴	۱۰۔ منٹو نمبر	۲۔ منٹو کے منتخب افسانوں کے ساتھ فن اور شخصیت پر مجسمہ پر کام
۶۲۴	۱۱۔ شوکت نمبر	۳۔ شوکت کی اہم مزاحیہ تخلیقات کے ساتھ فن اور شخصیت پر دلچسپ کام
		اور ان کے علاوہ :-

آزادی نمبر	ناولٹ نمبر	پنج سالہ نمبر
دس سالہ نمبر	خاص نمبر	سالنامے

سوم

کے سابقہ نمبر

۷۵۲	۱ - غزل نمبر	اُردو غزل کی پچھلے دو سو سالہ تاریخ
۱۰۹۰	۲ - افسانہ نمبر	اُردو افسانے کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ
۱۰۳۸	۳ - مکتبہ نمبر	اُردو خطوط کی - سو سالہ تاریخ
۱۵۱۴	۴ - شخصیات نمبر	مشاہیر ادب کی سو سالہ شخصی تاریخ
۹۲۸	۵ - طنز و مزاح نمبر	طنز و مزاح ادب کی سو سالہ تاریخ
۱۲۰۴	۶ - لاہور نمبر	لاہور کی نو سو سالہ سندھ مگر جامع تاریخ
۱۲۷۲	۷ - ادب عالیہ نمبر	نقوش کی دس سالہ تخلیقات کا انتخاب
۱۹۶۴	۸ - آپ بیتی نمبر	خودنوشت حالات چار سو سالہ شخصی تاریخ

۶۴۰	۹ - پطرس نمبر	پطرس کے سارے ہی مضامین کے ساتھ فن اور شخصیت پر مکمل کام
۳۸۴	۱۰ - منٹو نمبر	منٹو کے منتخب افسانوں کے ساتھ فن اور شخصیت پر مجسمہ پر کام
۶۲۴	۱۱ - شوکت نمبر	شوکت کی اہم مزاحیہ تخلیقات کے ساتھ فن اور شخصیت پر دلچسپ کام

اور ان کے علاوہ :-

پانچ سالہ نمبر	ناولٹ نمبر	آزادی نمبر
سالنامے	خاص نمبر	دس سالہ نمبر

نقوش کے ہر نمبر دوبارہ چھپ رہے ہیں اگر ان میں سے کسی نمبر کی ضرورت ہو تو آج ہی نقوش ہیک کرا دیں۔